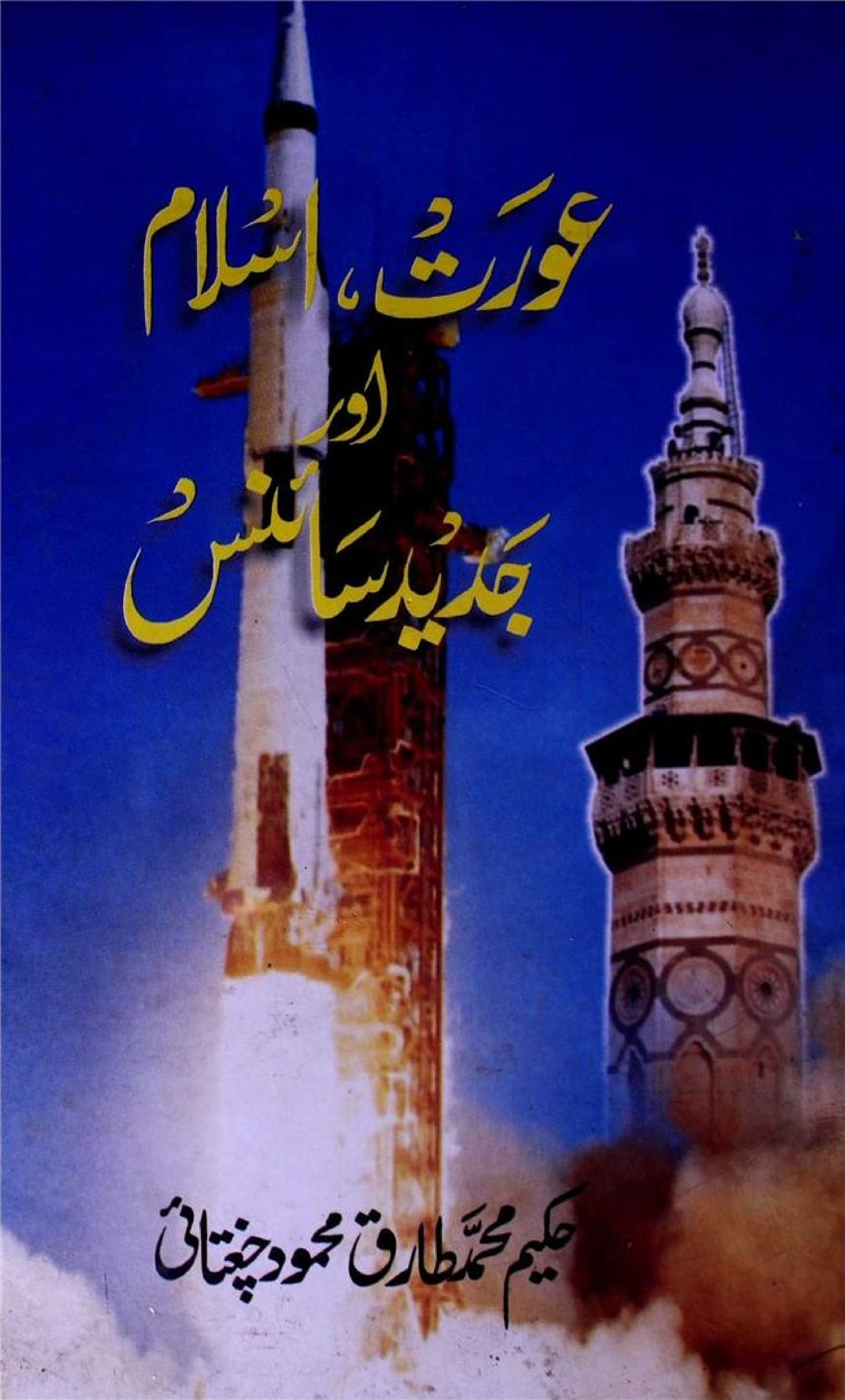
عورت، اسلام اور جدید سائنس



حکیم محمد طارق محمود چغتائی

عورت، اسلام

اور

جدید سائنس

مرتب و مؤلف

حکیم محمد طارق محمود چغتائی

مکتبہ الحسنات، دہلی

سلسلۂ مطبوعات نمبر 290 مکتبہ الحسنات، نئی دہلی

AURAT ISLAM AUR JADEED SCIENCE

HAKEEM MOHD. TARIQUE MEHMOOD CHUGHTAI

ISBN 81-86632-72-7

ایڈیشن 2004

ناشر:-

اے۔ایم۔فہیم

مکتبہ الحسنات، دہلی

2241، کوچہ چیلان، دریا گنج۔نئی دہلی-110002

فون:- 23271845, 56006161, 23252190

E-mail: m_alhasanat@rediffmail.com
faisalfaheem@rediffmail.com

قیمت

150/- روپے

Printed at:

H.S. Offset Printers

Darya Ganj New Delhi-2

انتساب

والدہ مرحومہ کے نام

جس کی شخصیت کے آئینے میں

میں نے اسلام کی عظمت جلوہ گر دیکھی،

شفقت کا ٹھنڈا میٹھا احساس پایا

اور

جنت کا سراغ پایا

حکیم محمد طارق محمود چغتائی

عورت، اسلام اور جدید سائنس
ایک جھلک

دیباچہ حکیم محمد طارق محمود چغتائی 9
جنت کی خوشخبری پانے والی خواتین 10
عورت قرآن وحدیث کی روشنی میں 14
عورتوں کے متعلق حضرت محمدؐ کے ارشادات 17
عورتوں کو اہم نصیحتیں 20
عورت کے کمالات،
ماؤں سے منسوب حضرات 22
دورتابعین کی نامور خواتین 23
خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات 28
مختلف شہروں میں علم حدیث 46
علم حدیث میں تصانیف 47
محدثات کی کتب ومرویات پر تخریج 48
حفظ قرآن، تجوید اور تفسیر 50
رشد وہدایت، تصوف اور تزکیہ نفس 53
شعروادب 54
امت کی مشہور عالمات ومحدثات 57
خطاطی وکتابت وانشاء کی ماہر خواتین 74
مدارس ومکاتب میں عظیم خواتین کا کردار 76
عظیم لوگوں کی عظیم مائیں 78
والدہ امام مالکؒ 78
والدہ امام سفیان بن عینیہؒ 79
والدہ امام اوزاعیؒ 80
والدہ امام ابن علیہؒ 80
والدہ امام شعبہ بن حجاجؒ 81
والدہ امام شافعیؒ 81
والدہ امام احمد بن حنبلؒ 82
والدہ امام بخاریؒ 82
والدہ امام الاوقصؒ 83
والدہ امام عمر بن ہارون بلخیؒ 84
والدہ امام زین الدین دمشقیؒ 84
والدہ امام حجاج بن یوسف بغدادیؒ 84
والدہ امام ابراہیم حربیؒ 85
والدہ ابوجعفر بن بسطامؒ 85
والدہ خلیفہ الناصر عباسیؒ 85
خانقاہوں اور رباط کی تعمیر کروانے والی خواتین 86
خلفاء وسلاطین کی خواتین کی رفاہی تعمیرات 88
ایام حج کے جمالیاتی مظاہر 89
سلطانی وجہانی 90
مدرسوں کی تعمیر 90
ذاتی اوصاف وکمالات 91
اعتراف واحترام 93
عورت کا درجہ 96

عہد زندگی 96
عورت ہر حال میں خیر ہے 97
عورت مرد سے زیادہ قابل احترام 97
اظہار خیال کی آزادی 97
گھر سنبھالنا کم درجہ کا کام نہیں 98
معاشرہ کی تعمیر میں عورت کی اہمیت 98
عورت کی حاکمیت 99
عورت کی گواہی 100
اضافی خصوصیت نہ کہ فضیلت 101
نادانی کا کلمہ 102
ماؤں کا ادب واحترام اور خدمت 103
عورت کا احترام، اسلام کی روشنی میں 106
جدید تحقیقات 109
چیف جسٹس کے ریمارکس 110
مومنہ کی صفات 113
تقسیم کار کا اصول 113
آیات قرآن 114
خواتین اسلام کی مثال 116
عورت مختلف ادوار میں 119
یونان 119
روم 121
مسیحی یورپ 122
جدید یورپ 124
نئی مغربی معاشرت کے تین اصول 125
فکر انسانی کی المناک نارسائی 128
عورت نامہ، خواتین اسلام کے
مشہور واقعات 130
ایک معصوم لڑکی کی دیانت، حق گوئی 130
خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں 131
غریب بیوہ عورت کی جرات 133
بادشاہ اور غریب عورت کا مقدمہ 134
غزنوی کے سامنے بڑھیا کی دیدہ دلیری 135
ملکہ ہندا اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی ہے 136
دانشمند ماں کا جواب 136
بیگم کی وفاداری اندھے اور تباہ حال
شوہر کے ساتھ 137
آزادی نسواں کی بازگشت 138
عصر حاضر میں آزادی نسواں 138
اسلام نے لڑکی کی پیدائش کو
نزول رحمت قرار دیا 139
ہنگامی حالت میں عورت کو معاش کی اجازت 139
جائیداد کا حق 139
تعلیم کا حق 140
عورت بطور ماں 140
عورت بطور بیٹی 140
عورت بطور بیوی 140
عورت بطور بہن 141
تعلیم کا حق 141
ملازمت وتجارت 141
عسکری خدمات 141
قاضی بن سکتی ہیں 141
عائلی معاملات 142
چند پابندیاں اور حقوق نسواں 142
خواتین اور کفالت عامہ کا نظام 142
آزادی نسواں اور عائلی نظام 142
بیجنگ کانفرنس اور اسلامی حقوق نسواں 144

مسلم ممالک میں خواتین کے حقوق کی تحریکیں	145
عورت جب اسلام سے روشناس ہوئی	147
اداکاری چھوڑنے والی مصری خواتین	147
سحر جلال کی فلمی دنیا سے واپسی	149
راحیلہ آغا کی کہانی	152
رائل پارک جانے کی غلطی میں بھی کر چکی ہوں	156
بیروت کی نجاح اسلام کی توبہ	162
دین حق کی طرف آنے والی خوش قسمت خواتین	165
امینہ اسلمی	165
محترمہ مریم جمیلہ	169
مونی کی کہانی	176
محترمہ ثریا	179
محترمہ خدیجہ	183
محترمہ فاطمہ ہیرین	187
راجکماری جاویدہ بانو بیگم	189
محترمہ فاطمہ چیکوسلواکیہ	191
بیگم مولانا عزیز گل	193
عورت اور عصمت کا انجام، اسلام سے روگردانی کے بعد	
مغربی تہذیب کی ایک جھلک	197
امریکی طالبات کی حالت زار	200
صدر متراں کی ناجائز بیٹی	200
یورپ میں معصوم مجرموں کی تعداد	200
لیڈز کے سفید فام کم عمر غنڈے	201
۱۲ سالہ لڑکا ۵۰۰ کاریں چوری کرنے کا مجرم	202
بریڈفورڈ کے نوعمر مجرم	202
۲۰۰ جرائم	203
بیس سالہ بچے کا کردار	203
۱۶ سال سے کم عمر لڑکیوں کے بارے میں	203
راہزن لڑکی کو قید	201
برطانیہ کی ماڈل گرلز	205
طلاق کا دارالخلافہ	205
ناجائز بچوں کا ہولناک تناسب	206
یہ ہے امریکی معاشرہ!	212
فحاشی کے فروغ میں ٹی وی اور نصاب تعلیم کا کردار	213
خدائی قوانین سے بغاوت کا فطری انجام	215
فرانسیسیوں کا ظاہر و باطن	215
فرانسیسی صدر کی بڑی بیٹی کا کردار	216
تہذیب جدید کے نتائج	217
عورت اور جدید سائنس	217
الٹی طرف سفر	218
مایوسی کا شکار	220
دردناک انجام	221
مصنوعی مسائل	222
غیر فطری مساوات کا نتیجہ	225
جدید عورت کی مظلومی	227
پاکبازی کی اہمیت	229
مصنوعی اولاد کا مسئلہ	230
غلطی کا اعتراف	231
مغربی شادیوں کا انجام	232
آبادی کا مسئلہ	233
سرپرستی سے محروم	233
خاتون سنگر کی موت کے بعد	234
فطرت سے دور ہوکر	235

بے قید آزادی کا تجربہ	236
خاتون لیڈر کا اعتراف	237
جنس کا تعلق رازداری سے	239
اجرتی ولادت	242
ترقی کے بجائے تنزل	242
مغرب اور خاندان	244
برطانوی بچوں کے جنسی رجحانات	244
فطرت، مغرب اور جدید سائنس	245
فطرت سے جنگ	246
شادی نہ کرنے کی غلطی	248
اچھی بیوی بنو	259
ناکامی کا اعتراف	250
اکیلے پن سے صرف مسائل پیدا ہوتے ہیں	250
مارلن منرو کی خودکشی	252
مجھ سے دور رہو	253
شہرت بوجھ بن گئی	254
میدان عمل سے محرومی	255
جاپان کی مثال	256
اخلاقی گراوٹ کی گھناؤنی مثالیں	258
یورپی معاشرے حیوانوں کے راستے پر	
امریکہ۔ سالانہ ۱۵ لاکھ استقاط حمل	263
ہر پانچواں امریکی پاگل ہے	264
مغرب اور خودکشی	265
امریکہ کو کس تہذیب وتمدن پر ناز ہے؟	266
صنف لطیف	268
عورت جب اقتدار کے تاج تک پہنچی	273
عورت پردے سے طوائف تک	289
فحاشی اور میرے تجربات	289
اس بازار میں	290
طاؤس ورباب آخر	292
ایک ہی تنور کی سوختہ	299
رہزنی کا پہلا شکار	309
گوشت ہی گوشت	315
بہن جی کہنے کا اثر	323
عورت کا نازک احساس	326
طوائفوں کی قابل رحم زندگی	328
عورت، سماج اور جنس	333
عورت اور جنسیات	343
حکایتیں اور افسانے	347
عورت مجموعہ اضداد، مجموعہ عادات، مجموعہ بدعات	349
نسوانی نفسیات کے چند نمایاں خدوخال	352
عورت کی نفسیات	363
عہد طفولیت (تشکیل کردار میں اسکی اہمیت)	365
خواہش تحفظ	368
مشاہدات	380
عورت، عامل اور تعویذ	391
پاکستانی خواتین کیا سوچتی ہیں؟	396
مغربی خواتین نے کیا پوچھا؟	407
نرگسیت	425
ایڈی پس کمپلیکس	440
عورت کے تندرستی صحت و کے راز	449

عرض ناشر

انسانیت کو آج جن خوفناک چیلنجوں کا سامنا ہے ان میں سب سے بڑا چیلنج عورت سے متعلق ہے۔ شیطانی تہذیب کے ایجنٹ جہاں جہاں اور جس جس روپ میں بھی موجود ہیں، وہ عورت کو بے وقار کرنے اور اسے شیطانی آرزوؤں پر قربان کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں۔ چودہ سو برس قبل اسلام اور اسکے پیروکاروں نے طبقہ نسواں کو پہلی مرتبہ مقام احترام سے نوازا تھا۔ المناک حقیقت یہ ہے کہ آج اسلام کے ماننے والوں کی صفوں میں بھی ایسے عناصر کی بڑی تعداد موجود ہے جو عورت کے اس مقام واحترام کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ عورت پر یہ ظلم جس طرح دنیا کے دیگر خطوں میں رہنے والے اور مذاہب کے ماننے والے ڈھا رہے ہیں، ظلم کی یہ تمام شکلیں نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں بھی جاری وساری ہیں۔ ان حالات میں وہ سعید فطرت افراد تحسین کے مستحق ہیں جو اسلامی تعلیمات کو اجاگر کرتے ہوئے عورت کی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے چاروں محترم رشتوں کی حیثیت میں پہچان کروا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چار حیثیتوں کے علاوہ عورت کی کوئی حیثیت بھی باوقار نہیں ہے۔ عورت کو محبوبہ کی حیثیت دیکر اس کا بدترین استحصال کیا جارہا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ آزادی نسواں اور مردوزن کی مساوات کے علمبردار اس استحصال کو اور آگے بڑھا رہے ہیں۔

حکیم محمد طارق محمود چغتائی ان سعید فطرت اہل قلم میں شامل ہیں جو نفع ونقصان سے بالاتر ہو کر انسانیت کی بھلائی اور بہبود کے لیے دن رات سرگرداں ہیں۔ حکیم صاحب انسانوں کا جسمانی علاج تو کر ہی رہے ہیں، ان کی توجہ ان کے روحانی امراض پر بھی ہے۔ ''عورت اسلام اور جدید سائنس'' کے نام سے آنے والی زیر نظر کتاب انسانیت کے روحانی امراض کے حل کی ایک موثر کوشش ہے، جس میں عورت کی عظمت کردار کا بھی مفصل تذکرہ کیا گیا ہے اور پستی کردار کے تباہ کن نتائج کی تفصیل بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ احترام انسانیت کے لیے تحریک بھی دلائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کی تالیف کا حقیقی مقصد پورا فرمائے اور یہ کتاب قارئین کے لیے بیش از بیش مفید ثابت ہو۔ ﴿آمین﴾

دیباچہ

لفظ عورت سامنے آتے ہی قلم رک جاتا ہے۔ سانس اٹک جاتی ہے، ورق سمٹ جاتے ہیں، الفاظ رک جاتے ہیں اور نظریں ادب سے جھک جاتی ہیں اس لئے کہ اسلام نے عورت کو سات پردوں میں چھپایا، عزت و عصمت دی۔ مقام وکمال عطا فرمایا، وقار وسربلندی کا تاج سر پہ رکھا۔ چراغ محفل نہیں، چراغ خانہ بنایا۔

لیکن اس کے برعکس مغرب نے عورت کو چراغ محفل بنا کر اس کی عزت وعصمت، وقار وشرافت، پردہ بلکہ چادر اور چاردیواری کے وقار کو مجروح کیا اور وہ چراغ محفل بن گئی۔

عورت، روپ نگر کی دیوی کئی روپ، انداز اور طرح طرح کی کیفیات کا مجموعہ ہے۔ زیر نظر کتاب "عورت اسلام اور جدید سائنس" دراصل اس عورت کے کئی اندازوں کا اور انوکھے رویوں کا نرالا مجموعہ ہے آپ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ یہی عورت جب کمال شرافت کی طرف لوٹی تو فرشتوں سے مقام بالا ہوا اور یہی عورت جب مقام شرافت سے گری تو شیطان سے بدتر ہوئی۔ یوں ایک دور میں یہ رحمان کی بندی رہی اور ایک دور یہ بھی ہے یہ شیطان کی بندی بن گئی۔

عالم اس بات کا گواہ ہے کہ عورت جب بھی گری ہے اسلام اور اسلامی تعلیمات سے روگردانی کیوجہ سے گری آئیں ہم ذرا اس کتاب کا مجموعی جائزہ لیں۔ کتاب میں ایک طرف قدرت اللہ شہاب کی تجرباتی تحریر کا پہلو نظر آتا ہے دوسری طرف صحافت کے ایک بلند ستون شورش کاشمیری کی یاس وحسرت بھری تصویریں اور تحریریں اس بازار میں نظر آتی ہیں۔ ادھر دیکھتا ہوں تو قدیم صحافت کا بے تاج بادشاہ دیوان سنگھ مفتون پکار پکار کر مجھے ناقابل فراموش کے نام سے عورت کا وجود اور پہلو عصمت اور عزت کے نام سے عیاں کرتا ہے اور پھر موجودہ زمانے میں ایم اے ملک کے ذریعے عورت کی نفسیاتی کیفیات واضح ہوتی ہیں یہ ایک نہیں بے شمار مفکرین اور دانش وروں کے مشاہدات وتجربات کا یہ مجموعہ کتاب ہے۔ کتاب پڑھ کر آپ کو یقیناً احساس ہوگا کہ یہ کتاب بھی عاجز کی سابقہ کتب کی تحقیق اور ریسرچ کا معیار باقی رکھے گی۔ اگر کتاب کے کسی بھی لفظ، سطر، یا باب سے آپ کی رائے مختلف ہو تو یقیناً ایسا ممکن ہے۔ لیکن عاجز نے ہر کتاب کا ماخذ اور حوالہ درج کرنے میں قطعی بخل نہیں کیا۔

خواستگار اخلاص وعمل اور طلب گار دعائے نیم شبی
حکیم محمد طارق محمود چغتائی

جنت کی خوشخبری پانے والی خواتین

ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ

حضرت نبی کریم ﷺ کے پاس جبرائیل امین تشریف لائے اور فرمایا کہ خدیجہ بنت خویلد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور میری طرف سے سلام عرض کر دیں اور انہیں ہیرے جواہرات سے جڑی جنت کی خوش خبری سنا دیں جس میں کوئی شور شرابا ہے نہ کوئی تھکاوٹ۔

اہل جنت میں افضل خاتون خدیجہ بنت خویلد ہیں (الحدیث)

فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

میں نے اپنی قمیص اس لئے پہنائی ہے کہ انہیں جنت کا لباس پہنایا جائے (الحدیث)

اللہ وہ ذات اقدس ہے جو زندہ کرتی ہے اور مارتی ہے اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے جسے موت نہیں آئے گی۔ میری والدہ فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما (الحدیث)

ام حرام بنت ملحانؓ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

میری امت میں سے جو پہلا لشکر بحری جنگ لڑے گا ان پر جنت واجب ہوگئی ہے۔ ام حرام نے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ! کیا میں ان میں شامل ہوں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں تم ان میں شامل ہوگی (الحدیث)

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کہ تم (ام حرام) اولین میں سے ہو آخرین میں سے نہیں (الحدیث)

ام عمارۃ نسیبۃ بنت کعبؓ

اے اللہ! انہیں جنت میں میرا رفیق بنا دے۔ (الحدیث)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ احد کے دن نسیبہ کے بارے میں کہ میں جب بھی اپنے دائیں یا بائیں دیکھتا تو نسیبہ کو اپنے دفاع میں لڑتا ہوا پاتا تھا۔ (الحدیث)

ام رومان بنت عامرؓ

جوحورالعین میں سے کسی عورت کودیکھنا چاہےتووہ ام رومان کی طرف دیکھ لے (الحدیث)

اے اللہ ! بے شک تجھ سے مخفی نہیں جو کچھ تیرے لئے اور تیرے رسول ﷺ کے لئے ام رومان کو

تکالیف پہنچی ہیں (الحدیث)

ام ایمن برکتہ بنت ثعلبہؓ

جوشخص جنت کی کسی خاتون سے شادی کرنا چاہے وہ ام ایمن سے نکاح کرے (حدیث شریف)

ام ایمن میری والدہ کے بعدمیری ماں ہیں (حدیث شریف)

الربیع بنت معوذؓ

درخت کے نیچےبیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں داخل نہیں ہوگا۔ (حدیث شریف)

نبی کریم ﷺ نے ربیع بنت موذ کوارشادفرمایا "مجھے وضوکراؤ"۔

سمیہ بنت خباطؓ

آل یاسر!صبر کروتمہاراٹھکانا جنت ہے (حدیث شریف)

اے اللہ! آل یاسر میں سے کسی کوآگ کاعذاب نہ دینا (حدیث شریف)

کبشہ بنت راضعؓ

اے ام سعدتمہیں بشارت ہواورتم اپنے گھرانے کوخوشخبری سناؤ کہ تمہارِے مقتولین جنت میں ایک ساتھ ہیں اورتمہارے گھرانے کے بارے میں ان کی شفاعت قبول کرلی گئی ہے (حدیث شریف)

ہررونے والی جھوٹ بولتی ہے۔سوائے ام سعد کے (حدیث شریف)

ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ

تم میں سے وہ عورت سب سے پہلے مجھ سے ملے گی جس کے ہاتھ لمبے ہوں گے (الحدیث)

بے شک زینب بنت جحشؓ بہت اہیں بھرنے والی ہے (حدیث شریف)

ام المومنین عائشہ بنت الصدیقؓ

حضرت جبرائیلؑ ایک ہرے کپڑے کے ٹکڑے پرحضرت عائشہ کی تصویرلائے اورفرمایا کہ یہ آپ کی دنیااور آخرت کی زوجہ ہیں۔ (حدیث شریف)

مجھ پرتکلیف ہلکی ہوگئی ہے میں نے جنت میں عائشہ کی ہتھیلی کی چمک دیکھی ہے۔ (الحدیث)

حضرت فاطمہ بنت رسول ﷺ

نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحبزادی کو فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم جنت کی خواتین کی سردار بنو۔ (حدیث شریف)

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ایک فرشتہ اترا اور اس نے مجھے خوشخبری سنائی کہ فاطمہ جنت کی خواتین کی سردار ہے۔'' (حدیث شریف)

الفریعۃ بنت مالکؓ

اصحاب شجرہ میں سے انشاء اللہ کوئی بھی آگ میں داخل نہیں ہوگا جنہوں نے اس کے نیچے بیعت کی (حدیث شریف)

نبی کریم ﷺ نے حضرت فریعہ کو ارشاد فرمایا کہ اپنے گھر میں رہو یہاں تک کہ لکھا ہوا اپنے وقت کو پہنچے۔ (حدیث شریف)

ام المنذر سلمیٰ بنت قیس الانصاریہؓ

اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان مومنین سے جب وہ تجھ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ (القرآن)

درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں داخل نہ ہوگا (حدیث شریف)

ام المنذر بیعت رضوان میں شریک تھیں۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

بے شک تیرے لئے ان میں سے جنت میں دو کمر بند ہوں گے (حدیث شریف)

حضرت ام سلیم بنت ملحانؓ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی دیکھا تو میں غمیصاء بنت ملحان کے سامنے ہوں (حدیث شریف)

نبی کریم ﷺ نے ام سلیم کے بارے میں فرمایا:

میں اس پر شفقت کرتا ہوں اس کا بھائی میرے ساتھ ہوا۔ (حدیث شریف)

حضرت ام ورقہ الانصاریہؓ

اپنے گھر میں قرار سے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت عطا فرمائے گا (حدیث شریف)

ہمارے ساتھ چلو! ایک شہید کی زیارت کریں گے۔ (حدیث شریف)

حضرت اسماء بنت یزید السکن الانصاریہؓ

رسول ﷺ نے حضرت اسماء کو بیعت کرتے وقت فرمایا۔

''اے اسماء واپس جاؤ اور جو عورتیں تمہارے پیچھے ہیں۔ انھیں بتاؤ کہ تمہارا اپنے شوہر کی اچھے طریقے سے اطاعت کرنا، اسے خوش رکھنا اور اس کی بات پر چلنا وہ اس کے برابر ہے۔ جو تم نے ابھی مردوں کے فضائل بتائے ہیں۔''

حضرت ام ہشام بنت حارثہؓ

''درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں کوئی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔

حضرت ام ہشامؓ فرماتی ہیں کہ:۔

میں نے سورۃ ق والقرآن المجید رسول ﷺ کی زبان مبارک ہی سے سیکھی۔

ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ

''حفصہ سے وہ شخص شادی کرے گا جو عثمان سے بہتر ہے اور عثمان اس خاتون سے شادی کرے گا جو حفصہ سے بہتر ہے (حدیث شریف)

حضرت جبرائیلؑ سیدنا رسول ﷺ کے پاس تشریف لائے اور حضرت حفصہ کے بارے میں فرمایا کہ:

یہ صوم وصلوۃ کی پابند ہے اور یہ آپ کی جنت میں زوجہ ہوں گی۔

بحوالہ: ''جنت کی خوشخبری پانے والی خواتین'' احمد خلیل جمعہ: مترجم مولانا ثناء اللہ محمود

عورت قرآن وحدیث کی روشنی میں

قرآن اور حدیث میں نہایت تفصیل کے ساتھ عورت کے متعلق احکام ہیں نیز عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کے بارے میں واضح تعلیمات درج ہیں۔ یہاں ان میں سے کچھ آیات اور احادیث کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

- ...... اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی رکھ بھلائی دی ہو۔ (النساء:19)
- ...... اور عورتوں کیلئے بھی معروف طریقہ وہی ہے جو مردوں کیلئے ہے اور مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور اللہ غالب ہے حکیم ہے۔ (البقرہ:228)
- ...... مردوں کیلئے اس میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا اور عورتوں کیلئے اس میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا، خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ یہ حصہ مقرر ہے۔ (النساء:7)
- ...... اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔
- ...... جس نے برا عمل کیا اس کو اسی کے بقدر بدلہ ملے گا۔ اور جس نے نیک عمل کیا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ وہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔ (المومن:40)
- ...... اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔ (النساء:124)
- ...... اور جو کوئی نیک عمل کرے گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو چلائیں گے اچھا چلانا اور ان کو اجر دیں گے ان کے بہترین عمل کے مطابق جو وہ کرتے تھے۔ (نحل۔97)
- ...... اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا۔ اللہ عزیز و حکیم ہے۔

5 ...... پس انکے رب نے ان کو جواب دیا کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ ہو یا

عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے ان کی خطائیں ضرور میں ان سے دور کردوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ انکا بدلہ ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے (آل عمران 195)

- عورتوں کی عزت وہی شخص کرے گا جو شریف ہو اور عورتوں کو وہی شخص بے عزت کرے گا جو کمینہ ہو۔ (حدیث)
- تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کیلئے رحم میں سب سے اچھا ہوں۔ (حدیث)
- کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے اگر اس کی کوئی خصلت اس کی ناپسند کے مطابق ہوگی تو کوئی دوسری خصلت اس کی پسند کے مطابق ہوگی۔ (مسلم)
- مومنین میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے اور تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لئے اچھا ہو۔
- ایک حدیث میں اچھی عورت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا سب سے بہتر عورتیں کون ہیں؟ فرمایا وہ عورت کہ جب مرد اسے دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے اور مرد جب کسی کام کیلئے حکم دے تو اس کی اطاعت کرے اور اپنے نفس اور اپنے مال میں وہ مرد کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرے۔ (نسائی)

عورت کو اسلام میں کتنا باعزت مقام دیا گیا ہے اس کا اندازہ حسب ذیل روایات سے ہوتا ہے۔

- دنیا کی ہر چیز سامان ہے اور دنیا کا سب سے اچھا سامان نیک عورت ہے (مسلم)
- کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ آدمی کیلئے بہتر جمع کرنے والا مال کیا ہے؟

نیک عورت کہ جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے اور جب وہ اس کو حکم دے تو اسکی اطاعت کرے۔ اور جب وہ موجود نہ ہو تو وہ اسکی حفاظت کرے (ابوداؤد)

- قرآن میں جب یہ آیت اتری کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں انکے لئے وعید ہے تو بعض صحابہؓ نے کہا کہ اگر ہم یہ جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو لیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے افضل چیز خدا کو یاد کرنے والی زبان ہے اور خدا کا شکر ادا کرنے والا دل ہے اور مومن بیوی جو اس کے ایمان پر اس کی مدد کرے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)
- اللہ کے تقویٰ کے بعد سب سے بہتر چیز جو ایک مومن پاتا ہے وہ نیک بیوی ہے اگر وہ اس کو حکم دے تو

وہ اس کی اطاعت کرے۔ اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر اس پر قسم کھائے تو وہ اس کو پورا کرے اور اگر وہ اس سے غائب ہو تو وہ اپنے نفس اور اس کے مال میں اس کی خیر خواہی کرے۔ (ابن ماجہ)

- چار چیزیں ہیں جن کو دی گئیں تو اس دنیا اور آخرت کی بھلائی دے دی گئی۔ شکر کرنے والا دل، اور ذکر کرنے والی زبان اور مصیبتوں پر صبر کرنے والا بدن اور ایسی بیوی جس کے نفس اور اپنے مال میں اس کو کوئی ڈر نہ ہو (البیہقی)
- حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم لوگ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیوں کہ وہ بھی تم سے وہی چاہتی ہیں جو تم ان سے چاہتے ہو۔ (رابطہ العالم الاسلامی، رجب شعبان 1406ھ)
- حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھ اس کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو تم اس کو توڑ دو گے۔ اور اگر تم چھوڑ دو گے تو وہ ویسی ہی رہے گی بس تم عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو۔ (بخاری)
- مجھے تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے خوشبو اور عورت محبوب بنائی گئی ہیں، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔
- عورتیں مردوں کی نصف ثانی ہیں۔
- تم میں سب سے اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کیلئے اچھا ہیں۔
- عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔

دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں۔ (ابن ماجہ)

- جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔
- جس شخص نے تین لڑکیوں کی پرورش کی پھر انکو ادب سکھایا اور انکی شادی کی اور انکے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کیلئے جنت ہے۔ (ابوداؤد)
- جس شخص کے یہاں لڑکی ہو۔ پھر وہ نہ اس کو زمین میں گاڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اس کو جنت میں داخل کریگا۔ (ابوداؤد)
- کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ افضل صدقہ کیا ہے تمہاری لڑکی جو (بیوگی یا طلاق کی وجہ سے تمہاری طرف لوٹا دی جائے) تمہارے سوا اس کا کمانے والا کوئی نہ ہو۔ (ابن ماجہ)
- اللہ جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعے کچھ آزمائے پھر وہ انکے ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ اس کیلئے آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی۔ (بخاری) ''بحوالہ خاتون اسلام''...... مولانا وحید الدین خان

عورتوں سے متعلق محمد ﷺ کے ارشادات

1۔ رسول ﷺ نے فرمایا عورت پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے وہ رمضان کے روزے رکھ لیا کرے اور اپنی آبرو کی حفاظت رکھے اور اپنے خاوند کی تابعداری کرے تو ایسی عورت جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

2۔ رسول ﷺ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! فلاں عورت کثرت سے نفل نمازیں اور روزے اور خیرات کرتی ہے لیکن زبان سے پڑوسیوں کو تکلیف بھی پہنچاتی ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ دوزخ میں جائے گی۔ پھر اس شخص نے کہا کہ فلاں فلاں عورت نفل نمازیں اور روزے وخیرات کچھ زیادہ نہیں کرتی یونہی کچھ پنیر کے چند ٹکڑے دے دلا دیتی ہے لیکن زبان سے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی آپؐ نے فرمایا وہ جنت میں جائے گی۔

3۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کسی عورت کا اپنے گھر میں گھر ہستی کا کام کرنا جہاد کے رتبہ کو پہنچتا ہے۔

4۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عورتو! میں نے تم کو دوزخ میں بہت دیکھا ہے۔ عورتوں نے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ تم پھٹکار سب چیزوں پر ڈالا کرتی ہو یعنی لعن طعن کرتی ہو، کوستی ہو۔ اور شوہر کی ناشکری بہت کرتی ہو اور اسکی دی ہوئی چیزوں کی بہت ناقدری کرتی ہو۔ (مشکوۃ)

5۔ اسماء بنت یزید الانصاریہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں عورتوں کی فرستادہ آپ کے پاس آئی ہوں (یعنی عورتوں نے مجھے یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ) مرد جمعہ اور جماعت اور عیادت مریض اور حضور جنازہ اور حج وعمرہ اور اسلامی سرحد کی حفاظت کی بدولت ہم پر فوقیت لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا تو واپس جا اور عورتوں کو خبر کردے کہ تمہارا شوہر کے لئے بناؤ سنگھار کرنا یا حق شوہری ادا کرنا اور شوہر کی رضامندی کا لحاظ رکھنا اور شوہر کے موافق مرضی اتباع کرنا یہ سب ان اعمال کے برابر ہے۔

6۔ رسولؐ نے فرمایا اس عورت پر اللہ کی رحمت نازل ہو جو رات کو اٹھ کر تہجد پڑھے اور اپنے شوہر کو بھی جگائے کہ وہ بھی نماز پڑھے۔

7۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب عورتوں میں سے اچھی وہ عورت ہے کہ جب اس کا شوہر اس کی طرف نظر کرے تو وہ اس کو خوش کردے اور جب وہ اس کو حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور اپنی جان اور

مال میں سے اس کو ناخوش کر کے اس کی مخالفت نہ کرے۔

8۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو عورت اپنے شوہر کو دنیا میں کچھ تکلیف دیتی ہے تو جنت میں جو حور اس شوہر کو ملے گی وہ کہتی ہے کہ خدا تجھے غارت کرے وہ تیرے پاس مہمان آیا ہے جلد ہی تیرے پاس سے ہمارے پاس چلا آئے گا۔

9۔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ سب سے اچھی عورت وہ ہے کہ اپنی عزت آبرو کے بارے میں پارسا ہو اور اپنے خاوند پر عاشق ہو۔ (بہشتی زیور)

10۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس عورت کو پسند کرتا ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ تو محبت اور لاگ کرے اور غیر مرد سے اپنی حفاظت کرے۔

11۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عورت دوسری عورت سے اس طرح نہ ملے کہ وہ اپنے خاوند کے سامنے اس کا حال اس طرح کہنے لگے کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

12۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخی عورتیں جن کو میں نے دیکھا نہیں، میرے زمانہ کے بعد پیدا ہوں گی کہ کپڑا پہنے ہوئے ہوں گی اور ننگی ہوں گی یعنی نام کو بدن پر کپڑا ہو گا۔ لیکن کپڑا اس قدر باریک ہو گا کہ تمام بدن نظر آئے گا۔ اور اترا کر بدن کو مٹکا کر چلیں گی۔ اور بالوں کے اندر موباف یا کپڑے دیکر بالوں کو لپیٹ کر اس طرح باندھیں گی جس سے بال بہت سے معلوم ہوں جیسے اونٹ کا کوہان ہوتا ہے ایسی عورتیں جنت میں نہ جائیں گی۔ بلکہ اس کی خوشبو بھی انکو نصیب نہ ہو گی۔

13۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو عورت زیور دکھلاوے کے لئے پہنے گی (قیامت میں) اسی سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔

14۔ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تشریف رکھتے تھے آپ نے ایک آواز سنی جیسے کوئی کسی پر لعنت کر رہا ہو۔ آپ ﷺ پوچھا یہ کیا بات ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ فلانی عورت ہے جو اپنی سواری کی اونٹنی پر لعنت کر رہی ہے۔ وہ اونٹنی چلنے میں کمی کرتی ہو گی۔

اس عورت نے چلا کر کہہ دیا ہو گا تجھے خدا کی مد ہو (لعنت ہو) جیسا کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ (کوسنے اور لعنت کرنے کی) (بہشتی زیور)

رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اس عورت کو اور اس کے سامان کو اس کی اونٹنی سے اتار دو۔ یہ اونٹنی تو اس عورت کے نزدیک لعنت کے قابل ہے پھر اس کو کیوں کام میں لاتی ہے (حضور ﷺ نے اصلاح اور تنبیہ کے واسطے فرمایا کہ جس چیز کو کام میں لاتی ہے اسی کو لعن طعن کرتی ہے)

15۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک عورت نے بخار کو برا بھلا کہا تو آپ نے فرمایا بخار کو برا مت کہو اس سے

گناہ معاف ہوتے ہیں۔

16۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بین کر کے رونے والی عورت (یعنی نوحہ کرنے والی اور چیخ کر چلا کر رونے والی عورت) اگر توبہ نہ کرے گی تو قیامت کے روز اس حالت میں کھڑی کی جائے گی کہ اسکے بدن پر کرتہ کی طرح ایک روغن لپیٹا جائے گا جس میں آگ بڑی جلدی لگتی ہے اور کرتہ کی طرح پورے بدن پر خارش ہوگی یعنی اس کو دو طرح کا عذاب ہوگا۔ خارش سے پورا بدن نوچ ڈالے گی اور دوزخ کی آگ لگے گی وہ الگ۔

17۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسلمان عورتو! کوئی پڑوسی اپنی پڑوسن کی بھیجی ہوئی چیز کو حقیر اور ہلکا نہ سمجھے بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔

(فائدہ) بعض عورتوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ دوسرے کے گھر سے آئی ہوئی چیز حقیر سمجھتی ہیں اور طعنہ دیتی ہیں (بہشتی زیور)

18۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب ہوا تھا۔ جس نے اس کو پکڑ کر باندھ رکھا تھا۔ نہ اس کو کھانے کو دیا نہ اس کو چھوڑا اور تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

(فائدہ) کوئی جانور پال کر اس کے کھانے پینے کا بندوبست یا خبر نہ لینا عذاب کی بات ہے۔

19۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بعض مرد اور عورت ساٹھ برس تک خدا کی عبادت کرتے ہیں پھر جب موت کا وقت آتا ہے تو شریعت کے خلاف وصیت کر کے دوزخ کے قابل (حق دار) ہو جاتے ہیں۔ (مثلاً یہ کہ فلاں وارث کو اتنا مال دے دینا)

تنبیہ: وصیت کے مسئلے کسی عالم سے پوچھ کر اس کے موافق عمل کرے کبھی اس کے خلاف نہ کرے۔ (سورۃ النساء بہشتی زیور ص 469)

بحوالہ: اصلاح خواتین ترتیب: مولانا مفتی محمد زید صاحب۔ انڈیا

عورتوں کو اہم نصیحتیں

★...... سب سے پہلے اپنے عقیدے ٹھیک کرو اور ضروری مسئلے سیکھو اور بہت اہتمام سے ان مسئلوں کی پابندی کرو۔

★...... ہر بات میں رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر چلنے کا اہتمام کرو۔ اس سے دل میں بڑا نور پیدا ہوتا ہے۔

★...... شرک کی باتوں کے پاس مت جاؤ فال مت کھلواؤ۔

★...... اولاد کے ہونے یا زندہ رہنے کے ٹوٹکے وغیرہ مت کرو۔

★...... بزرگوں کی منت مت مانو۔

شریعت میں جس سے پردہ ہے چاہے پیر ہو یا چاہے کیسا ہی قریبی رشتہ دار ہو جیسے دیور، جیٹھ، خالو کا یا ماموں کا یا پھوپھی کا بیٹا۔ یا بہنوئی یا نندوئی یا منہ بولا بھائی یا منہ بولا باپ ان سے خوب پردہ کرو۔

★...... خلاف شرع لباس مت پہنو جیسے ایسا کرتہ کہ جس میں پیٹ یا پیٹھ یا کلائی یا بازو کھلے ہوں یا ایسا باریک لباس جس میں بدن یا سر کے بال جھلکتے ہوں۔ یہ سب چھوڑ دو۔

★...... لمبی آستینوں کا اور نیچا اور موٹے کپڑے کا (جس سے بدن نہ جھلکے) لباس بناؤ۔ اور ایسے ہی کپڑے کا دوپٹہ بناؤ۔ اور دوپٹہ دھیان کر کے سر سے مت ہٹنے دو۔ ہاں گھر میں اگر خالی عورتیں ہوں یا ماں باپ اور حقیقی بھائی وغیرہ کے سوا گھر میں کوئی اور (یعنی نامحرم) نہ ہو تو اس وقت سر کھولنے میں ڈر نہیں۔

★...... کسی کو تانک جھانک کر مت دیکھو۔

★...... بیاہ، شادی، مونڈن، چلہ، چھٹی منگنی چوتھی وغیرہ میں کہیں مت جاؤ نہ اپنے کسی کو بلاؤ (کیونکہ اس میں بڑے فتنے اور خرابیاں ہوتی ہیں)

★...... کوئی کام نام کے واسطے مت کرو۔

★...... کون سے اور طعنہ دینے اور غیبت سے زبان کو بچاؤ۔

★...... پانچوں وقت نماز اول وقت پڑھو اور جی لگا کر ٹھہر ٹھہر کر پڑھو، رکوع اور سجدہ اچھی طرح کرو۔

★...... اگر تمہارے پاس زیور گوٹہ لچکا وغیرہ ہو تو حساب کر کے زکوۃ نکال دو۔

★...... خاوند کی تابعداری کرو۔ اس کا مال اس سے چھپا کر مت خرچ کرو۔ گھر کا کام خاص کر اپنے شوہر کی خدمت کرنا عبادت ہے۔

★...... گانا بھی مت سنو۔

★...... اگر تم قرآن پڑھی ہوئی ہو تو روزانہ قرآن پڑھو۔

★...... جو کتاب پڑھنے یا دیکھنے کیلئے لینا ہو تو پہلے کسی معتبر عالم کو دکھالو اگر وہ صحیح بتلائیں تو خرید لو ورنہ مت خریدو۔

★...... اگر کوئی شخص کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف کرے تو صبر کرو۔

★...... اپنے آپ کو صاحب کمال (بزرگ اور بڑا) مت سمجھو۔

★...... جو بات زبان سے کہنا چاہو پہلے سوچ لیا کرو۔ جب خوب اطمینان ہو جائے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس میں کوئی دین یا دنیا کی ضرورت ہے۔ یا فائدہ ہے اس وقت زبان سے نکالو۔

★...... کسی برے آدمی کی بھی برائی مت کرو نہ سنو۔

★...... کسی مسلمان کو اگر چہ وہ گنہگار یا چھوٹے درجہ کا ہو حقیر مت سمجھو۔

★...... مال و عزت کی حرص و لالچ مت کرو۔

★...... بات کو بنایا مت کرو بلکہ جب تم کو اپنی غلطی معلوم ہو جائے تو فوراً اقرار کرلو۔

★...... بے ضرورت اور بے فائدہ لوگوں سے زیادہ مت ملو اور جب ملنا ہو تو خوش اخلاقی سے ملو۔

★...... اللہ پر بھروسہ رکھو اور اسی سے اپنی حاجت عرض کیا کرو۔ اور دین پر قائم رہنے کی درخواست کرو۔

(قصد السبیل ص 15 ص 37)

بحوالہ: اصلاح خواتین

ترتیب: مولانا مفتی محمد زید صاحب۔ انڈیا

9326

عورت کے کمالات

ماؤں سے منسوب حضرات

بہت سے علماء فضلاء اور آئمہ دین کی مائیں عالمہ فاضلہ اور عاقلہ ہوتی ہیں یا کسی خاص وصف میں ان کی شہرت تھی یا اپنے لڑکوں کی تعلیم وتربیت میں نمایاں خدمت انجام دیتی تھیں اور وہ حضرات اپنے باپ کی بجائے اپنی ماں کی طرف منسوب ہوتے تھے۔ اور اسی نسبت سے ان کی شہرت تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی بعض حضرات اپنی ماؤں کی نسبت سے منسوب ہوئے مثلاً

حضرت شرجیل بن حسنہ کا نام عبداللہ بن مطاع بن عمر بن کندہ ہے اور انکی والدہ کا نام حسنہ ہے۔

حضرت بشیر بن خصاصیہ کے والد معبد بن شراحیل بن سبع ہیں اور ان کی والدہ خصاصیہ کا نام کبشہ یا ماریہ بنت عمر بن حارث ازدی ہے۔

حضرت ابن ام مکتوم کا نام عمرو بن قیس ہے۔ اور انکی والدہ ام مکتوم کا نام عاتکہ بنت عبداللہ ہے۔

حضرت ابن بحسینہ کا نام عبداللہ بن مالک ہے اور ان کی والدہ کا نام بحسینہ بنت حارث بن مطلب بن عبد مناف ہے۔

حضرت معاذ بن عفراء کا نام معاذ بن حارث بن رفاعہ ہے اور ان کی والدہ کا نام عفراء بنت عبید ہے۔

حضرت حارث بن برصا کا نام حارث بن مالک ہے۔ اور انکی والدہ کا نام برصاء بنت ربیعہ ہے۔ (المحدث الفاصل صفحہ 269-270)

علماء ومحدثین میں بہت سے حضرات اپنی ماؤں کی نسبت مشہور ہیں مثلاً:۔

ابن علیہ کا نام اسماعیل بن ابراہیم بن مقسم ہے اور انکی والدہ کا نام علیہ بنت حسان ہے۔

ابن عائشہ کا نام محمد بن حفص بن عمر ہے اور ان کی والدہ کا نام عائشہ بنت عبیداللہ بن عبداللہ ہے۔

ابن بنت سدی کا نام اسماعیل بن موسیٰ فراری ہے اور ماں کا نام بنت اسماعیل بن عبدالرحمٰن سدی ہے۔

ابن بنت الشافعی کا نام احمد بن محمد بن عبداللہ ہے اور ماں کا نام زینب بنت امام شافعی ہے۔

ابن ام قاسم کا نام حسن بن قاسم بن عبداللہ مرادی ہے اپنی دادی کی طرف منسوب ہیں۔ ان کا نام زہرا تھا۔ اپنے دیار کی مشہور خاتون تھیں مغرب سے آ کر مصر میں آباد ہو گئی تھیں۔

ابن عمامہ کا نام احمد بن عبداللہ اندلسی مالکی ہے عمامہ ان کی والدہ ہیں۔

ابن برکتہ کا نام ابو محمد عبداللہ بن محمد صابونی، قرطبی، مالکی ہے۔ برکتہ ان کی والدہ کا نام ہے۔

ابن بنت مہدی کا نام ابو حسن علی بن تمام قیرانی مالکی ہے۔

(خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات حضرت مولانا قاضی اظہر صاحب مبارک پوری)

دورتابعین کی نامورخواتین

حضرت عائشہؒ بنت طلحہؓ:

انکے بارے میں علامہ ابوذرعۃ الدمشقی نے فرمایا

عائشہ بنت طلحہ عظیم خاتون تھیں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتی تھیں۔ علامہ العجلیؒ نے فرمایا:

عائشہ بنت طلحہؓ ثقہ (معتبر ہیں)

علامہ مزی نے فرمایا عورتوں میں حضرت عائشہ ام المومنینؓ کی ان تین شاگردہ خواتین یعنی عمرۃ بنت عبدالرحمٰن، حفصہ بنت سیرین، عائشہ بنت طلحہؓ سے بڑی کوئی بھی عالمہ نہیں گذری۔

فاطمہ بنت الحسینؒ:

ان کے بارے میں ان کے شوہر حسنؒ بن حسنؓ نے اپنی وفات کے وقت انہیں کہا تم ہردل عزیز خاتون ہو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا:

فاطمہ کی بدی سے ناواقفیت نے اسے بدی سے محفوظ رکھا۔

میسون بنت تجدل:

علامہ ابن کثیر نے فرمایا

کہ وہ ارادے میں پختہ، عظیم الشان، حسن، برتری، عقل اور دین رکھنے والی خاتون تھیں۔

ہند بنت المھلب

فقیہہ ایوب السختیانیؒ نے فرمایا۔

میں نے ہند بنت المھلب سے زیادہ کوئی عقل مند خاتون نہیں دیکھی۔

رباب بنت امرئی القیس

مورخ حشام الکلبی کہتے ہیں کہ

رباب عورتوں میں بہتر اور ان سے افضل خاتون تھی ان کے شوہر حسین بن علیؓ نے فرمایا۔

لعمرك انني لاحب دارا لعل بها سكينة والرباب

ترجمہ: تیری عمر کی قسم بیشک میں اس گھر کو پسند کرتا ہوں جس میں سکینہ اور رباب رہتی ہیں۔

احبهما وابذل جل مالی ولیس للائمی فیها عتاب

ترجمہ: میں ان دونوں سے محبت کرتا اور اپنا بہترین مال ان پر خرچ کرتا ہوں اور اس بات پر مجھے ملامت کرنے والے کوئی عتاب نہیں۔

ولست لهم وان عتبوا مطیعا حیاتی اویغیبنی التذاب

ترجمہ: اور میں ان لوگوں کا مطیع نہیں بنوں گا اگر چہ وہ میری زندگی تکلیف دہ کردیں یا مجھے مٹی غائب کر دے۔

صفیہ بنت ابی عبید:

علامہ العجلیؒ نے فرمایا۔

صفیہ بنت ابی عبیدؒ مدنی تابعیہ معتبر خاتون ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے فرمایا...... صفیہ بنت ابی عبیدؒ مدنی تابعید معتبر خاتون ہیں۔

علامہ ابن کثیر نے فرمایا...... صفیہ بنت ابن عبید عبادت گذار نیک خواتین میں سے تھیں۔ یہ عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ کی زوجہ تھیں عبداللہ ان کی بہت عزت کرتے اور ان سے بہت محبت رکھتے تھے (رضی اللہ عنہ)

عمرۃ بنت عبدالرحمٰن

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث کو جاننے والی عمرہ کے علاوہ کوئی باقی نہیں۔

امام یحیٰی بن معینؒ نے فرمایا۔

عمرہ بنت عبدالرحمٰنؒ معتبر اور حجت کرنے والی خاتون ہیں۔

امام الذھبی نے فرمایا۔

عمرہ عالمہ فقیہہ حجت، اور بڑے علم والی خاتون تھیں۔

حفصہ بنت سیرینؒ

حضرت الیاس بن معاویہؒ نے فرمایا

میں نے کوئی شخص ایسا نہیں پایا جس کو حفصہ پر فضیلت دے سکوں۔

امام یحیی بن معینؒ نے فرمایا۔

حفصہ بنت سیرین ثقہ اور حجت ہیں۔

فاطمہ بنت المنذر

علامہ العجلیؒ نے فرمایا کہ

فاطمہ بنت المنذر مدنسیر تابعی اور ثقہ ہیں۔

اور یہ مشہور حدیث ہجرت کی راویہ ہیں انکے استاد ھشام بن عروہ ہیں جو خود ثقہ اور امام تھے فاطمہ کی احادیث صحاح سنن اور مسانید میں موجود ہیں۔

ام کلثوم بنت علیؓ

امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کی زوجہ فصیح اللسان اور اھل کوفہ میں مشہور خطبہ دینے والی، ان کی عظیم منقبت ہے کہ ان کے نانا رسول ﷺ اور انکے والد علی ابن ابی طالبؓ ہیں۔

خیرۃ ام الحسن البصریؒ

حضرت ام المومنین ام سلمہؓ کی باندی۔ حدیث نبوی کی راویہ ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں لکھا اور ایک بڑی جماعت نے ان کی روایت لی ہے سوائے امام بخاریؒ کے۔

سودۃ بنت عمارہؒ

ایک تابعیہ، فصیح اللسان شاعرہ، حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے انصار میں سے ایک فرد، حضرت معاویہؓ کے پاس وفد لے کر خود اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے شکوہ لے کر گئیں تو انہوں نے بھرپور انصاف کیا۔

فاطمہ بنت علی رضی اللہ عنہ

فاطمہ الزہرہ کی بیٹی، علم سے محبت کرنے والی، حدیث نبوی ﷺ کی راویہ، عبادت گذار خاتون، فقہیہ، معمرات میں سے ایک خاتون۔

عاتکہ بنت یزید:

ایک تابعیہ جب کے بارہ صحارم خلیفہ بنے۔ حدیث نبوی کی راویہ اپنے مال کی سختی، فقراء پر احسان کرنے والی، زیادہ عمر پانے والی تھیں۔

ام الخیر بنت الحریش:

ایک تابعیہ، فصیح اللسان، بہادر خاتون، حضرت امیر معاویہ کے پاس وفد لے کر گئیں، حق گو حکیم خاتون، اقوال زریں ان سے منقول ہیں۔

ام کلثوم بنت ابی بکر الصدیقؓ:

جب ام کلثوم اپنی ماں کے بطن میں بصورت جنین تھیں۔ ان کے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنی بیٹی عائشہ کو کہا کہ ان سے بھلائی کا معاملہ کرنا اور ان کے شوہر طلحہ الفیاض نے کہا کہ تم الہام کئے جانے والے باپ کی الہام کی جانے والی بیٹی ہو۔

سکینہ بنت الحسینؒ:

امام نووی نے فرمایا: سکینہ خواتین کی سردارنیوں میں سے تھیں اور اہل سخاوت اور اہل فضل میں سے تھیں۔ سکینہ ایک شاعرہ فصیح اللسان حدیث شریف کی راویہ اور شعر کی نقد و جرح کی ماہر تھیں۔

معاذہ بنت عبداللہ رحمہا اللہ تعالیٰ:

حافظ یحیی بن معینؒ نے فرمایا

معاذہ ثقہ (معتبر) اور حجت ہیں۔

ایک عبادت گزار، گوشہ نشیں، فقیہہ جن کے اقوال مشہور ہیں اپنے سے صابر و شاکر رہنے والی خاتون تھیں۔

نائلہ بنت الفرافصہ:

امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کی زوجہ ایک شاعرہ، فصیحہ، ایک خطیبہ، وفا شعار۔ مستجابات الدعوات (جن کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے)

عائشہ بنت سعد رحمہا اللہ:

علامہ العجلی نے فرمایا!

عائشہ بنت سعد مدینے کی رہنے والی تابعیہ اور معتبر خاتون ہیں۔ والد سعد بن ابی وقاص تھے۔ یہ احادیث نبویہ کی راویہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی چھ ازدواج مطہرات سے علم کی محبت میں ملی ہیں۔

ام عاصم بنت عاصم:

پرہیزگار، پاکیزہ، علم اور بھلائی سے محبت کرنے والی، محسنہ معزز، عمر بن عبدالعزیز کی والدہ محترمہ

سلمٰی بنت خصفہ:

انکے شوہر مثنی بن حارثہ الشیابی تھے پھر انکے بعد سعد بن ابی وقاص سے نکاح ہوا، جنگ قادسیہ میں ابو محجن ثقفی کو قید سے آزاد کیا تاکہ وہ لڑائی میں شریک ہو۔ بہترین رائے اور فراست کی مالک تھیں۔

ام الدرداء الصغریٰ:

ابن کثیر نے فرمایا

لوگ ان سے پڑھتے تھے اور جامع مسجد دمشق کی شمالی دیوار کے پاس ان سے فقہ حاصل کرتے تھے۔

عون بن عبداللہ فرماتے ہیں: ہم ام الدرداء کے پاس آتے تو اس کے پاس اللہ کا ذکر کرتے۔ ابن عساکر نے فرمایا! یہ درویش صفت، فصیح اللسان خاتون تھیں۔

علامہ نووی نے فرمایا۔ یہ فقیہہ اور دانش ور تھیں۔

فاطمہ بنت عبدالملک

حضرت زبیر بن بکار فرماتے ہیں: اس کے علاوہ کوئی عورت نہیں جو آج تک اس شعر کی مستحق ہو سکے۔

بنت الخليفه والخليفه جد ها

خلیفہ کی بیٹی اور اسکا دادا بھی خلیفہ

امت الخلالف او الخليفة زوجها

خلفاء کی بہن اور اس کا شوہر بھی خلیفہ۔

ام سملم الخولانیہ:

ایک تابعیہ ایک عابدہ، زاہدہ۔ سوت کات کر گزارہ کرنے والی۔ اپنے شوہر کی فرمانبردار بیوی۔

ام البنین بنت عبدالعزیز:

عمر بن عبدالعزیز کی بہن ایک عبادت گزار فقہیہ، قرآن کی تلاوت کرنے والی، فیاض خاتون، جن کو قابل عمل رائے اور حکمت بالغہ حاصل تھی۔

ام سنان بنت خیثمہ:

ایک فصیح اللسان شاعرہ ان کا مروان بن حکیم کے ساتھ ایک قصہ ہے۔ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان سے ملاقات، حق گو اور اپنی رائے کا بلند آواز سے اظہار کرنے والی خاتون۔

زینب بنت علیؓ:

حدیث نبوی ﷺ کی راویہ، پختہ ارادہ والی عقل راجح کی مالک بلیغہ، خطیبہ، جنکا یزید بن معاویہؓ خلیفہ کے ساتھ ایک مشہور مکالمہ ہے۔

حفصہ بنت عبدالرحمٰن

علامہ العجلی نے فرمایا حفصہ بنت عبدالرحمٰن، تابعیہ اور ثقہ ہیں۔ حدیث نبوی کی راویہ جن کی احادیث صحیح اور سنن میں موجود ہیں۔

الذرقاء بنت عدی رحمہا اللہ

ایک فصیح اللسان بلیغہ، بہادر جرات مند خاتون۔

حضرت امیر معاویہؓ کے پاس وفد لے کر گئیں اور ان کے درمیان مشہور مکالمہ ہوا۔

(بحوالہ: دور تابعین کی نامور خواتین احمد خلیل جمعۃ)

خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات

علم دین کا حصول ہر مسلمان مرد، عورت پر فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ طلب العلمه فريضة على كل مسلم"

البتہ اس میں عورتوں کی صنفی حیثیت کا لحاظ رکھا گیا ہے رسول اللہ ﷺ نے خود حضرات صحابیات کو دین کی تعلیم انکی حیثیت کے مطابق دی ہے اور اسکی تاکید فرمائی۔

عہد رسالت میں خواتین اسلام کی تعلیم

عہد رسالت میں عورتوں کی دینی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ وہ مردوں کی طرح درس گاہ نبوی میں حاضر نہیں ہوتی تھیں مگر مختلف طریقوں سے تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ قرآن کی تعلیم خاص طور سے صحابہ اپنے گھروں میں عورتوں اور بچوں کو دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے علم دین کے اٹھ جانے کی بابت کی تو ایک صحابی حضرت زیاد بن لبید انصاریؓ نے عرض کیا کہ:

(ترجمہ) علم دین کیسے ختم ہو جائے گا؟ ہم نے قرآن پڑھا ہے۔ خدا کی قسم! اس کو ہم پڑھتے رہیں گے اور ہماری عورتیں اور ہمارے لڑکے اس کو پڑھتے رہیں گے۔ (ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی ذہاب العلم)

صحابیات کے خصوصی اجتماع میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے جا کر تعلیم وتلقین اور وعظ فرمایا کرتے تھے امام بخاری نے الجامع الصحیح کی کتاب العلم میں باب هل يجعل للنساء يوماً على حدة فى العلم کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

(ترجمہ) رسول اللہ ﷺ سے عورتوں نے کہا کہ آپ کی تعلیم کے بارے میں مرد ہم عورتوں پر غالب ہیں اس لئے آپ خود ہمارے لئے ایک دن مقرر فرمائیں اس پر آپ نے ان سے ایک کا وعدہ فرمایا جس میں ان کو وعظ سنایا کرتے اور دینی باتوں کا حکم دیا، اسی سلسلہ میں آپ نے ان سے فرمایا کہ جس کے تین بچے فوت ہو گئے ہوں وہ اس کے لئے نار جہنم کے لئے پردہ ہو گے یہ سن کر ایک عورت نے سوال کیا کہ جس کے دو بچے فوت ہوئے ہوں؟ آپؐ نے فرمایا کہ دو بھی (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ہل یجعل لنساء یوما علی حدۃ فی العلم)

حضرت اسماء بنت یزید بن سکن الانصاریہؓ بڑی عاقلہ فاضلہ اور دین دار صحابیہ تھیں۔ ان کو صحابیات نے اپنا ترجمان اور نمائندہ بنا کر خدمت نبوی ﷺ میں بھیجا انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں مسلمانوں کی بیویوں کی طرف سے نمائندہ بن کر آئی ہوں۔ وہ کہتی ہیں اور میں بھی کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے

آپ کو مردوں اور عورتوں کی طرف مبعوث کیا ہے۔ہم عورتیں آپ ؐ ایمان لائیں اور آپ ؐ کی اتباع کی۔ہم پردہ نشین گھروں میں رہنے والی ہیں۔مردوں کی ہر خواہش پوری کرتی ہیں۔ان کی اولاد کی پرورش کرتی ہیں اور مرد نماز با جماعت ادا کرتے ہیں۔وہ جنازہ اور جہاد میں شرکت کرتے ہیں۔اس وجہ سے فضیلت اور ثواب پاتے ہیں۔جب وہ جہاد میں جاتے ہیں تو ہم ان کے مال و اولاد کی حفاظت و پرورش کرتی ہیں یارسول اللہ ﷺ! کیا ان صورتوں میں ہم بھی اجر و ثواب میں مردوں کے شریک ہوسکتی ہیں؟

رسول اللہ ﷺ اسماء بنت یزید کی دل پذیر تقریر سن کر صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے پوچھا کہ اسماء بنت یزید سے پہلے تم لوگوں نے دین کے بارے میں اس سے بہتر سوال کسی عورت سے سنا تھا؟ صحابہؓ نے نفی میں جواب دیا۔اس کے بعد رسول ﷺ نے فرمایا کہ اسماء! جاؤ! ان عورتوں کو بتادو کہ:

(ترجمہ) تم میں سے کسی عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ حسن سلوک، اس کی رضا جوئی اور اس کے مزاج کے مطابق اتباع۔ان تمام باتوں کے برابر ہے جن کا ذکر تم نے مردوں کے متعلق کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ بشارت سن کر اسماء خوشی کے ساتھ تہلیل و تکبیر کہتی ہوئی چلی گئیں اور عورتوں کو رسولِ اللہ ﷺ کی بشارت سنائی (الاستیعاب صفحہ 726 جلد نمبر 2)

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ صحابیات میں علم و دین حاصل کرنے کا کس قدر اہتمام تھا اور اس کیلئے اجتماعی طور سے رسول کریم ﷺ سے تقاضا کرتی تھیں اور آپ ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔

رسول نبی کریم ﷺ بسا اوقات وعظ و تلقین کے ذریعہ عورتوں کو تعلیم دیتے تھے ایک مرتبہ حضرت بلالؓ کو ساتھ لے کر عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے۔ان کو وعظ سنا کر صدقہ کرنے کی ترغیب دی اور عورتیں اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں دینے لگیں اور حضرت بلالؓ ان کو اپنے دامن میں رکھنے لگے۔(صحیح بخاری صفحہ 20 جلد نمبر 1 بحاشیہ سندی)

حضرت عائشہ صدیقہ صحابیات کو جس بات میں شک و شبہ ہوتا تھا اس کے بارے میں رسول ﷺ سے معلومات حاصل کیا کرتی تھیں۔نیز صحابیات، عائشہؓ اور حضرت ام سلمیٰؓ کے ذریعہ رسول ﷺ سے مسائل اور دین کی باتیں معلوم کرتی تھیں۔سن رسیدہ اور رشتہ کی عورتیں براہ راست آپ ﷺ سے مراجعت کرتی تھیں۔

صحابہؓ کی طرح صحابیات میں بھی محدثہ، عالمہ، فاضلہ، کاتبہ تھیں۔ام المومنین حضرت عائشہ فقیہہ الامت تھیں۔ام المومنین ام سلمیٰؓ بھی فقیہہ مفتیہ تھیں، حضرت زینب بنت ابو سلمہ حضرت ام سلمیٰؓ کی لڑکی اور رسول ﷺ کی پروردہ تھیں۔ان کے بارے میں لکھا ہے۔

(ترجمہ) وہ اپنے زمانے کی عورتوں میں سب سے بڑی فقیہہ تھیں۔

ابو رافع تابعی کا قول ہے کہ میں مدینہ میں کسی عورت کو فقیہہ سمجھتا ہوں تو زینب بنت ابو سلمہؓ کو (الاستیعاب صفحہ 756 جلد نمبر 2)

حضرت ام ابوالدرداء الکبری نہایت عاقلہ، فاضلہ، عابدہ اور واسعۃ العلم فقیہہ صحابیہ تھیں (تہذیب التہذیب صفحہ 422 جلد نمبر 12)

حضرت سعد بنت قحامہؓ نماز میں عورتوں کی امامت کرتی تھیں۔ حضرت سمرہ بنت نہیک اسدیہؓ کے حال میں لکھا ہے۔

انہوں نے بڑی عمر پائی تھی، بازاروں میں جا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی تھیں

بہت سی صحابیات لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ امہات المومنین حضرت عائشہؓ حضرت ام سلمیٰؓ دونوں پڑھنا جانتی تھیں اور حضرت حفصہؓ لکھنا پڑھنا دونوں جانتی تھیں۔ حضرت شفاء بنت عبداللہ عدویہؓ لکھنا جانتی تھیں رسول ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم نے جس طرح حفصہؓ کو پھوڑے کا رقیہ سکھایا گیا ہے کتابت بھی سکھا دو۔ حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ اور حضرت کریمہ بنت مقدادؓ لکھنا جانتی تھیں۔ (فتوح البلدان صفحہ نمبر 458)

علمائے صحابہؓ کی طرح عالمات صحابیاتؓ نے اپنا حلقہ درس و تدریس باقاعدہ قائم نہیں کیا مگر ان سے کئی احادیث روایت کی گئی اور فقہی مسائل اور فتاوے معلوم کئے گئے۔

صحابیات میں کئی شاعرات تھیں۔ جن کے اشعار کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں حضرت خنساءؓ بہت مشہور ہیں۔ اور اپنے بھائی صخر کے مرتبہ میں اتنے غم ناک اشعار کہے ہیں کہ ارثی العرب کہلائیں۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول ﷺ نے ان سے اشعار سنے ہیں۔ بنت عقبہ، زینب بنت عوام بن خدیلد سعدی بنت عمرو مریہ، سعدی بنت کریز بن ربعیہ، صفیہ بنت عبدالمطلب بن ہاشم، عاتکہ بنت زید بن عمرو عدویہؓ کے علاوہ متعدد صحابیات شعر گوئی میں مشہور تھیں۔ ان ہی حضرات صحابیاتؓ کے اسوہ پر بعد میں خواتین اسلام نے حدیث و فقہ، فتویٰ، تفسیر، شعر و ادب اور دوسرے علوم و فنون میں بڑھ چڑھ کر بھرپور حصہ لیا۔ اس کے ساتھ عملی طور سے ہر دینی و ملی معاملہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اندر باہر، ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اپنے نام کے نقوش چھوڑے جیسا کہ معلوم ہوگا۔

علم حدیث اور خواتین اسلام

اسلام اور مسلمانوں کے خاص معاملات میں یہ سنت الہیہ ہمیشہ جاری رہی کہ جس دور میں جس قسم کے علوم و فنون اور علماء فضلاء کی ضرورت ہوئی۔ اس میں مردوں کے علاوہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی پورے نشاط و انبساط کے ساتھ نمایاں خدمات انجام دیں۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں پورے اسلام میں احادیث و آثار کی روایات و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا اور دینی ضروریات کے پیش نظر انکے ساتھ خصوصی اعتناء کیا گیا۔ تو گھر کے باہر کی طرح گھر کے اندر بھی اور دیگر

بنات اسلام نے اپنے اپنے خاندانوں کی بڑی بوڑھیوں سے احادیث کی روایات کر کے گھر کے مردوں تک یہ امانت پہنچائی۔ جن خواتین اسلام کے پاس احادیث کے مجموعے تھے۔ ان کا پتہ چلا کر وہ مجموعے حاصل کئے گئے۔ چنانچہ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ مدنیہ جن کے مجموعہ احادیث کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد بن حزم کو خاص طور سے تاکید کی کہ وہ اس کو حاصل کر لیں (طبقات ابن سعد صفحہ 387، جلد نمبر 8) اور جن کے پاس احادیث محفوظ تھیں انہوں نے اپنے خاندان کے لوگوں سے ان کی روایات کیں۔ یہی حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ مدینہ ہیں جنہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، اپنی بہن ام ہشام، حبیبہ بنت سہل، ام حبیبہ اور حمنہ بنت جحش سے احادیث کی روایت کی تھی اور ان سے ان کے صاحب زادے ابوالرجال، بھائی محمد بن عبدالرحمٰن، پوتے حارثہ بن ابوالرجال، دونوں بھتیجے، یحیٰی بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن اور ابوبکر بن محمد بن عبدالرحمٰن اور ان کے بیٹے عبداللہ بن محمد بن عبداللہ نے روایت کی۔

امام حسن بصریؒ کی والدہ خیرہ نے اپنی مولاۃ و مالکہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی اور ان سے ان کے دو صاحب زادوں یعنی حسن بصری اور سعید بصری نے روایت کی۔ صفیہ بنت علیہ عنبریہ نے اپنے دادا حرملہ بن عبداللہ عنبری اور دادی قیلہ بنت مخرمہ سے روایت کی اور ان سے ان کے پوتے عبداللہ بن حسان عنبری نے روایت کی۔

رائطہ بنت مسلم نے اپنے والد مسلم سے اور ان سے ان کے بیٹے عبداللہ، بن حارث عنبری مکی نے روایت کی، فاطمہ بنت حسین بن علی ہاشمیہ مدنیہ نے اپنے والد ماجد حضرت حسین رضی اللہ عنہ، بھائی علی بن حسین (زین العابدین) پھوپھی حضرت زینب بنت حضرت علیؓ اور دادی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم سے روایت کی اور ان سے ان کی اولاد میں سے عبداللہ، ابراہیم اور ام جعفر نے روایت کی۔

ام یحیٰی حمید بنت عبید بن رفاعہ انصاریہ مدنیہ نے اپنی خالہ کبشہ بنت کعب بن مالک سے اور ان سے ان کے شوہر اسحاق بن عبداللہ بن ابوطلحہ اور بیٹے یحیٰی بن اسحاق نے روایت کی۔

حکیمہ بنت امیمہ نے اپنی والدہ امیمہ بنت رفیقہ سے اور ان سے ان کے گھر کے افراد نے روایت کی۔ اسماء بنت یزید قیسیہ بصریہ نے اپنے چچازاد بھائی انسؓ سے روایت کی۔

حبیبہ بنت میسرہ سے ان کے غلام عطا بن ابورباح نے روایت کی۔ حکیمہ بنت امیہ بن اخنس نے حضرت ام سلمہؓ سے اور ان سے ان کے بیٹے یحیٰی بن ابوسفیان اخنسی نے روایت کی۔

ام الرائح رباب بنت صلیع ضبیہ بصریہ نے اپنے چچا سلیمان بن عامر ضبی سے اور ان سے حفصہ بنت سیرین نے روایت کی۔

کبشہ بنت ابوبکر ثقفیہ بصریہ نے اپنے چچا سے اور ان سے ان کے بھتیجے بکار بن عبدالعزیز بن ابوبکرہ نے

روایت کی (ان روایات ومحدثات کے تذکرے تہذیب التہذیب جلد 12 میں ملاحظہ ہوں)

جبرہ بنت محمد بن ثابت بن سباع نے اپنے والد سے روایت کی۔ بعد ان سے ان کے شوہر عبدالرحمٰن بن ابوبکر بن عبداللہ تیمی وغیرہ نے روایت کی۔

تمنی بنت عمر بن ابراہیم بن الحمیری طیبی نے ابوالمظفر علی بن احمد کرخی سے اوران سے ان کے دونوں لڑکوں احمد بن ابوبکر بن بذنجی اور تمیم بن احمد کرخی سے اوران سے ان کے دونوں لڑکوں احمد بن ابوبکر بن بندنجی اور تمیم بن احمد بن ابوبکر بن بندنجی نے روایت کی۔

حبابہ نامی محدثہ مالک بن ضیغم کی خالہ ہیں ان سے مالک نے روایت کی۔ ام حبابہ بنت حیان جنگ جمل کے موقع پر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھیں اوران سے روایت کی اوران کے بھائی مقاتل بن حیان نے ان سے روایت کی۔

حبابہ بصریہ نے اپنی والدہ سے روایت کی، حسنہ بنت معرور بن سوید نے اپنے والد سے روایت کی۔

حکیمہ نے اپنے شوہر یعلے بن مرہ سے اوران سے عمر بن عبداللہ بن یعلی اور عثمان بن مغیرہ الاعشیٰ نے روایت کی۔ حکیمہ نامی تابعیہ نے حضرت عائشہؓ سے اوران سے ان کی صاحب زادی ام عاصم نے روایت کی۔

حمیضہ بنت ابوکثیر نے اپنی والدہ سے اوران سے عبدالرحمٰن بن اسحاق کوفی نے روایت کی۔

مینہ بنت عبید بن ابوبرزہ نے اپنی دادی یا نانی سے روایت کی۔ برہ بنت رافع سے ان کے بھائی عبداللہ نے روایت کی۔

تحسیہ بنت سلیمان بن عمر واسطیہ نے اپنے چچا محمد عمر واسطی سے روایت کی اور یحییٰ بن علی خضرمی نے ان سے حدیث کا سماع کیا۔ ام الجنوب بنت غیلہ نے اپنی والدہ سویدہ بنت جابر سے اوران سے محمد بن بشار بزار کے استاد عبدالحمید بن عبدالواحد نے روایت کی، برہ بنت موسیٰ بن نجیح باہلیہ نے اپنی والدہ سے روایت کی۔

تہیہ بنت جون نے بھی اپنی والدہ ہنسیرہ بنت یاسر سے روایت کی۔ (یہ تمام واقعات الاکمال جلد اول کے مختلف مقامات سے ماخوذ ہیں)

ام مکیہ آمنہ بنت عثمان بن حسن غدریہ مکیہ نے اپنے شوہر شیخ ابوالعباس قسطلانی اور بیٹے امین الدین قسطلانی کو اپنی مرویات کی اجازت دی (العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین فاسی صفحہ نمبر 184 جلد نمبر 8)

ام عبدالرحمٰن جرجانیہ سے ان کے شوہر شیخ میں بن علی جرجانی نے روایت کی۔ تاریخ جرجان سہمی صفحہ نمبر 468

ام عمر بنت حسان بغدادیہ نے اپنے والد ابوالغصن حسان بن زید اور شوہر سعید بن یحییٰ بن قیس سے احادیث کی روایت کی (تاریخ بغداد خطیب صفحہ 433، جلد نمبر 14)

خدیجہ بنت قاضی شہاب الدین احمد مکیہ نے اپنی نانی حسنہ بنت محمد بن کامل سے احادیث کا سماع کیا۔

(العقد الثمین صفحہ 206، جلد نمبر 8)

زینب بنت عبدالرحمٰن عجلیہ جرجانیہ اپنے دادا شیخ محمد بن معروف جرجانیہ کے مجموعہ مرویات کی روایت کیا کرتی تھیں۔ (تاریخ جرجان صفحہ نمبر 463)

ان چند مثالوں سے یہ روایت واضح ہو جاتی ہے کہ صدر اول و بعد کے ادوار میں بنات اسلام کے ذریعہ خاندانی احادیث و آثار کی ترویج و اشاعت کس طرح ہوئی ہے۔ درحقیقت ان روایات ومحدثات نے اپنے گھروں کو دارالحدیث اور دارالعلوم بنا رکھا تھا۔

تحصیل حدیث کیلئے سفر

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش وطلب میں محدثین نے عالم اسلام کی خاک چھانی ہے اور طلبہ حدیث کے قدموں سے اسلامی بلاد و امصار کو بڑی خیر و برکت ملی ہے اور ان سے مصائب دور کئے گئے۔ یہ ابتدائی ادوار میں یہ دینی و علمی اسفار در حالات عام طور سے احادیث و آثار کی روایت اور ان کی تدوین کے لئے کرتے تھے۔ بعد میں سند عالی کی طلب بھی ان اسفار کا سبب بن گئی۔ حدیث کی تحصیل کیلئے محدثین و رواۃ کی طرف محدثات و روایات نے بھی گھر بار چھوڑ کر دور دراز ملکوں کا سفر کیا ہے اور اپنی صنفی حیثیت وصلاحیت کے مطابق غربت و بے وطنی کی زندگی بسر کر کے علم دین کی تحصیل کی ہے۔ ام حسین جعہ بنت احمد محمیہ نے اپنے وطن نیشاپور سے بغداد کا سفر کر کے یہاں کے شیوخ ومحدثین سے روایت کی۔ چنانچہ 396 ہجری میں شیخ ابوالحسین محمد بن محمد شروئی بغدادی نے ان سے بغداد میں روایت کر کے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ (تاریخ بغداد صفحہ نمبر 444 جلد نمبر 14)

ام علی تقیہ بنت ابوالفرج غیث بن علی صوریہ بغدادیہ نے بغداد سے مصر جا کر مدتوں قیام کیا اور اسکندریہ میں امام ابوالطاہر بن محمد سلفی سے اکتساب علم کیا (ابن خلکان صفحہ 103 جلد نمبر 1)

زینب بنت برہان الدین ابراہیم بن احمد اردبیلیہ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنے چچا کے ساتھ بلاد عجم کا سفر کیا اور بیس سال کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئیں۔ (العقد الثمین صفحہ 224 جلد نمبر 8)

زلیخا بنت الیاس الواعظہ شہر غزنین کی رہنے والی تھیں۔ یہاں سے مکہ مکرمہ گئیں اور علماء ومحدثین سے روایت کر کے کئی سال تک حرم محترم کی مجاورت کے بعد فارس کے شہر ساوہ چلی گئیں۔ اس سفر و اقامت میں زلیخا الواعظہ نے حرم میں روایت اور عبادت دونوں نعمتیں حاصل کیں۔ (العقد الثمین صفحہ نمبر 237 جلد 8)

ام احمد بنت نفیس الدین محمد بن حسین ملک شام کے شہر حماۃ کی رہنے والی تھیں، انہوں نے یہاں سے مصر اور طرابلس کا سفر کر کے اپنے چچا سے روایت کی۔ (ذیل العبر، ذہبی صفحہ 89)

ام محمد زینب بنت احمد بن عمر کا وطن بیت المقدس تھا۔ امام ذہبی نے ان کو ''المعمر ہ الراحلہ'' کے القابہ سے یاد کیا ہے کیونکہ دور دراز ملکوں کا سفر کر کے تحصیل علم اور حدیث کی روایت میں مشہور تھیں۔ اسی وجہ سے بعد میں دور دراز ملکوں کے طلبہ حدیث ان سے روایت کرتے تھے۔ (ذیل العبر ، ذہبی صفحہ 126)

حرمین شریفین کا سفر اہل علم اور محدثین کے لئے بڑا پرکشش ہوتا تھا۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے ساتھ مقامی اور بیرونی علماء سے ملاقات اور روایات کا موقع ملتا تھا۔ بلکہ کتنے محدثین اس نیت سے صبح و زیارت کا سفر کرتے تھے۔ کہ حرمین شریفین کے فلاں عالم سے روایت و رویت کی سعادت حاصل ہوگی۔ اس بارے میں بھی علماء و محدثین کی طرح عالمات و محدثات نمایاں مقام رکھتی تھیں اور وہ بھی حرمین شریفین میں اقامت و مجاورت کر کے عبادت کے ساتھ افادہ و استفادہ کا بازار گرم کرتی تھیں۔ چنانچہ اسماء بنت محمد بن سالم نے بار بار حرمین شریفین میں حاضری دی اور یہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ (ذیل العبر ، ذہبی صفحہ نمبر 180)

کریمہ بنت احمد مروزیہ، خراسان کے مشہور مرو کی رہنے والی تھیں انہوں نے مستقل طور سے مکہ مکرمہ میں اقامت و مجاورت اختیار کر کے ایک زمانہ تک حدیث کا درس دیا۔ خطیب بغدادی نے مکہ مکرمہ ہی میں ان سے پانچ دن میں صحیح بخاری پڑھ کر روایت کی۔ نیز امام سمعانی ابن مطب اور ابو طالب زینبی جیسے ائمہ حدیث نے ان سے صحیح بخاری کی روایت کی (العبر فی خبر من غبر ذہبی صفحہ 254 جلد 3)

بہت سی محدثات اور روایات کسی مشہور امام حدیث اور شیخ وقت سے سماع و روایت کے لئے سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں چنانچہ ام محمد ہدیہ بنت علی بن عسکر ہراس مقدسیہ نے امام زبیدی سے روایت کے لئے ان کے وطن کا سفر کیا۔ (ذیل العبیر ، ذہبی صفحہ 70)

امتہ الرحمٰن ست الفقہاء بنت شیخ تقی الدین، صرف جز بن حرفہ کے سماع کے لئے شیخ عبدالحق کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ (ذیل العبر ، ذہبی صفحہ 147)

عائشہ بنت محمد حرانیہ نے امام زین الدین عراقی اور امام بلخی سے روایت کے لئے ان دونوں حضرات کی درس گاہ کا سفر کیا، عائشہ بنت معمر اصفہانیہ نے محدثہ فاطمہ جوزدانیہ کی خدمت میں حاضری دی۔ ست العرب بنت یحییٰ دمشقیہ نے امام ابن طبرزد کی درس گاہ میں پہنچ کر کتاب والغیلا شیات کا سماع کیا۔ اسی طرح مریم بنت احمد بعلبکیہ نے بہاوالدین اور ام محمد سہرہ بنت کمال الدین نے شیخ کاشغری کے یہاں جا کر روایت کی۔ (ذیل العبر وغیرہ)

عام طور پر ان تعلیمی اسفار میں طالبات کی صنفی حیثیت و ضرورت کا پورا خیال رکھا جاتا تھا اور ان کی راحت و حفاظت کا پورا اہتمام ہوتا تھا۔ خاندان اور رشتہ کے ذمہ داران کے ساتھ ہوتے تھے امام سہمی نے تاریخ جرجان میں فاطمہ بنت ابو عبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن طلقی جرجانی کے حال میں لکھا ہے کہ میں نے فاطمہ کو اس زمانہ میں دیکھا ہے کہ جب ان کے والد ان کو اٹھا کر امام ابو احمد بن عدی جرجانی کی خدمت میں لے جاتے تھے اور وہ ان

سے حدیث کا سماع کرتی تھیں۔ (تاریخ جرجان صفحہ 463)

فاطمہ بنت محمد بن علی طمنیہ اندلس کے مشہور محدث ابومحمد باجی اشبیلی کی بہن تھیں انہوں نے اپنے بھائی ابومحمد باجی کے ساتھ رہ کر طالب علمی کی۔ اور دونوں نے ایک ساتھ بعض شیوخ اور اساتذہ سے حدیث کی روایت کی اور اجازت لی (بغتیہ الملتمس صفحہ نمبر 531)

ام محمد فاطمہ بنت عبدالرحمٰن بن ابوصالح بغداد میں پیدا ہوئیں اور بچپن ہی میں بغداد سے مصر لے جائی گئیں۔ جہاں انہوں نے اپنے والد محترم اور دیگر شیوخ سے حدیث کا سماع کیا۔ (تاریخ بغداد صفحہ 441)

شمس الضحیٰ بنت محمد بن عبدالجلیل عالمہ، فاضلہ اور عابدہ، زاہدہ خاتون تھیں۔ انہوں نے شیخ الطریقت شیخ ابوالنجیب سہروردی کی خدمت میں رہ کر زہد وتصوف کی تلقین وتربیت پائی اور ان کے ساتھ دیگر محدثین سے حدیث کا سماع کیا۔

طالبات کے لئے مخصوص نشست گاہ اور پردہ

ان محدثات وطالبات کے لئے محدثین وشیوخ کی درس گاہوں میں مخصوص جگہ رہتی تھی۔ جس میں وہ مردوں سے الگ رہ کر سماع کرتی تھیں۔ اور طلبہ کو طالبات میں اختلاط نہیں ہوتا تھا۔ مغرب اقصیٰ کی عالمات، محدثات میں فقیہہ، مفتیہ ام ہانی عبوسیہ اوران کی بہن فاطمہ عبوسیہ وہاں کے مشہور علمی خاندان سے تھیں۔ ان کے ساتھ شیخ زروق کی دادی ام البنین اور دوسری عالمات ومحدثات شیخ عبدوس کے حلقہ درس حدیث میں شریک ہوتی تھیں اور قرویین کے دیگر علماء ومشائخ کی طرح ان کی درسگاہ میں بھی عورتوں کے لئے علیحدہ جگہ ہوتی تھی۔ مورخ کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''یہ محترم خواتین اپنے اسباق ایسے مکانوں سے سنتی تھیں جو ان کے لئے مخصوص تھے۔ کیونکہ شہر قرویین میں اس طرح طلبہ وطالبات کی جدا جدا نشست گاہوں کا عام طور پر انتظام رہتا تھا۔

محدثین کی مجالس درس میں بنات اسلام کی حاضری اوران سے حصول خیر وبرکت کے سلسلہ میں ایک واقعہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

امام ابوالولید حسان بن محمد بن احمد بن ہارون قریشی متوفی 349ھ خراسان کے زبردست فقیہہ، اپنے دور کے محدثین کے امام اور زہد وعبادت میں سب سے آگے تھے۔ انہوں نے اپنے مرض اعوت میں بیان کیا کہ میری والدہ نے مجھے بتایا ہے کہ جس زمانہ میں تم حالت حمل میں تھے امام عباس بن حمزہ کی مجلس درس قائم ہوئی، میں نے تمہارے والد سے دس دن تک اس میں حاضری اور شرکت کی اجازت چاہی۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ دسویں دن جب آخری مجلس ہوگئی۔ تو امام عباس بن حمزہ نے حاضرین سے کھڑے ہونے کو کہا چنانچہ سب لوگ کھڑے ہوگئے۔ میں بھی کھڑی ہوگئی۔ اس کے بعد انہوں نے دعا شروع کی۔ میں نے اس وقت اللہ تعالیٰ

سے دعا کی کہ مجھے عالم لڑکا عطا ہو۔ گھر آ کر خواب دیکھا کہ ایک آدمی میرے پاس آ کر کہہ رہا ہے کہ تم کو خوشخبری ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا سن لی اور لڑکا دیا جو عالم ہوگا اور تمہارے والد کی عمر تک زندہ رہے گا۔ اس کے بعد میری والدہ نے بتایا کہ ان کے والد کی عمر (یعنی میرے نانا کی عمر) بہتر سال تھی میرا ابھی یہ بہترواں سال پورا ہو چکا ہے۔ اس واقعہ کے چار دن بعد حسان بن احمد قریشی نے شب جمعہ 5 ربیع الاول 349ھ میں انتقال فرمایا۔ (المنتظم صفحہ 396، جلد نمبر 2)

محدثین کی طرف سے اجازت

طالبات وعالمات کے علمی اور دینی ذوق وشوق اور ان کی سفری مشکلات کے پیش نظر بہت سے شیوخ واساتذہ نے ان کو اپنی طرف سے حدیث کی روایت کی (اجازت) دے دی ہے۔ محدثین کے نزدیک اجازت کی یہ صورت ہوتی ہے کہ شیخ اپنے سماع وروایت کے اصل نسخہ یا اس سے مقابلہ کئے ہوئے نسخہ کو یہ کہہ کر اپنے تلمیذ کو دے کر ھذا اسماعی او روایتی عن فلان فاروہ عنی او اجذت لک روایت یعنی یہ فلاں محدث اور شیخ سے میری مسموع یا مروی احادیث ہیں۔ تم ان کو میری طرف سے روایت کر دیا میں نے تم کو اپنی طرف سے حدیث کی روایت کی اجازت دے دی ہے بسا اوقات کسی ملک اور شہر کے طالب علم اور محدث کو دوسرے ملک اور شہر کے شیوخ تحریری اجازت دیتے ہیں اور جن کو اجازت دی جاتی ہے وہ اپنے شیخ کے تلمیذ اور شاگرد مانے جاتے ہیں، بہت سے محدثین نے اس طرح روایت کی اجازت دے کر محدثات و راویات کو اپنی شاگردی میں لیا ہے۔ محدثات کے تذکرہ میں آجازلھا فلان ولھا اجازہ عن الفلان وغیرہ الفاظ اسی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ نیز بہت سی محدثات نے مردوں کو اسی طرح اپنی طرف سے حدیث کی روایت کی اجازت دے دی ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

محدثات کو محدثین کی طرف سے اجازت بالروایت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں شیخ صدر الدین تو اس کی صاحب زادی ام محمد عائشہ دمشقیہ کو ابو القاسم بن قمیرۃ ابن مسلمہ، مکی بن علوان، بہاؤ الدین زہیر، ابن ایلاق، ابن دفتر خوان سلیمانی اور نور بن سعید نے اپنی مرویات کی اجازت دی۔ (العقد الثمین 266 جلد 8)

ام کمال عائشہ بنت قاضی شہاب الدین احمد بن ظہیرہ کو محمد بن علی قطروانی، محمد بن یعقوب بن رصاص، قاضی ناصر الدین محمد بن محمد تونسی مالکی، ابو الحرم، محمد بن محمد قلانسی کے علاوہ اور بہت سے محدثین نے اپنی مرویات کی اجازت دی۔ (العقد الثمین صفحہ 267 جلد نمبر 3)

ام الہدیٰ عائشہ بنت خطیب تقی الدین طبریہ مکیہ کو ان کے دادا محب الدین طبری، والد خطیب تقی الدین طبری، چچا قاضی جلال الدین طبری کے علاوہ رضی الدین بن خلیل اور ان کے بھائی علم الدین بن خلیل وغیرہ نے اجازت دی (العقد الثمین صفحہ 268)

ام ابراہیم فاطمہ بنت خطیب عزالدین ابراہیم بن عبداللہ مشہور محدث ابراہیم ابن خلیل کی سب سے آخری شاگرد تھیں۔ اسی طرح وہ محمد بن عبدالقادر ابن سروی، ابن عوہ اور خطیب مردہ سے روایت بالا جازت کرنے والوں میں سب سے آخری شاگرد تھیں۔ (ذیل العمر، حسینی صفحہ 259 جلد نمبر 5)

عجیبہ بنت محمد ماقداریہ بغدادیہ اپنے شیوخ حدیث مسعود اور رستمی وغیرہ سے روایت بالا جازت میں سب سے آخری تلمیذہ تھیں۔ (العمر صفحہ 194 جلد نمبر 5)

ام الخیر جویریہ بنت قاضی زین الدین طبریہ مکیہ کو مختلف بلاد وامصار کے علماء ومحدثین نے اپنی مرویات کی اجازت سے نوازا تھا۔ مصر سے محمد بن قماح ابن عالی دمیاطی، ابن کشتغری، ابن اسعردی، احمد بن علی مشتولی اور دیگر شیوخ نے اور دمشق سے احمد بن علی جزری اور بہت سے محدثین نے اجازت دی۔ زینب بنت ضیاء الدین محمد بن عمر قسطانیہ مکیہ کو بغداد سے ابراہیم بن خیرالدین، ابوجعفر بن سعید فضل اللہ بن عبدالرزاق جیلی اور امام رضی الدین حسن صنعانی لاہوری نے تحریری اجازت روانہ کی۔ ست الکل بنت امام رضی الدین کو مصر کے محدثین کی ایک جماعت نے اجازت دی جس میں سیدہ بنت موسیٰ بن عثمان اور درباس مارانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ (العقد الثمین جلد 12 ملاحظہ ہو)

ام الحسن ست الکل بنت احمد قبیہ کو مصر سے یحییٰ بن قاضی شرف الدین بن قماح، عائشہ بنت عمر صنہاجیہ وغیرہ نے اور دمشق سے ابوبکر رضی الدین، زینب بنت کمال الدین اور دوسرے محدثین نے اجازت دی۔ دمشق کی اجازت ست الکل کے خالہ زاد بھائی کے ذریعہ آئی تھی۔ (العقد الثمین جلد 12 ملاحظہ ہو)

ام المویدزینب بنت ابوالقاسم، عبدالقاسم عبدالرحمٰن نیشاپوریہ کے بارے میں ایک جماعت سے روایت اور اجازت علم حدیث حاصل کیا تھا۔ ان کو اجازت دینے والے اعیان علماء میں حافظ ابوالحسن عبدالغافر بن اسماعیل فارسی اور علامہ محمود بن عمر زمخشری صاحب کشاف جیسے حفاظ وسادات شامل ہیں۔ (ابن خلکان صفحہ نمبر 216 جلد نمبر 1)

صفیہ بنت عبدالوہاب قرشیہ محدثہ وقت تھیں حالانکہ انہوں نے کسی شیخ اور محدث سے سماع وروایات نہیں کی تھی بلکہ ان کو محدث مسعود ثقفی اور دیگر محدثین کبار نے روایت کی اجازت دی تھی۔ (العمر صفحہ 188 جلد نمبر 5)

مسندات: محدثات میں بہت سی بڑے پایہ کی عالمات وفاضلات گزری ہیں۔ جو اسناد حدیث میں ایسا ممتاز مقام ومرتبہ رکھتی تھیں کہ علماء محدثین نے ان سے سند لی، ان میں سے چند مسندات یہ ہیں:

ام محمد اسماء بنت محمد بن عالم بن ابومواہب، ام محمد فاطمہ بنت ابراہیم بن محمود بعلبیہ (مسندۃ الشام) ام عبداللہ زینب بنت احمد بن عبدالرحیم قدسیہ، (مسندۃ الشام) فاطمہ بنت احمد بن قاسم حرازیہ) (مسندۃ الوقت) ست الوزراء بنت عمر بن اسعد بن منجا تنوخیہ۔

القابات وخطابات

علماء ومحدثین کی طرح عالمات ومحدثات بھی بڑے بڑے علمی ودینی القاب وخطابات سے نوازی گئی ہیں۔ ذیل میں ان چند بنات اسلام کے القابات درج کئے جاتے ہیں جو اقلیم علم کی ملکہ میں اور مسلمانوں نے ان کے علمی ودینی قیادت وامامت کو تسلیم کیا ہے۔ (ست بمعنی سیرہ ہے)

ست الاجناس	موفقیہ بنت عبدالوہاب بن عتیق بن وردان مصریہ۔
ست الاھل	ام احمد بنت علوان بن سعید بعلبکیہ۔
ست الشام	خاتون اخت الملک العادل
ست العرب	ام الخیر بنت یحیٰی بن قائماز کندیہ دمشقیہ۔
ست الفقہاء	شریفہ بنت خطیب شرف الدین احمد بن محمد دمشقیہ۔
ست الفقہاء	امۃ الرحمٰن بنت تقی الدین ابراہیم بن علی واسطیہ صالحیہ۔
ست الکل	عائشہ بنت محمد بن احمد بن علی قیسہ۔
ست الکل	بنت امام رضی الدین ابراہیم بن محمد طبریہ مکیہ۔
ست الکل	بنت احمد بن محمد مکیہ۔
ست الملوک	فاطمہ بنت علی بن علی بن ابو بدر بغدادیہ۔
ست الناس	کمالیہ بنت احمد بن عبدالقادر دمرادیہ۔
ست الوزراء	بنت عمر بن اسعد تنوخیہ۔
تاج النساء	بنت رستم بن ابورجاء بن محمد اصفہانیہ۔
شرف النساء	امۃ اللہ بنت احمد بن عبداللہ بن علی آنبوسیہ۔
فخر النساء	شہدہ بنت احمد ابن عمر ابریہ بغدادیہ۔
زین الدار	وجیہہ بنت علی بن یحیٰی انصاریہ بوصیریہ۔
شجرۃ الدر	ام خلیل۔
حرہ	ام المویدزینب بنت ابوالقاسم عبدالرحمٰن شعریہ نیشاپوریہ)
جلیلہ	ام عمر خدیجہ بنت عمر بن احمد بن عدیم۔
معلمہ	غالیمہ بنت محمد اندلسیہ۔
شیخہ	ام عبداللہ حبیبہ بنت خطیب عزالدین ابراہیم مقدسیہ۔
شیخہ	ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ۔
شیخہ	ام الفضل صفیہ بنت ابراہیم بن احمد مکیہ۔

شیخہ　　　　ام احمد زینب بنت مکی بن علی کامل حرانیہ۔

سند عالی

احادیث کی روایت میں سند عالی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علوے سند کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً کسی سند میں رواۃ حدیث دوسری سند سے کم ہوں جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ روایت مختصر اور قریب ہو۔ یا کسی امام سے قربت ہو یا کسی کتاب کی روایت میں قربت ہو۔ محدثین نے اس فضیلت کی خصوصیت کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کیا ہے۔ سند عالی رکھنے والے محدثین کی درس گاہوں میں طلبہ حدیث کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ ان ہی کی طرح بہت سی محدثات نے بھی سند عالی کی فضیلت حاصل کی۔ اور ان کے در پر بھی طلبہ حدیث جوق در جوق آئے۔ فاطمہ بنت دقاق کے بارے میں امام ذہبی نے لکھا ہے۔

(ترجمہ) ''وہ بڑی قدر و منزلت کی مالکہ تھیں اور ان کی اسناد عالی تھیں۔ اپنے زمانہ میں عابدات میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔'' (العبر صفحہ 296 جلد 3)

اور ام المؤید زینب شعریہ نیشاپوریہ کے متعلق تصریح کی ہے۔

(ترجمہ) ''ان کے انتقال سے سند عالی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔'' (العبر صفحہ 56 جلد 5)

ام محمد زینب بنت احمد بن عمر قدسیہ مسند دارمی، مسند عبد بن حمید کتاب الثقفیات کی سند عالی میں منفرد تھیں۔ اس لئے طلبہ حدیث نے ان کتابوں کی روایت کے لئے ان کی درس گاہ کا سفر کیا اور دور دور سے حاضر ہو کر ان سے سند حاصل کی انہوں نے خود نیشاپور سے مصر اور مدینہ منورہ آ کر ان کتابوں کی روایت کی تھی۔

احادیث اور کتب احادیث میں منفردات

محدثین کی طرح محدثات بھی بعض احادیث یا کتب احادیث کی روایت میں اپنے زمانہ میں منفرد ہوتی تھیں اور دوسرے معاصرین و معاصرات کے یہاں ان کی روایات نہیں تھیں اس تفرد اور خصوصیت کی وجہ سے طلبہ حدیث نے ان محدثات و شیخات سے قلمی طور سے روایت کی۔

مسندۃ الشام ام عبداللہ زینب بنت کمال الدین مقدسیہ کا شمار ایسی ہی محدثات میں تھا۔ ام محمد اسماء بنت محمد بن سالم کو بھی تفرد کی فضیلت حاصل تھی۔ امۃ الحق بنت حافظ ابوعلی حسن بن محمد بکریہ کے بارے میں ہے:

(ترجمہ) ''وہ احادیث کے چند اجزاء کی روایت میں منفرد تھیں۔'' (العبر صفحہ نمبر 352)

اور صفیہ بنت عبدالوہاب قرشیہ کے متعلق لکھا ہے:

(ترجمہ) ''وہ بہت سی احادیث کی روایت میں اپنے زمانہ میں تنہا تھیں۔'' (العبر صفحہ 189، جلد نمبر 3)

زینب بنت خطیب یحیٰی بن عزالدین مسلمیہ کے حال میں ہے:

(ترجمہ) ''انہوں نے بہت زیادہ روایت کی اور تفرد رکھتی تھیں۔''

زینب بنت سلیمان اسعر دیہ کے متعلق لکھا ہے:

(ترجمہ) ''کچھ احادیث کی روایت میں منفرد تھیں۔''

زینب بنت عبداللہ بن رضی الدین کو بھی یہ شرف حاصل تھا کہ:

(ترجمہ) ''چند اجزاء حدیث کی روایت میں وہ بھی منفرد تھیں۔''

ام الفضل بی بی بنت عبدالصمد ہرثمیہ ہردیہ کے پاس احادیث کا ایک جز (مختصر سا مجموعہ) تھا۔ جو ان ہی کی نسبت سے مشہور تھا۔ انہوں نے اس کی روایت عبدالرحمٰن بن ابوشریح سے کی تھی۔ (العمر 257)

خاتمۃ الاصحاب

شیوخ اور محدثین کے اصحاب وتلامذہ میں جو آخری شاگرد ہوتا ہے۔ یا ان میں جو سب سے آخر تک زندہ رہتا ہے۔ وہ خاتمۃ الاصحاب ہوتا ہے۔ ایسے محدث سے بھی سند عالی ملتی ہے۔ اس لئے طلبہ حدیث اس سے روایت کرتے ہیں، اس خصوصیت کی وجہ سے وہ مرجع ہوتا ہے۔ محدثات میں بھی ایسی خاتمۃ الاصحاب ہوئی ہیں۔

فاطمہ بنت خطیب عزالدین ابراہیم مقدسیہ، شیخ ابراہیم بن خلیل کی خاتمۃ الاصحاب ہیں یعنی ان کے بعد کسی نے شیخ ابراہیم سے روایت نہیں کی۔ نیز وہ ابن عبدالقادر، ابن سری، ابن عوہ اور خطیب مردا سے اجازۃً روایت کرنے والوں میں آخری شاگرد ہیں۔

عجیبہ باقداریہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ مسعود ثقفی، رستمی اور محدثین کی ایک جماعت سے روایت بالاجازت کرنے والوں میں آخری شاگردہ ہیں۔ ام ہانی عفیفہ بنت احمد فارقانیہ اصفہانیہ نے امام ابونعیم اصفہانی کے شاگرد عبدالواحد الاشج سے روایت سب سے آخر میں کی ہے اور وہ ان کی خاتمۃ الاصحاب ہیں۔ مشہور محدث ابوالغنائم مسلم بن احمد مازنی دمشقی سے سب سے آخر میں روایت کرنے والے دو ہیں ایک فاطمہ بنت سلیمان دوسرے ابوالفتوح اغماتی اسکندرانی۔

تحدیث و روایت اور اس کے طریقے

محدثات اسلام جس طرح طلب علم میں سفر ہو یا حضر شرعی احکام کی پابندی اور اپنے صنفی تقاضوں کا پورا خیال رکھ کر شریعت ونسوانیت کی حدود میں رہیں۔

اسی طرح حدیث کی تدریس و روایت میں ذمہ دارانہ طور طریقہ اختیار کیا اور کسی حال میں اپنی حد سے باہر نہیں ہوئیں۔ خاص طور پر حجاب اور پردہ کے بارے میں ان کا رویہ بہت سخت رہا ہے۔

عاصم بن سلیمان الاحول کا بیان ہے کہ ہم لوگ حفصہ بنت شیریں کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ اپنی چادر کو سنبھال کر چہرہ پر ڈال لیتی تھیں ہم ان سے عرض کرتے تھے کہ آپ یہ تکلفات کیوں کر رہی ہیں۔ آپ جیسی عمر

رسیدہ خواتین کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(ترجمہ) جو بوڑھی عورتیں گھروں میں بیٹھنے والی ہیں۔ جن کو توقع نہیں رہی نکاح کی، ان پر گناہ نہیں کہ وہ اتاریں اپنے کپڑے (یعنی پردہ) بشرطیکہ اپنی زیب وزینت ظاہر کرنے والی نہ ہوں۔ تو وہ ہم سے دریافت کرتی تھیں کہ اس آیت کے بعد کیا فرمایا گیا ہے؟ اور جواب میں ہم یہ آیت سنایا کرتے تھے۔

(ترجمہ) اور اگر وہ اس سے بچیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ اس پر کہتی تھیں کہ چادر اوڑھ لینے میں یہی بات ہے۔ (طبقات ابن سعد صفحہ 325 جلد 7)

مغرب اقصیٰ کی مسجد الاندلس کو مریم بنت محمد بن عبداللہ اخذیہ نے تعمیر کیا تھا۔ جس میں طیب بن کیران کی صاحب زادی مشتغل طور پر مختلف علوم وفنون کا درس پردہ کے پیچھے دیا کرتی تھیں اور اس میں باری باری مرد اور عورتیں سب ہی شامل ہوتے تھے۔ راوی کا بیان ہے:

(ترجمہ) وہ مسجد الاندلس میں منطق کا درس پردے کے پیچھے سے دیا کرتی تھیں۔ وہ مختلف علوم کی جامع تھیں۔ ان کے درس میں عورتیں عصر کے بعد اور مرد ظہر کے بعد حاضر ہوتے تھے۔

بعض عالمات اور فاضلات شرعی احکام سے فائدہ اٹھا کر شرعی حدود کے ساتھ بے نقاب بھی علماء وفضلاء کے سامنے آتی تھیں اور ان سے علمی ودینی موضوعات پر گفتگو کرتی تھیں۔ چنانچہ عطیہ بنت حسان بصریہ بنوشیبان کی مولاۃ یعنی باندی تھیں۔ وہ علم وفضل میں اتنا بلند مقام رکھتی تھیں کہ بصرہ کے علماء ومشائخ اور فقہاء ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ کھل کر ان سے بات چیت کرتی تھیں۔ طبقات ابن سعد میں ہے:-

(ترجمہ) علیہ بنت حسان بڑی شان وشوکت کی عقل مند اور نمایاں حیثیت کی عورت تھیں۔ بصرہ کے محلہ عوقہ میں ان کا مکان ان ہی کے نام سے مشہور تھا۔ حضرت مری اور بصرہ کے دوسرے اعیان وفقہاء ان کے یہاں جایا کرتے تھے اور وہ ان کے سامنے آ کر گفتگو اور سوال وجواب کیا کرتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد صفحہ 365، جلد 7)

محدثات نے اپنی حدود میں رہتے ہوئے جس طرح اپنے اساتذہ شیوخ سے سماعاً اجازۃً حدیث کی روایت کی ہے، اسی طرح خود بھی ان ہی طرائق سے دوسروں کو حدیث کا درس دیا اور روایت کا جو طریقہ حسب موقع رہا اسی کے مطابق روایت کی۔ چنانچہ ائمہ حدیث اور حفاظ حدیث نے ان سے بھی سماعاً قراۃً اور اجازتاً استفادہ کیا۔

سماع یعنی استاذ اپنے شاگرد کو احادیث سنائے اور شاگرد سنے۔ بنات اسلام نے یہ طریقہ اپنے عزیز واقارب اور خاندان والوں کو درس حدیث دیتے ہوئے اختیار کیا ہے۔

قراۃ یعنی شاگرد اپنے استاد کے سامنے حدیث پڑھے، استاد کے ساتھ طلبہ کی جماعت بھی سنے۔ ایسی صورت میں گویا پوری جماعت استاد کے سامنے پڑھ رہی ہے اور وہ سن رہا ہے اس طریقہ کو قرۃ علی الشیخ کہتے ہیں

اورعرض بھی کہتے ہیں۔ عام طور سے محدثات وشیخات نے اپنے تلامذہ کو اسی طریقہ سے حدیث کا درس دیا ہے۔ وہ پس پردہ ہوتی تھیں اوران کا کوئی رشتہ دار یا محرم قرات کرتا تھا جسے وہ طلبہ کی جماعت سنتی تھی۔

اجازۃ یعنی استاد اپنی روایت کردہ احادیث کو اپنے شاگردوں کو یہ کہہ کردے کہ تم کو میری طرف سے ان کی روایت کی اجازت ہے۔ اس طریقہ سے بہت سے محدثین نے محدثات کو بہت سی محدثات نے محدثین کو اجازت دی ہے۔ امام ابوالقاسم سہمی جرجانی نے ہبۃ العزیز بنت احمد جرجانیہ سے روایت کرنے کی کیفیت یوں بیان کی ہے۔

(ترجمہ) ام الفضل ہبۃ العزیز بنت احمد نے ہم سے یوں حدیث بیان کی کہ ان کے بھائی ابوذر ان کے سامنے پڑھ رہے تھے۔ (تاریخ جرجان صفحہ نمبر 463)

ام محمد فاطمہ بنت عبدالرحمٰن بغدادیہ سے عبدالرحمٰن بن قاسم حدیث کا سماع کررہے تھے اوران کے لڑکے احمد اپنے والد کے ساتھ اس سماع میں شریک تھے۔ (تاریخ بغداد صفحہ 441 جلد 14)

امام ابن جوزی نے فاطمہ بنت حسین رازیہ سے اپنے سماع کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

(ترجمہ) میں نے فاطمہ سے حدیث کا سماع اپنے استاد ابوالفضل بن ناصر کی قرابت سے کیا ہے (المنتظم صفحہ نمبر 8 جلد نمبر 10)

امام تقی الدین فاسی مکی صاحبِ العقد الثمین نے زینب بنت قاضی مکہ کمال الدین سے مقام بدر میں حدیث کا سماع کیا تھا۔ ان کا بیان ہے:۔

(ترجمہ) زینب نے مقام بدر میں اپنے شوہر قاضی جمال الدین بن ظہیرہ کی موجودگی میں ہم سے کچھ حدیثوں کی روایت کی۔ (العقد الثمین صفحہ 233 جلد 8)

فاطمہ بنت نفیس الدین محمد بھنیہ کلیہ نے کتاب ابن ابی الدنیا کی روایت کی اس کی کیفیت امام تقی الدین فاسی مکی نے اس طرح بیان کی کہ صدرالدین احمد بن بہاء الدین دمشقی نے اس کی قرأت کی اوراس مجلس میں فاطمہ کے صاحبزادے شیخنا محمد بن عبدالمالک مرجانی اور شیخنا ابن سکر نے صدرالدین مذکورہ کے ساتھ اس کا سماع کیا۔ (العقد الثمین 290 جلد 8)

ام عبدالکریم فاطمہ بنت نورالدین محمد طبریہ مکیہ سے شریف ابوالخیر بن ابوعبداللہ فاسی اوران کے بھائی شریف ابوالمکارم نے حدیث کا سماع کیا اورابن قطیر نے قرأت کی (العقد الثمین 291 جلد 8)

محدثات وشیخات کی درس گاہوں میں طلبہ حدیث کا ہجوم

ان محدثات وشیخات سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے لئے دور دراز ملکوں سے طلبہ حدیث جوق در جوق حاضر ہوتے تھے اوران سے روایات کو اپنے مفاخر ومحاسن میں شمار کرتے تھے۔

ام محمد بن زینب بنت احمد بن عمر مقدسیہ نوے سال کی عمر تک حدیث کا درس دیتی رہیں۔ اور مختلف ملکوں کے طلبہ حدیث ان درس گاہوں میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوئے۔ انہوں نے خود بھی مختلف شہروں میں گھوم گھوم کر درس دیا۔ امام ذہبی نے ان کے حال میں لکھا ہے:۔

(ترجمہ) طلبہ نے ان کے یہاں کا سفر کیا اور خود انہوں نے مصر اور مدینہ۔ ام احمد زینب بنت مکی حرانیہ نے چورانوے سال کی عمر تک حدیث کا درس دیا۔ اس دور میں بھی ان کی درس گاہ میں طلبہ کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ ذہبی نے لکھا ہے۔

(ترجمہ) ان کے یہاں طلبہ کی بھیڑ رہا کرتی تھی۔ (العبر صفحہ 358 جلد 5)

ام عبداللہ زینب بنت کمال الدین احمد بن عبدالرحیم مقدسیہ مسندۃ الشام ہیں ان کی پوری زندگی احادیث کی روایت اور کتب حدیث کی تعلیم میں گزری، ان کی درس گاہ میں طلبہ کی بڑی کثرت رہا کرتی تھی۔ امام ذہبی نے لکھا ہے:

(ترجمہ) ان کے یہاں طلبہ کی کثرت رہا کرتی تھی۔ وہ بہت سی احادیث کی روایت میں منفرد تھیں اور انہوں نے حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کا درس دیا۔ العبر صفحہ 213 جلد نمبر 5)

فخر النساء شہدہ بنت احمد بن عمر بغدادیہ تقریباً سو سال کی عمر میں فوت ہوئیں ان کو سماع عالی کا شرف حاصل تھا۔ اس لئے بڑے بڑے آئمہ حدیث ان کی درس گاہ میں آ کر سماع کرتے تھے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے:

(ترجمہ) ان کو سماع عالی حاصل تھا اس سے انہوں نے خلف کو سلف سے ملا دیا۔ یعنی ان کو آئمہ حدیث سے سماع حاصل تھا اور ان کے تلامذہ ان سے سماع حاصل کر کے ان آئمہ حدیث کے سلسلہ تلمذ میں داخل ہوئے۔ (دنیات الاعیان)

امام ابن جوزی نے ان کے بارے میں تصریح کی ہے:

وہ بڑی نیک اور صالحہ تھیں ان سے برسوں حدیث کا درس لیا گیا۔ تقریباً سو سال کی عمر پائی۔ (المنتظم صفحہ نمبر 228 جلد نمبر 1)

کریمہ بنت اور مروزیہ کشمیہنیہ علم حدیث میں بڑے مرتبے کی مالک تھیں۔ صحیح بخاری کی روایت میں ان کو خاص فضیلت حاصل تھی اس زمانہ کے اعیان و مشاہیر ان سے شرف تلمذ حاصل کرتے تھے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے۔

(ترجمہ) ان سے خطیب بغدادی ابن مطلب سمانی، ابو طالب زینبی جیسے آئمہ حدیث نے پڑھا۔ (المنتظم صفحہ 270 جلد 8)

خطیب بغدادی نے ان سے یوں روایت کی کہ جب وہ 463ھ میں حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ گئے تو وہیں پانچ دن ان سے صحیح بخاری پڑھی۔

ام محمد زینب بنت احمد تونسیہ مکیہ، بنت المغربی کی کنیت سے مشہور تھیں ان کے بارے میں امام فاسی نے لکھا ہے:
(ترجمہ) انہوں نے حدیث کا درس دیا اور ان سے فضلاء نے سماع کیا (العقد الثمین صفحہ 226 جلد نمبر 8)
مسندہٗ مکہ فاطمہ بنت احمد مکہ مکرمہ میں حدیث کا درس دیا کرتی تھیں جس میں اعیان محدثین ہوتے تھے۔
امام تقی الدین فاسی کا بیان ہے۔

(ترجمہ) انہوں نے حدیث کا درس دیا اور ان سے ہمارے اساتذہ وغیرہ میں سے بڑے ممتاز حضرات نے سماع کیا ہے۔ خود میں نے ان سے کتاب التقضیات کا سماع کیا ہے۔ (العقد الثمین صفحہ نمبر 296 جلد نمبر 8)
مسندۃ الشام کریمہ بنت عبدالوہاب سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے لئے طلبہ حدیث ہی نہیں۔ حفاظ حدیث اور مسندین وقت ان کی درس گاہ میں حاضر ہوتے تھے۔ چنانچہ حافظ زین العابدین محمد بن ابوبکر صولی شافعی ابیوردی نے چالیس سال کی عمر میں ان سے حدیث کا سماع کیا۔ اسی طرح امام عماد الدین مرتضیٰ مسندی دمشقی اور مسند شام امام بہاؤ الدین ابن قاسم نے ان کی خدمت میں آ کر روایت کی اجازت حاصل کی۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں وہاں کی محدثات و روایات کے ذکر میں ان سے روایت کرنے کو نہایت فخریہ انداز میں بیان کیا ہے اور بعض محدثات سے استفادہ کرنے پر افسوس ظاہر کیا ہے چنانچہ خطیب نے لکھا ہے کہ میں نے فاطمہ بنت ہلال بن احمد کرجیہ سے سماع کیا ہے وہ صادقہ تھیں۔ بغداد کے مشرقی حصے میں شنبہ بازار کے کنارے رہتی تھیں۔ ستیتہ بنت قاضی ابوالقاسم عبدالواحد بن محمد بجلیہ صادقہ فاضلہ تھیں۔ بغداد کے مشرقی علاقے میں مریم دارالخلافہ کے قریب رہتی تھیں۔ میں نے ان سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی ہے۔ خدیجہ بنت محمد بن علی الواعظؒ شاہجانیہ صالحہ اور صادقہ تھیں۔ بغداد کے محلے قطیعۃ الربیع میں رہتی تھیں۔ میں نے ان سے حدیث لکھی ہے، ام سلمہ خدیجہ بنت موسیٰ بن عبداللہ الواعظہ صالحہ فاضلہ تھیں۔ بغداد کے مقام توثہ میں رہتی تھیں۔ میں نے ان سے بھی حدیث لکھی ہے طاہرہ بنت احمد بن یوسف تنوخیہ سے میں نے قاضی ابوالقاسم تنوخی کے گھر میں سماع کیا ہے۔ طاہرہ کی مسموعات قاضی تنوخی کے پاس ان کی کتاب میں تھیں۔ ام عمر بنت ابوالفضل حسان بن زید ثقفیہ بغداد میں معاذ بن مسلم کے گھر کے پاس رہتی تھیں۔ میں نے ان سے سماع کیا ہے، نیز لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) انہوں نے ہمارے معاصرین کو حدیث کا درس دیا جیسے محمد بن صباح جرجرائی اور دواہی وغیرہ۔
بغداد کی محدثات و شیخات میں فاطمہ بنت محمد بن عبید بن شخیر صیرفیہ مشہور شیخہ حدیث تھیں۔ ابوالفتح محمد بن ابوالفوارس کے پڑوس میں قیام کرتی تھیں بہت سے محدثین نے ان سے روایت کی ہے۔ خطیب بغدادی کو ایک واسطہ سے ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اسکے باوجود براہ راست ان سے روایت نہ کرنے پر افسوس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

(ترجمہ) ان سے سماع میرے مقدر میں نہیں تھا۔ مگر ابوطاہر محمد بن احمد الشافی نے ان کی روایت مجھ سے بیان کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ بغداد جلد 14) بالترتیب `433 `446 `433 `445 `445 `446 (445

ست الوزراء بنت عمر بن اسعد تنوضیہ مسندۃ الوقت تھیں۔ ان کا حلقہ درس دمشق سے مصر تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ دونوں شہروں میں حدیث کا درس دیا کرتی تھیں، خاص طور سے صحیح بخاری اور مسند امام شافعی کے درس میں ان کو شہرت حاصل تھی۔ انہوں نے مصر و دمشق میں یہ دونوں کتابیں متعدد بار پڑھائیں۔ (ذیل العبر ذہبی صفحہ 88)

شمس الضحیٰ بنت محمد بن عبدالجلیل محدثہ، عابدہ، زاہدہ تھیں۔ ان کا باقاعدہ حلقہ درس تھا۔ جس میں طلبہ حدیث شریک ہو کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ امام تقی الدین فاسی مکی کا بیان ہے کہ:

(ترجمہ) ان سے طلبہ حدیث کی ایک جماعت نے سماع کیا ہے۔ (العقد الثمین صفحہ نمبر 257 جلد نمبر 8)

فاطمہ بنت حسین الواعظ رازیہ کے حال میں امام ابن جوزی نے لکھا ہے کہ میں نے ان سے اپنے استاد ابوالفضل بن ناصر کی قربت کے ذریعے ابراہیم حربی کی کتاب ذم الغیبۃ، ابن سمون کی کتاب المجالس اور امام شافعی کی مسند کا سماع کیا ہے۔ (المنتظم صفحہ 8 جلد نمبر 10)

امام ذہبی نے ام محمد شہدہ بنت کمال الدین کے تذکرہ میں ان سے اپنے سماع کی تصریح کی ہے۔ محدث ابن نقطہ کا بیان ہے کہ میں نے عائشہ بنت معمر اصفہانیہ سے مسند ابی یعلی کا سماع کیا ہے اور عائشہ نے اس کا سماع امام سیرفی سے کیا ہے امام تقی الدین فاسی مکی کا بیان ہے کہ ام محمد علی بنت ابوالیمن محمد نے اپنی پھوپھی ام الحسن فاطمہ بنت احمد بن رضی الدین سے حدیث مسلسل بالاولیۃ کا اور اپنے نانا شیخ رضی الدین طبری سے تساعیات رازی کا سماع کیا تھا۔ اور میں نے علماء بنت احمد سے ان دونوں کا سماع کیا ہے اور مسند مکہ فاطمہ بنت احمد بن قاسم سے ہمارے شیوخ نے سماع کیا تھا اور میں نے ان سے ثقفیات کا سماع مدینہ منورہ میں کیا جب کہ وہاں مقیم تھیں۔ (العقد الثمین صفحہ نمبر 281 تا 296۔ جلد نمبر 8)

امام احمد بن علی صالح حنفی متوفی 765ھ نے زینب بنت معلم سے سماع کیا۔ ست الوزراء سے صحیح بخاری پڑھی۔ (طبقات السنیۃ فی تراجم الحنیفہ صفحہ 461 جلد نمبر 1) ابوالعباس احمد بن علی قرشی بکری، کرفری ذہبی، ابن جزری کی طرح فاطمہ بنت ابراہیم مقدسیہ نے بھی حدیث کی اجازت دی تھی۔ (طبقات رسنیۃ فی تراجم الحنیفہ صفحہ 470 جلد نمبر 1)

اجازۃ بالراویۃ معلوم ہو چکا ہے کہ بہت سے شیوخ حدیث نے عورتوں کو اپنی طرف سے روایت کی اجازت دے کر ان کو اپنے علماء تلمذ میں شامل کیا ہے۔ اسی طرح بہت سی شیخات حدیث نے مردوں کو اپنی طرف سے روایت کی اجازت دی ہے اور محدثین نے اس شرف و فضیلت پر فخر کیا ہے۔ دو ایک مثالیں اس کی بھی

ہوں۔

امام تقی الدین فاسی مکی نے لکھا ہے کہ ام محمد سیدہ بنت شیخ رضی الدین نے ہمارے شیخ حافظ زین الدین، عبدالرحیم عراقی کو روایت کی اجازت دی ہے اور ام محمد عائشہ بنت ابراہیم (دمشقیہ) نے امام برہان الدین ابراہیم بن احمد شامی کو اجازت دی ہے۔ (العقد الثمین صفحہ 353 جلد نمبر 8)

ابن خلکان نے ام المویدزینب حرہ سے اجازت پانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

(ترجمہ) ام المویدزینب سے ہم کو اجازت حاصل ہے جسے انہوں نے 616ھ کسی مہینہ میں لکھا تھا۔ (ابن خلکان صفحہ 216 جلد نمبر 1)

اجازت بالروایۃ کا طریقہ محدثین میں بہت عام تھا۔ بلکہ آج بھی اطراف پڑھ کر مختلف کتب حدیث کی سند و اجازت دی جاتی ہے۔

مختلف شہروں میں درس حدیث

عام طور سے محدثات وشیخات کی مجلس درس ان کے مکان میں منعقد ہوتی تھی اور طلبہ حدیث وہیں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ ان کے مکان جیسا کہ خطیب بغدادی نے ان سے روایت کے سلسلہ میں ان کی قیام گاہوں کی نشاندہی کی ہے۔ مگر ان میں کئی عالمات و فاضلات نے مختلف شہروں میں بھی درس دیا ہے اور دینی علوم کو چلتے پھرتے عام کیا ہے۔ خلدیہ بنت جعفر بن محمد، بغداد کی باشندہ تھیں۔ ایک مرتبہ وہ بلاد عجم کے سفر میں نکلیں تو مقام دینور میں ان سے خطیب ابوالفتح منصور بن ربیعہ زہری نے حدیث کی روایت کی۔ (تاریخ بغداد صفحہ 444 جلد نمبر 14)

مسندۃ الوقت ست الوزراء بنت عمر تنوخیہ نے متعدد بار مصر اور دمشق میں صحیح بخاری اور مسند شافعی کا درس دیا۔ زینب بنت احمد مقدسیہ نے مصر اور مدینہ منورہ میں تعلیم دی۔ آمنہ بنت عنان نے بغداد اور موصل میں مجلس درس منعقد کر کے حدیث کی روایت کی۔ تقی الدین فاسی نے زینب بنت قاضی مکہ سے مقام بدر میں سماع کیا۔

باہمی سماع وروایت: گزر چکا ہے کہ صدر اول میں جب احادیث کی روایت وتدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو خواتین نے ایک دوسرے سے روایت کی۔ پھر ان کی احادیث مردوں تک پہنچیں۔ یہ سلسلہ بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا۔ اور شیخات ومحدثات نے اپنی ہم جنسوں میں دینی تعلیم پھیلائی اور ان کو درس حدیث دیا۔

چنانچہ ام سلیمان ابیہ بنت نافع جو حضرت مصعب بن زبیر کی صاحبزادی سکینہ کی باندی ہیں۔ ان سے عمر بن مصعب بن زبیر کی صاحب زادی فاطمہ کی باندی طیب نے روایت کی۔

منیہ بنت عبید بن ابو برزہ نے اپنی دادی سے اور ان سے ام الاسود نے روایت کی۔

ام نضرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور ان سے تحیہ راسبیہ بصریہ نے روایت کی اور ام البنین بنت صعب منقت اپنے والد سے اور ان سے سلامہ بنت عمر وقیسیہ نے روایت کی۔ ام البنین بنت عیاض اسلمیہ سے

ان کی بہن قسمیہ بنت عیاض نے روایت کی۔

ام یحیٰ حیشہ بنت عبدالجبار بن وائل سے میمونہ بنت حجر بن عبدالجبار بن وائل نے روایت کی۔ یعنی بھتیجی نے پھوپھی کی روایت کو، رفیعہ بنت وزر نے ابن شہاب اور ام ازعر سے اور ان سے ان کی پھوپھی کریمہ بنت عاطف بلویہ نے روایت کی۔ سدرہ مولاۃ ابن عامر نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اور ان سے احمد بن حارث بن واقد غسانی کی والدہ ام الازہر بنت عمر غسانیہ نے روایت کی (الاکمال جلد اول، دوئم اور چہارم کے مختلف مقامات سے یہ واقعات لئے گئے)

مسندہ الشام زینب بنت کمال الدین احمد مقدسیہ کو عجیبہ باقدازیہ نے اپنی مرویات کی اجازت دی۔ فاطمہ بنت سلیمان انصاریہ نے کریمہ بنت احمد مروزیہ سے اجازت کا سماع کیا۔ عائشہ بنت معمر اصفہانیہ نے فاطمہ جوزوانیہ کی مجلس درس میں حاضر ہوکر ان سے روایت کی۔ شیخہ معمرہ زینب بنت مکی نے ست الکعبہ سے سماع کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی پوتی شہزادی فاطمہ بنت الملک المحسن احمد نے بھی ست الکعبہ سے حدیث کا سماع کیا۔ فاطمہ بنت احمد سامریہ بغدادیہ نے حواریہ بنت عیسیٰ خزاز سے روایت کی۔

علم حدیث میں تصانیف

بنات اسلام نے علم حدیث کی اشاعت میں صرف درس و تدریس اور روایت ہی سے کام نہیں لیا بلکہ محدثین کی طرح انہوں نے بھی اس فن میں مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ اور اسلامی کتب خانوں میں اپنی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا۔ اپنی مرویات کو کتابی شکل میں مدون کیا۔ فن رجال میں کتابیں لکھیں، کتب احادیث کو نقل کیا۔ ان میں سے بہت سی عالمات کتابوں کے ضبط و مقابلہ اور تصحیح میں خاص ملکہ اور شہرت رکھتی تھیں۔ امام ذہبی نے عجیبہ بنت حافظ محمد بن ابو غالب باقدریہ بغدادیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ حدیث کے کمالات دس جلدوں میں لکھے تھے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے:

(ترجمہ) شیوخ و اساتذہ کے تذکرہ میں ان کی ایک کتاب دس جلدوں میں ہے۔ (العبر صفحہ 194 جلد 5)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عجیبہ باقداریہ کے شیوخ کی تعداد کس قدر زیادہ تھی۔

ام محمد فاطمہ خاتون بنت محمد خطیہ اصفہانیہ کو تصنیف و تالیف میں بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ انہوں نے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں لکھی تھیں جن میں الرموز من الکنوز، پانچ جلدوں میں تھی۔ امام فاسی نے تصریح کی ہے:

(ترجمہ) وعظ گوئی میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے اچھی اچھی کتابیں لکھیں جیسے ان کی کتاب الرموز من الکنوز تقریباً پانچ جلدوں میں ہے۔ (العقد الثمین صفحہ 202 جلد نمبر 8)

ام محمد بنت فاطمہ بنت نفیس الدین محمد بہنسیہ مکیہ نے حدیث اور دوسرے علوم میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ فاسی نے لکھا ہے: (ترجمہ) علم حدیث اور دوسرے علوم میں انہوں نے اپنے قلم سے بہت کچھ لکھا ہے۔ (العقد

الثمین صفحہ 273 جلد نمبر 8)

خدیجہ بنت محمد شاہجانیہ بغدادیہ نے اپنے استاد حدیث ابن میمون کی جملہ مرویاواحادیث کوایک الگ کتاب میں جمع کیا تھا۔ (العمر صفحہ 246 جلد نمبر 3)

ام محمد شھدہ بنت کمال الدین عمر کو بہت سی حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ انہوں نے بہت سی احادیث کتابی شکل میں یکجا کرلی تھیں (ذیل العمر ذہبی صفحہ 49)

کریمہ بنت احمد مروزیہ کواپنی کتابوں کوضبط ومقابلہ کے ذریعہ درست کرنے اور اپنے نسخوں کومقابلہ کرکے تصیح کرنے میں بڑااچھا سلیقہ تھا۔ وہ بڑی سمجھ بوجھ کی محدثہ تھیں (ذیل العمر ذہبی صفحہ نمبر 854 جلد نمبر 3)

خدیجہ بنت شیخ شہاب الدین مکیہ اوران کے معاصر علماء وفضلاء میں خط وکتابت کے ذریعہ دینی اموراور علمی مسائل میں بحث وتحقیق جاری رہا کرتی تھی۔ وہ اس سلسلہ میں چھوٹے بڑے رسائل لکھا کرتی تھیں۔

عائشہ بنت عمارہ بن یحیٰ افریقہ کے شہر بجایہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کا خط نہایت پاکیزہ اور خوبصورت تھا۔ انہوں نے ایک کتاب اپنے ہاتھ سے نقل کی تھی جواٹھارہ جلدوں میں تھی عنبرینی کا بیان ہے:۔

(ترجمہ) ان کا خط بہت عمدہ تھا میں نے ثعلبی کی ایک کتاب ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہے جواٹھارہ جلدوں میں ہے۔ (عنوان الدرایہ فی من کان من العلماء فی الماتہ التابعہ بجایہ صفحہ 47-48)

ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے، کہ عالمات وفاضلات نے تصنیف وتالیف اور کتابت وتحریر کے شعبہ میں بھی اپنی اچھی یادگار چھوڑی ہے۔ افسوس ہے کہ بعد میں ان کی تصانیف سے اعتنا نہیں کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کی کوئی کتاب آج ہمارے سامنے نہیں ہے۔

محدثات کی کتب ومرویات پر تخریج

محدثات کی کتابوں اوران کی مرویات کی قبولیت واہمیت کے پیش نظر بہت سے علماء ومحدثین نے ان پر تخریج لکھی اوران کواصل قرار دے کر مرویات کوان سے ملایا۔

اللہ تعالیٰ نے بنات اسلام کو یہ شرف بھی عطاء فرمایا ہے کہ ان کی کتابوں اور مرویات پران کے تلامذہ یا بعد کے علماء نے تخریج کی ہے۔ امام فاسی نے ام الفضل خدیجہ بنت تقی الدین علی بن ابوبکر بحسریہ مکیہ کے حال میں لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) ان کی احادیث پر تخریج کی گئی اورانہوں نے حدیث کادرس دیا۔ (العقد الثمین صفحہ 23 جلد 8)

اسی طرح ام احمد رسیہ بنت احمد بن ابوبکر محمد طبریہ مکیہ کے بارے میں بیان کیا ہے:

(ترجمہ) ان کی احادیث پر بھی تخریج کی گئی اور انہوں نے بھی حدیث کا درس دیا۔ (العقد الثمین صفحہ 221 جلد نمبر 8)

افسوس کہ آج نہ محدثات کی کتابوں کا پتہ ہے نہ ان کی کتابوں پر تخریج کی گئی کتابوں کا پتہ ہے۔

فقہ وفتویٰ

ان محدثات وعالمات میں بہت سی فقہیات ومفتیات بھی گزری ہیں۔ جنہوں نے کتاب وسنت کے ساتھ فقہ وفتویٰ میں کمال حاصل کیا ہے اور فقیہہ اور مفتیہ کی حیثیت سے شہرت پائی ہے اور مسلمانوں نے ان کے تفقہ وافتاء پر کامل اعتماد کے ساتھ عمل کیا ہے۔ امام ابن قیم کی تصریح کے مطابق تقریباً بائیس صحابیات فقہ وفتویٰ میں مشہور تھیں۔ جن میں سات امہات المومنین شامل تھیں اور ان سب میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فقیہ امت کا لقب رکھتی تھیں۔ زینب بنت ابوسلمہ رضی اللہ عنہا تفقہ میں اس قدر آگے تھیں کہ مشہور تابعی ابو رافع جب بھی مدینہ منورہ کی کسی فقیہہ کو یاد کرتے تھے تو زینب بنت ابوسلمہ رضی اللہ عنہا پہلے یاد آجاتی تھیں۔

مشہور حنفی فقیہہ وعالم شیخ علاؤالدین سمرقندی متوفی 539ھ مصنف تحفۃ الفقہاء کی صاحب زادی فاطمہ فقیہہ جلیلہ تھیں۔ ان کے شوہر شیخ علاؤالدین کاسانی متوفی 587ھ نے تحفۃ الفقہا کی شرح البدائع والصنائع کے نام سے لکھی۔ فاطمہ کے بارے میں بیان کیا گیا کہ شرح لکھنے کے درمیان جب بھی ان کے شوہر سے کوئی غلطی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کو متنبہ کر کے تصحیح کرا دیتی تھیں۔ فاطمہ اپنے والد اور شوہر کے ساتھ باقاعدہ فتویٰ نویسی بھی کرتی تھیں۔ ان کے حال میں لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) فتاوے پر فاطمہ ان کے والد اور ان کے شوہر، تینوں کے دستخط ہوا کرتے تھے۔

قاضی ابوعبداللہ حسین بن اسماعیل محاملی کی صاحب زادی امۃ الواحد ستینہ نے اپنے والد اور اسماعیل بن عباس وراق عبا الغافرین سلامہ جمعی، ابوالحسن مصری، حمزہ ہاشمی وغیرہ سے حدیث کا سماع کیا تھا۔ نہایت ہی فاضلہ اور صالحہ عورت تھیں۔ فرائض، حساب، نحو اور دیگر علوم وفنون میں مہارت رکھتی تھیں اور خاص بات یہ تھیں کہ:

(ترجمہ) انہوں نے قرآن اور فقہ کو زبانی یاد کیا تھا اور فقہ شافعی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ شیخ ابوعلی بن ابوہریز کے ساتھ فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ (العبر صفحہ 4 جلد نمبر 3، المنتظم صفحہ 139 جلد 6 صفۃ الصفوہ صفحہ 297، جلد 2)

ابن جوزی نے بنت المحاملی کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

(ترجمہ) وہ نہایت فاضلہ اور مذہب شافعی کی فقہ کی سب سے بڑی حافظ تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں بنت المحاملی سے زیادہ فقہ شافعی کا جاننے والا دوسرا کوئی نہیں تھا۔ اسی لئے وہ امام ابوعلی بن ابوہریرہ کے ساتھ فتویٰ دیا کرتی تھیں۔

فقیہہ مفتیہ ام ہانی، عیوسیہ، ان کی بہن فاطمہ اور شیخ زورق کی دادی فقیہ ام البنین، یہ تینوں فقیہات ومفتیہات مغرب اقصیٰ میں فقہ وفتویٰ میں خاص شہرت کی حامل تھیں۔

ام عیسیٰ بنت ابراہیم بن اسحاق بغداد یہ بھی بغداد میں مفتیہ تھیں خطیب نے لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) ان کے بارے میں مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ عالمہ اور فاضلہ تھیں اور فقہی مسائل میں فتویٰ دیا کرتی تھیں۔

ابن جوزی نے ام عیسیٰ کے فتویٰ دینے کی تصریح تقریباً ان ہی الفاظ میں کی ہے۔ (تاریخ بغداد صفحہ نمبر 442 جلد نمبر 14، المنتظم 315 جلد 6)

شیخ تقی الدین ابراہیم بن علی واسطی کی صاحبزادی امتہ الرحمٰن تفقہ اور فتویٰ میں خاص ملکہ اور شہرت رکھتی تھیں۔ (ذیل العبر حسینی صفحہ 287) ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ شیخہ، عالمہ، فقیہہ، زاہدہ، قانتہ اور خواتین زمانہ کی سیدہ تھیں (ذیل العبر ذہبی صفحہ 80)

فقیہہ یوسف بن یحییٰ اندلسی کی بہن فاطمہ بنت یحییٰ اندلسیہ قرطبیہ عالمہ فاضلہ اور پرہیزگار ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہہ بھی تھیں اور بھائی کی طرح بہن بھی اس فن میں شہرت رکھتی تھی۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے جنازہ میں جس قدر زیادہ مسلمان شریک ہوئے اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی (بغیۃ الملتمس صفحہ 531) اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امام ابوبکر محمد بن علی اندلسی متوفی 703ھ صبح سے زوال تک مسجد میں بیٹھ کر قرآن اور دیگر علوم شرعیہ کے ساتھ ساتھ عورتوں کو فتویٰ بتایا کرتے تھے اور وہ مسجد میں آ کر فتویٰ معلوم کیا کرتی تھیں، (بلقات المفسرین صفحہ 109، جلد 2)

حفظ قرآن، تجوید اور تفسیر

ان محدثات و عالمات میں بہت سی حافظات، قاریات، مقریات اور مفسرات تھیں جنھوں نے حدیث کی طرح قرآن کی خدمت میں بہترین کارنامے انجام دیئے ہیں۔ حفصہ بنت سیرین نے بارہ برس کی عمر میں قرآن کریم کو مع اس کے معنی و مطالب کے حفظ کر لیا تھا۔ (تہذیب التہذیب صفحہ 409 جلد نمبر 11) فن تجوید اور قرات میں بھی وہ مہارت رکھتی تھیں۔ ہشام راوی کا بیان ہے جب کبھی ان کے بھائی محمد بن سیرن کو قرات کے بارے میں کوئی شبہ پڑ جاتا تو اپنے شاگردوں سے کہتے جاؤ حفصہ سے پوچھو کہ وہ اسے کس طرح پڑھتی ہیں۔ حفصہؓ ہر روز نصف قرآن پڑھا کرتی تھیں (صفتہ الصفوۃ صفحہ 16، جلد نمبر 4)

فاطمہ نیشاپوریہ مشہور مفسرہ تھیں اور فہم القرآن میں کلام کرتی تھیں۔ ابن ملوک نامی ایک بزرگ کا بیان ہے کہ میں نے اس سے زیادہ بزرگ عورت کبھی نہیں دیکھی۔ ایک دن میں نے ان کی علمیت پر تعجب کرتے ہوئے حضرت ذوالنون مصری سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے ایک ولیہ ہے اور میری استاد ہے۔ (صفتہ الصفوۃ صفحہ 16 جلد نمبر 4)

امتہ الواحد بنت المحاملی عالمہ، فاضلہ اور فقیہہ و مفتیہ کے ساتھ حافظ قرآن بھی تھیں۔

امام ضیاء الدین مقدسی کی بہن آسیہ اپنے زمانے کی بے مثل عابدہ، زاہدہ اور حافظ قرآن تھیں، اسی طرح ان

کی زوجہ آسیہ بنت محمد بن خلف مقدسیہ قرآن کی بہترین عالمہ اور علوم قرآنی کی مہارت میں شہرت رکھتی تھیں۔ فن تجوید وقرات سے خاص شغف تھا۔ (حاشیہ الاکمال صفحہ 92۔ جلد 1)

امام زین الدین ابوالحسن علی بن ابراہیم قاری دمشقی مصری متوفی رمضان 599ھ زبردست فقیہ، واعظ اور مفسر قرآن تھے اور یہ تمام فضائل ان کی والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ تھے جو خود بھی نہایت نیک، حافظہ قرآن اور مفسرہ تھیں۔ ناصح الدین راوی کا بیان ہے کہ:

(ترجمہ) زین الدین اپنی ماں کی دعاء سے اس مرتبہ کو پہنچے وہ بہت نیک، حافظہ قرآن اور تفسیر جانتی تھیں۔

امام زین الدین کا بیان ہے کہ جب میں اپنے ماموں امام شرف الاسلام عبدالوہاب سے تفسیر پڑھ کر والدہ کے پاس جاتا تو وہ مجھ سے دریافت کرتیں کہ ایش فسر الیوم بھائی نے آج کیا تفسیر بیان کی۔ جب میں بتاتا کہ فلاں فلاں سورتوں کی تفسیر بیان کی ہے تو فرماتیں کہ کیا فلاں کا قول نقل کیا؟ کیا فلاں بات بیان کی؟ جب میں کہتا کہ نہیں، تو ان کو بیان کر کے کہتی تھیں کہ انہوں نے یہ چھوڑ دیا ہے ان کا یہ حال تھا کہ:

(ترجمہ) وہ اپنے والد کی لکھی ہوئی تفسیر کتاب الجواہر کو جو تیس جلدوں میں تھی زبانی یاد رکھتی تھیں اور چالیس سال تک مصلی پر بیٹھ کر عبادت کرتی رہیں۔ (طبقات الحنابلہ صفحہ نمبر 440، جلد 1)

طبقات المفسرین میں اس واقعہ کو یوں لکھا ہے کہ شیخ الاسلام امام ابوالفرج عبدالواحد بن محمد شیرازی مقدسی متوفی 486ھ نے کتاب الجواہر کے نام سے تیس جلدوں میں قرآن کی تفسیر لکھی اور یہ پوری کتاب ان کی صاحب زادی کو یاد تھی۔ (طبقات المفسرین جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 262)

امام ابومحمد سراج الدین عبدالرحمٰن بن عمر دانی حنبلی متوفی جمادی الاول 243ھ کی اولاد میں ایک نابینا صاحب زادی تھیں جو اپنے زمانہ میں قوت حافظہ میں عجوبہ شمار کی جاتی تھیں۔ طبقات الحنابلہ میں ہے کہ:

(ترجمہ) ابومحمد حران کی ایک لڑکی نابینا تھی اس کے حافظ کا یہ حال تھا کہ صحاح ستہ کی حدیث کے بارے میں پوچھا جاتا تو فوراً بتادیتی تھیں۔ قوت حافظہ میں وہ عجوبہ تھیں۔ (طبقات الحنابلہ)

میمونہ بنت ابوجعفر مدنیہ، مشہور قاریہ مجودہ تھیں اور انہوں نے یہ فن اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔

امام القراء ابن جزری نے اپنی صاحب زادی سلمیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے قرات سبعہ میں قرآن مجید حفظ کر کے سنایا تھا اور قرات عشرہ کی تعلیم بھی ان کے اصول کے مطابق حاصل کی تھی۔ وہ فن تجوید میں اس قدر آگے تھیں کہ اس زمانہ میں کوئی قاری و مجود ان کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔

ابن تغری بردی نے النجوم الزاہرہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کی زوجہ زبیدہ کی محل سرا میں ایک ہزار باندیاں قرآن پڑھا کرتی تھیں اور ان کی آواز شہد کی مکھیوں کی مانند سنائی دیتی تھی۔ بنات اسلام نے قرآن کی خدمات اس کی کتابت کر کے بھی کی ہے۔ ابن فیاض نے اخبار قرطبہ میں لکھا ہے کہ شہر قرطبہ کے مشرقی علاقہ میں

ایک سو ستر عورتیں خط کوفی میں قرآن کریم لکھتی تھیں اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پورے شہر قرطبہ کی عورتوں میں قرآن کریم کی کتابت کا کتنا ذوق رہا ہوگا۔ ہمارے ملک کے بادشاہ شاہجہاں کی پوتی شہزادی شاد خانم نے خط ریحان میں کمال متانت سے ایک قرآن کریم لکھا تھا۔ جس کے آخر میں خط رقاع میں اپنا نام نسب تحریر کیا تھا۔

وعظ وتذکیر

پردہ نشینان علم وفضل نے وعظ وتذکیر اور خطابت کے ذریعہ خواتین اسلام کے ایمان وعمل کو تازگی بخشی اور رونق بخشی ہے اور ان کے ذریعہ مسلم خانوادوں اور کنبوں کی بڑی اصلاح ہوئی ہے۔ ان محدثات وفقہیات اور عالمات میں بڑے آن وبان کی واعظ اور خطیبہ گزری ہیں جن کی ذات سے عام عورتوں کو بہت زیادہ فیض پہنچا ہے۔ وہ عورتوں کے مخصوص اجتماعات میں جا کر وعظ سناتی تھیں اور ان کے یہاں عورتیں آ کر وعظ سنتی تھیں۔ اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صنف نازک میں ادا ہوا ہے۔ امام حسن بصری کی والدہ ماجدہ خیرہ عورتوں کے مجمع میں وعظ سنایا کرتی تھیں۔ حضرت اسامہ بن زید کا بیان ہے:

(ترجمہ) میں نے حسن بصری کی والدہ کو دیکھا ہے کہ وہ عورتوں میں وعظ کہتی تھیں۔ (طبقات ابن اسعد صفحہ 376، جلد نمبر 8)

معاذۃ بنت عبداللہ مشہور تابعی حضرت صلہ بن اشیم کی زوجہ بڑی عالمہ فاضلہ اور عابدہ، زاہدہ خاتون تھیں۔ وہ عورتوں کے مجمع میں صدر نشین ہو کر ان کو وعظ سنایا کرتی تھیں۔ جعفر بن کیسان کا بیان ہے:-

(ترجمہ) میں نے معاذۃ کو دیکھا ہے کہ وہ بیٹھی وعظ سناتی ہیں اور ان کے گرد عورتوں کا حلقہ ہے۔ (طبقات ابن سعد صفحہ 483 جلد 8)

ام الحکم عائشہ بنت محمد بغدادیہ "الواعظہ" کے لقب سے مشہور تھیں اور عورتوں میں وعظ کہتی تھیں۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ:

وہ نہایت بزرگ تھیں۔ عورتوں کو وعظ سنایا کرتی تھیں۔ (العبر صفحہ نمبر 168 جلد نمبر 5)

ام احمد زلیخا بنت الیاس غزنویہ بھی "الواعظہ" کے لقب سے مشہور ہیں خرقہ پوش، عابدہ، زاہدہ خاتون تھیں۔ گھروں میں جا کر عورتوں کو وعظ سناتی تھیں۔ امام فاسی کا بیان ہے:

(ترجمہ) وہ وعظ کہتی تھیں اور خرقہ پہن کر عورتوں کے حجروں میں جاتی تھیں۔ (العقد الثمین صفحہ نمبر 238 جلد نمبر 8)

اس سلسلہ میں شیخہ، عالمہ، محدثہ، زاہدہ ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ کی خدمات بہت اہم ہیں۔ ان کے وعظ وتذکیر سے صرف بغداد ہی کی خواتین ہی نہیں بلکہ دمشق اور مصر کی عورتوں نے بھی ان سے بڑا فیض پایا۔ جس کی وجہ سے وہ "سیدہ خواتین دوراں" کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ امام ذہبی نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ ان

کی ذات سے عورتوں کی بڑی تعداد نے نفع پایا اور گناہوں سے توبہ کی، وہ زبردست عالمہ، قانعہ اور تعلیم وتذکیر کے ذریعہ نفع رسانی کی حریص تھیں۔ ان میں اخلاص اور خوف خدا بہت زیادہ تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دیتی تھیں۔ ان کے ذریعہ دمشق اور مصر کی عورتوں کی بڑی اصلاح ہوئی۔ عوام وخواص کے دلوں میں ان کے لئے حد سے زیادہ احترام تھا۔ اور وہ لوگوں میں مقبول تھیں۔ (ذیل العبر ذہبی صفحہ **80**)

خیرونہ فاسیہ" کے تذکرہ نگاروں نے ان کی دینی خدمات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) یعنی شہر فاس کی عورتوں میں اشعری عقائد کے پھیلانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

اور وہ اس بارے میں مغرب میں خاص شہرت رکھتی ہیں۔ امام ابن جوزی کے صاحب زادے ابوالمحاسن یوسف بن عبدالرحمٰن سترہ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تو خلیفہ ناصر عباسی کی والدہ جہتہ نے ان کی کفالت کی اور ان کے والد امام ابن جوزی کے وعظ کی جگہ ان کو واعظ مقرر کیا جو اس کی قبر کے قریب تھی، اور شاہی خلعت اور انعام واکرام سے نوازا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ابوالمحاسن وعظ گوئی اور فقہی درس میں اپنے اقران اور معاصرین میں خاص شہرت کے مالک بن گئے۔ (طبقات المفسرین صفحہ **281**، جلد **2**)

رشد وہدایت، تصوف اور تزکیہ نفس

ان بنات اسلام میں بہت سی اللہ والیاں تھیں جن کے نفوس قدسیہ کی برکت سے خواتین اسلام میں زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت کی روح پیدا ہوئی ہے۔ ان عابدات وزاہدات وصوفیات نے اپنی ہم جنسوں میں بڑا کام کیا ہے اور ان کی رباطوں اور خانقاہوں میں بھی تزکیہ نفس، اخلاقی تربیت اور اصلاح حال کا کام ہوا ہے اور ان کے چشمہ فیض سے احسان، تصوف اور اخلاق وروحانیت کے دھارے بہے ہیں۔

ام احمد زلیخا غزنویہ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ الواعظہ کے لقب سے مشہور تھیں اور خرقہ پوشی میں زندگی بسر کی۔ وہ عورتوں کے یہاں جا جا کر وعظ وتلقین کیا کرتی تھیں۔ فاطمہ بنت حسین رازیہ بھی ''الواعظہ'' مشہور تھیں۔ ساتھ ہی متعبدہ اور صوفیہ تھیں۔ ان کے بارے میں ابن جوزی نے لکھا ہے:

(ترجمہ) ان کی خانقاہ تھی جس میں عابدوزاہد عورتیں جمع ہوا کرتی تھیں۔ (المنتظم صفحہ **7** جلد نمبر **10**)

تاج النساء بنت رستم اصفہانیہ مکہ مکرمہ میں مجاورت واقامت اختیار کر کے زہد وتصوف میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ بلکہ بقول امام تقی الدین فاسی مکی:۔

(ترجمہ) وہ مکہ مکرمہ کی صوفیہ میں سب سے آگے تھیں۔ (العقد الثمین **192**، جلد **8**)

اسی طرح مکہ کی مشہور شیخہ، عالمہ، زاہدہ، صفیہ بنت ابراہیم کے بارے میں ان کا بیان ہے:

(ترجمہ) وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں صوفیات کی شیخہ اور فقراء کی خادمہ تھیں۔ (العقد الثمین صفحہ **259** جلد **8**)

یعنی صفیہ بنت ابراہیم حرمین شریفین کی عابدات وزاہدات اور صوفیات کی مرشدہ تھیں اور ان کی اصلاح

وتربیت کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ ساتھ ہی یہاں کے مردفقراء اور عباد وزہاد کی خدمت بھی کرتی تھیں۔ زہرہ بنت محمد بن احمد کو یہاں مورخوں نے شیخہ، صالحہ، صوفیہ کے القاب سے یاد کیا ہے دمشق میں ان کے نام سے رباط الزہرہ تھی۔ وہ اسی سے متصل سکونت کرتی تھیں اور اپنی خانقاہ میں رہنے والی صوفیات وزاہدات کو تعلیم وتربیت دیتی تھیں۔

فاطمہ بنت محمد قسطلانیہ مکیہ محدثہ ہونے کے ساتھ زبردست صوفیہ بھی تھیں، انہوں نے خرقہ تصوف شیخ نجم الدین تبریزی سے پہنا تھا اور جن اعیان محدثین نے ان سے پڑھا ان کوانہوں نے خرقہ تصوف پہنایا۔ (العقد الثمین صفحہ 259، جلد 8)

فاطمہ بنت عبدالرحمٰن حرانیہ کا لقب ''صوفیہ'' ہے ان کے احسان وتصوف کے بارے میں خطیب بغدادی اور ابن جوزی کا بیان ہے کہ وہ صوفیہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ کیوں کہ صوف (اونی کمبل) ہی پہنتی تھیں اور ساٹھ سال سے زائد مدت تک اپنے مصلیٰ پر بلابستر سوئی تھیں۔ (العقد الثمین صفحہ نمبر 287 جلد نمبر 8)

امام حافظ ضیاء الدین مقدسی کی بہن اور شیخ مجد الدین عیسیٰ کی زوجہ آسیہ مقدسیہ اپنے زمانہ کی مشہور عابدات میں تھیں۔ دین ودیانت اور خیر وصلاح میں بہت آگے تھیں۔ کتاب المشتبہ میں ان کے بارے میں ہے:

(ترجمہ) وہ عابدات میں سے تھیں۔ ساتھ ہی قرآن کی حافظہ، دین ودیانت اور صلاح وتقویٰ میں مشہور اور اوراد ووظائف کی پابند اور اپنے زمانہ میں بے مثال خاتون تھیں۔

ان چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بنات اسلام کا وجود مسعود دینی علوم وفنون اور اسلامی اعمال کے ہر میدان میں نمایاں رہا ہے اور اسلامی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے خالی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ زہد وتصوف اور خانقاہی زندگی میں بھی ان کی ذات بڑی پرکشش نظر آتی ہے اور اس میں انہوں نے عورتوں کے ساتھ مردوں کی بھی خدمت کی ہے۔

شعروادب

خواتین اسلام نے ادب وعربیت اور شعروشاعری میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اور ان میں نامی گرامی شاعرات وادبیات گزری ہیں۔ جن کے سامنے اچھے اچھے شعراء وادباء سپرانداز رہے ہیں۔ مریم بنت ابویعقوب اندلسیہ اپنے دور کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ نہایت دین دار اور باکمال خاتون تھیں۔ اندلس سے حج وزیارت کا سفر کیا تھا۔ عورتوں کو شعروادب کی تعلیم دیتی تھیں۔ اشبیلیہ میں مستقل قیام تھا۔ ان کے تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) مریم صاحبہ ادیبہ شاعرہ اور صاحب حیثیت مشہور تھیں۔ عورتوں کو عربی کی تعلیم دیتی تھیں اور اپنی دین داری اور بزرگی کی وجہ سے بہت ہی معزز اور محترم مانی جاتی تھیں۔

چوتھی صدی کے بعد ان کی شاعری کو بہت شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی ان کے دو اشعار یہ ہیں۔

وما تر تجی من بنت سبعین حجة
وسبع کنسج العنکبرت المهلهل
تدب دبیب الطفل تسعی الی العصا
وتمشی بهامشی الاسیر المکبل

امیر اندلس ابن المہد نے یہ اشعار سن کر مریم کی خدمت میں دینار بھیجے۔(بغیۃ الملتمس صفحہ 528)

غسانیہ بھی اندلس کی مشہور شاعرہ تھیں۔ مقام بجایہ میں رہتی تھیں۔ سلاطین اور امراء کی مدح میں اشعار اور قصائد کہا کرتی تھیں۔ انہوں نے امیر مریہ خیران عامر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس میں درباری شاعر ابو عمر احمد بن دراج کے قصیدہ ورحیہ کا معارضہ ومقابلہ کیا تھا۔(بغیۃ الملتمس صفحہ نمبر 529)

اندلسی شاعرات میں دادی آسیہ اس فن میں شہرت رکھتی تھیں اور امراء کی شان میں اشعار کہتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے وطن آش سے اشبلیہ کا سفر کر کے امیر المومنین خلیفہ ابو یعقوب کو سر دربار اپنے اشعار سنائے۔(بغیۃ الملتمس صفحہ 530)

نزہوں نامی ایک خاتون غرناطہ کی مشہور ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ فی البدیہہ اشعار کہنے اور حاضر جوابی میں مہارت اور شہرت رکھتی تھیں۔(البغیۃ الملتمس صفحہ نمبر 530)

مستکفی باللہ محمد بن عبدالرحمٰن والی اندلس کی صاحب زادی ولادہ تھیں ان کے بارے میں ان کے تذکرہ نگار نے لکھا ہے: (ترجمہ) ''وہ ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ ان کی باتیں وزنی اور طبیعت شاعرانہ تھی۔ شعراء وادباء میں رہ کر ان سے ادبی مسائل میں سوال وجواب کرتی تھیں۔ اور سب پر بھاری تھیں۔'' صفر 484ھ میں اندلس میں فوت ہوئیں۔(بغیۃ الملتمس صفحہ نمبر 532)

مغرب اقصیٰ کی ادیبہ شاعرہ سارہ بنت احمد بن عثمان متوفیہ 750ھ شعر وادب میں اس قدر آگے تھیں کہ ابن سلمون نے ان سے ''اجازت'' حاصل ہونے پر فخر کیا اور رشید فہری اور سارہ کے درمیان شعری وادبی تعلقات تھے۔

مکہ مکرمہ کی مشہور محدثہ اور عابدہ وزاہدہ خاتون خدیجہ بنت شیخ شہاب الدین نوری بھی شاعرہ تھیں اور نہایت عمدہ اشعار کہتی تھیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں بہت سے اشعار اور نظمیں کہی ہیں۔(العقد الثمین صفحہ 208 جلد نمبر 8)

محدثہ وفقیہہ زینب بنت کمال الدین ہاشمی بھی مکہ مکرمہ میں رہتی تھیں۔ عقل وخرد، مروت اور شرافت اور عزت وریاست میں بہت آگے تھیں۔ ساتھ ہی شعر وشاعری کا نہایت ہی ستھرا ذوق رکھتی تھیں۔ اور ان کو بہت سے اشعار یاد تھے۔(العقد الثمین صفحہ 233 جلد نمبر 8)

اسی طرح ام الحسین بنت قاضی مکہ شہاب الدین طبری شاعری کرتی تھیں اور ان کی نظمیں مشہور ومقبول تھیں۔(العقد الثمین صفحہ نمبر 231، جلد نمبر 8)

ام علی تقیہ بنت ابوالفرج غیث بن سلمی صوری بقول ابن خلکان نہایت عالمہ وفاضلہ تھیں۔ان کے عمدہ عمدہ اشعار وقصائد ہیں۔ایک مرتبہ انہوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھتیجے المظفر تقی الدین عمر کی مدح میں قصیدہ ضمیرہ کہا جس میں شراب اور اس کے متعلقات کا ذکر تھا، جب امیر مذکور نے وہ قصیدہ پڑھا تو کہا کہ یہ محترمہ یہ باتیں ایام طفلی سے جانتی ہیں جب اس کی خبر ام علی کو ملی تو انہوں نے دوسرا قصیدہ حربیہ کہا، جس میں جنگ اور اس کے متعلقات کو نہایت سلیقہ سے بیان کیا اور اس پیغام کے ساتھ یہ قصیدہ بھی امیر کو بھیج دیا کہ علمی بهذا لعلمی بهذا۔ (جس طرح مجھے یہ معلوم ہے اسی طرح مجھے وہ بھی معلوم ہے)ان کی ولادت دمشق میں صفحہ 505ھ میں اور وفات اوائل شوال 579ھ میں ہوئی۔

(ابن خلکان صفحہ نمبر 103 جلد نمبر 1)

(بحوالہ: خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات)

(حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری)

امت کی مشہور عالمات ومحدثات

طبقات وتراجم اور تذکرہ ورجال کی کتابوں میں مردوں کی کھلی زندگی کے مقابلہ میں عورتوں کی مستور زندگی کے حالات میں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جو ان کے علمی و دینی کارناموں مثلاً تحدیث وروایت، تفقہ وافتاد وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کے صنفی وذاتی اور مخفی باتوں کو پس پردہ رکھنے کے باوجود ان کے ظاہری فضل وکمال سے باطنی اوصاف معلوم ہو جاتے ہیں۔ پھول کو دیکھ کر اس کی خوشبو کا پتہ چل جاتا ہے۔ زیب النساء مخفی نے اپنے اس شعر میں گویا اپنی صنف کے مقام ومرتبہ کی ترجمانی کی ہے۔

درسخن مخفی صنم، چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بہید مرا

ہم چند خواتین اسلام کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ جن میں ان کے فضل وکمال کی پوری عکاسی ہے۔ آئینہ چھوٹا ہے مگر تصویر پوری نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ کا اختصار بھی مقصود ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر ان کا اجمالی تذکرہ کافی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ خطیبؒ بغدادی کی تاریخ بغداد ذہبیؒ کی العبر فی خبر من عبر اور ابن جوزیؒ کی المنتظم فی تاریخ الملوک والامم سے ماخوذ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق جس دور جدید میں دین کی خدمت کے لیے جیسے افراد و جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک کار بمطابق اپنے تناسب اور حیثیت رہتی ہیں۔ پہلی اور دوسری صدی میں احادیث وآثار کی جمع وتتبع میں راویان حدیث کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اسی طرح چھٹی اور ساتویں صدی میں صلیبی درندوں اور تاتاریوں بھیڑیوں کے وسط ایشیاء کے اسلامی مملکتوں اور شہروں پر یلغار کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ساتھ اسلامی علوم وفنون میں تباہی آئی تو اللہ تعالیٰ نے اس دور میں مردوں کی طرح عورتوں کی جماعت کثیرہ کو پیدا فرمایا جس نے علمی اور دینی کارناموں میں تجدیدی خدمت انجام دی۔ ان میں بہت سی معمرہ تھیں اور سینکڑوں سال تک زندہ رہ کر اپنا فیض جاری رکھا۔ علماء نے ان معمرات کے تذکرے میں اس امتیاز کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

1۔ ام عمر بنت حسان بغدادیؒ

ام عمر بنت ابوالغص حسان بن زید ثقفی بغدادی نے اپنے والد ابوالغص اور اپنے شوہر سعید بن یحییٰ بن قیس

سے حدیث کی روایت کی اور ان سے امام احمد بن حنبل، ابوابراہیم ترجمانیؒ، محمد بن صباح جرجرائی، ابراہیم بن عبداللہ ہروی، علی بن مسلم طوسیؒ نے روایت کی، خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ میں نے ام عمرؒ سے حدیث کی سماعت و روایت کی ہے۔ وہ بغداد میں معاذ بن مسلم کے مکان کے پاس رہتی تھیں اور ان سے ہمارے کئی اصحاب نے روایت کی ہے۔

2۔ زینب بنت سلیمان بدادیہؒ

زینب بنت سلیمان بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلبؒ کا شمار فاضل نساء میں تھا۔ انہوں نے اپنے والد سلیمان بن علیؒ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ان سے عاصم بن علی واسطی، قاضی جعفر بن عبدالواحد، عبدالصمد بن موسیٰ ہاشمی، احمد بن خلیل بن مالکؒ نے روایت کی۔ ایک مرتبہ خلیفہ مامون کے یہاں اس حال میں گئیں کہ سواری پر تھیں۔ بدن پر سفید قیمتی طیلسان تھا۔ عدن کی سیاہ زرق برق چادر میں ملبوس تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی نائب حاجب عطاء نے حریم کا پردہ اٹھایا اور بڑھ کر ان کے پیر کو بوسہ دیا۔ اسی حال میں حاجب علی نے ان سے ایک حدیث روایت کی۔

3۔ زینب بنت سلیمان بغدادیہؒ

زینب بنت سلیمان خلیفہ ابوجعفر منصور کی پوتی اور سلیمان کی لڑکی تھیں۔ انہوں نے اپنے والد سے حدیث کی روایت کی اور سماعت کی اور ان سے ان کے بھائی ابو یعقوبؒ نے روایت کی۔

4۔ خدیجہ ام محمد بغدادیہؒ

خدیجہ ام محمد حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں جا کر ان سے حدیث پڑھتی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے یزید بن ہارون، اسحاق بن یوسف ارزقؒ، ابوالنصر ہاشم بن قاسمؒ نے روایت کی ان کا بیان ہے کہ 226ھ میں خدیجہ ام محمد نے مجھ سے حدیث کی، وہ میرے والد کے یہاں آتی تھیں ان سے حدیث سنتی تھیں اور حدیث بیان کرتی تھیں۔

5۔ مضغہ، مخہ، زہدہ اخوات بشر حافیؒ

مضغہ، مخہ اور زہدہ تینوں مشہور عابد وزاہد حضرت بشر حافیؒ کی بہنیں عبادت وتقویٰ میں مشہور تھیں۔ مضغہ سب سے بڑی تھیں۔ زہدہ کی کنیت ام علی تھی۔ امام احمد بن حنبلؒ کے صاحب زادے عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں والد کے ساتھ مکان میں موجود تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ والد کے حکم پر میں نے دروازہ کھولا تو ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے کہا کہ میں امام صاحب سے ملنا چاہتی ہوں تم اجازت لو۔ اور اجازت کے بعد اندر آ کر سلام کیا کہ ابوعبداللہ! میں رات کو چراغ کی روشنی میں سوت کاتتی ہوں۔ بعض اوقات چراغ بجھ جاتا ہے تو چاندنی میں کاتتی ہوں۔ تو ایسی حالت میں مجھ کو چراغ اور چاند کی روشنی میں کاتتے ہوئے دھاگے کی اجرت میں

فرق کرنا چاہئے؟ امام صاحب نے کہا اگر تم کو فرق معلوم ہوتا ہو تو اس کو ظاہر کر دو۔ پھر اس عورت نے پوچھا کہ مریض کا تکلیف کی وجہ سے رونا کیا شکوہ ہے؟ امام صاحب نے کہا کہ میرے خیال میں یہ شکوہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔

عبداللہ کہتے ہیں کہ والد صاحب نے کہا کہ میں نے کسی شخص سے اس قسم کا مسئلہ معلوم کرتے ہوئے نہیں سنا ہے۔ تم جاؤ دیکھو کہ یہ عورت کہاں جاتی ہے اور میں نے دیکھا کہ وہ بشر بن حارث کے مکان میں گئی ہے اور وہ ان کی بہن تھی۔ واپس آ کر والد صاحب کو بتایا تو فرمایا کہ بشر حافی کی بہن کے سوا ایسی عورت ہونا محال ہے۔

6۔ عباسیہ زوجہ امام احمد بن حنبلؒ

عباسیہ بنت فضل امام احمد بن حنبلؒ کی زوجہ اور ان کے صاحب زادے صالح کی ماں ہیں۔ ان سے صرف یہی صالح پیدا ہوئے۔ بڑی نیک اور بزرگ عورت تھیں۔ امام صاحبؒ کہتے ہیں کہ میرے اور اس کے درمیان کبھی ایک بات میں بھی اختلاف نہیں ہوا۔ امام صاحب کی زندگی میں ان کا انتقال ہوا۔

7۔ میمونہ اخت ابراہیم خواص

میمونہ مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن احمد خواص کی بہن تھیں، تقویٰ و توکل، زہد و عبادت اور دنیا سے بے نیازی میں اپنے بھائی کی پیرو تھیں۔ ایک مرتبہ کسی نے ابراہیم خواص کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہن میمونہ نے اس سے پوچھا کہ تم کو کس کی تلاش ہے؟ اس نے ابراہیم خواص کا نام لیا تو میمونہ نے کہا کہ وہ باہر گئے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ کب واپس آئیں گے؟ میمونہ نے جواب دیا کہ جس کی جان کسی دوسرے کے قبضے میں ہے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کب لوٹے گا۔

8۔ حواریہ اخت ابوسعید خرازہ

حواریہ شیخ ابوسعید بن عیسیٰ خراز کی بہن تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی سے حدیث پڑھی اور ان سے فاطمہ بنت احمد سامریہ نے پڑھا۔

9۔ عبدہ بنت عبدالرحمان انصاریہؒ

عبدہ بنت عبدالرحمان بن مصعب بن ثابت ام احمد انصاریہؒ نے اپنے والد سے حدیث کی روایت کی۔ اور ان سے محمد بن مخلد دوری اور سلیمان بن احمد طبرانی نے روایت کی۔ ان کا مکان بغداد میں مربعۃ الخرسی (خرسی چوک) میں تھا۔ بڑی عاقلہ و عابدہ و فصیحہ خاتون تھیں۔

10۔ سمانہ بنت حمدانؒ

سمانہ بنت حمدان محمد بن موسیٰ انباریہ، وضاح بن حسان کی نواسی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اپنے نانا وضاح بن حسان کی کتاب سے بھی استفادہ کیا۔ ان سے ابوبکر شافعیؒ اور ابوالقاسم

طبرانی نے حدیث کی روایت کی۔ سامنہ انبار میں رہتی تھیں۔

فاطمہ بنت عبدالرحمان خرانیہ ؒ

فاطمہ بنت عبدالرحمان بن ابوصالح حرانی کی کنیت ام محمد ہے۔ ان کی جائے پیدائش بغداد ہے۔ صوفیہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ وہ صوف پہنتی تھیں۔ ساٹھ سال تک اپنے مصلیٰ پر بغیر بستر چادر کے سوئیں۔ ان سے ان کے بھتیجے عبدالرحمان بن قاسم نے حدیث پڑھی۔ نو عمری میں انہیں مصر لایا گیا۔ انہوں نے اپنے والد عبدالرحمان بن ابوصالح سے حدیث پڑھی ہے۔ اسی سال سے زائد عمر میں 312ھ میں انتقال کیا۔

11۔ مئیہ کاتبہ

مئیہ کاتبہ خلیفہ معتمد عباسیؒ کی باندی ہیں۔ انہوں نے ابوالطیب محمد بن اسحاق بن یحیٰ وشاء سے حدیث کی روایت کی اور ان سے عبیداللہ بن عبداللہ بن نبرار انباری نے روایت کی۔

12۔ ام عیسیٰ بنت ابراہیم حربیؒ

ام عیسیٰ بنت ابراہیم بن اسحاق حربیؒ نہایت عاقلہ عالمہ تھیں اور فقہی مسائل میں فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ 328ھ میں فوت ہوئیں اور اپنے والد ابراہیم عربی کے پہلو میں دفن ہوئیں۔

13۔ ام سلمہ فاطمہ بنت عبداللہ بحستانیہؒ

ام سلمہ فاطمہ بنت ابوبکر عبداللہ بن ابوداؤد سجستانیؒ مشہور محدث امام ابوداؤد صاحب السنن کی پوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ان سے ابوالقاسم عبدالواحد بن زوج الحترہ محمد بن جعفر وغیرہ نے روایت کی ہے۔ فاطمہ نے 362ء میں ابواسحاق مزکی کے مکان میں حدیث کا درس دیا تھا۔

14۔ خدیجہ بنت ابوبکر محمدؒ

خدیجہ بنت ابوبکر محمد بن احمد بن ابوالثلج نے زیاد بن عبداللہ بکائی کی تصنیف الجمل کی روایت اپنے والد سے کی جس کو انہوں نے بکائی کے شاگرد دلوح بن حاتم سے روایت کیا تھا اور ابراہیم بن مخلد بن جعفر نے فاطمہ سے اس کی روایت کر کے لکھا۔

15۔ امتہ السلام بنت قاضی ابوکر احمدؒ

امتہ السلام بنت قاضی ابوبکر احمد بن کامل کی کنیت ام الفتح ہے۔ انہوں نے محمد بن اسماعیل بصلاتی اور محمد بن حسین بن حمید بن ربیعؒ سے حدیث کی تعلیم پائی، ان کی ولادت رجب 299ھ میں ہوئی اور وفات 25 رجب 390ھ میں ہوئی۔

16۔ خلدیہ بنت جعفرؒ

خلدیہ بنت جعفر بن محمد بن نصیر بن قاسم خلدیؒ عابدہ، زاہدہ، عالمہ تھیں۔ خطیب بغدادی نے ابوالفتح منصور

بن ربیعہؒ کے واسطہ سے ان سے روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم خواص کا بیان ہے کہ میں نے دس سے زائد مشائخ کو اس بات پر متفق پایا ہے:

(ترجمہ) ''وعظ وتذکیر دراصل بدعت ہے اور یہ اچھی بدعت ہے۔ مشائخ کی مجلس میں رحمت نازل ہوتی ہے۔ ان کے بیان والفاظ کی برکت سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور ان کی ترہیب وتخویف سے لوگوں کے دل گناہ سے نفرت کرتے ہیں۔''

17۔ جمعہ بنت احمد محمدیہؒ

جمعہ بنت احمد بن محمد بن عبیداللہ کی کنیت ام الحسین ہے۔ وہ اپنے وطن نیشاپور سے بغداد آئیں اور یہاں ابو عمرو بن حمدان، حافظ ابواحمد، عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رازی، بشیر بن محمد بن یاسین، ابوبکر طرازیؒ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ عابدہ، زاہدہ، عالمہ تھیں۔ امام ابو حامد اسفرائینی ان کی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔ ایک واسطہ سے خطیب بغدادی کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

18۔ فاطمہ بنت ھلالؒ

فاطمہ بنت ھلال بن احمد کرجی کی کنیت ام فرج تھی۔ انہوں نے ابوعمرو بن سحاکؒ اور ابوبکر شافعی سے حدیث کی روایت کی اور ان سے خطیب بغدادی نے 409ھ میں حدیث کی سماعت کی ہے۔

19۔ فاطمہ بنت محمدؒ

فاطمہ بنت محمد بن عبید بن شخیر صیر فی بغداد میں امام ابوالفتح محمد بن ابی الفوارس کے جوار میں قیام کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے والد سے حدیث پڑھی ثقہ، محدثہ تھیں۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ میں ان سے براہ راست روایت نہ کرسکا۔ البتہ ابوطاہر محمد بن احمد اشنائی نے ان کی حدیث مجھ سے بیان کی ہے۔

20۔ طاہرہ بنت احمد تنوخیہؒ

طاہرہ بنت احمد بن یوسف الازرق بن یعقوب تنوخیہ کا بیان ہے کہ میں پہلی شعبان 359ھ میں پیدا ہوئی اور ابومحمد بن ماسی، مخلد بن جعفر باقرحی، ابوالحسن بن لولو، ابوبکر بن اسماعیل رداقؒ، ابوالحسین بن بواب وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ لیکن میری کتابیں ضائع ہوگئیں۔ طاہرہ خطیبؒ کی استاذ حدیث ہیں۔ 436ھ میں بصرہ میں فوت ہوئیں۔

21۔ خدیجہ بنت البقال موسیٰؒ

خدیجہ بنت موسیٰ بن عبداللہ، بنت البقال کے نام سے مشہور ہیں۔ کنیت ام سلمہ ہے۔ ان کا لقب واعظہ ہے یعنی وہ وعظ بیان کرتی تھیں۔ حدیث کا درس امام ابوحفص شاہین سے لیا تھا۔ بغداد کے علاقہ توثہ میں قیام کرتی تھیں۔ نہایت ثقہ، صالحہ، فاضلہ، محدثہ وعالمہ تھیں۔ خطیب بغدادی نے ان سے روایت کی ہے۔ خدیجہ بنت

البقال جمادی الآخر 437ھ میں فوت ہوئیں اور بغداد کے مقبرہ شونیزی میں دفن کی گئیں۔

22۔ جبرۃ السوداؒ

جبرۃ السوداء، امام ابوالفتح محمد بن احمد بن ابوالفوارس کی باندی تھیں۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابوالحسین احمد بن محمد ابن التیم نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے اور ہمارے متعدد اصحاب نے ان سے روایت وسماعت کی ہے۔ جمادی الاولیٰ 446ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

23۔ ستیۃ بنت قاضی عبدالواحدؒ

ستیۃ بنت قاضی ابوالقاسم عبدالواحد بن محمد بن عثمان بجلی نے ابوالقاسم عمر بن محمد بن سبنک سے روایت کی اور خطیب بغدادی نے ان سے روایت کی، صاحقہ فاضلہ، محدثہ تھیں۔ بغداد میں مریم دارالخلافت کے مشرقی جانب قیام کرتی تھیں۔ ان کا انتقال رجب 447ھ میں ہوا۔

24۔ خدیجہ بنت محمد شاہجہانیہؒ

خدیجہ بنت محمد بن علی بن عبداللہ شاہجہانیہ واعظہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ صالحہ، صادقہ، عالمہ ومحدثہ تھیں۔ بغداد میں قطیعۃ الربیع میں سکونت کرتی تھیں۔ خطیب بغدادی نے ان سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ 451ھ میں جب میں بغداد سے شام گیا تو وہ بھی بغداد سے چلی گئیں۔ 18 محرم 460ھ میں ان کا انتقال ہوا اور پنجشنبہ کو شیخ ابن سمعون کی قبر کے پاس دفن کی گئیں۔ ان کی ولادت 376ھ میں ہوئی تھی۔ (یہ تمام تراجم خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کی جلد 14 سے ماخوذ ہیں)

25۔ امۃ الواحد ستیۃ بنت قاضی حسینؒ

امۃ الواحد ستیۃ بنت قاضی ابوعبداللہ حسین بن اسماعیل محاملیؒ حافظ قرآن تھیں۔ خاص طور سے فقہ شافعی کی بلند پایہ عالمہ تھیں اور امام ابوعلی ابوہریرہ کے ساتھ فتوی دیتی تھیں۔ 377ھ میں وفات پائی۔

26۔ بی بی بنت عبدالصمدؒ

بی بی بنت عبدالصمد بن علی، ام الفضل وام عربی ہرثمید ہرویہ اپنے وقت کی مشہور محدثہ تھیں۔ انہوں نے امام عبدالرحمان بن ابوشریح سے ایک خاص خبر کی روایت کر کے خود اس کی روایت کرتی تھیں اور اس میں ان کو شہرت حاصل تھی۔ 90 سال کی عمر میں 477ھ یا اس کے بعد انتقال کیا۔

27۔ عائشہ بنت حسن ورکانیہؒ

عائشہ بنت حسن ورکانیہ اصفہانیہ نے امام ابوعبداللہ بن مندہ سے حدیث کی روایت کی 460ھ میں فوت ہوئیں۔

28۔ فاطمہ بنت شیخ ابوعلی حسنؒ

فاطمہ بنت شیخ ابوعلی حسن بن علی الدقاق، امام قشیری کی زوجہ ہیں۔ عابدہ، زاہدہ اور بڑی قدر ومنزلت کی

عورت تھیں۔ان کا شمار اس زمانہ کی مشہور عبادت گذار و عابدات میں تھا۔اسی کے ساتھ حدیث میں سند عالی رکھتی تھیں۔امام ابونصیر اسفرائینی،امام علوی،امام ابوعبداللہ حاکم اور محدثین کی ایک جماعت سے حدیث کی روایت کی تھی۔90 سال کی عمر میں ذی قعدہ 480ھ میں انتقال کیا۔

29۔فاطمہ بنت حسن بغدادیہؒ

فاطمہ بنت حسن بن علی الاقراع،ام الفضلؒ بغدادیہ نہایت خوش خط کاتبہ تھیں۔اہل علم نے ان سے تحسین خط لکھا۔مشہور خوش نویس ابن ربواب کی نقل کرتی تھیں۔وزیر کندری کے لیے ایک ورق لکھا تو اس نے ایک ہزار دینار دیا۔حدیث کی روایت ابوعمر بن مہدی فارسی سے کی تھی۔480ھ میں فوت ہوئیں۔

30۔کریم بنت محمد مروزیہؒ

کریمہ بنت احمد بن محمد بن حاتم،ام الکرام مروزیہ نے مکہ مکرمہ میں مجاورت کرلی تھی۔انہوں نے صحیح بخاری کی روایت امام کشمینی سے کی تھی۔نیز زہر سرخسیؒ سے روایت کی۔احادیث کے لکھنے اور مقابلہ کرنے پر خاص توجہ رکھتی تھیں۔بڑی فہم وفراست اور قدر و منزلت رکھتی تھیں۔زندگی بھر شادی نہیں کی۔سو سال کی عمر 463ھ میں انتقال کیا۔

31۔ام المؤید زینت مشعریہؒ

ام المؤید زینب بنت ابوالقاسم عبدالرحمان بن حسن شعریہ حرہ جرجانیہ نیشاپوریہ 526ھ میں پیدا ہوئیں۔عبداللہ بن الفراویؒ زاہر شحامیؒ عبدالمنعم بن قشیریؒ اور دوسرے محدثین سے سماعت و روایت کی۔حدیث میں سند عالی رکھتی تھیں۔ان کے انتقال کے بعد اس دور و دیار میں سند عالی کا سلسلہ منقطہ ہوگیا۔جمادی الآخر 615ھ کو انتقال کیا۔

32۔امتہ اللہ بنت احمدؒ

امتہ اللہ بنت احمد بن علی آبنویؒ کے والد زبردست محدث تھے۔امتہ اللہؒ نے ان سے بہت زیادہ احادیث کی روایت کی ہے۔اور اس کے بارے میں وہ منفرد تھیں۔ان کا لقب شرف النساء تھا۔نہایت صالحہ،عابدہ،عالمہ و محدثہ تھیں۔محرم 626ھ میں فوت ہوئیں۔

33۔عجیبہ بنت محمد باقداریہؒ

عجیبہ بنت حافظ محمد بن اب غالب باقداریہ بغدادیہؒ نے عبدالحق،عبداللہ بن منصور موصلی سے روایت کی اور امام مسعود اور امام اسمتیؒ کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت سے روایت میں ان کی خاتمۃ الاصحاب ہیں۔انہوں نے دس اجزاء میں اپنے شیوخ کی روایات جمع کی ہیں۔647ھ میں انتقال کیا۔

34۔ست العرب بنت یحییؒ

ست العرب بنت یحییٰ بن قائماز،ام الخیر دمشقیہ کندیہ نے اپنے آقا تاج الدین کندیؒ سے حدیث کی تعلیم

حاصل کی اور ابن طبرزد کی مجلس میں الغیلانیات کے درس میں شریک ہوئیں۔ 684ھ میں وفات پائی۔

35۔ تقیہ بنت محمدؒ

تقیہ بنت محمد بن آموسان نے ابوعبداللہ خلال اور غالم بن خالد سے حدیث کی روایت کی رجب 607ھ میں انتقال ہوا۔

36۔ عائشہ بنت معمر اصفہانیہؒ

عائشہ بنت معمر بن فاخر، ام حبیبہ اصفہانیہؒ نے امام زاہر اور محدثین کی ایک جماعت سے روایت کی جو فاطمہ جوزدانیہ کے درس حدیث میں شریک ہوئیں۔ 607ھ میں فوت ہوئیں۔

37۔ سعیدہ بنت عبدالملکؒ

سعیدہ بنت عبدالملک بن یوسفؒ نے محدث عثانی سے روایت بالاجازۃ کی۔ ان کا انتقال 640ھ میں ہوا۔

38۔ جمال النساء بنت احمد بغدادیہؒ

جمال النساء بنت احمد بن ابوسعد غراف بغدادیہؒ نے ابن البطی اور احمد بن محمد کاغذی سے حدیث کی تعلیم پائی۔ جمادی الاولیٰ 640ھ میں فوت ہوئیں۔

39۔ آسیہ ام سیف الدینؒ

آسیہ حافظ سیف الدین بن مجد الدین کی والدہ ہیں۔ ان کے بھائی ضیاء الدین نے اپنی بہن آسیہ کے بارے میں بیان کیا ہے کہ علم وعمل میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ قیام اللیل کبھی نہیں چھوڑتی تھیں۔ 640ھ میں فوت ہوئیں۔

40۔ زہرہ بنت محمدؒ

زہرہ بنت محمد بن احمد شجہ، صالحہ اور صوفیہ تھیں۔ ان کی خانقاہ تھی۔ انہوں نے ابن بطی اور یحییٰ بن ثابت سے حدیث کی روایت کی تھی۔ 79 سال کی عمر میں 633ھ میں وفات پائی۔

41۔ ام الفضل زینب بنت ابراہیمؒ

ام الفضل زینب بنت ابراہیم قیسی خطیب ضیاء الدین دولعی کی زوجہ تھیں۔ انھوں نے نصر اللہ مصیقی سے حدیث کی سماعت وروایت کی اور ابوعبداللہ فراوی اور محدثین کی ایک جماعت سے روایت بالاجازت کی۔ ربیع الاول 610ھ میں فوت ہوئیں۔

42۔ ام الخیر زینب بنت قاضی یحییؒ

ام الخیر یحیی بنت قاضی القضاۃ محی الدین یحییٰ بن محمد قرشی دمشق نے علی بن حجاج ابن المقیر اور دوسرے محدثین سے روایت کی۔ بہتر سال سے زائد عمر میں شعبان 700ھ میں انتقال کیا۔

43۔امۃ الحق بنت ابو علی حسنؒ

امۃ الحق بنت حافظ ابو علی حسن محمد بن بکر شامیہؒ نے اپنے والد کے دادا اور خود اپنے دادا سے روایت کی۔ اس کے علاوہ حنبل اور ابن طبرزد وغیرہ سے روایت کر کے تفرد رکھتی تھیں۔ 87 سال کی عمر میں مقام شیرز میں اپنے رشتہ داروں کے یہاں رمضان 685ھ میں انتقال کیا۔

44۔ام احمد زینب بنت مکیؒ

ام احمد زینب بنت مکی بن علی حرانی نے حنبلؒ ابن طبرزد ہست الکتبہ اور دوسرے محدثین سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی مجلس تحدیث وروایت میں طلبہ حدیث کا بڑا اژدہام ہوتا تھا۔ شیخہ، معمرہ اور عابدہ تھیں اور 94 سال تک اپنا درسی فیض جاری رکھ کر شوال 688ھ میں انتقال کیا۔ صفیہ اخت تقی الدین ابو اسحاق ابراہیم بن علی بن احمد واسطی صالحی حنبلیؒ کی بہن ہیں۔ ان کے بھائی امام تقی الدینؒ علامہ، زاہد، قدوہ اور سند الوقت تھے۔ صفیہ نے موفق الدین اور ابن راجح سے حدیث پڑھی، 80 سال سے زائد عمر میں ذی الحجہ 992ھ میں فوت ہوئیں۔

45۔ام محمد صفیہ بنت عبد الرحمانؒ

ام محمد صفیہ بنت عبد الرحمان عمر فرافساوی کے حال میں لکھا ہے کہ انہوں نے پانچ سال کی عمر میں شیخ موفق الدین سے حدیث کی روایت کی۔ مقام جبل میں 664ھ میں لاپتہ ہوگئیں۔

46۔ام محمد زینب بنت عمر کندیؒ

ام محمد زینب بنت عمر کندی بعلبکیہ دمشقیہؒ نے شیخ مؤید الدین طوسیؒ اور ابو ردح وغیرہ سے روایت کی۔ حج و زیارت سے مشرف اور اور الحاجہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ خیر کے کاموں میں بہت آگے تھیں۔ ان کے بہت سے اوقاف اور کارہائے خیر تھے۔ 90 سال کی عمر میں جمادی الآخرہ 698ھ میں انتقال کیا۔

47۔امۃ العزیز خدیجہ بنت یوسفؒ

امۃ العزیز خدیجہ بنت یوسف بن غنمیہ عالمہ فاضلہ تھیں۔ حدیث کی تعلیم ابن اللتی مکرم اور محدثین کی ایک جماعت سے حاصل کی۔ علم نحو میں شہرت رکھتی تھیں۔ نہایت خوش خط تھیں۔ اہل میت کو تعزیت بہت اچھے طریقے سے دیا کرتی تھیں۔ ایک مدت تک اہل میت گھرانوں کو تسلی اور صبر کی تلقین کی۔ 70 سال سے زائد عمر میں 698ھ میں فوت ہوئیں۔

48۔صفیہ بنت عبد الوہابؒ

صفیہ بنت عبد الوہاب بن علی قرشیہ مشہور محدثہ کریمہ کی بہن تھیں۔ ان کو مسعود ثقفی اور کبار محدثین نے روایت حدیث کی اجازت دی تھی۔ اپنے زمانہ میں بہت سی احادیث کی روایت میں منفرد تھیں۔ مقام حماۃ (شام) میں 646ھ میں انتقال کیا۔

49۔امتہ الحکم عائشہ بنت محمد بغدادیہ

امتہ الحکم عائشہ بنت محمد بن علی بغدادیہ کو شیخ ابوالحسن بن غمرہ اور شیخ عبدالقادر نے روایت حدیث کی اجازت دی تھی۔نہایت نیک تھیں۔عورتوں میں وعظ کرتی تھیں اور الواعظہ کے لقب سے مشہور تھیں۔جمادی الاولیٰ 641ھ میں انتقال کیا۔

50۔ام حبیبہ عائشہ بنت معمرؒ

عائشہ بنت معمر بن فاخر۔ام حبیبہ اصفہانیہ مشہور محدثہ تھیں۔فاطمہ جوزدانیہ کی مجلس درس میں شریک ہوکر ان سے سماعت و روایت کی۔نیز شیخ زاہر اور دیگر محدثین سے تعلیم پائی۔ابن نقطہ کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے مسند ابو یعلی کی سماعت کی ہے جس کا سماع انہوں نے سعید میرقیؒ سے کیا تھا۔ربیع الثانی 607ھ میں وفات پائی۔

51۔ام ہانی صفیہ بنت احمد

صفیہ بنت احمد بن عبداللہ بن محمدؒ،ام ہانی فارفانیہ اصفہانیہؒ 510ھ میں پیدا ہوئیں۔وہ سب سے آخری شاگرد ہیں جنہوں نے امام ابونعیم کے شاگرد امام عبدالواحد لانجی سے حدیث کی روایت کی۔وہ ان کی خاتمہ الاصحاب ہیں ان کو ابوعلی حداد اور محدثین کی ایک جماعت سے حدیث کی روایت کی اجازت حاصل تھی۔اور انہوں نے محدثہ فاطمہ سے امام طبرانی کی معجم کبیر اور معجم صغیر کی روایت و سماعت کی ہے۔ربیع الثانی 605ھ میں وفات پائی۔

52۔عین الشمس بنت احمدؒ

عین الشمس بنت احمد بن ابوالفرخ ثقفہ اصفہانیہؒ نے اسماعیل بن زخشید اور ابن ابوذر سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور دونوں حضرات کی خاتمۃ الاصحاب ہیں۔ربیع الثانی 610ھ میں انتقال کیا۔

53۔کریمہ بنت عبدالوہابؒ

ام الفضل کریمہ بنت عبدالوہاب بن علی قرشیہ زبیریہ مسندۃ الشام ہیں۔بنت الجبق کی کنیت سے مشہور ہیں۔انہوں نے ابویعلیٰ حبولی،عبدالرحمان بن ابوالحسن دارانی حسانی،زیاد اور دوسرے محدثین سے تعلیم پائی اور ابوالوقت سنجری،ابوالخیر باغبانی،مسعود ثقفی کے علاف حدیث کا درس دیا۔مقام میطور میں اپنے باغ میں جمادی الثانیہ 641ھ میں انتقال کیا۔

54۔مریم بنت احمد بعلبکیہؒ

مریم بنت احمد بن حاتم بعلبکیہ شیخ بہاءالدین کے درس حدیث میں شریک ہوئیں اور شیخ اربلی سے بھی سماعت و روایت کی۔نہایت نیک صالحہ،عالمہ تھیں۔698ھ میں فوت ہوئیں۔

55۔ست الکتبہ نعمت بنت علیؒ

ست الکتبہ نعمت بن علی بن یحیٰ بن طراح نے دمشق میں اپنے دادا سے بہت زیادہ حدیث کی روایت کی۔ ربیع الاول 614ھ میں وفات پائی۔

56۔ھد یہ بنت عبدالحمیدؒ

ہدیہ بنت عبدالحمید بن محمد مقدسیہ صالحہ نے شیخ ابن الزبیدی سے صحیح بخاری کی تعلیم حاصل کی۔ مقام جبل میں ربیع الثانی 699ھ میں انتقال کیا۔

57۔امتہ الرحمان ست الفقہاء

امتہ الرحمان، ست الفقہاء بنت تقی الدین ابراہیم بن علی واسطیؒ نے شیخ عبدالحقؒ کے درس حدیث میں حاضر ہو کر جزء ابن عرفہ کا سماع کیا اور ابراہیم بن خلیل وغیرہ سے سماعت وروایت کی ہے۔ نیز جعفر ہمدانی، کریمہ، احمد بن معز الدینؒ وغیرہ نے ان کو روایت کی اجازت دی۔ فاطمہ بنت دباہی کی والدہ ہیں۔ حدیث کی روایت بہت زیادہ کی ہے۔ نہایت بابرکت، نیک اور معترہ، عالمہ، محدثہ تھیں۔ 93 سال کی عمر میں ربیع الثانی 624ھ میں فوت ہوئیں۔

58۔خدیجہ بنت رضی الدینؒ

خدیجہ بنت رضی الدین عبدالرحمان بن محمدؒ نے امام قزوینی، شیخ بہاء الدین اور دوسرے محدثین سے حدیث کی روایت کی۔ 84 سال کی عمر میں 701ھ میں انتقال کیا۔

59۔ام عمر خدیجہ بنت عمر بن احمدؒ

ام عمر خدیجہ بنت عمر بن احمد بن عدم جلیلتہ القدر محدثہ تھیں۔ انہوں نے شیخ رکن الدین ابراہیم حنفیؒ سے روایت کر کے امام ذہبیؒ کو حدیث کی تعلیم دی۔ شہرہ حماۃ میں 708ھ میں انتقال کیا۔

60۔ام عبداللہ فاطمہ بنت سلیمانؒ

ام عبداللہ فاطمہ بنت سلیمان بن عبدالکریم انصاری کو شیخ فتح الدین شیخ ابن عضیجہ اور دوسرے محدثین کی طرف سے حدیث کی روایت کی اجازت حاصل تھی۔ انہوں نے حدیث کی تعلیم علم مازنی، کریمہ اور ابن رواحہ سے پائی تھی۔ بڑی نیک اور صالحہ تھیں۔ زندگی بھر شادی نہیں کی تھی اور علم دین کی خدمت کرتی رہیں۔ بہت زیادہ حدیث کی تعلیم دی اور کئی کتب حدیث کے درس میں منفرد تھیں۔ 90 سال کی عمر میں ربیع الثانی 708ھ میں فوت ہوئیں۔

61۔ام زینب فاطمہ بنت عباسؒ

ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ کو تذکرہ نگاروں نے الشیخہ، العالمہ، الفقیہہ، الزاہدہ، القانتہ، سیدۃ نساء، زمانہا اور واعظہ کے نام سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ علم وافر رکھتی تھیں۔ معمولی زندگی پر قانع تھیں۔ لوگوں کو نفع رسانی اور تذکیر کی حریص تھیں۔ اخلاص، خشیت اور امر بالمعروف کے اوصاف رکھتی تھیں۔ ان کی ذات سے دمشق اور مصر کی عورتوں نے اصلاح پائی اور لوگوں کے دلوں میں ان کو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ خاص طور پر

سے عورتوں کی بڑی تعداد نے ان سے نفع اٹھایا۔ 80 سال سے زائد عمر میں ذوالحجہ 714ھ میں وفات پائی اور خلائق نے ان کے جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔

62۔ زینب بنت کمال الدین مسندۃ الشامؒ

مسندۃ الشام ام عبداللہ زینب بنت کمال الدین احمد بن عبدالرحیم مقدسیہ نے محمد بن عبدالہادی خطیب مردایلدانی سبط ابن جوزی اور دوسرے محدثین سے درس حدیث لیا اور عجیبہ باقداریہ ابن الخیر، ابن العلیق اور عدد کثیر سے حدیث کی روایت کی اجازت پائی۔ ان کے درس حدیث میں کثرت سے طلبہ شریک ہوتے تھے۔ متعدد کتب حدیث کی روایت میں منفرد تھیں اور بڑی بڑی کتابوں کی روایت کی۔ 94 سال کی عمر میں 19 جمادی الاولیٰ 740ھ میں انتقال کیا۔

63۔ ام محمد زینب بنت احمدؒ

ام محمد زینب بنت احمد بن عمر بن ابوبکر مقدسی المعرقہ، الراحلۃ ہیں یعنی طویل عمر پائی اور حدیث کے لیے بہت زیادہ طول طویل استعار کیئے۔ انہوں نے شیخ ابن اللتی اور شیخ ہمدانی سے روایت کی۔ تقفیات مسند عبد بن حمید اور مسند دارمی کی روایت میں منفرد تھیں۔ اس لیے طلبہ حدیث نے ان سے روایت دور دور سے سفر کیا۔ مدینہ منورہ اور مصر میں بھی انہوں نے حدیث کا درس دیا۔ 94 سال کی عمر میں ذوالحجہ 722ھ میں وفات پائی۔

64۔ امۃ العزیز بنت نجم الدینؒ

امۃ العزیز بنت نجم الدین اسماعیل بن ابراہیم ابن الخباز کے والد اپنے زمانہ کے مشہور محدث تھے۔ امۃ العزیز نے ابن عبدالدائم اور دیگر شیوخ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، معمرہ تھیں۔ 90 سال سے زائد عمر میں ذوالحجہ 750ھ میں انتقال کیا۔

65۔ زینب بنت سلیمانؒ

زینب بنت سلیمان بن رحمت اسعر ویؒ نے امام ابن الزبیدی شمس الدین احمد بن عبدالواحد علی بن حجاج اور دیگر محدثین سے حدیث پڑھی، چند کتب حدیث کی روایت میں منفرد تھیں۔ بڑی عمر پائی تھی۔ مصر میں 80 سال سے زائد عمر میں ذوقعدہ 705ھ میں وفات پائی۔

66۔ زینب بنت عبداللہؒ

زینب بنت عبداللہ بن رضی الدین نے حافظ ضیاء الدین سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، چند اجزائے حدیث کی روایت میں منفرد تھیں۔ شام کے مقام صالحیہ میں 718ھ میں وفات پائی۔

67۔ زینب بنت یحیٰؒ

زینب بنت یحیٰؒ بن شیخ عزیز الدین بن عبدالسلام سلمیہ سلطان العلماء عزالدین کی پوتی ہیں۔ انہوں نے

یلدانی، ابراہیم بن خلیلؒ عمر بن عوہؒ، عثمان بن خطیبؒ العرافہ سے حدیث کی روایت کی۔ اور سبط ابن جوزیؒ نے ان کو اپنی مرویات میں منفرد تھیں۔ بڑی عمر پائی، ان کا شمار معمرات میں تھا۔ ذوقعدہ 735ھ میں وفات پائی۔

68۔ ام محمد شہدہ بنت کمال الدینؒ

ام محمد شہدہ بنت کمال الدین عمر بن عدیم عقیلی 10 محرم 617ھ میں پیدا ہوئیں، معمرہ تھیں۔ امام کاشغری کی مجلس درس میں شریک رہی ہیں۔ اور عمر بن بدر اور ثابت بن مشرف سے روایت کی اجازت حاصل تھی۔ وہ احادیث کو لکھتی اور یاد کرتی تھیں۔ بڑی زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں۔ امام ذہبی نے ان سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ حلب میں 709ھ میں وفات پائی۔

69۔ صفیہ بنت احمد مقدسیہؒ

ام محمد صفیہ بنت احمد بن احمد مقدسیہ، امام بہاء الدین بن عزالدینؒ عمر کی زوجہ ہیں۔ ابن عبدالدائم سے صحیح بخاری کی روایت کی ہے۔ ان کو معمرۃ الصالحۃ المغیرہ کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ بڑی عمر میں ذوالحجہ 741ھ میں انتقال کیا۔

70۔ عائشہ بنت محمد حرانیہ

عائشہ بنت محمد بن مسلم حرانیہ نے امام عراقیؒ اور امام بلخی کے درس حدیث میں شریک رہ کر علم حاصل کیا، نیز یلدانی اور محمد بن الجہادیؒ وغیرہ سے روایت کی اور کئی روایات میں منفرد تھیں۔ 90 سال کی عمر میں 736ھ میں وفات پائی۔

71۔ فاطمہ بنت خطیب عزالدینؒ

ام ابراہیم فاطمہ بنت خطیب عزالدین ابراہیم بن عبداللہ مقدسیہ صالحۃ المعمرہ الصالحہ العابدہ تھیں۔ شیخ ابراہیم بن خلیل کی خاتمۃ الاصحاب یعنی ان کی آخری شاگردہ ہیں۔ اسی طرح محمد بن عبدالقادر ابن السروری بن عوہ اور خطیب مردا سے روایت کی اجازت میں ان حضرات کی آخری شاگرد ہیں۔ شوال 747ھ میں 93 سال کی عمر میں انتقال کیا۔

72۔ فاطمہ بنت شیخ ابراہیمؒ

ام محمد فاطمہ بنت شیخ ابراہیم بن محمود بن جوہر بطائحی الصالحۃ المسندۃ شیخ ابراہیم بن قرشیہ اور ان کے بھائیوں کی والدہ ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری کی روایت متعدد بار ابن الزبیدی سے کی تھی۔ صحیح مسلم کی روایت شیخ الحنیفہ ابن الحصیری سے کی۔ ابن رواحہ سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ نہایت دیندار لوعبادت گذار عالمہ تھیں۔ 84 سال کی عمر میں صفر 711ھ میں انتقال کیا۔

73۔ فاطمہ بنت نفیس الدینؒ

ام احمد فاطمہ بنت نفیس الدین محمد بن حسنین بن رواحہ نے نصر اور طرابلس میں اپنے چچا سے حدیث کی تعلیم حاصل کر کے درس دیا۔ مقام حماۃ میں 716ھ میں وفات پائی۔

74۔ ست الوزراء بنت عمرؒ

ست الوزراء بنت عمر بن اسعد بن تنوخیہ مسندہ الوقت بن اسعد اور ابن الزبیدیؒ سے حدیث پڑھی اور متعدد بار دمشق اور مصر میں صحیح بخاری اور مسند شافعی کا درس دیا۔ بڑی نیک خاتون تھیں۔ 92 سال کی عمر میں شعبان 716ھ میں فوت ہوئیں۔

75۔ ست الناس کمالیہ بنت احمدؒ

ست الناس کمالیہ بنت احمد بن عبدالقادر بن رافع و مرادی نے عبداللہ بن برطلہ اندلسی، محمد بن جراح اور شرف الدین مریؒ سے روایت بالا جازت کی، شعبان 731ھ میں انتقال کیا۔

76۔ ست الاجناس موفقیہ بنت عبدالوہابؒ

ست الاجناس موفقیہ بنت عبدالوہاب بن عتیق بن وردان مصریہ نے حسن بن دینار، علم الدین بن صابونی، عبدالعزیز نقار، اور دوسرے محدثین سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور بعض کتب حدیث کی روایت میں انفرادی مقام رکھتی تھیں۔ 83 سال کی عمر میں 712ھ میں انتقال کیا۔

77۔ ام محمد ہدیہ بنت علیؒ

ام محمد ہدیہ بنت علی بن عسکر الہراسؒ معمرہ ہیں، انہوں نے حدیث کی تعلیم ابن الزبیدی کی مجلس درس میں حاضر ہو کر حاصل کی اس کے علاوہ ابن اللتی اور ہمدانی سے روایت کی۔ ان کے حال میں لکھا ہے کہ فقیرہ، صالحہ، قنوعہ، متعبدہ، قابلہ خاتون تھیں۔ قدس میں جمادی الاولیٰ 712ھ میں فوت ہوئیں۔

78۔ زین الدار وجیہہ بن علیؒ

زین الدار وجیہہ بنت علی بن یحییٰ بن علی انصاریہ بوصیریہ نے احمد بن محاس سے حدیث کی تعلیم پائی اور یوسف شاوی اور امیر یعقوب ہدبانی سے اجازت حاصل کی۔ 734ھ میں انتقال کیا۔ (یہ تراجم امام ذہبی کی کتاب ''العبر فی خبر من عبر'' اور اس کے ذیل الذہبی اور ذیل الحسینی سے ماخوذ ہیں)۔

79۔ فاطمہ بنت عبدالرحمان صوفیہؒ

فاطمہ بنت عبدالرحمان بن ابوصالح حرانی، ام محمدؒ بغداد میں ہوئیں اور بچپن ہی میں مصر لے جائی گئیں۔ اپنے والد عبدالرحمانؒ سے حدیث کی روایت کی، صوفیہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ صوف یعنی اون کے کپڑے پہنتی تھیں۔ ساٹھ سال تک اپنے مصلیٰ پر بغیر بستر کے سوئیں۔ ان سے ان کے بھتیجے عبدالرحمان بن قاسم نے حدیث

پڑھی۔انہوں نے طویل عمر پائی تھی۔اسی سال سے زائد عمر میں 312ھ میں وفات پائی۔(المنتظم صفحہ 192 جلد 6)

80۔ریطہ بنت عبید اللہ عابدہؒ

ریطہ بنت عبید اللہؒ عابدہ وزاہدہ تھیں۔شیخ ابوعثمان نیشاپوریؒ دوسرے مشائخ کی صحبت ومعیت میں رہ کر ان کے ملفوظات واقوال یاد کیئے۔ان کی زیارت کے لیے ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔خانہ نشین ہو کر عبادت وریاضت میں مشغول رہتی تھیں۔334ھ میں انتقال کیا۔(المنتظم صفحہ 358 جلد 6)۔

81۔بنت ابوالحسن مکیؒ

بنت ابوالحسن مکی مکہ مکرمہ میں مجاورت واقامت رکھتی تھیں۔نہایت عابدہ، زاہدہ، بزرگ خاتون تھیں۔ان کے والد ابوالحسن ٹوکری بناتے اور فروخت کر کے تیس درہم ان کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔جس سے وہ سال بھر اپنا خرچ چلاتی تھیں۔ایک مرتبہ ان کے والد نے ایک حاجی کے ذریعہ یہ رقم روانہ کی تو انہوں نے اس میں بیس درہم ملا کر پچاس درہم کر دی اور جب اس عابدہ، زاہدہ کو پیش کیا تو پوری رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔اور کہا کہ اس میں بیس درہم مشتبہ شامل ہو گئے ہیں۔(المنتظم صفحہ 361 جلد 6)

82۔رقیہ بنت محمد قشیرؒ

رقیہ بنت محمد بن علی بن وہب قشیریہ علم حدیث میں بڑا مقام رکھتی تھیں۔کئی علماء نے ان سے حدیث کی روایت کی اور ان سے اجازت پائی۔مقام قوص میں پیدا ہوئیں اور وہیں نشو ونما پائی۔بعد میں قاہرہ میں مستقل قیام کر لیا تھا۔اور وہیں 741ھ میں انتقال کیا۔

83۔زینب بنت شیخ احمد رفاعیؒ

زینب بنت شیخ احمد رفاعیؒ نے اپنے والد کے سلسلۂ رفاعیہ سے منسلک رہ کر پوری زندگی زہد وتقویٰ میں بسر کی۔نہایت نیک عابدہ، زاہدہ اور صالحہ خاتون تھیں۔تصوف میں ان کا بڑا مقام تھا۔اس کے ساتھ قرآن حفظ کیا اور حدیث کی روایت کی اور فقہ وفتویٰ میں کمال حاصل کیا۔ان سے ان کی اولاد نے طریقت کی تعلیم وتربیت پائی۔630ھ میں انتقال کیا۔

84۔عائشہ بنت یوسف باعونیہؒ

عائشہ بنت یوسف بن احمد، ام عبدالوہاب باعونیہ صوفیہ، فقیہہ اور شاعرہ تھیں۔لغت اور شعر وادب کی تعلیم اپنے زمانہ کے ارکان سلطنت کی مدح میں قصیدہ کیا۔اسی سلسلہ میں حلب کی زیارت کی، تصوف میں ان کی کئی تصانیف ہیں۔الفتح الحقی صوفیہ کے انداز میں تحریر کیا۔''الملامح اشریفہ فی الآ ثار الاطیفہ''میں صوفیہ کے اشارات بیان کئے ہیں۔اسی طرح''الاشارات الخفیہ فی المنازل العلیہ''اور''المورد الاہنی فی المولد السنی''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا بیان ہے جو مولد النبی الباعونہ کے نام سے مشہور ومطبوع ہے۔صاحب دیوان

شاعرہ تھیں۔ 922ھ میں فوت ہوئیں۔

85۔ عائشہ بنت احمد قرطبیہؒ

عائشہ احمد بن محمد بن خادم قرطبیہ کے دور میں اندلس میں عقل وفہم، علم وادب وفصاحت وبلاغت اور شاعری میں کوئی ان کا ہمسر نہیں تھا۔ اندلس کے ملوک وسلاطین کی مدح میں قصائد کہتی تھیں۔ سلاطین اندلس ان کی سفارش کرتے تھے۔ خط وکتابت پاکیزہ اور حسین وجمیل تھا۔ مصاحف لکھتی تھیں۔ کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ زندگی بھر مجرد رہ کر 400ھ میں اندلس میں انتقال کیا۔

86۔ عائشہ بنت محمد مقدسیہؒ

عائشہ بنت محمد بن عبدالحادی مقدسیہؒ اپنے زمانہ میں دمشق کی سیدۃ المحدثین تھیں۔ امام حافظ حجار سے صحیح بخاری پڑھتی تھی۔ آخری عمر میں حدیث کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان کی جلالت شان کے لیے یہی کافی ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے اور کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ تعلیم میں ان کا اسلوب تعلیم وتدریس نہایت آسان اور سہل تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ اسے زمانہ میں تمام روئے زمین پر سب سے زیادہ مسندہ تھیں۔ 816ھ میں انتقال کیا۔

87۔ عائشہ بنت علی اصفہانیہؒ

عائشہ بنت علی بن عمر بن شبل منہاجیہ جمیریہؒ حدیث کی مشہور عالمہ ھیں۔ انہوں نے بہت زیادہ حدیث کی روایت کی اور دوسروں کو اس کا درس دیا۔ ایک واسطہ سے حافظ ابن حجرؒ نے ان سے روایت کی ہے۔ مصر میں 39ھ میں انتقال کیا۔

88۔ ست العجم بنت نفیسؒ

ست العجم بنت نفیس بن ابوالقاسم بغدادیہ مشہور صوفیہ تھیں۔ بغداد سے نکل کر حلب میں مستقل قیام کر لیا تھا۔ ان کی شخصیت اور تصوف میں علوئے مرتبت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے شیخ اکبر ابن عربی کی کتاب ''المشاہد القدسیہ'' کی شرح قیام حلب کے دوران لکھی اور اسی کے بعد ہی 852ء میں حلب میں انتقال کیا۔

89۔ سارہ بنت احمد حلبیہؒ

سارہ بنت احمد بن عثمان حلبیہؒ کے تذکرہ نگار ابن القاضی نے ان کے حالات بیان کیے ہیں۔ وہ شیخہ؛ استاذ ادیبہ، شاعرہ کے ساتھ صوفیہ تھیں۔ انہوں نے ابن سلموں کو حدیث کی اجازت دینے کے ساتھ تصوف کا خرقہ بھی پہنایا۔ اور امراء وخطباء اور شعراء کو اپنے اشعار سنائے۔ ساتویں صدی میں فوت ہوئیں۔

90۔ زمرد خاتونؒ

زمرد خاتون بنت امیر جاولی دمشق کے سلطان دقاق کی بہن اور تاج الملوک بوری کی زوجہ تھیں۔ بڑی عالمہ،

فاضلہ اور بلند ہمت خاتون تھیں۔ حدیث کی روایت کی کتابوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا اور قرآن مجید حفظ کیا۔ دمشق میں مدرسہ خاتونیہ برانیہ تعمیر کیا۔ جب اس خاتون نے اپنے لڑکے شمس الملوک اسماعیل کو دیکھا کہ اس کا فتنہ فساد بہت بڑھ گیا ہے اور فرنگی عیسائیوں کو اسلامی ملکوں پر حملہ کرنے میں مدد کر رہا ہے تو اپنے غلاموں سے 539ھ میں اس کو قتل کرا دیا اور اس کے بعد حالات میں بہتری پیدا ہوگئی تو زمرد خاتون نے بغداد اور مکہ مکرمہ میں کچھ دن رہ کر مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت ان کے پاس دولت اور مال میں سے کچھ نہیں رہ گیا تھا تو مزدوری پر گیہوں جو صاف کر کے آٹا پیستی تھیں اور اسی پر گذر بسر کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ 557ھ میں اسی حال میں انتقال کیا اور جنۃ البقیع میں دفن کی گئیں۔

91۔ ست الوزراء تنوخیہؒ

ست الوزراء بنت عمر بن اسعد تنوخیہ حنبلیہ ''وزیرہ'' کے لقب سے مشہور اور فقیہہ اور محدثہ تھیں۔ صحیح بخاری کی روایت امام ابوعبداللہ زبیدیؒ سے کر کے خود اس کی روایت کی۔ نیز دمشق اور مصر میں مسند شافعیؒ متعدد بار روایت کی۔ ان کی شہرت کا یہ حال تھا کہ دور دراز مقامات سے طلبہ ان کی درس گاہ میں آ کر حدیث کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ مسندہ الوقت تھیں۔ بڑی عمر میں 716ھ میں دمشق میں فوت ہوئیں۔

92۔ زینب بنت عبدالرحمان شعریہؒ

زینب بنت عبدالرحمان بن حسن مرجانی شعری، ام المؤید اپنے زمانہ کی مشہور فقیہہ، محدثہ تھیں ------ سے حدیث کی تعلیم پائی تھی۔ بہت سے محدثین نے ان کو روایت کی اجازت دی تھی۔ نیشاپور میں 615ھ میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال سے سند عالی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ (یہ حالات الاعلام زرکلی جلد نمبر 3 سے ماخوذ ہیں)

''خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات''

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری

خطاطی اور کتابت وانشاء کی ماہر خواتین

ان خواتین میں بہت سی کاتبات ومنشیات بھی ہیں جنہوں نے فن انشاء اور حسن کتابت وخطاطی میں نام پیدا کیا ہے اور امراء وسلاطین نے سرکاری مراسلات ومکاتبات میں ان سے کام لیا ہے۔

ام الفضل فاطمہ بنت حسن بن علی الاقرع بغدادیہ کاتبہ، بنت الاقرع کی کنیت سے مشہور ہیں۔ فن خطاطی و خوشنویسی میں استاد زمانہ تھیں۔ مشہور ابن البواب کے خط کی پوری نقل کرتی تھیں اور اہل علم ان سے خطاطی سیکھتے تھے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے:

(ترجمہ) ''فاطمہ کاتبہ کے طرز خط پر لوگوں نے اپنے خط درست کئے۔ وہ ابن البواب کاتب کے خط کی نقل کرتی تھیں۔'' (العبر صفحہ 296 جلد 3)

بنت الاقرع کو ان کے حسن خط کی وجہ سے وزیر ابونصر عبدالملک کندری نے بلاد جبل بلایا اور دیوان عزیزی عیسائی اور شاہ روم کے مابین صلح نامہ کی کتابت کرائی۔ یہ صلح نامہ صرف ایک روز میں لکھا گیا تھا جس پر بنت الاقرع کو ایک ہزار دینار دیئے گئے تھے۔ (المنتظم صفحہ نمبر 40 جلد 9)

امتہ العزیز خدیجہ بنت یوسف عالمہ، فاضلہ اور محدثہ تھیں اور ساتھ ہی مشہور خوشنویس تھیں اور اس فن کے مشاہیر سے خطاطی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ امام ذہبی کا بیان ہے کہ:

(ترجمہ) ''انہوں نے خطاطوں کی ایک جماعت سے خوشنویسی سیکھی تھی۔''

فخر النساء شہرہ بنت احمد کاتبہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کا خط نہایت پاکیزہ اور حسین تھا۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) ''ان کا خط حسین وجمیل تھا۔'' (المنتظم صفحہ 288 جلد 10)

ابن خلکان نے ان کے حسن خط کے بارے میں لکھا ہے:

(ترجمہ) ''وہ علماء میں سے تھیں اور ان کا خط نہایت عمدہ تھا۔'' (ابن خلکان صفحہ 245 جلد 1)

اندلس کی مشہور کاتبہ اور ادیبہ مرنہ امیر الناصر الدین اللہ کے خاص کاتبہ ومنشیہ تھیں اور ان کا خط نہایت حسین وجمیل تھا۔ 358ھ میں فوت ہوئیں۔ (بغیۃ الملتمس صفحہ 530)

منیہ کاتبہ خلیفہ معتمد علی اللہ عباسی کی باندی تھیں۔ فن کتابت وانشاء میں خاص شہرت رکھتی تھیں اور الکاتبہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ انہوں نے حدیث کی تعلیم ابوالطیب محمد بن اسحاق بن یحییٰ الوشا سے پائی تھی۔ اور ان سے عبید اللہ بن حسین بن عبد اللہ بزار انباری نے روایت کی تھی۔ (تاریخ بغداد صفحہ 442 جلد نمبر 14)

اندلس کی عالمات وفاضلات میں صفیہ بنت عبد اللہ حسن خط میں شہرت کی مالک تھیں۔ ایک مرتبہ ایک عورت نے ان کے خط میں عیب نکالا تو اس کے جواب میں یہ اشعار کہے:

و عاتبة خطی فقلت لها اقصری ... فسوف اریك الدرفی نظم مسطری
و نادیت کفی کی تجور بخطها ... و قربت اقلامی و ودقی و محبری
فخطت بابیات ثلاث نظمتها ... لیبد و لها خطی و قلت لها انظری

(بغیۃ الملتمس صفحہ 528)

عالمات اندلس میں سے لبنیٰ نامی ایک کاتبہ اور منشیہ خلیفہ حکم بن عبد الرحمان اموی کی خاص کاتبہ تھیں اور سرکاری خط وکتابت کی ذمہ داری سنبھالتی تھیں۔ اور ان کو فن کتابت میں حذاقت اور طہارت حاصل تھی۔ خط نہایت پاکیزہ تھا۔ علم الحساب میں بھی ماہر تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ شاعری، نحو، عروض اور دیگر علوم وفنون سے حصہ وافر رکھتی تھیں۔ (بغیۃ الملتمس صفحہ 530)

عائشہ بنت عمارہ بن یحییٰ شریف بجاویہ الفریقیہ، ادیبہ وشاعرہ تھیں۔ ان کا خط نہایت پاکیزہ تھا اور پختہ تھا۔ ایک کتاب اٹھارہ جلدوں میں اپنے خط سے نقل کی تھی۔ (عنوان الدرایہ صفحہ 47)

بحوالہ: خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات
حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری

مدارس و مکاتب میں عظیم خواتین کا کردار

چوتھی صدی کے اندر موجود مدارس کا انتظام ہوا۔اس سے پہلے عام طور پر اہل علم اپنے مکانوں اور محلہ کی مسجدوں اور جامع مسجدوں میں تعلیمی حلقے قائم کرتے تھے جن کی افادیت آج کل کے جامعات اور دار العلوم سے کسی طرح کم نہ تھی۔قدیم زمانہ میں عالمات و فاضلات نے بھی عام طور سے اپنے اپنے گھروں میں اپنے درس کے حلقے قائم کئے بعد میں جب کارواج ہوا تو انھوں نے نسوانی مدرسے جاری کیے۔

بنات اسلام کی طرف سے سب سے پہلا مدرسہ مغرب اقصیٰ کے شہر فاس میں 245 ھ میں قائم ہوا جو آج بھی جامع قرومین کے نام سے موجود ہے اور اس کا فیض عالم اسلام کی عظیم درس گاہ کی حیثیت سے جاری ہے۔ اس کی تعمیر کا سہرا فاس کی ایک عابدہ زاہدہ نیک دل خاتون ام البنین فاطمہ بن محمد عبداللہ فہریہ رحمۃ اللہ علیہا کے سر ہے۔اس نے جامع قرومین کی زمین خریدنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا تاکہ اس میں حرام کا مال لگنے کا شبہ نہ ہو اور بنیاد کے دن سے تعمیر مکمل ہونے تک اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے روزہ رکھا۔قبیلہ ہوارہ کے ایک آدمی سے زمین خریدی، خاندانی وراثت کے مال سے قیمت ادا کی اور شنبہ یکم رمضان 245 ھ میں بنیاد رکھی۔

اس طرح ام البنین کی بہن مریم بنت محمد بن عبداللہ فہریہ رحمۃ اللہ علیہا نے اسی سال 245 ھ میں ایک مسجد تعمیر کرائی جس میں اپنے والد سے پائی ہوئی وراثت کا مال خرچ کیا۔بعد میں یہ مسجد جامع الاندلس کے نام سے مشہور ہوئی اور اس سے بھی صدیوں تک علوم وفنون کا سرچشمہ جاری رہا۔اور چوتھی صدی میں اس کو جامع قرومین کی شاخ قرار دے دیا گیا۔(حاضر العالم الاسلامی)

اندلس کی مشہور عالمہ فاطمہ غالیمہ بنت محمد عورتوں کو ہر قسم کی تعلیم دیتی تھیں۔اسی وجہ سے ''المعلمۃ'' کے لقب سے مشہور ہوئیں (بغیۃ الملتمس صفحہ 531)

اندلس ہی کی دوسری عالمہ مریم بنت ابو یعقوب شالبیہ تھیں جنھوں نے اندلس سے مکہ مکرمہ آ کر حج ادا کیا تھا۔اور حاجہ مشہور ہوئی تھیں۔ان کے حال میں لکھا ہے عورتوں کو علم و ادب کی تعلیم دیتی تھیں اور دینداری و بزرگی میں بلند مقام رکھتی تھیں۔انہوں نے طویل عمر پائی۔(بغیۃ الملتمس 528)

ان دونوں فاضلات و عالمات کے باقاعدہ نسوانی مدرسے تھے جن میں وہ مستقل طور سے عورتوں کو تعلیم دیا کرتی تھیں۔

مکہ مکرمہ کے قاضی شیخ شہاب الدین طبری کی صاحب زادی ام الحسین محدثہ وفقیہہ اور عابدہ وزاہدہ عورت تھیں۔انہوں نے مکہ مکرمہ میں بہت سے رفاہ عام کے کام کیے۔جن میں کتاب الایتام یعنی یتیموں کے لیے

مکتب بھی تھا۔ اس مدرسہ کو تعمیر کر کے مکہ میں اور باہر بہت سی جائداد وقف کی تا کہ یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت ہو۔ (العقد الثمین صفحہ نمبر 342 جلد نمبر 8)

مکہ مکرمہ میں مدرسہ قاتیبائی کے قیام و اجراء میں ایک نیک دل خاتون کے اخلاص و ایثار کو بڑا دخل تھا اور یہ شاہی مدرسہ ایک فقیرہ کے جذبہ ایثار کی نشانی تھا۔ 883ھ میں مصر کے سلطان قاتیبائی نے مکہ مکرمہ کے شاہی وکیل کو لکھا کہ اس کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا جائے جس میں مذاہب اربعہ کی تعلیم دی جائے۔ اسی کے ساتھ ایک رباط تعمیر کی جائے۔ جس میں یتیموں کے لیے بہتر کمرے بنوائے جائیں اور مدرسہ کے طلبہ کو بقدر کفایت وظیفہ جاری کیا جائے۔ وکیل نے مدرسہ کے لیے جگہ تلاش کی تو بنوالحسن کی خاتون شریفہ شمسیہ نے اپنا ذاتی مکان پیش کر دیا جس کو خرید کر مدرسہ تعمیر کیا گیا۔ یہ مدرسہ باب الاسلام اور باب النبیؐ کے درمیان واقع تھا اور اس کا فیض مدتوں جاری رہا۔ (تاریخ مکہ احمد سباعی صفحہ 227)

یمن کے شہر زبین میں مدرسہ ام السلطان الجاہد تھا جس کے مدرس شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن عمر علوی تھے۔ دمشق میں مدرسہ نمداداویہ اور مدرسہ خاتونیہ برانیہ مشہور مدارس میں شمار ہوتے تھے جن کی تعمیر خواتین نے کی تھی اور علماء اور محدثان مین درس دیا کرتے تھے۔ خواتین کے دوسرے مدارس کا ذکر بعد میں آ رہا ہے۔

بحوالہ: خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات
حضرت مولانا قاضی اظہرؒ صاحب مبارکپوری

عظیم لوگوں کی عظیم مائیں

خواتین اسلام نے ملکۃ البیت اور راعیۃ الدار بن کر اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت میں پوری دل چسپی لی ہے اور اپنی بہترین کوشش ومحنت سے اپنے بچوں کو دینی علوم میں امامت وسیادت کا وارث بنایا ہے۔ ذیل کے چند واقعات سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ آج کی ماؤں کے لیے ان کے واقعات میں بڑی عبرت ہے۔

موقع کی مناسبت سے ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ امام یزید بن ہارون واسطی، متوفی 206 ھ رحمۃ اللہ علیہ تبعہ تابعین میں بڑے مقام ومرتبہ کے مالک ہیں۔ وہ اپنی طالب علمی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں طلب علم میں کئی سال تک اپنے اہل وعیال سے دور رہا۔ بغداد پہنچا تو معلوم ہوا کہ مقام عسکر میں ایک تابعی عالم ہیں۔ میں ان کی خدمت میں گیا اور حدیث بیان کرنے کی گذارش کی تو انہوں نے ایک حدیث بیان کی۔

(ترجمہ) ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کو اللہ تعالیٰ کسی مصیبت میں مبتلا کرے تو اس کو صبر کرنا چاہئے۔ پھر صبر کرنا چاہئے پھر صبر کرنا چاہئے۔''

شیخ نے یہ حدیث بیان کر کے کہا کہ اس کے علاوہ اور کوئی حدیث نہیں بیان کروں گا۔ اس کے بعد میں اپنے وطن واپس چلا آیا۔ رات گئے گھر پہنچا اور گھر والوں کی نیند کے خلل کی وجہ سے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا اور کسی طرح کھول کر اندر گیا۔ میری بیوی چھت پر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اوپر آ کر دیکھا کہ بیوی سوئی ہوئی ہے اور ایک نوجوان بھی اس کی بغل میں سویا ہوا ہے۔ میں نے پتھر اٹھا کر اس کو مارنا چاہا مگر عسکر کے شیخ کی حدیث یاد آ گئی اور رک گیا۔ اسی طرح دو تین بار پتھر اٹھایا اور رک گیا اسی دوران میری بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جوان کو جگایا اور کہا کہ اٹھو اپنے باپ سے ملو اور لڑکے نے اٹھ کر میری پذیرائی کی۔ جس وقت میں طلب علم کے سفر میں نکلا تھا تو میری بیوی حمل سے تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ حدیث پر عمل کی برکت ہے۔ (آثار البلاد واخبار البلاد صفحہ 480)

والدہ امام مالکؒ

امام دار الہجرت حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ کا نام عالیہ بنت شریک بن عبدالرحمان بن شریک ازدی ہے۔ (جمہرۃ انساب العرب صفحہ 436) بڑی عاقلہ فاضلہ خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے مالکؒ کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ کی۔ امام صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنی ماں سے کہا کہ میں علم دین

حاصل کروں گا تو کہا کہ آؤ۔ میں تم کو علماء کا لباس پہنا دوں۔ پھر مجھ کو اپنے کپڑے پہنائے میرے سر پر طویلہ (سیاہ ٹوپی) رکھی اس کے اوپر عمامہ باندھا اور کہا کہ:

(ترجمہ) ''ربیعہ رائیؒ کی مجلس میں جاؤ اور ان کے علم سے پہلے ان کے اخلاق و آداب سیکھو۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ ماں نے کہا:

(ترجمہ) ''اب جاؤ حدیث لکھو، پڑھو۔'' (المحدث الفاضل صفحہ 201، ترتیب المدارک صفحہ نمبر 119 جلد 1)

اس وقت امام ربیعہ رائیؒ کا درس مسجد نبوی میں قائم ہوتا تھا اور مدینہ کے اعیان و اشراف ان کے حلقہ میں جمع ہوتے تھے۔ وہ امام مالکؒ کے پہلے شیخ اور استاد ہیں۔ والدہ کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی اور لڑکا ان کی مجلس سے امام اسلام بن کر اٹھا۔

والدہ امام سفیان بن عینیہؒ

حضرت سفیان بن عینیہ ہلالی رحمتہ اللہ علیہ جلیل تبع تابعی عالم اور امام شافعی کے استاد ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اگر مالکؒ و سفیان نہ ہوتے تو حجاز سے علم ختم ہو گیا ہوتا۔ ان کی والدہ ماجدہ نے ان کو علم و دین کی تعلیم جس انداز سے دلائی وہ مسلمان ماؤں کے لیے باعث عبرت ہے۔ دکیع بن جراح امام ابن عینیہ کے شاگرد ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ سفیان کی والدہ نے ان سے کہا:

(ترجمہ) ''پیارے بیٹے! تم علم حاصل کرو، میں کتائی کر کے تمہاری ضروریات پوری کروں گی۔ بیٹے، جب تم دس حدیث لکھ لو (پڑھ لو) تو اپنے بارے میں غور کرو اور دیکھو کہ چال چلن، تحمل اور وقار میں اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اگر یہ باتیں نہ دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ علم تمہارے حق میں مضر ہے نافع نہیں ہے۔'' (تاریخ جرجان سہمی صفحہ 449)

والدہ کی خصوصی توجہ اور نصیحت کے مطابق امام ابن عینیہ نے 78 سے زائد علماء تابعین سے حدیث کی روایت کی اور ان کا شمار حکمائے حدیث میں ہوا اور خلق اللہ نے ان سے علم دین حاصل کیا۔

امام ابن عینیہ اپنی مجلس میں طلبہ کے سامنے بیان کرتے تھے کہ جس وقت میں ابن شہاب زہری کی مجلس میں گیا۔ میرے کان میں بند تھے اور سر پر چوٹیاں تھیں۔ زہری نے مجھے آتا ہوا دیکھ کر کہا: ''واسنینہ واسنینہ یہاں بیٹھو، یہاں بیٹھو۔ میں نے اس سے چھوٹا طالب علم نہیں دیکھا۔''

نضر ہلالی کا بیان ہے کہ میں سفیان بن عینیہؒ کی مجلس درس میں تھا کہ ایک بچہ آیا جس کو اہل مجلس حقارت سے دیکھنے لگے۔ ابن عینیہؒ نے ان سے کہا کہ پہلے تم لوگ بھی ایسے ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اے نضر اگر تم مجھے اس وقت دیکھتے تو تعجب کرتے جب میری عمر دس سال کی تھی۔ میری لمبائی پانچ بالشت تھی۔ میرا چہرہ دینار کی طرح تھا۔ اور میں خود شعلہ نار کی طرح تھا۔ میرے کپڑے انگے، میری آستین چھوٹی، میرا دامن مناسب مقدار میں، میرا جوتا چوہے کے کان کی مانند تھا اور میں مختلف شہروں کے علماء جیسے ابن شہاب زہری اور عمرو بن دینا کی مجلس میں آتا جاتا تھا۔ اور ان کے حلقہ درس میں کھونٹی کی طرح بیٹھتا

تھا۔ میری دوات اخروٹ کی طرح میرا قلم دان موزے کی مانند اور میرا قلم پستہ جیسا ہوتا تھا۔ جب میں مجلس میں جاتا تو اہل مجلس کہتے کہ چھوٹے شیخ کے لیے جگہ خالی کرو۔ (الکفایہ صفحہ 60-61)

والدہ امام اوزاعی

شیخ الاسلام امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ کا نام عبدالرحمان بن عمرو بن محمد اوزاعی ہے۔ ان کا فقہی مسلک تیسری صدی تک جاری رہا۔ اسی ہزار مسائل کے جواب زبانی دیئے، عالم ربانی تھے اور یہ سب ان کی والدہ ماجدہ کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا۔ یتیم تھے، ماں نے ان کی پرورش کی اور شیخ الاسلام کے مرتبہ کو پہنچایا۔ ان کے حال میں لکھا ہے کہ:

(ترجمہ) ''بعلبک میں پیدا ہوئے۔ اپنی ماں کی گود میں یتیمی میں پرورش پائی اور جیسا ادب ماں نے سکھایا سلطان اپنی اولاد کو ویسا ادب سکھانے سے عاجز ہیں۔'' (تذکرہ الحفاظ صفحہ 169 جلد 1)

ایک روایت میں ہے کہ امام اوزاعی بعلبک میں پیدا ہوئے، مقام کرک میں نشو ونما پائی۔ اس کے بعد ان کی والدہ ان کو بیروت لے گئیں اور وہیں انتقال فرمایا۔ امام اوزاعی کے بڑے مناقب اور فضائل ہیں۔

والدہ امام ابن علیہؒ

ریحانتہ الفقہاء والمحدثین امام اسماعیل بن ابراہیم بن مقسم بصریؒ اپنی ماں کی نسبت سے ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہیں۔ ان کے دادا مقسم سندھ کے علاقہ قیقان (گیگان، قلات) کے قیدی بن کر عبدالرحمان بن اسد بن قطبہ اسدی کے غلام ہوئے اور والد ابراہیم کوفہ میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں وہ بصرہ آتے جاتے تھے۔ وہیں بصرہ میں علیہ بنت حسان سے شادی کر لی جو بنی شیبان کی باندی تھیں۔ اس کو کے بارے میں ابن سعد طبقات کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ:

(ترجمہ) ''وہ بڑی محترم، عقل مند، ممتاز عورت تھیں۔ بصرہ کے محلہ عوقہ میں اس کا مکان اسی کے نام سے مشہور تھا اور حضرت صالح مری اور بصرہ کے اعیان واشراف اور فقہا اس کے ہاں آتے جاتے تھے اور وہ نکل کر ان سے دینی وعلمی مسائل میں گفتگو کرتی تھی۔''

اسی عالمہ فاضلہ ماں کے بطن سے 110ھ میں امام اسماعیل بصریؒ پیدا ہوئے جس نے ان کو اپنی پرورش اور تعلیم وتربیت سے فقہاء مورثین کا صدر نشین بنایا۔ مشہور محدث عبدالوارث کا بیان ہے کہ علیہ بن حال اپنے لڑکے اسماعیل کو میرے پاس لائی۔ یہ بصرہ کا حسین ترین لڑکا تھا اور کہا کہ:

(ترجمہ) ''یہ میرا بیٹا آپ کے پاس رہے گا اور آپ سے اخلاق سیکھے گا۔''

میں اس لڑکے کو اپنے ساتھ رکھتا تھا اور جب اہل علم کی مجلس کے پاس سے گذرتا تو پہلے اس کو بھیج دیتا۔ اس کے بعد مجلس کے شیخ کے پاس جاتا تھا۔

امام عبدلاوارث نے اپنے شاگرد کی تعلیم وتربیت اس طور سے کی کہ اہل علم کی نظر میں شاگرد استاد سے بڑھ گیا۔

مشہور محدث امام ابراہیم حربی کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''جب ابن علیہ اپنے شیخ عبدالوارثؒ کی مجلس سے نکلے تو اہل بصرہ شک نہیں کرتے تھے کہ وہ علم حدیث میں عبدالوارث سے زیادہ ثقہ ہیں۔ (تاریخ بغداد صفحہ 231 جلد نمبر)

والدہ امام شعبہ بن حجاجؒ

امام شعبہ بن حجاج واسطی بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک اور حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہما کی زیارت کا شرف پایا ہے اور چار سو تابعین سے حدیث کی روایت کی ہے۔ ان کی والدہ محترمہ عالمہ فاضلہ تھیں اور اپنے بیٹے کی تعلیم پر خصوصی نظر رکھتی تھیں۔ امام شعبہؒ کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''میری ماں نے بتایا کہ یہاں عورت کے ہاں جا کر حضرت عائشہؓ کی حدیث سن لو''

اور والدہ کی ہدایت کے مطابق میں نے اس عورت کے یہاں جا کر حضرت عائشہؓ کی حدیثیں سنیں اور والدہ کو بتایا کہ میں نے اس عورت کے یہاں جا کر احادیث کا سماع کر لیا۔ تو انہوں نے کہا کہ لا یسالک اللہ یعنی اللہ تعالیٰ اب تم سے علم دین میں کوتاہی کا سوال نہیں کرے گا۔ (طبا قات ابن سعد صفحہ 281 جلد نمبر 7)

جس بیٹے کی ماں علم حدیث میں اتنی وسیع نظر رکھتی ہو اس کا بیٹا کیوں نہ امامت کے درجہ کو پہنچے گا۔ بقول امام احمد بن حنبلؒ شعبہ رجال کے علم و حدیث کی بصیرت میں امت وحدہ، اور بقول سفیان ثوریؒ امیر المؤمنین فی الحدیث تھے۔

والدہ امام شافعیؒ

حضرت امام شافعی کا نام محمد بن ادریس بن عباس ہے۔ والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ بنت عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابو طالب ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں شافعیؒ شکم مادر میں تھے۔ میں نے ایک خواب دیکھا کہ مشتری ستارہ میرے جسم سے نکلا اور مصر پر گر گیا جس کی روشنی ہر شہر میں پہنچی۔ اس کی تعبیر بیان کی گئی کہ ان کے بطن سے ایسا عالم پیدا ہو گا جس کا علم مصر سے تمام شہروں میں عام ہو گا۔ (تاریخ بغداد صفحہ 58 جلد 2)

امام صاحب یتیم تھے۔ ان کے والد کا انتقال پیدائش سے پہلے یا بعد میں ہوا۔ اور ان کی والدہ نے پرورش و تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ امام صاحب کا بیان ہے کہ میں یتیم تھا۔ والدہ میری کفالت کرتی تھیں۔ میں 150ھ میں ملک شام کے شہر غزہ میں پیدا ہوا۔ دو سال کی عمر میں مکہ لایا گیا۔

دوسری روایت میں ہے کہ میں عسقلان میں پیدا ہوا۔ میری والدہ مجھ کو مکہ لائیں۔ میری والدہ کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ اور میں مکہ میں مکتب کے معلم کی خدمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں بچوں کو سبق پڑھا دیتا تھا۔ اور وہ مجھ مفت تعلیم دینے پر راضی ہو گیا۔ میں علماء کی مجلس میں احادیث اور مسائل سن کر یاد کر لیتا تھا۔ میری ماں کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ کاغذ پر لکھ سکوں۔ ادھر ادھر سے ہڈیاں، ٹھیکرے کھجور کے پتے چن کر ان

ہی پر احادیث وغیرہ لکھ لیا کرتا تھا۔ یمن کا سفر درپیش ہوا تو میری ماں کے پاس رقم نہیں تھی کہ سفر کی تیاری کروں اور کپڑے وغیرہ بنواؤں۔ اس لیے ماں کی ایک چادر سولہ دینار میں رہن کر کے سامان سفر مہیا کیا۔ (مختصر تاریخ ائمہ اربعہ)

والدہ امام احمد بن حنبلؒ

حضرت امام احمد بن حنبل شیبانی بغدادیؒ کی والدہ کا نام صفیہ بنت میمونہ عبدالملک شیبانی تھا۔ امام صاحب تین سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد اور دادا کو نہیں دیکھا۔ میری والدہ نے میری پرورش کی۔

امام صاحب کی والدہ نے اپنے یتیم بچے کو بڑے اہتمام اور پیار و محبت سے تعلیم و تربیت دی۔ حتی کہ اس زمانہ کے امرا اس پر رشک کرنے لگے۔ ابوسراج کا بیان ہے کہ میرے والد احمد بن حنبلؒ کے حسن سیرت و شرافت کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر کافی دولت خرچ کرتا ہوں۔ ان کے لیے علم و ادب کا انتظام کرتا ہوں تا کہ وہ ادب سیکھیں مگر نامراد ہو رہا ہوں اور یہ احمد بن حنبل یتیم لڑکا ہے دیکھو کیسا اچھا چل رہا ہے۔

امام صاحبؒ کی والدہ جب تک زندہ رہیں اپنے بیٹے کی ہر طرح خبر گیری کرتی رہیں اور ان کی شفقت و محبت ہر حال میں ان کے شامل حال رہی۔ **186** ھ میں جب کہ امام صاحب کی عمر بائیس سال کی تھی، دریائے دجلہ میں زبردست سیلاب آیا، ان ہی ایام میں ملک کے محدث جریر بن عبدالحمید بغداد آئے۔ امام صاحب کے ساتھ اس سیلاب میں تحصیل حدیث کے نلئے گئے۔ مگر امام صاحب کی ماں نے جانے کی اجازت نہیں دی تو نہ جا سکے۔

اسی طرح جب امام صاحب صبح کو اندھیرے میں کسی محدث کے پاس اس کی مجلس میں جانا چاہتے تو والدہ نہایت شفقت و محبت سے روک دیتی تھیں۔ امام صاحب کا بیان ہے کہ بسا اوقات میں منہ اندھیرے حدیث کی تعلیم کے لیے نکلنا چاہتا تھا تو میری والدہ میرے کپڑے پکڑ کر کہتی تھیں کہ صبح ہونے دو اس کے باوجود میں اندھیرے ہی میں ابوبکر بن عیاش کی مجلس درس میں پہنچ جاتا تھا۔ (مناقب الامام احمد صفحہ **14** صفحہ **28**)

امام صاحب بھی اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ نہایت ادب و احترام کے ساتھ اور سعادت مندی سے پیش آتے تھے۔

ایک مرتبہ امام صاحب کی والدہ کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ اسی زمانے میں زکوۃ کی رقم آئی تو یہ کہہ کر واپس کر دی کہ لوگوں کے مال کے میل کچیل سے عریانی بہتر ہے۔ کچھ دن یہاں رہ کر کوچ کرنا ہے۔

والدہ امام بخاریؒ

شیخ الاسلام والمسلمین امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ یتیم تھے۔ والدہ ماجدہ نے ان کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی اور بچپن ہی میں ان کو تحصیل علم کا شوق دلایا۔ ان کی ولادت **194** ھ میں ہوئی اور گیارہ بارہ سال کی عمر میں حدیث کا پہلا سماع **205** ھ میں کیا اور بچپن ہی میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتابیں زبانی یاد کر لیں

اور اپنے شہر کے محدثین محمد بن سلام، محمد بن عبداللہ مسندی، محمد بن یوسف بیکیزی سے حدیث کی روایت کی اور ستر ہزار احادیث یاد کر لی تھیں۔ سلیم بن مجاہد کا بیان ہے کہ ایک دن میں محمد بن سلام کی مجلس درس میں ذرا دیر سے پہنچا۔ اس کے بعد میں نے محمد بن اسماعیل سے مل کر پوچھا کہ تم ہی کہتے ہو کہ مجھے ستر ہزار احادیث یاد ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، بلکہ اس سے زیادہ۔ (طبقات کبریٰ، شعرانی صفحہ 171 جلد 17)

امام بخاری اپنے شہر کے علماء ومحدثین سے تحصیل علم کے بعد اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ علمی سفر پر نکلے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے:

(ترجمہ) ''امام بخاریؒ نے بحالت یتیمی نشوونما پائی اور 210ھ میں اپنے شہر کی احادیث پڑھنے کے بعد اپنی ماں اور بہن کے ساتھ علمی سفر پر نکلے۔'' (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ صفحہ 218 جلد 2)

اس وقت امام صاحبؒ کی عمر پندرہ سولہ سال تھی اور اٹھارہ سال کی عمر میں تاریخ الکبیر تصنیف فرمائی۔ ان کا بیان ہے کہ جب میں اٹھارہویں سال میں داخل ہوا تو صحابہ اور تابعین کے قضایا واقوال کی تدوین کرنے لگا۔ اسی زمانہ میں کتاب تاریخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے پاس چاندراتوں میں تصنیف کی۔ (تاریخ بغداد صفحہ 3 جلد 2)

ایک روایت میں ہے کہ امام صاحب نے اپنی والدہ اور بڑے بھائی احمد کے ساتھ ساتھ سفر حج کیا۔ حج کے بعد بھائی وطن چلے گئے اور امام صاحب تحصیل علم کرنے لگے۔

امام بخاریؒ کی تصانیف میں الجامع الصحیح اور التاریخ الکبیر شاہکار ہیں۔ اور صحیح بخاری تو اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانی گئیں ہیں اور یہ ان کی والدہ ماجدہ کی توجہ کا فیض ہے کہ ان کا یتیم لڑکا امیر المؤمنین فی الحدیث کے مرتبہ کو پہنچا۔

والدہ امام الاوقصؒ

قاضی مکہ حضرت محمد بن عبدالرحمان الاوقص کا واقعہ عجیب ہے۔ ان کی گردن ان کے بدن میں گھسی ہوئی تھی اور دونوں مونڈھے نکلے ہوئے تھے۔ قد پستہ تھا، شکل وصورت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان کی والدہ بڑی عاقلہ فاضلہ تھیں۔ ان کو اپنے اس لڑکے کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا:

(ترجمہ) ''اے بیٹے! تم جس جماعت میں جاؤ گے لوگ تم سے ہنسی مذاق کریں گے۔ اس لیے تم علم حاصل کرو، وہ تمہیں سربلند کرے گا۔''

دوسری روایت میں امام الاوقص کا بیان ہے کہ:

(ترجمہ) ''میری ماں سمجھدار تھیں۔ اس نے کہا کہ بیٹے! تمہاری خلقت ایسی ہے کہ جوانوں میں تم بیٹھ نہیں سکتے ہو۔ اس لیے علم دین حاصل کرو۔ وہ کمی کو پورا کر دے گا۔ اور حقارت کو ختم کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بات سے مجھے نفع پہنچایا۔ میں نے فقہ اور دین کا علم حاصل کیا اور قاضی بن گیا۔

امام اوقص بیس سال تک مکہ مکرمہ میں قاضی رہے۔ ان کے رعب وداب کا حال یہ تھا کہ فیصلہ چاہنے والے

ان کے سامنے کانپتے تھے۔ایک مرتبہ وہ دعا کر رہے تھے اور کہتے تھے:

(ترجمہ)''اے اللہ میری گردن کو نار جہنم سے بچا۔''

ایک منچلی عورت یہ جملہ سن کر بولی:

(ترجمہ)''بھتیجے! تیری گردن ہی کہاں ہے؟''

والدہ امام عمر بن ہارون بلخیؒ

امام ابو حفص عمر بن ہارون بلخی ثقفی رحمتہ اللہ علیہ اپنے دور میں خراسان کے مشاہیر علماء محدثین میں سے تھے۔علوم دین کے مخزن تھے۔ان کی والدہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اور اپنے لڑکے کے علمی مشاغل میں ہاتھ بٹاتی تھیں۔ایک عالم ابو غسان بیان کرتے ہیں:

(ترجمہ)''مجھے معلوم ہوا کہ ان کی والدہ حدیث لکھنے میں ان کی مدد کرتی تھیں۔ (تذکرہ الحفاظ صفحہ نمبر 311 جلد 1)

انہوں نے امام مالک، امام ابن جریج، امام سغبہ بن حجاج، امام سفیان ثوری وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ان کے تلامذہ میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری کے والد اسماعیل بن ابراہیم جیسے حضرات ہیں۔

والدہ امام زین الدینؒ دمشقی

امام زین الدین علی بن ابراہیم دمشقی مصریؒ کی والدہ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں ان کے والد کی تفسیر الجواہر جو تیس جلدوں میں تھی ان کو زبانی یاد تھی اور وہ اپنے لڑکے زین الدین کی تعلیم پر بڑی توجہ دیتی تھیں۔اور جب وہ تفسیر پڑھ کر آتے تھے تو وہ پوچھا کرتی تھیں کہ آج کیا پڑھا ہے۔پھر مزید باتیں بتاتی تھیں اور ان کو دعا دیتی تھیں۔ جس سے زین الدین کو بڑا فیض پہنچا۔ایک عالم ناصح الدین کا قول ہے:

(ترجمہ)''زین الدین اپنی والدہ کی دعا سے فیض یاب ہوئے۔وہ نیک، حافظ قرآن اور تفسیر کی عالمہ تھیں۔''(طبقات الحنابلہ صفحہ 440 جلد 1 وغیرہ)

زین الدین اپنی والدہ کی دعا اور توجہ سے فقہ و تفسیر کے زبردست عالم اور واعظ تھے۔

والدہ امام حجاج بن یوسف بغدادیؒ

امام ابو احمد حجاج بن یوسف بن حجاج بغدادیؒ، حجاج ابن الشاعر کے نام سے مشہور ہیں۔حافظ حدیث مامون وثقہ اور اپنے زمانے کے یکتا محدث تھے اور یہ مقام ان کو ان کی والدہ کے تعاون و توجہ سے ملا۔ان کا بیان ہے:

(ترجمہ)''میری والدہ نے ایک سو روٹی کا انتظام کیا جن کو میں نے ایک قبیلے میں رکھا اور بغداد میں جا کر امام شبانہ کی خدمت میں سو دن رہا، روزانہ ایک روٹی دریائے دجلہ میں بھگو کر کھاتا تھا۔جب روٹیاں ختم ہو گئیں تو وہاں سے چلا آیا۔(تذکرۃ الحفاظ صفحہ 118 جلد 2)

ان کے شیوخ میں ام ابوداؤد طیاسی، امام یعقوب بن ابراہیم، امام حجاج الاعور اور امام شبانہؒ وغیرہ ہیں اور امام ب:داؤد بحبتانی، امام مسلم، امام قی بن مخلد اور ام عبدالرحمان بن ابوحاتم وغیرہ نے ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کی ہے۔

والدہ امام ابراہیم حربیؒ

امام ابواسحاق ابراہیم بن اسحاق حربی بغدادی متوفی 285ھ امام احمد بن حنبلؒ کے معاصر اور علم وعمل، زہدو تقویٰ میں ان ہی کے مانند تھے۔ بڑے مقام ومرتبہ کے بزرگ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ''میں روزانہ عشاء کے وقت گھر آتا تھا اور میری والدہ میرے لیے بادنجان بھون کر یا قہوہ کا چاٹ یا مولی کا سالن تیار رکھتی تھی جس کو میں کھالیتا تھا۔ میں بڑی فقر وفاقہ اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتا تھا مگر کبھی اپنی والدہ، بھائی، بہن اور بیوی سے شکایت نہیں کی۔ مرد وہ ہے جو اپنا غم خود اٹھائے اور اہل وعیال کو غمگین نہ کرے۔ (المنتظم صفحہ 4 جلد 6)

والدہ ابوجعفر بن بسطامؒ

خلیفہ المقتدر باللہ کے وزیر ابوالحسن بن فرات نے ایک مرتبہ شیخ ابوجعفر بن بسطامؒ سے کہا کہ یہ تمہاری روٹی کا کیا قصہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اس کا واقعہ یہ ہے کہ میری والدہ نہایت نیک سن رسیدہ عورت تھیں۔ میری پیدائش کے وقت ہی سے اس کی عادت ہوگئی تھی کہ جس بستر میں میں سوتا تھا اس کے نیچے ایک روٹی رکھ دیا کرتی تھی۔ اور صبح میری طرف سے اس روٹی کا صدقہ کر دیا کرتی تھی اور میں بھی اب تک ایسا ہی کر رہا ہوں۔ یہ سن کر وزیر ابن الفرات نے کہا کہ میں تم سے بہت بدظن تھا اور گرفتار کرنا چاہتا تھا تین رات سے مسلسل خواب دیکھتا تھا کہ تم سے جنگ کر رہا ہوں تا کہ تم کو گرفتار کروں مگر تمہارے ہاتھ میں ڈھال کی مانند روٹی رہتی تھی جس سے میرا تیر تم کو نہیں لگتا تھا۔ جاؤ اب تم مامون ہو۔ (المنتظم صفحہ 192 جلد 6)

والدہ خلیفہ الناصر عباسی اور امام ابن جوزیؒ کے صاحبزادے

اس سلسلہ میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ امام ابن جوزی کے انتقال کے وقت ان کے صاحب زادے امام یوسف بن عبدلرحمان ابن جوزیؒ کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔ ان کی تعلیم وتربیت اور کفالت کی خدمت خلیفہ الناصر عباسی کی والدہ الجہتہ نے انجام دی۔ اور وہ اپنے والد امام ابن جوزی کے جانشین بنے۔ جب وہ تیئس سال کے ہوئے تو خلیفہ الناصر نے بغداد کے مشرقی اور مغربی دونوں علاقوں کا محتسب بنا کر مقبول الشہادت قرار دیا۔ امام یوسف بن جوزیؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت دی تھی۔ خلیفہ کی طرف سے متعدد ملوک وسلاطین کے یہاں سفیر بن کر گئے۔ دمشق میں مدرسہ تعمیر کر کے بڑی جائداد اس کے لئے وقف کی۔ بغداد کے محلہ جلیلہ میں ایک مدرسہ جاری کیا اور محلہ حربیہ میں دار القرآن بنایا اور اسی میں دفن کیے گئے۔ آخر میں بغداد کے مدرسہ مستنصریہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 656ھ میں فتنہ تاتار میں شہید ہوئے۔ (طباقات المفسرین صفحہ 380 جلد 2)

خانقاہوں اور رباط کی تعمیر کروانے والی خواتین

خواتین اسلام نے مدارس کی طرح بہت سی رباطیں یعنی سرائیں اور خانقائیں بھی تعمیر کی ہیں۔ جن میں عابدات وزاہدات اور صوفیات سکون واطمینان سے زہد وتقویٰ اور احسان وتصوف کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ زہرہ بنت محمد نہایت صالحہ اور صوفیہ تھیں۔ انہوں نے دمشق میں اپنے نام سے رباط الزہرہ تعمیر کی تھی اور اسی کے قریب سکونت اختیار کر کے اپنی رباط اور خانقاہ کی عابدات وصوفیات کو فیض پہنچایا۔ فاطمہ بنت حسین رازیہ بڑی عابدہ زاہدہ اور واعظہ تھیں۔ انہوں نے عابدات اور صوفیات کے لیے رباط بنوائی تھی۔

مکہ مکرمہ میں بہت سی خواتین نے بہت سی رباطیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں جن میں عابدات وزاہدات کے آرام کے لیے ہر طرح کا انتظام تھا۔ امام تقی الدین فاسیؒ نے ایسی چند خانقاہوں کا تذکرہ کیا ہے۔ خلیفہ مقتدی عباسی کی قہرمانہ نے **492**ھ میں رباط فقاعیہ تعمیر کرائی جو بیواؤں کے لیے وقف تھی۔ جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تھا۔ خلیفہ الناصر عباسی کی والدہ کے نام رباط ام الخلیفہ تھی۔ جس کی تاریخ وقف **579**ھ تھی۔ شریفہ فاطمہ بنت امیر ابو لیلےٰ محمد نے **577**ھ رباط خاتون بنوا کر وقف کر دیا۔

ام الحسین بنت شہاب الدین طبریہ مکیہ نے رباط السیدہ تعمیر کر کے فقراء ومساکین کے لیے وقف کیا۔

امام قطب الدین قسطلانی کی والدہ اور مکہ مکرمہ کی دیگر خواتین نے مل کر رباط المساجد کے نام سے ایک رباط تعمیر کروائی جس میں بے سہارا اور بے وطن دیندار عورتیں رہتی تھیں۔

رباط بنت التاج ایسی عورتوں کے لیے وقف تھی جو اپنے وطن سے مکہ مکرمہ آ کر عبادت وریاضت میں مشغول رہتی تھیں۔

ابو مرشد مبارک بن عبداللہ قاسمی کی دو صاحبزادیوں ام خلیل خدیجہ اور ام عیسیٰ مریم نے رباط ابن السوداد خرید کر شافعی مذہب کی عابدات وصوفیات کے لیے وقف کیا جن کے شوہر نہیں تھے۔

ام سلیمان اور بنت الحرابی دونوں خواتین نے مل کر زاویہ ام سلیمان اور رباط بنت الحرابی کے نام سے دو خانقاہیں تعمیر کی تھیں جن میں مکہ مکرمہ کی عابدات رہتی تھیں۔

یمن کے سلطان الملک الاشرف اسماعیل بن فضل کی زوجہ کریمہ نے مکہ مکرمہ میں رباط الجنہ تعمیر کر کے وقف کی۔ (شفاء الغرام اور العقد الثمین)

بنفشہ متوفاۃ 573ھ کا لقب جہتہ معظمہ تھا۔ بڑی فاضلہ، عالمہ نیک دل خاتون تھیں۔ انہوں نے سوق المدینہ میں صوفیات اور عابدات کے لیے ایک رباط اور خانقاہ بنوائی جس کا افتتاح پہلی رجب کو کیا۔ اس افتتاحی تقریب میں بنفشہ نے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا جس میں صوفیات و عابدات نے شرکت کی اور موقع کی مناسبت سے وعظ وتقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ اس میں ایک کمرہ رباط زوزنی کے شیخ ومرشد ابوبکر صوفی کی بہن کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اور جہتہ معظمہ بنفشہ نے شرکائے جلسہ میں مال تقسیم کیا۔ (المنتظم صفحہ 271 جلد 10)

مکہ مکرمہ میں پانی کی سبیل

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہارون الرشید کی زوجہ زبیدہ کے کارہائے خیر بڑے فیض رساں ہیں۔ خاص طور پر نہر زبیدہ اس نیک بخت خاتون کا زندہ وتابندہ کارنامہ ہے۔ ان کے صدقات وتبرکات اور امور خیر کی تفصیل ہے۔ مختصر طور سے ان کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

ام الحسین نے سعی میں پانی کی ایک سبیل وقف کی تھی۔ صوفیہ ام سلیمان کی سبیل جنت المعلیٰ کے قریب تھی۔ مصر کے سلطان الملک الناصر کی بہن نے سبیم الست بنوا کر وقف کی تھی۔ زینب بنت قاضی شہاب الدین نے اپنے بھائی قاضی نجم الدین کے ایصال ثواب کے لیے سبیل السیدہ وقف کی تھی۔ خلیفہ مقتدرہ عباسی اور اس کی والدہ دونوں نے سبیل جوفی وقف کی تھی۔ صوفیہ ام سلیمان نے محلہ سوق اللیل میں خاص طور سے عورتوں کے لیے طہارت خانہ بنوایا تھا۔ (شفاء الغرام اور العقد الثمین)

(بحوالہ: خواتین اسلام کی دینی اور علمی خدمات مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری)

خلفاء وسلاطین کی خواتین کی رفاہی تعمیرات

یہ چند مثالیں ان بنات اسلام کی دینی وعلمی تعمیرات وعمارات کی ہیں جن کی زندگی زہدوتقوی، ایثار واخلاص اور فقر ومحتاجی میں بسر ہوتی تھی۔ اب چند مثالیں خلفاء اور سلاطین وامراء کی خواتین و بیگمات اور شہزادیوں کی ملاحظہ ہوں جنہوں نے دینی وعلمی اور رفاہی کاموں میں بڑے خلوص اور للّٰہیت سے کام لیا ہے۔ ان میں متعدد خواتین نے ملکی نظام سنبھالا ہے اور ملکی خدمات میں حسن تدبیر سے کام لے کر نام پیدا کیا ہے۔ اس بارے میں عجمی سلاطین اور امراء کی خواتین کا کردار بہت نمایاں ہے۔ ان خواتین کے واقعات میں مسلمان امیروں اور مالداروں کی عورتوں کو خاص طور سے غور کرنا چاہئے اور دینی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔

نہر زبیدہ

ام جعفر زبیدہ زوجہ ہارون الرشید کا نام امۃ العزیز ہے۔ اس کے دادا خلیفہ ابو جعفر منصور نے بچپن میں اس کو زبیدہ کے نام سے یاد کیا اور یہی مشہور ہوا۔ اس کے یہاں ایک سو باندیاں قرآن کی حافظہ تھیں۔ ہر ایک روز قرآن کا ایک عشر بطور وظیفہ پڑھتی تھی اور ان کی تلاوت سے زبیدہ کا فیض آج مکہ مکرمہ میں جاری ہے۔ اس نے حنین سے ایک چشمہ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر مکہ مکرمہ تک جاری کیا اور وادی نعمان سے دوسرا چشمہ عرفات تک جاری کیا۔ اس کے وکیل نے کہا اس کام میں خرچہ بہت زیادہ ہے تو اس نے کہا کہ تم اس کام کو کرو اگر چہ پہاڑ توڑنے میں ہر ہتھوڑے پر ایک دینار خرچ ہو۔ ایک اندازے کے مطابق نہر زبیدہ کے اجراء پر سترہ لاکھ دینار خرچ ہوئے اور جب آخر میں وکیل نے اس کے خرچ کا حساب وکتاب زبیدہ کے سامنے کیا تو اس نے کہا کہ (ترجمہ) ”ہم نے یوم حساب پر اس حساب کو چھوڑ رکھا ہے۔“

اس زمانہ سے آج تک اس نہر کی بار بار امراء وسلاطین نے صفائی ومرمت کرائی ہے۔ اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی یوں شرف حاصل ہوا ہے کہ گذشتہ صدی میں مکہ مکرمہ میں مقیم مسلمانان ہند نے اس کی مرمت کے لیے انجمن بنائی اور ہندوستان کے امراء واعیان کو بھی اس میں شریک کیا۔

اس کے بعد زبیدہ خاتون نے مکہ مکرمہ میں پانچ حوض بنوائے وہاں کے چند مکانوں کو خرید کر وقف کیا۔ جن میں دار ارقم بھی تھا۔ باب احیا کبیر میں اپنے خادم یاسر کو وضو خانے بنوانے کا حکم دیا۔ ان کارہائے خیر کے علاوہ اس خدا پرست اور خدا ترس خاتون نے اور بہت سے رفاہ عامہ کے کام انجام دیئے ہیں۔ زبیدہ نے جمادی الاول 216ھ

میں انتقال کیا۔(ابن خلکان صفحہ 208 جلد 1،العقد الثمین صفحہ 216 جلد 1،تاریخ مکہ سباعی صفحہ 99-100)

ایام حج کے جمالیاتی مظاہرے

سلطان ناصر الدولہ بن حمدان کی شہزادی جمیلہ خاتون نے 366ھ میں شان وشوکت اور داد و دہش کا حج ادا کیا کہ ضرب المثل بن گیا۔ چار سو محمل میں اس کے حسن و جمال اور شان وشوکت کے مناظر ات کی سوار تھیں اور معلوم نہیں ہوتا تھا کہ جمیلہ خاتون کس محمل میں ہیں۔ اور مجاورانِ حرم کو اپنی سخاوت سے مالا مال کر دیا۔(العبر صفحہ 240 جلد 3)

امام محمد بن احمد بن جبیر اندلسی متوفی 614ھ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے سفر نامہ میں حج 579ھ میں تین شہزادیوں اور خاتون کا ذکر اور مکہ مکرمہ میں ان کی خیرات اور خدمات کا تذکرہ کیا۔ یہ تینوں اس سال حج کے لیے آئی تھیں۔ پہلی خاتون درب ارمن اور بلاد روم کے سلطان مسعود کی شہزادی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال کی تھی۔ لکھا ہے کہ اس جوان خاتون نے حج کی راہ میں بہت سے نیک کام کیے ہیں۔ اس کے تیس اونٹ حجاج کے لیے پانی لاتے تھے اور تین اونٹ سامان خورد و نوش لانے کے لیے ہیں اور ایک سو اونٹ دوسرے سامان لانے کے لیے ہیں اور یہ سب انتظام حاجیوں کی راحت رسانی کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ اس خاتون کے اور بھی کارنامے ہیں ج کا ذکر طویل ہے۔ دوسری خاتون طلاشن موصل کے حکمران معز الدین کی والدہ اور سلطان نور الدین زنگی سلطان شام کے بھائی بابک کی زوجہ ہے۔ اس خاتون کے بھی بر اور نیکی کے افعال کثیرہ ہیں اور تیسری خاتون اصفہا کے سلطان دقوس کی شہزادی ہے۔ یہ بڑی قدر و منزلت اور شان وشوکت کی مالک ہے اور نیک کاموں سے رغبت رکھتی ہے۔ ان تینوں خواتین کا معاملہ نیکی اور شان وشوکت میں عجیب ہے۔(رحلتہ ابن جبیر صفحہ 143)

تاتاریوں میں سب سے پہلے بادشاہ خربندہ اسلام قبول کر کے محمد خدابندہ بنا، اس کے بعد اس کا نوعمر شاہزادہ ابوسعید بہادر خاں تخت نشین ہوا۔ اس حدیث العہد بالاسلام شاہی خاندان کی خواتین و بیگمات تک دین داری اور دینی زندگی میں اس قدر آگے تھیں کہ جب سلطان ابوسعید بہادر خاں شاہی حشم و خدام رکھتا تھا اور کسی مہم پر روانہ ہوتا تھا تو خواتین ساتھ ہوتی تھیں اور ہر خاتون اپنے حشم و خدام کے ساتھ الگ رہتی تھی۔ اور ہر ایک کے لیے امام موذن اور قاری قرآن ہوتے تھے۔(رحلہ ابن بطوطہ صفحہ 146 جلد 1)

خاتون سفریہ سلطان ملک شاہ کی محبوبہ باندی تھی۔ اس کی بطن سے سلطان سنجر پیدا ہوا۔ اس کے حال میں لکھا ہے کہ بڑی دیندار خاتون تھی۔ حج کو جانے والوں کے لیے مکہ کے راستے میں پانی کی سبیل لگوائی تھی۔ سلطان ملک شاہ نے حرم سرا میں آنے کے بعد اپنی ماں اور بھائیوں کو بلانے کے لیے بھاری رقم خرچ کر کے آدمی بھیجے اور جب وہ آئے تو اپنی ہم عمر اور ہم شکل باندیوں میں بیٹھ گئی۔ اس کی والدہ نہ پہچان سکی اور اس نے گفتگو کی تو آواز سے پہچان گئی اور فوراً اٹھ کر بوسہ دیا اور مسلمان ہو گئی۔ خاتون سفریہ تاریخ کی ان چند نادر خواتین میں سے تھیں جن کے بطن سے دو خلیفہ یا سلطان پیدا ہوئے۔ اس کا انتقال 515ھ میں ہوا۔

الجہتہ القائمیہ خلیفہ القائم بامر اللہ کی ام ولد باندی تھی۔ اس نے اپنے ذاتی مال و دولت کے ایک حصہ سے حجاج کی خدمت کے لیے وصیت کی تھی۔ صوم صلوٰۃ اور تقوی میں مشہور تھی۔ 487ھ میں فوت ہوئی اور اس کے پوتے خلیفہ المقدر بامر اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (المنتظم صفحہ 25 جلد نمبر 9)

سلطانی و جہانبانی

خاتون ترکان بنت طراج سلطان ملک شاہ کی بیگم تھی اس کے والد طراج فارس کے بادشاہ افراسیاب کی نسل سے تھے۔ اس ملکہ خاتون کا مزاج شاہانہ تھا۔ ملک شاہ کے مرنے پر ملکہ اصفہان بن گئی۔ بڑے عزم و ارادہ، شان و شوکت اور فہم و فراست کی مالک تھی۔ سرکاری خزانہ کی حفاظت کی، فوج کو منظم کیا اور میدان جنگ میں لشکر کی قیادت خود کر کے جنگ میں بہادرانہ حصہ لیتی تھی۔ اس کے انتقال کے وقت دس ہزار ترکی فوج اس کے ساتھ تھی۔ اس کی تدبیر مملکت اور حسن انتظام سے پورے قلمرو میں امن و امان اور خوشحالی عام تھی۔ رمضان 487ھ میں فوت ہوئی۔ (المنتظم صفحہ 84، جلد 9)

شجرۃ الدرام خلیل سلطان، الملک الصالح کی محبوب بیگم نہایت عقل مند، بہادر اور باصلاحیت عورت تھی۔ سلطان ملک الصالح کے انتقال کی خبر کسی کو نہ ہونے دی اور اس کی طرف سے شاہی احکام جاری کرتی رہی، حتی کہ اعیان سلطنت کو اس کی خبر نہ ہو سکی اور منبروں پر اس خاتون کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اعیان سلطنت نے اس کو ملکہ تسلیم کیا۔ مگر یہ صورت زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکی۔ اور مصر کے بادشاہ المعز نے ملک پر قبضہ کر کے اس سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد انجام یہ ہوا کہ قتل کر کے مصر کے قلعہ کے نیچے گرا دی گئی پھر دفن کی گئی۔ یہ خاتون ترکی النسل، جری اور قوت اقدام کی مالک تھی۔ (العبر 223 جلد 5 صفحہ 222)

مدرسوں کی تعمیر

سلطان مصر الملک الناصر محمد بن قلادوں کی شہزادی اور امیر بکر حجازی کی بیگم نے مصر میں 761ھ میں المدرستہ الحجازیہ تعمیر کیا اور فقہ شافعی کا درس مقرر کر کے شیخ الاسلام سراج الدین عمر بن اسلان بلقینی کو مجلس صدارت میں بٹھایا۔ جنہوں نے فقہ کا درس جاری کیا۔ نیز اس شہزادی نے اس مدرسہ میں شاندار کتب خانہ قائم کر کے مختلف علوم و فنون کی بہت سی کتابیں وقف کیں۔ (خط مقریزی صفحہ 381 جلد 2)

خلیفہ ناصر الدین اللہ، احمد بن المستضی کی والدہ زمردخو کی النسل تھی۔ اس نے ایک مدرسہ جاری کیا جس میں امام فخر الدین، ابو عبد اللہ محمد بن ابو علی نوخانی فقیہہ شافعی درس دیتے تھے۔ (طبقات المفسرین صفحہ 212، جلد 2)

ترکان بنت الملک عز الدین مسعود بن قطب الدین زنگی کا لقب جہتہ اتابکیہ تھا۔ الملک الاشرف موسیٰ کی بیگم تھی۔ اس نے ملک شام کے مقام جبل نیں مدرسہ تعمیر کرایا جو اس کی نسبت سے مشہور ہوا۔ اسی مدرسہ میں اس کی قبر ہے۔ (العبر صفحہ 164 جلد 5)

ربیعہ خاتون صاحب سلطان صلاح الدین ایوبی اور الملک العادل کی بہن تھی۔اس نے مقام جبل میں مدرسہ تعمیر کیا تھا۔اسی سال سے زائد عمر میں شعبان 663ھ میں انتقال کیا اور اسی مدرسہ میں دفن کی گئی۔(العبر جلد نمبر 5 صفحہ 176)

خلیفہ المستضئی بامر اللہ حسن بن المستنجد باللہ عباسی عتیقہ باندی طاب الزمانی حبشیہ نے مکہ مکرمہ میں ایک مدرسہ جاری کیا جو شافعی فقہاء وطلبہ کے لیے وقف تھا۔یہ مدرسہ دار ارقم کے ایک حصہ میں تھا۔اس کی تاریخ وقف شعبان 580ھ ہے۔(العقد الثمین مقریزی صفحہ 381 جلد 2)

ترکی کے سلطان مراد خان کی والدہ نے شہر اسکدار میں ایک بہت بڑا مدرسہ جاری کیا اور اس کے افتتاح کی تقریب بہت شاندار طریقہ سے منائی اور عام مجلس منعقد کی جس میں روم کے علماء وفضلاء اور مشائخ کی ایک بڑی جماعت شریک ہوئی اور شیخ احمد بن روح جابری الانصاری نے سورہ انعام کی تفسیر بیان کر کے پہلا درس دیا۔اس موقع پر نہایت شاندار دینی وعلمی جشن منایا گیا۔سلطان کی والدہ نے تمام شرکائے درس کی دعوت کی اور سب کو ایک ایک ہزار دینار عطیہ دیا۔انواع واقسام کے کھانوں سے حاضرین کی تواضع کی گئی اور ان ہی شرکائے درس میں سے تقریباً پچاس اہل علم کو مدرسہ میں تدریس وتعلیم کے لیے وقف رکھا گیا۔(الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ صفحہ 406 جلد 1)

خاتون ام الصالح کے نام سے دمشق میں ایک مدرسہ جاری ہوا جس میں تجوید وقرات کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس فن کے ائمہ مدرس تھے۔امام سخاوی کے مشہور شاگرد شیخ جمال الدین ابراہیم بن داؤد مقری علسقلانی اس میں شیخ القراء تھے۔ان کے بعد شیخ زین الدین مقری بائیس سال تک مدرسہ الصالح میں شیخ المقربین کے عہدہ پر رہے۔اس مدرسہ میں شیخ ناصر الدین محمد شافعی نے مدتوں درس دیا۔(العبر 375 جلد 10)

شہدہ بنت احمد بن عمر ابری کا لقب فخر النساء تھا۔وہ خلیفہ عباسی وکیل کی زوجہ تھیں۔انہوں نے حدیث کی تعلیم ابن السراج اور طراد سے حاصل کی تھی۔ان کا خط نہایت حسین وجمیل تھا۔کاتبہ یعنی انشاء پرداز تھیں۔ساتھ ہی نہایت نیک، مخیرہ عورت تھیں۔امور خانہ داری میں مصروفیت کے ساتھ اہل علم سے تعلیمی وتدریسی افادہ اور استفادہ کا تعلق رکھتی تھیں۔کئی سال تک حدیث کا درس دیا۔تقریباً ایک سو سال کی عمر میں 14 محرم 574ھ میں انتقال کیا۔قلعہ کی جامع مسجد میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔تجہیز وتکفین اور تدفین میں علماء ومحدثین اور عوام کا جم غفیر تھا۔(المنتظم صفحہ 288 جلد 10)

خلیفہ المقتدر باللہ کی والدہ شغب صالحہ فاضلہ خاتون تھیں۔ساتھ ہی اس کے ذاتی املاک واموال بے شمار تھے۔جن سے سالانہ دس لاکھ دینار آمدنی ہوتی تھی اور اس کا بیشتر حصہ صدقہ کر دیا کرتی تھی۔ہر سال طبیبوں اور حکیموں کو بھیجتی تھیں اور مکہ مکرمہ کے حوضوں کی اصلاح ومرمت کراتی تھیں۔321ھ میں انتقال کیا۔(المنتظم صفحہ 353 جلد 6)

ذاتی اوصاف وکمالات

یہ عالمات ومحدثات، فقیہات، مفتیات، صوفیات اور معلمات علم وفضل اور عمل وکردار کی دولت کے ساتھ جاہ و

حشم، شان وشوکت، عفت وعصمت، عزم وحوصلہ، فہم وفراست، نظم وضبط کے ذاتی اوصاف وکمالات بھی رکھتی تھیں۔

ام خلیل شجرۃ الدر حسن وجمال کے ساتھ ذکاوت، عقلمندی اور بہادری میں بھی مشہور تھیں۔ خدیجہ بنت شہاب الدین نوریہ مکیہ کے بارے میں تصریح ہے کہ یہ خاتون دیندار، پرہیز گازی، عفت وشرافت وکرامت اور عبادت میں بہت اونچا مقام رکھتی تھی۔ (العقد الثمین صفحہ 208 جلد 8)

ملہ مکرمہ کے قاضی وخطیب کی صاحب زادی محدثہ زینب ہاشمیہ عزت وشرافت، اخلاق ومروت، بلند ہمتی کے ساتھ عقل وافر رکھتی تھیں۔ (العقد الثمین صفحہ 233 جلد 8)

قاضی مکہ شیخ نجم الدین احمد کی صاحبزادی کمالیہ کی اولعزمی اور عالی حوصلگی کا اندازہ ان کے شوہر شیخ خلیل مالکی کے اس قول سے ہوتا ہے کہ اگر وہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹانا چاہتی تو ہٹا دیتی۔ (العقد الثمین صفحہ 312 جلد 8)

تقویٰ اور طہارت میں عزیمت کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ شیخۃ الحجبیہ مکہ مکرمہ میں رہتی تھیں اور تیس سے زائد سال تک اس گوشت اور میوہ کو منہ ہی نہیں ڈالا جو افریقہ کے مقام بجلیہ سے منگوائے جاتے تھے کیونکہ ان کے باشندوں کے بارے میں سیدہ بدلیہ کو بتایا گیا تھا کہ وہ لوگ لڑکیوں کو وراثت میں شریک نہیں کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں وہ اپنے شیخ نور الدین کے نقش قدم پر چلتی تھیں جو مدینہ منورہ کے پھلوں کو استعمال نہیں کرتے تھے کہ ان کے علم کے مطابق لوگ ان کی زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے۔ (حاشیہ المتشرین صفحہ 34)

فاطمہ بنت نصر بن عطار نہایت عابدہ، زاہدہ اور عالمہ تھیں۔ ان کے حجاب کا یہ عالم تھا کہ پوری زندگی میں صرف تین بار ضرورت کی وجہ سے باہر نکلیں۔ وہ دنیاوی زیب وزینت سے بہت دور تھیں۔ (المنتظم صفحہ 279 جلد 10)

اسی طرح ام عبدالرحمان صفیہ بنت ابو الخیر مخزومیہ کے بارے میں تصریح ہے کہ وہ صرف حج کے ارکان ومناسک کی ادائیگی کے لیے باہر نکلتی تھیں۔

ام کلثوم بنت قاضی جمال الدین قرشیہ مکیہ شادی کے بعد اپنے شوہر شہاب الدین احمد بن ظہیرہ کے ساتھ رہیں اور ایک سال تک کسی دوسرے نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ آخری زندگی تک یوں رہی کہ ان کی مانگ تو کیا ان کے سر کے بال بھی نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کا یہ حال تھا کہ اگر اپنی کسی لڑکی کو کھلے سر دیکھتی تھیں۔ تو سزا دیتی تھیں۔ وہ بڑی نیک اور عقل مند با عفت وعصمت خاتون تھیں۔ (العقد الثمین)

ست الکل بنت ابراہیم، جیلانیہ کی والدہ عائشہ خاتون بڑی با اخلاق، بامروت، عالمہ، فاضلہ تھیں۔ ان کا مستقل قیام عدن میں تھا۔ اور تجارتی میں سلسلہ مکہ مکرمہ آتی جاتی تھیں۔ اسی دوران مکہ مکرمہ میں فوت ہوئیں مگر کبھی حجاب سے باہر نہ ہوئیں اور نہ کسی اجنبی شخص نے ان کا چہرہ دیکھا۔

خواتین اسلام میں سے کئی ایک نے اپنی پوری زندگی دین اور علم دین کی خدمت کے لیے یوں وقف کر دی کہ زندگی بھر شادی نہ کی۔ اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ام الکرام کریمہ بنت احمد امروزیہ مستقل طور سے مکہ مکرمہ میں قیام کرتی تھیں۔ ائمہ حدیث نے ان سے صحیح بخاری کی روایت کی ہے۔ انہوں نے زندگی بھر شادی

نہیں کی اور تجرد کی حالت میں بڑی عمر میں وفات پائی۔ (العبر 254 جلد 3)

فاطمہ بنت سلمان معمرہ محدثات میں سے ہیں۔ زندگی بھر مجرد رہیں۔ تقریباً نوے سال کی عمر میں فوت ہوئیں۔ (العبر صفحہ 254 جلد 3)

شیخہ معمرہ حبیبہ بنت عزالدین مقدسیہ اکانوے سال کی عمر میں فوت ہوئیں۔ انہوں نے بھی شادی نہیں کی تھی۔ مسندۃ الشام زینب بنت کمال الدین نے پوری زندگی علم وعمل اور صلاح وتقویٰ میں بسر کی اور دنیا سے بن بیاہی گئیں۔

اعتراف اور احترام

ان عالمات وفاضلات کی خدمت وعظمت کے اعتراف میں علماء اسلام نے بڑی فراخ دلی اور وسعت ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کو بڑے بڑے القابات وخطابات سے نوازا۔ ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ان سے استفادہ وافادہ میں کوئی کسر نہیں اٹھارکھی۔ ام خدیجہ بغدادیہ امام احمد بن حنبل کی مجلس میں حاضر رہا کرتی تھیں۔ امام صاحب ان سے بہت مانوس تھے اور ان پر خاصی توجہ فرماتے تھے۔ امام صاحب کے صاحب زادے کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''خدیجہ والد صاحب کے پاس آتی جاتی تھیں اور ان سے حدیث کا سماع کرتی تھیں اور والد صاحب بھی ان سے احادیث بیان کیا کرتے تھے۔''

مشہور حافظ حدیث ابن علیہ کی والدہ بنت حسان کے پاس بصرہ کے مشائخ اور فقہاء آتے تھے اور وہ ان سے علمی ودینی گفتگو کرتی تھیں۔ مشہور محدثہ اور عابدہ زاہدہ ریطہ بنت عبداللہ کی زیارت کے لیے بڑے بڑے مشائخ اور عباد وزہاد آیا کرتے تھے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے۔
(المنتظم صفحہ نمبر 258 جلد 6)

خدیجہ بنت شہاب الدین ملیہ سے اہل علم کے استفادہ کا یہ حال تھا کہ ان میں ان کے معاصر علماء میں مختلف علمی ودینی مسائل میں خط وکتابت رہا کرتی تھی۔ (العقد الثمین صفحہ 208 جلد 8)

خواتین اسلام کی عظمت وجلالت اور امامت وسیادت کا عملی اقرار واعتراف ان کے ہاتھ سے خرقہ پوشی کے ذریعہ بھی ہوا ہے اور مشائخ نے شیخات سے احسان وتصوف میں خرقہ حاصل کی ہے۔ امۃ الرحمان فاطمہ بنت قطب الدین مکیہ جمالہ نے شیخ نجم الدین تبریزی سے خرقہ خلافت پہنا اور اعیان کی ایک جماعت کو حدیث کی تعلیم دے کر خرقہ خلافت پہنایا۔ (العقد الثمین جلد نمبر 8 صفحہ 288)

حفصہ بنت سیرین کی بزرگی وبرتری کا اعتراف ایاس بن معاویہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

(ترجمہ) ''میں نے کسی کو ایسا بزرگ نہیں پایا کہ اسے حفصہ پر فضیلت دوں۔'' (تہذیب التہذیب صفحہ 409 جلد 12)

شیخہ ام الفتح امۃ السلام بنت قاضی ابوبکر احمد بن کامل بغدادیہ کے علم وفضل اور دین... ت کا اعتراف بغداد

کے اعیان محدثین نے کیا ہے۔ خطیب کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''میں نے امام ازہری اور امام تنوخی کو امۃ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے۔ ان دونوں حضرات نے ان کی خوب تعریف کی اور ان کی دیانت، عقل اور فضل کو بیان کیا۔ (تاریخ البغداد صفحہ 443 جلد 14)

امام ابو حامد اسفرائینی اپنی جلالتِ شان کے باوجود ام حسین جمعہ بنت احمد نیشاپوریؒ کی تعظیم اور تکریم کیا کرتے تھے۔ محدث خلال کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''ابو حامد افرائینی ان کی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔'' (تاریخ بغداد صفحہ 444، جلد نمبر 14)

ام زینت فاطمہ بنت عباس بغدادیہ محدثہ، واعظہ تھیں اور عوام وخواص میں بے پناہ مقبولیت رکھتی تھیں۔ ذہبیؒ کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''ان کی ہر دل عزیزی اور لوگوں میں مقبولیت حد سے زائد تھی۔'' (ذیل العبر ذہبی صفحہ 80)

خدیجہ بنت شہاب الدین نوریہ مکیہ کے بھائی شیخ الاسلام قاضی کمال الدین اور قاضی نور الدین اپنی بہن کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور ان سے دعا کراتے تھے۔ فاسیؒ کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''دونوں بھائی اپنی بہن کی تعظیم وتکریم میں انتہائی درجہ مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ اور ان کی دعا کی برکت حاصل کرتے تھے۔'' (العقد الثمین صفحہ 207 جلد 8)

فخر النساء شہدہ بنت احمد بغدادیہ کے علم وفضل کا شہرہ دور دور تک تھا۔ (ابن خلکان صفحہ 245 جلد 1)

ام العقل ستیتہ بنت قاضی ابو القاسم عبد الواحد کے ذکر میں امیر ابن ماکولا نے فخریہ انداز میں لکھا ہے:

(ترجمہ) ''وہ ہماری پڑوسن تھیں میں نے ان سے حدیث لکھی ہے۔'' نیز تصریح کی ہے کہ ان سے خطیب بغدادیؒ اور صوری وغیرہ نے تعلیم حاصل کی ہے۔ (اکمال 264 جلد 4)

اسی طرح امیر ابن ماکولا نے ابو الفتحؒ بن ابو الفوارس کی باندی جبرہ کے بارے میں نہایت فخر وامتنان کے انداز میں لکھا ہے:

(ترجمہ) ''وہ ہمارے استاد عبد العزیز بن علی ازجی کی زوجہ تھیں۔ ابن ابو الفوارسی سے حدیث کی روایت کی۔ میرے یہاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ میں نے انؒ سے سماع نہیں کیا، البتہ میرے علاوہ دوسروں نے ان سے سماع کیا ہے۔'' (اکمال صفحہ نمبر 30 جلد نمبر 2)

امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد العزیز، امام محمد بن ہیصم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ شیخ صاحبؒ نے اپنی صاحب زادی ام کلثوم کی شادی اپنے شاگرد سے کردی اور میاں بیوی دونوں ہی اپنے زمانہ میں علم وفضل میں یکتا وبے مثل تھے۔

تذکرہ نگار کا بیان ہے:

(ترجمہ) ''ام الکلثوم اپنے زمانہ کی مشہور عالمہ تھیں اور ان کے شوہر زمانہ کے فضلاء میں سے تھے۔''
(طبقات المفسرین صفحہ 355 جلد نمبر 2)

ان خادمات اسلام کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا آخر منظر اس وقت قابل دید ہوتا تھا جب وہ دنیا سے جاتی تھیں اور علماء اور عوام والہانہ انداز سے ان کو الوداع کہتے تھے اور ان خواتین کے جنازہ میں بے پناہ مخلوق شریک ہوتی تھی۔ بغداد کی مشہور محدثہ اور زاہدہ فاطمہ بنت نصر کے جنازہ میں اس قدر زیادہ مسلمان شریک ہوئے کہ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے جامع القصر کے مقصورہ کی جالیاں نکالنی پڑیں۔ اطراف کے تمام بازار اور سڑکیں آدمیوں سے بھر گئیں اور عید کے دن سے زیادہ مجمع ہوا۔ ان کے جنازہ میں علماء اور عوام کے علاوہ ارکان دولت بھی شریک ہوئے۔ اعیان بغداد مقبرہ امام احمد تک ان کے جنازہ کے ساتھ گئے۔ بھائی نے نماز جنازہ پڑھائی اور باپ کے پہلو میں دفن کی گئیں۔ مدتوں ان کا ذکر خیر عوام وخواص میں ہوتا رہا۔ (المنتظم صفحہ 279 جلد نمبر 10)

اندلس کی محدثہ وفقیہہ اور عابدہ وزاہدہ فاطمہ بنت یحیٰ قرطبہ میں فوت ہوئیں اور مقام ربض میں دفن کی گئیں۔ ان کے جنازہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں اس قدر آدمی شریک ہوئے کہ کسی عورت کے جنازہ میں اس سے زیادہ آدمی نہیں دیکھے گئے۔ ان کی نماز جنازہ محمد بن ابوزید نے پڑھائی۔ (بقیۃ الملتمس صفحہ 531)

فخر النساء شہدہ بغدادیہ کی نماز جنازہ جامع القصر میں ادا کی گئی۔ اور اس قدر مجمع ہوا کہ مقصورہ کی جالیاں ہٹانا پڑیں۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ ان کے جنازہ میں علماء اور کثیر مخلوق نے شرکت کی۔ اسی طرح مکہ مکرمہ کی محدثہ ام الخیر جویریہ کے جنازہ میں خلق کثیر نے حاضری دی۔ اور ایک جم غفیر نے اس میں شرکت کی۔

(خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات)

(حضرت مولانا قاضی اظہر صاحب مبارک پوری)

عورت کا درجہ

عورت کا درجہ اسلام میں وہی ہے جو مرد کا ہے۔ حیثیت اور حقوق اور آخرت کے انعامات میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اسلام کے نزدیک مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں تاہم اسلام نے دونوں کے درمیان تقسیم کا اصول رکھا ہے نہ کہ یکسانیت کار کا اصول۔

اسلام اس کو پسند نہیں کرتا کہ دونوں میں سے کوئی صنف اپنے آپ کو کم سمجھے اور ایک دوسرے کی نقل کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں کے مشابہ بنیں، اور ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کے مشابہ بنیں۔

انسانیت کو مرد اور عورت کی صنفی تقسیم کے ساتھ پیدا کرنا براہ راست خالق کی منصوبہ بندی ہے۔ اس تقسیم کو باقی رکھنے ہی میں انسانی زندگی کی ترقی ہے۔ جو مرد یا عورت اس تقسیم کو توڑنے کی کوشش کرے وہ گویا نظام فطرت کو توڑتا ہے۔ نظام فطرت کو توڑنا صرف تخریب ہے وہ کسی درجہ میں بھی تعمیر کا کام نہیں۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت ایک دوسرے کا ثنی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ جو مرد ہے وہی عورت ہے اور جو عورت ہے وہی مرد ہے بلکہ دونوں میں ناقابل عبور قسم کے حیاتیاتی فرق پائے جاتے ہیں یہ فرق تقسیم کار کی حکمت پر مبنی ہیں وہ اس اعتبار سے ہیں کہ مرد کی کمی کی تلافی عورت کرے اور عورت کے اندر جو کمی ہے وہ مرد کے ذریعہ پوری ہو۔

مرد اور عورت کے بارے میں اسلام کا تصور دونوں صنفوں کی فطری ساخت میں ثابت شدہ فرق پر مبنی ہے۔ یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ مرد اور عورت کی ساخت میں فرق ہے۔ مرد اپنی پیدائشی ساخت کے اعتبار سے "باہر" کے کام کے لئے موزوں ہے اور عورت اپنی پیدائشی ساخت کے اعتبار سے "اندر" کے کام کے لئے موزوں ہے۔ اسی فرق اور تقسیم پر اسلام کے تمام قوانین بنائے گئے ہیں۔ مرد اور عورت کے معاشرتی مقام کے بارہ میں اسلام کی تعلیمات تقسیم عمل کے اصول پر مبنی ہیں۔ نہ کہ اشتراک عمل۔ کے اصول پر۔

عہد زندگی

قرآن میں نکاح کے معاملہ کو میثاق غلیظ (انساء: 21) کہا گیا ہے یعنی مضبوط عہد۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نکاح کی صورت میں مرد اور عورت کے درمیان جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس کی حیثیت اسلام میں کیا ہے یہ حقوق اور ذمہ داریوں کا ایک دو طرفہ معاہدہ ہے اس کے ذریعہ سے ایک مرد اور ایک عورت اپنے آپ کو ساری عمر کے

لئے ایک بے حد سنجیدہ رشتہ میں جوڑتے ہیں۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق بنیں۔ دونوں مل کر زندگی کے سفر کو طے کریں۔

معاہدہ ہمیشہ دوطرفہ بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کا معاہدہ بھی دوطرفہ بنیادوں پر قائم ہے۔ امام ترمذیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگاہ، تمہاری عورتوں کے اوپر تمہارا حق ہے اور تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کا حق ہے۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لئے یہاں چند آیات اور احادیث نقل کی جاتی ہیں۔

عورت ہر حال میں خیر ہے

(ترجمہ) اور تم عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزران کرو۔ اگر وہ تم کو پسند نہ ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو اور اللہ نے اس کے اندر بہت زیادہ بھلائی رکھ دی ہو۔ (النساء: 19)

اسی آیت میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں۔ ایک عورت اگر ایک اعتبار سے زیادہ ہے تو وہ دوسرے اعتبار سے کم ہوگی اور اگر وہ کسی اعتبار سے کم ہے تو وہ کسی اور اعتبار سے زیادہ ہو گی۔ اس لئے کسی عورت کی صرف کمی کو دیکھ کر اس سے بیزار نہ ہو جاؤ، بلکہ اس کے روشن پہلو کو دیکھ کر اس کے ساتھ اچھی طرح نباہ کرو۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔ باہر کی دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے۔ جو گھر کی دنیا میں اس تجربہ سے سبق لے سکے۔ زندگی کی کامیابی ''تاریکی'' میں ''روشنی'' دیکھنے کا نام ہے۔ اور یہ اہم سبق ہر آدمی کو اس کے گھر سے سکھایا جاتا ہے۔

عورت مرد سے زیادہ قابل احترام (ایک حدیث)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ! لوگوں میں کون ہے جو سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا۔ تمہاری ماں۔ اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تمہارا باپ۔

ماں کی صورت میں عورت کو سب سے زیادہ قابل احترام بنانا بتاتا ہے کہ اسلام کس قسم کا معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام کے نزدیک سب سے زیادہ بہتر معاشرہ وہ ہے جس میں عورت کو سب سے زیادہ عزت اور احترام کا مقام حاصل ہو۔ جو شخص ''ماں'' کے روپ میں ایک خاتون کا سب سے زیادہ لحاظ کرے۔ اس کے اندر لازمی طور پر یہ مزاج بنے گا کہ وہ دوسری خواتین کا بھی سب سے زیادہ لحاظ کرے۔ اس طرح پورے معاشرہ میں عورت کو وہ مقام مل جائے گا۔ جو گھر کے اندر ایک ماں کو ملا ہوا ہے۔

اظہار خیال کی آزادی

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں سے کہا کہ تم لوگ عورتوں کے زیادہ مہر نہ

باندھو۔ اس کے بعد ایک عورت اٹھی اور اس نے بلند آواز سے کہا اے عمر، اس معاملہ میں آپ کو دخل دینے کا حق نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے عورتوں کو زیادہ مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بات واپس لے لی اور کہا: عورت نے صحیح بات کہی اور عمر نے غلطی کی۔

حضرت عمر فاروق اپنے وقت کے حکمران تھے۔ ان کو ایک عام عورت نے برسرِ عام ٹوک دیا اور حکمران کو اپنی بات واپس لینی پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں عورت کو کس قدر زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ حقوق کا آخری درجہ ہے کہ کسی کو اظہار رائے کا مطلق اختیار حاصل ہو اور اسلامی معاشرہ میں ایک عورت کو یہ بات پوری طرح حاصل ہوتی ہے۔

گھر سنبھالنا کم درجہ کا کام نہیں

حضرت نسیبہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ انہوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مرد اجر میں بڑھ گئے۔ وہ جمعہ میں اور اجتماعات میں اور جہاد میں شریک ہوتے ہیں۔ پھر ہم عورتوں کے لئے کیا باقی رہا؟ آپؐ نے فرمایا کہ اے نسیبہ! تم میں سے ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ بہتر طریقہ سے رہے اور اس کی مرضی کو پورا کرے۔ یہ ان تمام اعمال کے برابر ہے جن کا تم نے مردوں کے سلسلہ میں ذکر کیا۔

موجودہ زمانہ کا یہ ذہنی بگاڑ ہے کہ گھر سنبھالنے کو کم درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اور باہر کے کام کو زیادہ بڑا کام سمجھ لیا گیا ہے مگر اسلام گھر سنبھالنے کے کام کو بھی اتنا عزت کا درجہ دیتا ہے جتنا کہ باہر کے کام کو۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں یکساں اہمیت کے کام ہیں۔ ان میں سے کسی فریق کو یہ حق نہیں کہ وہ احساس برتری میں مبتلا ہو اور نہ کسی فریق کو چاہئے کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنی اہمیت خود اپنی نظر میں گھٹالے۔

معاشرہ کی تعمیر میں عورت کی اہمیت

(ترجمہ) حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا۔ ابلیس کا تخت سمندر کے اوپر ہے وہ اپنے دستے بھیجتا ہے تو وہ انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ابلیس کے نزدیک وہ شیطان سب سے بڑا قرار پاتا ہے جس نے سب سے بڑا فتنہ پیدا کیا ہو۔ تو شیطانوں میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ایسا اور ایسا کیا۔ شیطانوں کا سردار ابلیس کہتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ان میں ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایک مرد اور ایک عورت کے پیچھے لگا رہا یہاں تک کہ میں نے دونوں کے درمیان جدائی ڈال دی۔ ابلیس اس کو اپنے قریب کرتا ہے اور اس کو لپٹالیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں تم نے کیا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسانی معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے۔ وہ ہتھیار یہ ہے کہ وہ مرد اور عورت کے درمیان جھگڑے کھڑے کرے اور دونوں کو ایک دوسرے سے دور کردے۔ قدیم زمانہ میں یہ فتنہ بہت محدود پیمانہ پر پیدا ہوتا تھا۔ یعنی ایک میاں بیوی یا ایک گھر اس فتنہ کا شکار ہوتا تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں نئے نئے نظریات نے پوری نسل انسانی کو اس فتنہ میں ڈال دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں

کی مصنوعی آزادی اور غیر فطری مساوات کا ذہن اتنے بڑے پیمانہ پر بنایا گیا ہے کہ قوموں کی قومیں اس سے متاثر ہو کر رہ گئی ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں شادی شدہ زندگی کو برا سمجھا جاتا ہے۔ جدید ترقی یافتہ سماج میں مردوں اور عورتوں کا یہ حال ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر طلاق لے لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے گھر اجڑتے ہیں۔ بچے اپنے ماں باپ سے چھوٹ کر مجرمین کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جنسی بے قیدی کی بنا پر طرح طرح کی مہلک بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ خاندانی بندھن کا پابند نہ ہونے کا مزاج موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہوا ہے اور وہ بلاشبہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

گھر بگڑنے سے پورا معاشرہ بگڑتا ہے اور معاشرہ بگڑنے سے پوری قوم بگڑ جاتی ہے، یہ موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ازدواجی زندگی کا احترام ختم ہو گیا۔ خاندانی بندھن کے ساتھ زندگی گزارنے کو کمتر درجہ کی چیز سمجھا جانے لگا۔

عورت کی حاکمیت

1964ء میں ہالی وڈ (امریکہ) نے ایک فلم بنائی تھی جس کا نام تھا Kisses for my president اس فلم میں دکھایا گیا تھا۔ کہ ایک شادی شدہ امریکی خاتون امریکہ کی صدر منتخب ہوگئی ہے مگر اس کے جلد ہی بعد وہ حاملہ ہوتی ہے۔ حاملہ ہونے کے مسائل سے وہ اتنا پریشان ہو جاتی ہے کہ وہ صدارتی آفس چھوڑ کر گھر چلی جاتی ہے اور بالاخر صدارت کے عہدہ سے استعفاد دیتی ہے۔

جدید مغربی دنیا میں ابھی تک اسکو ایک غیر سنجیدہ چیز سمجھا جاتا رہا ہے کہ کسی عورت کو اعلیٰ حکومتی عہدہ دیا جائے۔ 1972ء کے ایک پول میں امریکہ کے ووٹروں کی اکثریت نے کہا تھا کہ خاتون صدر کے مقابلہ میں انہیں ایک سیاہ فام مرد صدر زیادہ قابل قبول ہے۔ ایک شخص نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ خاتون صدر جب ہسپتال میں اپنا بچہ جنے گی تو ہسپتال کے بلیٹن میں اعلان کیا جائے گا کہ صدر اور نومولود بچہ دونوں بخیریت ہیں۔

اصولی معیار کے اعتبار سے، ووٹر یہ چاہیں گے کہ عورت امیدوار میں بھی وہی خصوصیات ہوں جو مرد امیدوار میں ہوتی ہیں۔ استعداد، حوصلہ، تجربہ، استحکام، ذہانت۔ مگر عورت امیدوار کے معاملہ میں ووٹر کی نفسیات نہایت نازک ہو جاتی ہیں۔ انہیں ابھی تک یہ یقین نہیں کہ عورت کے اندر بھی اس قسم کی مردانہ صفات ہو سکتی ہیں۔

متعدد سائنس داں خالص سائنسی بنیاد پر عورت کو اعلیٰ حکومتی عہدہ دینے کے خلاف ہیں۔ مثلاً سرجن ایڈگر برمن آزادی نسواں کی حامی خواتین کی نظر میں اس وقت معتوب ہو گئے۔ جب کہ انہوں نے یہ کہا کہ اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے عورتیں زیادہ جذباتی ہیں اور اس اعتبار سے وہ اقتدار کے منصب کے لئے غیر موزوں ہو سکتی ہیں۔"

1987ء میں امریکہ میں خاص اس مسئلہ پر لوگوں کی رائے معلوم کی گئی۔ معلوم ہوا کہ امریکی ووٹروں کی

تقریباً ایک تہائی تعداد خیال کرتی ہے کہ امریکہ کا صدر بننے کے لئے عورت کے مقابلہ میں مرد زیادہ موزوں ہیں یہ بات ایک عوامی رائے شماری کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے جس کا اہتمام حقوق نسواں کی ایک تنظیم کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ مطالعہ کا یہ نتیجہ جو ایک انجمن خواتین کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ بتاتا ہے کہ رائے دینے والوں میں صرف آٹھ فی صد تعداد ایسی تھی جس کا خیال تھا کہ وہائٹ ہاؤس کے عہدہ کے لئے عورت زیادہ بہتر ہوسکتی ہے۔

49 فی صد نے کہا کہ دونوں جنسوں میں کوئی پیدائشی فرق نہیں ہے اور 31 فیصد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مرد صدر بننے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ رائے شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں بعض دوسرے سماجی معاملات کے لئے زیادہ لائق ہوسکتی ہیں۔ مثلاً افلاس، صحت، تعلیم، منشیات اور شہری حقوق"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایران کا بادشاہ کسریٰ مرگیا تو اس کے درباریوں نے کسریٰ کی لڑکی کو ایران کا بادشاہ بنادیا۔ یہ خبر آپ کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا۔ وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جو عورت کو اپنا حاکم بنائے۔

دور جدید کی مذکورہ تحقیق اسلام کے اصول کی تصدیق ہے۔ اسلام میں چودہ سو سال پہلے یہ کہا گیا تھا کہ عورت اقتدار اعلیٰ کے منصب کے لئے غیر موزوں ہے۔ یہ بات ماضی میں بظاہر ایک خبر تھی آج وہ ایک مسلمہ علمی حقیقت ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے جو بات الہامی طور پر کہی تھی اس کو انسان کے لئے لمبے مطالعہ اور تجربے نے اب ایک ثابت شدہ واقعہ بنادیا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اسلام کے اصول فطری حقائق پر مبنی ہیں نہ کہ محض مفروضات اور قیاسات پر۔

عورت کی گواہی

اسلام کے قانون شہادت میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے۔ قرآن میں قرض کے معاملہ کا قاعدہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ کرلو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔ ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلادے۔ (البقرہ)

حالیہ تحقیق نے ثابت کردیا ہے کہ قرآن کا یہ قانون بالکل فطری ہے۔ کیونکہ وہ حیاتیاتی حقیقت کے عین مطابق ہے۔

ٹائمز آف انڈیا (18 جنوری 1985ء) میں یو پی آئی کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ یہ رپورٹ اخبار کے صفحہ 9 پر ہے اور اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترتیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنس داں نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونووگوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس

کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصیت ہے۔ صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے۔

مذکورہ آیت کا تعلق قرض سے ہے یعنی وہ صورت جب کہ آج معاملہ کیا جائے گا اور آئندہ اسکی ادائیگی ہو۔ ایسے معاملہ میں حکم دیا گیا کہ اس کے اوپر دو مرد گواہ ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ گواہ مقرر کی جائیں یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں انصاف پسندی کے بعد دوسری جو چیز دیکھنے کی ہے وہ یادداشت ہے اور جب حیاتیاتی طور پر عورت کی یادداشت مرد سے کم ہو تو یہ عین مطابق حقیقت ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔ گویا عورت اور مرد میں گواہی کا فرق بر بنائے ضرورت ہے نہ کہ بر بنائے فضیلت۔

اضافی خصوصیت نہ کہ فضیلت

قرآن کی ایک آیت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

(ترجمہ) مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی۔ (النساء 34)

یہاں فضیلت سے مراد خصوصیت ہے گھر کے نظام کو درست طور پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک سربراہ اور نگران ہو۔ یہ سربراہی یا نگرانی اسی فرد کو سونپی جائے گی جو نسبتاً اس کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو۔ یہ اہلیت قدرتی تخلیق کے اعتبار سے مرد کے اندر زیادہ ہے اس آیت میں کلی فضیلت کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں صرف اس فضیلت کا ذکر ہے۔ جو مرد کے لئے یہ استحقاق ثابت کرتی ہے کہ اس کو گھر کا قوام بنایا جائے۔

فضل بعضھم علی بعض عربی کا ایک اسلوب ہے جو قرآن میں مختلف مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی سے مختلف قسم کی فصلیں اور میوے پیدا ہوتے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

(ترجمہ) اور زمین میں پاس پاس مختلف قطع ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتی ہے۔ اور کھجوریں ہیں ان میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دہرے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہین اور ہم بڑھا دیتے ہیں ان میں ایک کو ایک سے میووں میں۔'' (الرعد 4)

تمام مفسرین نے یہاں ''تفضیل'' سے مراد فرق اور تنوع لیا ہے نہ یہ کہ کسی ایک پھل کو دوسرے تمام پھلوں کے اوپر مطلق برتری حاصل ہے یعنی ہر پھل میں ایک منفرد خصوصیت ہے۔ جو دوسرے میں نہیں۔ ہر پھل میں رنگ اور مزہ کے اعتبار سے ایک مزید پہلو ہے جو دوسرے پھل سے مختلف ہے۔ عورت اور مرد میں بھی اسی طرح فرق رکھا گیا ہے۔ ایک صنف کے اندر ایک اضافی خصوصیت ہے تو دوسری صنف کے اندر دوسری اضافی خصوصیت۔

اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ جن چیزوں میں اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی ہے ان مین ہوس نہ کرو۔ مردوں کو ان کی کمائی کا حصہ اور عورتوں کو ان کی کمائی کا حصہ (النساء 32) یعنی ہر ایک کو کوئی ایسی خصوصیت دی گئی ہے جو

دوسرے کونہیں دی گئی ہے۔اس لئے دوسرے کو جو کچھ ملا ہے اس پر شک وحسد نہ کرو بلکہ تم کو جو کچھ ملا ہے اس کو استعمال کر کے اس کے ذریعہ سے تعمیر حیات میں اپنا حصہ ادا کرو۔

یہ صحیح ہے کہ جسمانی اعتبار سے عورت کے اندر بعض کمزوریاں ہیں مگر جسمانی کمزوری کا مطلب غیر افضل نہیں ہوتا۔ یہی معاملہ عورت اور مرد کا بھی ہے۔ عورت اور مرد دونوں کے اندر کوئی مزید صفت ہے جو ایک کے اندر ہے۔ وہ دوسرے کے اندر نہیں۔ ہر ایک کو کسی نہ کسی اعتبار سے فضیلت (اضافی خصوصیت) حاصل ہے دونوں کو چاہئے کہ وہ اپنی اضافی خصوصیت کے اعتبار سے زندگی کے نظام میں اپنا مقام متعین کریں۔ ہر صنف کو اللہ تعالیٰ نے کسی کار خاص کے لئے موزوں بنایا ہے اور اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی کار خاص میں لگا دے۔

نادانی کا کلمہ

اخبارات میں ایک کیس شائع ہوا ہے۔ یہ نادرہ بیگم قریشی کا کیس ہے جو بلاس پور (مہاراشٹر، بھارت) کی رہنے والی ہے اس کے شوہر نے ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد اس کو طلاق دے دی۔ اب وہ عدالت کے ذریعہ اپنے سابقہ شوہر سے گزارہ وصول کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ٹائمز آف انڈیا یکم مئی 1986ء کی رپورٹ کے مطابق جب نادرہ بیگم قریشی سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں اندور کی شاہ بانو کے راستہ پر چل رہی ہے۔ اور فوجداری قانون کی دفعہ 125 کے تحت اپنے لئے گزارہ وصول کرنا چاہتی ہے (جب کہ یہ اسلام کے خلاف ہے) تو اس نے تیزی سے جواب دیا کہ اسلام نے میرے لئے کیا کیا ہے کہ میں اس کے اصولوں کی پابندی کروں۔ نہ جج اور نہ وکیل اس میں کامیاب ہو سکے۔ کہ وہ مسز قریشی کو اپنا مقدمہ واپس لینے پر راضی کر سکیں۔ اس نے مسٹر قریشی کے اس پیش کش کو بھی ٹھکرا دیا کہ وہ اس کو اور اس کی لڑکی کو دوبارہ واپس لینے پر تیار ہیں اس نے پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے عدالت سے درخواست کی کہ وہ اس کو پانچ سو روپیہ ماہوار دلائے۔ مسز شاہ بانو کے برعکس وہ ابھی جوان (30 سال) ہے اور اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے:

یہ ایک نادان عورت کا کلمہ ہے نہ کہ واقف کار عورت کا کلمہ۔ مذکورہ خاتون اگر تاریخ سے واقف ہوتی تو وہ جانتی کہ عورت کو جو کچھ اسلام ہی کے ذریعے ملا ہے حتیٰ کہ ایک عورت کا کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ اسلام نے میرے لیے کیا کیا ہے؟ یہ بھی اسلام ہی کا عطیہ ہے۔ اسلام سے پہلے عورت کو یہ درجہ ہی حاصل نہ تھا کہ وہ برسر عام کھڑی ہو کر اس طرح آزادانہ کلام کر سکے۔

(بحوالہ خاتون اسلام)

(مولانا وحید الدین خاں)

ماؤں کا ادب واحترام اور خدمت

قرآن وحدیث میں والدین کی تعظیم وتکریم اور خدمت کی بڑے تاکید آئی ہے اور اس پر بڑی اجر وثواب کی بشارت دی گئی ہے۔ اس بارے میں والدہ کا حق اولاد پر بہت زیادہ ہے خاص طور پر جو والدہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کرے اس کا حق اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے علماء نے ایسی ماؤں کا بے حد ادب و احترام کیا ہے۔

امام حسن بصریؒ

حضرت حسن بصریؒ نے ایک مرتبہ اپنی والدہ خیرہ کے ہاتھ میں کراثہ (گندنا) دیکھا تو کہا کہ اس گندے پودے کو پھینک دو۔ اس پر والدہ نے کہا چپ رہو، تم سٹھیانے شیخ ہو۔ والدہ کی بات سن کر امام حسن بصریؒ نے ہنس کر کہا کہ کون بڑا ہے میں یا تم۔ (تہذیب التہذیب صفحہ 416 جلد 12)

امام غزوان رقاشیؒ

امام غزوان رقاشی رحمتہ اللہ علیہ نہایت عابد وزاہد، مجاہد اور بزرگ عالم دین تھے۔ قرآن کی تلاوت بہت زیادہ کرتے تھے۔ ان کی والدہ بے لکھی پڑھی تھیں۔ ایک دن غزوان تلاوت کر رہے تھے۔ والدہ نے کہا غزوان، زمانہ جاہلیت میں ہمارا اونٹ گم ہو گیا تھا، تم قرآن میں اس کو پا رہے ہو؟ غزوان نے ماں کی اس بات کو نہ برا مانا اور نہ ان کو جھڑکا بلکہ نہایت ادب اور محبت کے لہجہ میں کہا کہ:

(ترجمہ) ''اے ماں! خدا کی قسم میں اس میں اچھے بدلے کا وعدہ پا رہا ہوں۔''

حضرت غزوانؒ جہاد میں شریک ہوا کرتے تھے جب ان کے ساتھ مجاہدین واپس آئے تو ان کی والدہ استقبال میں نکل کر ان سے معلوم کرتی تھیں کہ تم لوگ غزوان کو پہچانتے ہو؟ تو وہ کہتے تھے:

(ترجمہ) ''اے بوڑھیا! وہ تو ہمارے پیشوا ہیں۔'' (طبقات ابن سعد صفحہ نمبر 217 جلد 7)

حضرت غزوان چالیس سال تک کھل کر نہیں ہنسے تھے۔ ایک شخص نے نہ ہنسنے کی وجہ معلوم کی تو بتایا کہ میں ہنس کر کیا کروں گا؟

امام مسعر بن کدام کوفیؒ

امام مسعر بن کدام کوفی رحمتہ اللہ علیہ اپنے مکان اور مسجد کے علاوہ کہیں نہیں رہتے تھے۔ ان کی والدہ بڑی عابدہ وزاہدہ تھیں۔ جب مسجد جاتے تو اپنے ساتھ ایک گدا لے جاتے۔ والدہ کو بھی ساتھ لے جاتے اور مسجد میں

پہنچ کر گدا بچھا دیتے جس پر والدہ نماز پڑھتی تھیں اور خود مسجد میں دوسری جگہ نماز پڑھ کر بیٹھ جاتے تھے اور شاگردوں کو حدیث کا درس دیتے تھے۔ فارغ ہو کر والدہ کے پاس جاتے، گدا اٹھاتے اور والدہ کو واپس لے کر آتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ (طبقات ابن سعد صفحہ 365 جلد 6)

امام احمد بن علی ابار بغدادیؒ

امام حافظ ابوالعباس احمد بن علی بن مسلم بغدادیؒ ابار کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کی والدہ بڑی رحم دل، خدا ترس خاتون تھیں۔ اپنے لڑکے سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ لڑکا بھی اپنی والدہ کا بے حد لحاظ کرتا تھا اور ان کی دلجوئی اور ناز برداری میں کمی نہیں کرتا تھا۔

امام ابار نے ایک مرتبہ اپنی والدہ سے اجازت چاہی کہ امام قتیبہ سے جا کر حدیث حاصل کریں مگر والدہ نے اس سفر کی اجازت نہیں دی۔ جب والدہ کا انتقال ہو گیا تو امام ابار نے بلخ کا سفر کیا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ امام قتیبہ کا انتقال ہو چکا ہے اور وہاں کے اہل علم نے ابار کو تسلی دی۔ (تذکرۃ الحفاظ صفحہ 193 جلد 2)

امام اعظم ابوحنیفہؒ

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے والدین نہایت نیک تھے۔ امام صاحبؒ ان کے لیے ہمیشہ دعا کرتے تھے۔ خاص طور سے اپنی والدہ ماجدہ کا بے حد احترام اور تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ ان کی دل داری و دل جوئی میں لگے رہتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اعمال کے تین حصے کیئے ہیں۔ ایک تہائی اپنے لیے۔ ایک تہائی اپنے والدین کے لیے اور تہائی اپنے استاد حماد کے لیے۔

آپ کے والد کا انتقال پہلے ہوا اور والدہ 130 ھ کے بعد فوت ہوئیں۔ اس لیے ان کی خدمت کا زیادہ موقع ملا۔

امام صاحب اپنی والدہ کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ حتیٰ کہ عمر بن فر کی مجلس درس میں جاتے تو والدہ کو سواری پر لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی والدہ نے کسی بات پر قسم کھائی اور اس کے بارے میں اپنے بیٹے سے فتویٰ پوچھا مگر ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئیں۔ اور کہا کہ جب تک زرعہ واعظ سے دریافت نہیں کرو گے مجھے اطمینان نہ ہوگا۔ امام صاحب زرعہ واعظ کے پاس لے گئے اور والدہ نے خود ان سے فتویٰ پوچھا انہوں نے کہا کہ فقیہ کوفہ آپ کے ساتھ ہے میں کیا فتویٰ دوں۔ امام صاحب نے والدہ محترمہ کے احترام میں زرعہ واعظ سے کہا میں فتویٰ نے بتایا ہے اور آپ فتویٰ دے دیں۔ چنانچہ ایسا ہوا اور والدہ راضی ہو گئیں۔

امیر کوفہ یزید بن عمر بن ہبیرہ نے امام صاحب کو عہدہ قضا پیش کیا اور انکار پر ایک سو دس درے مارے۔ آپ کہتے تھے کہ مجھے اس سزا سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی جتنی اس حادثہ کی وجہ سے والدہ کے رنج و غم سے ہوئی۔ والدہ نے کہا کہ نعمان جس علم کی وجہ سے تم کو یہ دن دیکھنا پڑا اس سے ترک تعلق کر لو۔ میں نے کہا کہ اگر میں اس

علم سے اگر دنیا حاصل کرنا چاہتا تو بہت زیادہ حاصل کر لیتا۔ میں نے علم صرف اللہ کی رضا جوئی اور اپنی تجارت کے لیے حاصل کیا ہے۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ صفحہ 53 عقود الجمان صفحہ 292 تاریخ بغداد 266 جلد 13)

امام ابوالمظفر سمعانی''

کتاب الانساب کے مصنف امام ابوسعد سمعانی مروزیؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے بعض اساتذہ سے سنا ہے کہ میرے دادا ابوالمظفر سمعانی نے شیخ الحرم امام سعد بن علی ابن محمد (متوفی 471ھ) کی صحبت اختیار کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں مجاورت اور قیام کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ مگر وہاں دوران قیام میں ایک رات والدہ کو خواب میں دیکھا کہ کہتی ہیں کہ بیٹے! تمہارے اوپر میرا جو حق ہے اس کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ مرلوٹ آؤ۔ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ دادا کا بیان ہے کہ میں گھبرا کر اٹھا اور سوچا کہ سعد بن علی سے یہ خواب بیان کر کے ان سے مشورہ کروں گا اور صبح کو ان کے پاس گیا۔ مگر طلبہ اور مستفیدین کی بھیڑ کی وجہ سے بات نہیں کر سکا۔ جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا انہوں نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور فرمایا ''ابوالمظفر! بڑھیا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلے گئے میں سمجھ گیا کہ وہ میرے مافی الضمیر کو سمجھ کر یہ بات کہہ رہے ہیں اور میں اسی سال وطن واپس آ گیا۔ (تذکرۃ الحفاظ صفحہ 346 جلد 3)

خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات

حضرت مولانا قاضی ابوطاہر صاحب مبارک پوری

عورت کا احترام

اسلام کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ اللہ کا خوف اور انسانوں کا احترام۔ اس کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

(ترجمہ) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی (کی جنس) سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے اور تم اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی بے شک اللہ تمہارے اوپر نگران ہے۔ (النساء 1)

اس آیت میں (خدا نے اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا) کا مطلب بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کے بعد ان کے جسم سے ان کی ایک پسلی نکال کر ان کی بیوی حوا کو بنایا۔ مگر یہ تصریح صحیح نہیں یہ بائبل کی بات ہے نہ کہ قرآن کی بات۔

بائبل میں حضرت حوا علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں اسی قسم کی روایت آئی ہے۔ یہاں ہم بائبل کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا۔ اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت کو بنا کر اسے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس لئے وہ ناری کہلائے گی۔ کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ (پیدائش 2:21-23)

بائبل کی یہی روایت ہے جس کو بعد کے کچھ لوگوں نے قرآن کی تفسیر میں داخل کر دیا اور اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنے لگے مگر یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بائبل ایک محرف کتاب ہے۔ اس میں پیغمبروں کے کلام کے ساتھ عام انسانی کلام کی آمیزش ہوئی ہے اس لئے اس کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنا درست ہے۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت یا کسی بھی دوسری آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حوا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا قرآن کریم کی مذکورہ آیت جو لفظ ہے۔ وہ منھا (اس سے) ہے نہ کہ من ضلع آدم (آدم کی پسلی سے)۔ چنانچہ محقق مفسرین نے منھا سے مراد من جنسھا لیا ہے یعنی نفس واحدہ (آدم) کی جنس سے نہ یہ کہ خود آدم کے اپنے جسم سے۔ ابو مسلم اصفہانی اور بعض دوسرے مفسرین سے یہی قول نقل کیا گیا ہے اور یہی قرآنی الفاظ کے مطابق ہے۔

القول الثانی ماھو اختیار ابی مسلم الاصفهانی ان اعداد من قوله و خلق منها زوجها ای من جنسها، تفسیر کبیر. ویحتمل ان یکون المعنی من جنسه لامنه نفسه حقیقة (البحر المحیط)

منھا کو من جنسھا کے معنی میں لینے کی تائید بعض دوسری آیات سے ہوتی ہے قرآن میں نفس کا لفظ بار بار جنس کے معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح یہ دوسری آیتیں سورہ نساء کی مذکورہ آیت کی نہایت واضح تشریح کر رہی ہیں یہاں ہم چند آیات نقل کرتے ہیں۔

(ترجمہ) اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائیں۔ (النحل 72)

(ترجمہ) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں تاکہ تم سکون حاصل کرو۔ (الروم 71)

(ترجمہ) وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے اور اس طرح مویشیوں میں سے جوڑے بنائے۔ (الشوریٰ: 11)

ان آیات پر غور کیجئے۔ ان میں عام مردوں کی ازواج (بیویوں) کے لئے بھی عین وہی لفظ آیا ہے جو سورۃ النساء کی آیت میں حضرت آدمؑ کی زوجہ (بیوی) کے لئے آیا ہے۔ اس کے مطابق حوا کو جس طرح آدمؑ کے ''نفس'' سے پیدا کیا گیا، اسی طرح دوسرے تمام مردوں کی بابت بھی ارشاد ہوا ہے کہ ان کی بیویوں کو ان کے ''انفس'' سے پیدا کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دوسری آیتوں کے یہ معنی نہیں لئے جاسکتے کہ مرد کی بیوی اس کے اپنے جسم کے اندر سے نکالی گئی ہے۔ یہاں لازمی طور پر اس کو جنس کے معنی میں لینا ہوگا۔ یعنی یہ اللہ نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے تمہاری عورتیں بنائیں تاکہ وہ تمہارے لئے حقیقی معنوں میں رفیق زندگی بن سکیں۔

جس طرح عام آدمیوں کی بیویاں ان کی ہم جنس ہیں نہ کہ حیاتیاتی معنوں میں ان کے جسم کا حصہ۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی بیوی حضرت حوا علیہ السلام بھی ان کی ہم جنس تھیں۔ وہ آدمؑ کے جسم کے اندر سے نکالی نہیں گئیں۔ اللہ نے آدمؑ کی طرح ان کی بیوی کو بھی اپنی قدرت سے پیدا کیا جس طرح اس نے عام مردوں کی طرح ان کی عورتوں کو اپنی قدرت خاص سے پیدا فرمایا ہے۔

احادیث

اب ایک سوال ان احادیث کا ہے جو اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہیں اور جن میں صراحۃً ضلع (پسلی) کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث میں آدم و حوا کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ وہ عام عورتوں کے بارے میں ہیں۔ یعنی ان احادیث میں ہر عورت کی تخلیقی نوعیت کا ذکر ہے نہ کہ مخصوص طور پر حضرت حوا علیہ السلام کی تخلیقی نوعیت کا ذکر۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

''عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔'' (التفسیر المظہری)
اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ عورت واقعتہً پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ کیونکہ پورے فقرہ کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں حدیث کا مدعا عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کرنا ہے۔ اس لئے اس کی وہی تشریح درست ہوگی جو اس اصل مدعا کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔

''عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔'' کا فقرہ یہاں مجازی معنوں میں ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا معاملہ پسلی جیسا معاملہ ہے وہ پسلی کی مانند ہیں چنانچہ دوسری روایت میں خود حدیث میں یہ صراحت موجود ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت پسلی کی مانند ہے اگر تم اس کو سیدھا کرو گے تو تم اس کو توڑ دو گے۔ (بخاری، کتاب النکاح، مسلم، کتاب الرضاع)

بخاری اور مسلم کی اس روایت میں واضح طور پر کالضلع کا لفظ ہے یعنی یہ کہ عورت پسلی کی مانند ہے نہ یہ کہ وہ خود پسلی سے بنائی گئی ہے۔ پسلی کی مانند ہونے کا مطلب کیا ہے۔ یہ بھی صراحتہً حدیث میں موجود ہے چنانچہ فرمایا کہ اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو تم اس کو توڑ دو گے۔

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے'' یا عورت پسلی کی مانند ہے'' دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ صرف ادبی اسلوب کا فرق ہے نہ کہ حقیقت کا فرق۔ ہر زبان میں یہ اسلوب عام ہے کہ جب تشبیہہ میں شدت پیدا کرنا مقصود ہو تو ''مثل'' کا لفظ حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی بہادری بتانے کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ شیر کی طرح ہے اور جب اس بات کو زور دے کر کہنا ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ ''وہ شیر ہے'' جیسے میر انیس نے کربلا کے میدان کا نقش کھینچتے ہوئے کہا ہے:

''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔''

عورت کے بارہ میں نفسیات اور حیاتیات کا علم بتاتا ہے کہ وہ ''صنف نازک'' ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں کمزور اور نازک ہوتی ہے۔ اس کے مزاج میں انفعالیت ہے۔ چنانچہ کسی واقعہ سے وہ بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ہر آدمی جانتا ہے خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا۔ ہر باپ جانتا ہے کہ بیٹے سے سختی کی جا سکتی ہے۔ مگر بیٹی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ شدت کا تحمل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ خودکشی کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ خودکشی کرتی ہیں۔ وہ ایک معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر خودکشی کر سکتی ہیں۔ یا ذہنی اختلال کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہی وہ معلوم حقیقت ہے جس کو حدیث میں تمثیل کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ آدمی کے سینے پسلی کی ہڈیاں کسی قدر خم دار ہوتی ہیں ان کا خم دار رہنا ہی مصلحت کے مطابق ہے۔ کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں کرتا کہ آپریشن کے ذریعہ ان پسلیوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔

اسی معلوم واقعہ کی مثال دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ ان کی فطرت کے مطابق پیش آؤ۔ عورتوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہ ذہن نشین رکھو کہ عورتیں فطری طور پر نازک اور جذباتی ہوتی ہیں۔ اللہ نے مخصوص مصالح کے تحت انہیں بالارادہ ایسا ہی بنایا ہے۔ اس لئے تم ان کے ساتھ ہمیشہ نرم برتاؤ کرو۔ کوئی بات بتانا ہو تو نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بتاؤ اگر تم ان کے ساتھ سختی کرو گے تو ان کی شخصیت اس کا تحمل برداشت نہ کر سکے گی۔ ان کا دل اسی طرح ٹوٹ جائے گا جس طرح پسلی سیدھا کرنے میں ٹوٹ جاتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بار سفر میں تھے۔ کچھ خواتین اونٹ پر بیٹھی ہوئی چل رہی تھیں ساربان نے اونٹ کو تیز چلانا چاہا۔ اونٹ جب تیز چلنے لگتا ہے تو مسافر کا جسم کافی ہلنے لگتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساربان (حضرت انجشہ) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: (اے انجشہ! یہ آبگینے ہیں، ذرا آہستہ چلو)

جدید تحقیقات

موجودہ زمانہ میں خاص علمی طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان بنیادی پیدائشی فرق پائے جاتے ہیں انسائیکلوپیڈیا ٹانیکا 1984ء میں خواتین کی حالت پر ایک مفصل مقالہ ہے اس مقالہ کا ذیلی عنوان یہ ہے:

(مرد اور عورت کے فرق کا علمی مطالعہ) مقالہ کے اس حصہ میں مقالہ نگار نے دکھایا۔ ہے کہ جدید تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان عین پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

اوصاف شخصیت کے اعتبار سے، آدمیوں کے اندر جارحیت کی خصوصیت زیادہ پائی گئی ہے۔ ان میں حاصل کرنے کا جذبہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور ناکامی کی صورت میں مردوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسانی سے بے ہمت ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ میں بے شمار تجربات کئے گئے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ایک تجربہ کیا گیا کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کا انتخاب کیا گیا۔ دونوں کم عمر تھے اور ابھی بولنے کی عمر کو نہ پہنچے تھے۔ تاہم ان کی جسمانی صحت یکساں تھی۔ ان کو دو الگ الگ کٹہرے میں رکھ کر نکلنے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد لڑکی رونے چلانے لگی۔ جب کہ لڑکے نے ادھر ادھر ہاتھ مار کر اندازہ کرنا شروع کر دیا کہ کیا کسی طرف سے وہ نکلنے کا راستہ پا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک تجربہ میں پایا گیا کہ بارہ ماہ کی لڑکیاں کسی اجنبی کمرہ میں ہوں اور انہیں خوفزدہ کیا جائے تو وہ اپنی ماؤں کی طرف بھاگتی ہیں۔ جب کہ اسی عمر کے لڑکے کچھ کرنے کی راہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی میں ریسرچ کرنے والوں نے دیکھا کہ اگر ایک لڑکی بوتل پینے میں مشغول ہے تو وہ اس وقت پینے سے رک جاتی ہے جب کہ کوئی شخص کمرے میں آتا ہوا نظر آئے۔ اس کے برعکس ایک لڑکا کسی آنے والے پر کوئی

دھیان نہیں دیتا وہ اپنا کام بدستور جاری رکھتا ہے۔

ماہرین نے بتایا کہ عورت اور مرد کے تمام فرق ان کے جین کے اندر پائے جاتے ہیں نہ کہ سماجی حالات میں عورتوں کے اندر انفعالیت کا سبب ان کے مخصوص ہارمون ہیں۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون میں یہ فرق پیدائش کے بالکل آغاز سے موجود رہتا ہے (ٹائم میگزین، نیویارک 20 مارچ 1972ء)

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے تمام احکام فطری حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطری تقاضوں کو قانونی صورت دینے ہی کا دوسرا نام شریعت ہے۔ عورت کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بھی اسی بنیادی اصول پر مبنی ہیں۔ نفسیات اور حیاتیات اور عضونیات میں موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ مرد کے مقابلہ میں عورتیں فطری طور پر مستقل مزاج ہوتی ہیں۔ مخصوص معاشرتی مصالح کی بنا پر خالق نے ان کو نسبتاً نازک پیدا کیا ہے۔

یہی وہ فطری حقیقت ہے جس کی رعایت اسلامی تعلیمات میں رکھی گئی ہے۔ اس بنا پر اسلامی شریعت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو۔ کہ وہ بے حوصلہ نہ ہوں تا کہ وہ دل شکنی سے محفوظ رہیں اور زندگی میں اپنے مخصوص فرائض کو بخوبی ادا کرسکیں۔ عورتیں لوہے کی مانند نہیں ہیں کہ ان پر ٹھونک پیٹ کا کوئی اثر نہ پڑے۔ وہ پسلی کی مانند ہیں۔ وہ فطرتاً جیسی بھی ہیں انہیں ویسی ہی رہنے دو اگر تم ان کے ساتھ لوہے جیسا برتاؤ کرو گے تو تم ان کی شخصیت کو توڑ دو گے۔

چیف جسٹس کا ریمارک

محمد احمد۔ شاہ بانو کیس (کریمنل اپیل نمبر 103-1981ء مورخہ 23 `1985ء) میں فیصلہ دیتے ہوئے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس وائی وی۔ چندراچوڑ نے ایک خصوصی نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں وہ کہتے ہیں کہ عام دیوانی اور فوجداری قانون کے تحت چھ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سماج کے ایک بڑے حصہ کیلئے دوررس اہمیت کے حامل ہیں کہ روایتی طور پر غیر منصفانہ سلوک کا شکار رہا ہے عورتیں اسی قسم کا ایک حصہ ہیں۔ قانون ساز منو نے کہا کہ عورت آزادی کی مستحق نہیں اور اسلام پر یہ الزام ہے کہ اس کا ایک تباہ کن پہلو عورت کو کمتر درجہ دینا ہے پیغمبر اسلام کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے امید افزا طور پر غلطی سے کہ عورت ایک ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اس لئے تم اپنی بیویوں سے نرم سلوک کرو۔

واضح ہو کہ چیف جسٹس صاحب کی مذکورہ عبارت میں ''امید افزا طور پر غلطی سے'' کا مطلب یہ نہیں کہ موصوف کے نزدیک پیغمبر کی طرف اس قول کو منسوب کرنا غلط ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر نے اگرچہ یہ کہا ہے کہ عورت ''ٹیڑھی پسلی'' سے پیدا کی گئی ہے مگر جو لوگ عورت اور مرد کے درمیان برابری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو اس سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ ہمارے لئے امید کا پہلو یہ ہے کہ پیغمبر کا ارشاد بطور واقعہ درست نہیں۔ چیف جسٹس کے اس فقرہ کا مقصد ''بیان'' کی تردید ہے نہ کہ خود ''انتساب'' کی تردید۔

ایک چیف جسٹس کا یہ ریمارک خالص قانونی اعتبار سے کسی حد تک باموقع ہے۔ اس کے بارہ میں کوئی قانون دان ہی قطعی رائے دے سکتا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ خالص علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

چیف جسٹس صاحب نے پیغمبر اسلام کا یہ قول اس دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ کہ اسلام سماج کے ایک طبقہ (عورت) کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کی تاکید کر رہا ہے۔ محترم چیف جسٹس کا ریمارک منو کے قول کے لئے تو درست ضرور ہے مگر وہ پیغمبر اسلام کے قول پر بالکل صادق نہیں آتا۔

مذکورہ قول رسولؐ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ عورت کے ساتھ نرمی (خیر) کا سلوک کرو۔ پھر اس حدیث کے بارہ میں کس طرح یہ برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے (جیسا کہ منو کے حوالے میں پایا جاتا ہے) جہاں تک عورت کے پسلی کی مانند ہونے کا تعلق ہے وہ عورت کے ساتھ بہتر سلوک کی توجیہ کے طور پر ہے نہ کہ بہتر سلوک کی تردید کے طور پر ہے۔ اس بارہ میں اوپر یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ محض ایک مثال ہے عورت کی مخصوص نفسیات کی بنا پر اس کے معاملہ کو پسلی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس سے نرم سلوک کرو۔ اگر تم عورت کے ساتھ سخت سلوک کرو گے تو یہ عورت کی فطرت کے مطابق نہ ہوگا۔ اس سے بگاڑ پیدا ہوگا نہ کہ اصلاح۔

خلاصہ

سورۃ نساء کی آیت (خلق منہا زوجہا) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس جنس سے آدم کو بنایا، اسی جنس سے اس نے آدم کے جوڑے (حوا) کو بھی بنایا تا کہ دونوں میں موافقت رہے اگر ایسا ہوتا تو دو الگ الگ جنس ہوتے۔ مثلاً ایک آگ سے بنایا جاتا اور دوسرا مٹی سے تو دونوں کے درمیان باہمی موافقت نہ ہوتی پھر نہ خاندانی زندگی میں سکون پایا جاتا اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ دونوں مشترکہ جدوجہد سے تمدن کی تعمیر کریں۔

حدیث میں عورتوں کے بارے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا مقصد تمثیل کی زبان میں یہ بتانا ہے کہ عورتوں کی مخصوص فطری ساخت کی بنا پر ضروری ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک اختیار کیا جائے پیغمبر اسلام نے بار بار مختلف انداز سے یہ نصیحت فرمائی ہے اور خود اپنی پوری زندگی میں اس کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں رات کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ نماز کی اقامت کا بہت خاص اہتمام فرماتے تھے۔ لیکن خواتین کے ساتھ آپ کی رعایت کا یہ حال تھا کہ نماز میں اگر کبھی چھوٹے بچے کی رونے کی آواز آجاتی تو آپؐ نماز کو جلد ختم کر دیتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

میں مسجد میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ اس کو لمبا کروں، پھر میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اس اندیشہ کی بنا پر کہ میں اسکی ماں کو تکلیف دوں گا۔

حدیث رسول میں عورت کو پسلی (ضلع) سے تشبیہ دینا ایک سادہ سی بات ہے۔ اس معاملہ میں جو شبہات

پیدا ہوئے، اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کو بائبل کے بیان سے جوڑ دیا گیا۔ حالانکہ مذکورہ حدیث کا بائبل کے بیان سے کوئی تعلق نہیں حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ ایک فطری حقیقت ہے۔ جس کو دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے مثلاً میتھو آرنلڈ نے اسی بات کو ان الفاظ میں کہا کہ عورتوں پر دل کی دلیل کام کرتی ہے نہ کہ دماغ کی۔''

خط و کتابت

اوپر ہم نے وہ ریمارک نقل کیا ہے جو ہندوستانی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر چندراچوڑ نے اس معاملہ میں محمد احمد۔ شاہ بانو کیس پر فیصلہ صادر کرتے ہوئے دیا تھا۔

(بحوالہ: خاتون اسلام) (مولانا وحید الدین خان)

مومنہ کی صفات

مرد اور عورت کی باہمی حیثیت کو سمجھنے کے لئے قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے: **انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض** (ال عمران 195) اس آیت میں عورت اور مرد کے لئے **بعضکم من بعض** کا لفظ آیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا جز ہو۔

یہ مرد اور عورت کی حیثیت کے بارے میں نہایت جامع بیان ہے۔ اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہنا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے برابر کے ساتھی ہیں۔ حیاتیاتی اعتبار سے اگر چہ دونوں صنف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک صنف مذکر ہے اور دوسری صنف مونث۔ مگر انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں بالکل یکساں ہیں۔ جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔ حقوق کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں۔

یہی بات حدیث میں ایک اور انداز سے واضح کر دی گئی ہے ایک حدیث کے مطابق، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عورتیں مردوں کا شقیقہ ہیں (**انما النساء شقائق الرجال**) شق یشق کے اصل معنی ہیں پھاڑنا۔ ایک لکڑی کو درمیان سے پھاڑا جائے تو وہ دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے شقیق کے معنی ہوئے دو حصوں میں پھٹی ہوئی چیز کا آدھا حصہ۔ چنانچہ کسی چیز کے نصف کو شق الشئ کہتے ہیں۔ اسی سے مزید وسعت پا کر بمعنی بھائی اور شقیقہ بمعنی بہن بولا جانے لگا۔

اس تشریح کے مطابق مذکورہ حدیث کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ عورتیں مردوں کا نصف ثانی ہیں۔ یا عورتیں مردوں کا دوسرا نصف ہیں جدید تہذیب میں عورت کو نصف بہتر کہا گیا ہے مگر یہ ایک ادبی تعبیر ہے نہ کہ سائنسی تعبیر۔ حدیث کے مطابق عورت مرد کا نصف ثانی ہے اور یہ یقیناً زیادہ صحیح اور سائنسی تعبیر ہے۔ اسی ایک لفظ سے عورت کے بارے میں اسلام کے پورے نقطہ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے زیر نظر کتاب گویا حدیث کے اسی بیان کی تفصیل ہے۔

تقسیم کار کا اصول

اسلام نے سماجی زندگی میں دونوں جنفوں کے عمل کے درمیان ایک حد تک تقسیم کار کا اصول اختیار کیا ہے۔ مرد کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر باہر ہے اور عورت کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر اندر۔ اس تقسیم کا کوئی بھی تعلق امتیاز سے نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دونوں کی صنفی خصوصیات مجروح نہ ہوں۔ دونوں اپنی پیدائشی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لاسکیں۔ بغیر اس کے کہ خاندان یا سماج کے اندر کوئی رخنہ واقع ہو۔

بالفاظ دیگر، یہ فرق انتظام کی بنیاد پر ہے، نہ کہ اعزاز کی بنیاد پر۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت کے لئے جو چیزیں درکار ہیں وہ عورتوں کے لئے بھی وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں۔ آخرت کی نجات کا مستحق بننے کے لئے عورتوں کو بھی وہی کرنا ہے جو مردوں کو کرنا ہے۔

دنیا میں زندگی کا انتظام چلانے کے لئے عورت اور مرد کے اندر حیاتیاتی فرق رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے بعض امور میں دونوں کے حدود کار ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ تاہم خدا کی رضا اور آخرت کی نجات حاصل کرنے کے لئے جو بنیادی شرط درکار ہے وہ ایک صنف کے لئے بھی وہی ہے جو دوسری صنف کے لئے ہے۔

اسلام کا آغاز حقیقتاً خدا کی شعوری دریافت سے ہوتا ہے، جس کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان اگر حقیقی ہو تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت خدا کے آگے جھک پڑتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کا اثاثہ خدا کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ خدا کی خاطر صبر کرنے والے بن جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ چھوڑ دیتے ہیں اور سچ بولنے والے بن جاتے ہیں۔

وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں سال کے ایک مہینہ میں کھانا پینا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات پر کنٹرول کرتے ہیں۔ اپنی عبدیت کا شعور اور خدا کی معرفت ان کا یہ حال کر دیتی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر موقع پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

آیات قرآن

یہی وہ چیزیں ہیں۔ جو خدا کو ہر فرد کے اندر درکار ہیں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، قرآن میں یہ بات مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

(ترجمہ) بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں۔ ان سب کے لئے اللہ نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں وہ تمام بنیادی صفات بتا دی گئی ہیں۔ جو اس مرد یا عورت میں ہونی چاہیں جو اللہ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شامل ہونا چاہئے۔

اسلام...... پہلی چیز اسلام بتائی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا نفس اللہ کی اطاعت پر راضی ہو جائے۔ وہ اللہ کے احکام کی پیروی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔

ایمان..... اس سے مراد وہ شعوری یافت ہے جب کہ آدمی خدا کو اپنے خالق اور معبود کی حیثیت سے پالے۔ جب آدمی کا فکر خدا کے فکر میں ڈھل جائے۔ جب آدمی اس یقین تک پہنچ جائے کہ سب سے بڑی حقیقت وہی ہے، جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ انسان کے لئے ظاہر کی ہے۔

قنوت..... یعنی مخلصانہ فرماں برداری۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کر لیا جائے۔ جو خدا اور رسول نے بتایا ہے۔

صدق..... اس سے مراد قول اور عمل کی مطابقت ہے یعنی وہی کہنا جو آدمی کرنے والا ہو اور وہی کرنا جو اس نے اپنی زبان سے کہا ہے۔ لوگوں کے درمیان وہ ایک صاحب کردار انسان کی حیثیت سے زندگی گزارے۔

صبر..... یعنی دین کے احکام پر چلنے کے لئے اگر تکلیفیں اٹھانی پڑیں تب بھی اس سے نہ ہٹنا۔ نفس اور شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے دینی تقاضوں پر قائم رہنا۔ غیر خدائی محرکات کی بنا پر خدائی راستہ کو نہ چھوڑنا۔

خشوع..... اس کا مفہوم تواضع اور خاکساری ہے۔ یہ کیفیت وہ ہے جو خدا کی بڑائی اور اس کے کامل اختیار کے تصور سے پیدا ہوتی ہے ایسے لوگوں کے اوپر سب سے زیادہ جو چیز چھائی ہوئی ہوتی ہے وہ خدا کا خوف ہے۔ یہ احساس ان کو خدا کے آگے بالکل جھکا دیتا ہے اور دوسرے انسانوں کے سامنے بھی ان کو متواضع اور مہربان بنا دیتا ہے۔

صدقہ..... یعنی وہ اپنے مال میں سے بندوں کا حق ادا کرتے ہیں جس طرح اپنی ضرورت کا احساس انہیں اپنے اوپر خرچ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اسی طرح وہ دوسرے حاجت مندوں کی امداد سے بھی بے پروا نہیں ہوتے۔

صوم..... یعنی اللہ کے لئے روزہ رکھنا، روزہ رکھ کر آدمی اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ جب کہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی محتاجی کا تجربہ کرے اور پھر اس رزق پر خدا کا شکر ادا کرے جو خدا نے اس کو اپنے پاس سے عطا کیا۔

حفظ فروج..... یعنی عفت اور پاک دامنی کا طریقہ اختیار کرنا اور بے حیائی والے اعمال سے بچنا۔ حیا کا فطری پردہ جو خدا نے پیدا کیا ہے اس کا پورا لحاظ رکھنا۔

ذکر اللہ..... خدا کو بہت زیادہ یاد کرنا خدا کی حقیقی دریافت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو کوئی خدا کو حقیقی طور پر پالیتا ہے۔ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ہر موقع پر اس کو خدا یاد آتا ہے وہ دل و زبان سے بار بار خدا کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ سورہ التحریم (آیت 5) میں عورتوں کی صفات بیان کی گئی ہیں اس میں تین مزید صفتوں کا ذکر ہے۔ توبہ، عبادت، سیاحت۔

توبہ..... توبہ کے معنی ہیں لوٹنا۔ یعنی غلطی کر کے پلٹ آنا۔ یہ مومن اور مومنہ کی نہایت خاص صفت ہے۔ اس

دنیا میں ایسے امتحانی اسباب رکھے گئے ہیں کہ آدمی سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر یہ ہونا چاہئے کہ نفس کے غلبہ سے آدمی وقتی طور پر غلطی کر جائے۔ اس کے بعد خدا کی پکڑ کا احساس اس پر طاری ہو اور وہ فوراً پلٹ کر خدا سے معافی مانگنے لگے۔ یہ توبہ اپنے مقابلہ میں خدا کی عظمت کا اعتراف ہے وہ اللہ کو بہت پسند ہے۔

عبادت...... عبادت سے مراد وہ عمل ہے جو کسی کی فوق الفطری بڑائی کو مان کر اس کے سامنے کیا جائے۔ اسی کو پرستش کہتے ہیں۔ اسی قسم کی پرستش اللہ کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہیں۔ مومن اور مومنہ کی عبادت صرف خدا کے لئے ہوتی ہے۔

سیاحت...... اس کی بہترین تشریح اس حدیث میں ملتی ہے جو ابوداؤد میں آئی ہے:

حضرت ابو عمامہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ کو سیاحت (درویشی) کی اجازت دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد (کوشش کرنا) ہے۔

سیاحت سے مراد اللہ کے راستہ کا وہ عمل ہے جس کی خاطر چلنا پھرنا پڑے مثلاً علم دین حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا۔ دین کی خاطر ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے مقام کی طرف ہجرت کرنا۔ نصیحت کی غرض سے فطرت کے مناظر اور تاریخی عبرت کے مقامات دیکھنے کے لئے جانا۔ اللہ کے دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے دوڑ دھوپ کرنا وغیرہ۔

اوپر جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب وہ ہیں۔ جن کا تعلق کسی خاص صنف سے نہیں۔ ان کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ یہی چیزیں اسلام کی اصل ہیں اور یہی فلاح ونجات کا ذریعہ ہیں۔ عورتوں کے لئے بھی اور مردوں کے لئے بھی۔

امام راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کی رائے کے مطابق سائحون سے وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن کی آیت افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او اذان یسمعون بھا (الحج: 46) کا مصداق ہیں۔

خواتین اسلام کی مثال

تاہم دین کے معاملہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے جس طرح مردوں کے دو درجے ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی دو درجے ہیں ایک عام، دوسرا خاص۔ عام درجہ وہ ہے جو ہر خاتون کے لئے ہے یعنی ذاتی معاملہ میں خدا اور بندوں کے حقوق ادا کرنا، خدا کے بارہ میں عقیدہ کی درستگی۔ خدا کے احکام کی بجا آوری۔ زندگی کے معاملات میں انصاف پر قائم رہنا۔ نفسانی محرکات اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرنا۔ اپنی ذات اور اپنے مال سے خدا کا حق نکالنا۔ ہمیشہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو سامنے رکھنا۔ اپنے گھر اور اپنے متعلقین کے درمیان اسلامی اخلاق کے ساتھ رہنا۔ معاملات میں ہمیشہ وہ کرنا جو اسلام کا تقاضا ہے۔

عورت کا دوسرا اہم فرض اپنے بچوں کی اصلاح و تربیت ہے۔ ہر عورت بالآخر ماں بنتی ہے۔ بچہ سے ماں کا اور ماں کا بچے سے بے حد گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق بگاڑ کا سبب بھی بن سکتا ہے اور بناؤ کا بھی۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے عورت کا فرض یہ ہے کہ وہ اس تعلق کو خوب بناؤ اور اصلاح کے لئے استعمال کرے۔

تیسری چیز جو عورت کے لئے ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اپنے شوہر کے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے مسئلہ نہ بنے۔ زندگی میں ''کیا کیا جائے'' سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے۔ ''کیا نہ کیا جائے'' اس معاملہ میں عورتوں سے جذباتی ہونے کی بناء پر کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ اور اپنے گھر والوں کے ساتھ غیر ضروری قسم کے مسائل کھڑے کر دیتی ہیں۔

اس کی وجہ سے گھر کا سکون غارت ہو جاتا ہے۔ بظاہر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ جسے گھر میں کچھ نہیں۔ عورت اگر اتنا کرے کہ وہ گھر کے اندر مسئلہ نہ پیدا کرے تب بھی اس نے بہت بڑا کام کیا۔ اگر عورت کے اندر مزید صلاحیت ہو اور اس کو وسیع تر مواقع حاصل ہوں تو وہ اس کے آگے کا کام بھی کر سکتی ہے۔ جس کو ہم نے خصوصی درجہ کا نام دیا ہے۔ اسلامی تواریخ میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہلیہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نہایت ذہین خاتون تھیں۔ غالباً ان کا حافظہ وہ تھا جو آج کل عکسی حافظہ کے نام سے یاد جاتا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہوئی باتوں کو اچھی طرح یاد رکھا۔ وہ چونکہ رسول اللہ کے مقابلہ میں بہت کم عمر تھیں اس لئے آپ کی وفات کے بعد 50 سال زندہ رہیں۔ وہ امت امید کے لئے ٹیپ ریکارڈر ثابت ہوئیں۔ آپ کی وفات کے نصف صدی بعد تک آپ کی باتیں لوگوں کو سناتی رہیں۔ عبداللہ بن عباس صحابہ کرامؓ کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ حبر الامتہ کہے جاتے ہیں اور قرآن کی تفسیر میں امتیازی مقام رکھتے ہیں، یہ عبداللہ بن عباسؓ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد تھے انہوں نے علم دین زیادہ تر حضرت عائشہؓ سے سیکھا، اسی طرح بہت سے صحابہ و تابعین آپ سے علم و دین سیکھتے رہے۔ اس مثال میں ایک اسلامی خاتون علم دین میں مہارت پیدا کر کے لوگوں کی رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مہر کی مقدار کم ہوتی تھی۔ بعد میں جب فراخی کا دور آیا تو لوگ مہر کی رقم زیادہ مقرر کرنے لگے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں ایک بار ممبر پر آئے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ چار سو درہم مہر پر کس نے زیادتی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مہر آپس میں چار سو درہم یا اس سے کم ہوتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا کہ خبردار تم عورتوں کے مہر میں زیادتی مت کرو۔ جب بھی مجھے معلوم ہو گا کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہر سے زیادہ مہر باندھنا ہے تو میں اس زیادہ کو ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دوں گا۔

اس کے بعد مجمع کے گوشہ سے ایک عورت اٹھی اس نے کہا کہ اے امیر المومنین! اللہ کی کتاب زیادہ اتباع

کے قابل ہے یا آپ کا قول۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی کتاب۔ عورت نے کہا ابھی آپ نے لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کریں۔ حالانکہ اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے (واتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منه شیاء) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر ایک عمر سے زیادہ عالم ہے (کل احدا فقه من عمر ، حیاۃ الصحابه، جلد 2 صفحہ 677) اس مثال میں ایک عورت دینی بات کا مجمع عام میں اعلان واظہار کر رہی ہے۔

امام ابو جعفر ملحادی (321-229ھ) ایک مشہور محدث ہیں۔ ان کی کتاب ملحادی حدیث کی ایک مشہور کتاب ہے اور عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ امام ملحادی نے یہ کتاب اپنی بیٹی سے املا کرائی ہے اس کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ باب حدیث پڑھ کر سناتے اور اس کے مطالب بیان کرتے اور بیٹی ان کے پاس بیٹھ کر لکھتی جاتی۔ اس طرح پوری کتاب تیار ہوگئی ...... اس مثال میں عورت دین کے معاملہ میں اپنے محرم رشتہ دار کی معاونت کر رہی ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے کہاں تک آگے جاسکتی ہے۔

(بحوالہ خاتون اسلام) (مولانا وحید الدین خاں)

عورت مختلف ادوار میں

یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ تاریخ سے اس کی مثالیں زیادہ تفصیل کے ساتھ دی جاسکیں۔مگر توضیع مدعا کے لئے دو چار مثالیں ناگزیر ہیں۔

یونان

اقوام قدیمہ میں سے جس قوم کی تہذیب سب سے زیادہ شاندار نظر آتی ہے وہ اہل یونان ہیں۔اس قوم کے ابتدائی دور میں اخلاقی نظریہ، قانونی حقوق اور معاشرتی برتاؤ ہر اعتبار سے عورت کی حیثیت بہت گری ہوئی تھی۔ یونان خرافیات (Mythology) میں ایک خیالی عورت پانڈرا (Pandora) کو اسی طرح تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا۔جس طرح یہودی خرافیات میں حضرت حوا علیہا السلام کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت حوا کے متعلق اس غلط افسانے کی شہرت نے عورت کے بارے میں یہودی اور مسیحی اقوام کے رویئے پر جو زبردست اثر ڈالا ہے اور قانون، معاشرت، اخلاق، ہر چیز کو متاثر کیا ہے۔وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔قریب قریب ایسا ہی اثر پانڈرا کے توہم کا یونانی ذہن پر بھی ہوا تھا۔ان کی نگاہ میں عورت ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق تھی۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اس کا مرتبہ گرا ہوا رکھا گیا تھا۔اور عزت کا مقام مرد کے لئے مخصوص تھا۔

تمدنی ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں یہ طرز عمل تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ برقرار رہا۔تہذیب اور علم کی روشنی کا صرف اتنا اثر ہوا کہ عورت کا قانونی مرتبہ تو جوں کا توں رہا۔البتہ معاشرت میں اس کو نسبتاً ایک بلند تر حیثیت دے دی گئی۔وہ یونانی گھر کی ملکہ تھی۔اس کے فرائض کا دائرہ گھر تک محدود تھا۔اور ان حدود میں وہ پوری طرح بااقتدار تھی۔اس کی عصمت ایک قیمتی چیز تھی۔جس کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔شریف یونانیوں کے ہاں پردے کا رواج تھا۔ان کے گھروں میں زنان خانے، مردان خانوں سے الگ ہوتے تھے۔ان کی عورتیں مخلوط محفلوں میں شریک نہ ہوتی تھیں نہ منظر عام پر نمایاں کی جاتی تھیں۔نکاح کے ذریعہ سے کسی ایک مرد کے ساتھ وابستہ ہونا عورت کے لئے شرافت کا مرتبہ تھا اور اس کی عزت تھی اور بیسوا بن کر رہنا اس کے لئے ذلت کا موجب سمجھا جاتا تھا۔یہ اس زمانہ کا حال تھا۔جب یونانی قوم خوب طاقت ور تھی۔اور پورے زور کے ساتھ عروج و ترقی کی طرف جارہی تھی۔اس دور میں اخلاقی خرابیاں ضرور موجود تھیں۔مگر ایک حد کے اندر تھیں۔یونانی عورتوں سے اخلاق کی جس پاکیزگی اور طہارت وعصمت کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔اس سے مرد مستثنیٰ تھے۔ان سے نہ اس کا مطالبہ تھا اور نہ اخلاقاً کسی مرد سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ پاک زندگی بسر کرے گا۔بیسوا طبقہ یونانی معاشرت کا ایک غیر منفک جزو تھا اور اس طبقہ سے تعلق رکھنا مردوں کے لئے کسی طرح معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ اہل یونان پر نفس پرستی اور شہوانیت کا غلبہ شروع ہوا اور اس دور میں بیسوا طبقہ کو وہ عروج نصیب ہوا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ فلاسفر، شعراء، مورخین، اہل ادب اور ماہرین فنون، غرض تمام سیارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ نہ صرف علم وادب کی محفلوں کی صدر نشین تھی۔ بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اس کے حضور میں طے ہوتے تھے۔ قوم کی زندگی وموت کا فیصلہ جن مسائل کے ساتھ وابستہ تھا۔ ان میں اس عورت کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی، جس کی دوراتیں بھی کسی ایک شخص کے ساتھ وفاداری میں نہ بسر ہوتی تھیں۔ یونانیوں کے ذوق جمال اور حسن پرستی نے ان کے اندر شہوانیت کی آگ کو زیادہ بھڑکا دیا۔ وہ اپنے اس ذوق کا اظہار جن مجسموں (یا آرٹ کے عریاں نمونوں) میں کرتے تھے۔ وہی ان کی شہوانیت کو اور زیادہ ہوا دیتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن سے یہ تصور ہی محو ہو گیا تھا کہ شہرت پرستی بھی کوئی اخلاقی عیب ہے۔ ان کا معیار اخلاق اتنا بدل گیا تھا کہ معلمین اخلاق اور بڑے بڑے فلاسفر بھی زنا اور فحش میں کوئی قباحت اور کوئی چیز قابل ملامت نہ پاتے تھے۔ عام طور پر یونانی لوگ نکاح کو ایک غیر ضروری رسم سمجھنے لگے تھے اور نکاح کے بغیر عورت اور مرد کا تعلق بالکل معقول سمجھا جاتا تھا جس کو کسی سے چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ آخر کار ان کے مذہب نے بھی ان کی حیوانی خواہشات کے آگے سپر ڈال دی۔ ''کام دیوی'' (Aphro Dite) کی پرستش تمام یونان میں پھیل جس کی داستان ان کے خرافیات میں یہ تھی کہ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے تین مزید دیوتاؤں سے آشنائی کر رکھی تھی اور ان کے ماسوا ایک فانی انسان کو بھی اس کی جناب میں سرفرازی کا فخر حاصل تھا۔ اسی کے بطن سے محبت کا دیوتا کیوپڈ پیدا ہوا جو، ان دیوی صاحبہ اور ان کے غیر قانونی دوست کی باہمی لگاوٹ کا نتیجہ تھا، یہ اس قوم کی معبودہ تھی اور اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو قوم ایسے کریکٹر کو نہ صرف مثال (آئیڈیل) بلکہ معبودیت تک کا درجہ دے دے، اس کے معیار اخلاق کی دستی کا کیا عالم ہوگا۔ یہ اخلاقی انحطاط کا وہ مرتبہ ہے۔ جس میں گرنے کے بعد کوئی قوم پھر کبھی نہ ابھر سکی۔ ہندوستان میں بام مارگ اور ایران میں مزدکیت کا ظہور ایسے ہی انحطاط کے دور میں ہوا۔ بابل میں بھی قحبہ گری کو مذہبی تقدس کا درجہ ایسے ہی حالات میں حاصل ہوا جس کے بعد پھر دنیا نے کبھی بابل کا نام افسانہ ماضی کے سوا کسی دوسری حیثیت سے نہ سنا۔ یونان میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ فاحشہ عورتیں دیوداسیاں بن گئیں۔ اور زنا ترقی کر کے ایک مقدس مذہبی فعل کے مرتبے تک پہنچ گئی۔

اسی شہوت پرستی کا ایک دوسرا مظہر یہ تھا کہ یونانی قوم میں عمل قوم لوط ایک وبا کی طرح پھیلا اور مذہب اخلاق نے اسکا بھی خیر مقدم کیا۔ ہومر اور ہیلوڈ کے عہد میں اس فعل کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ مگر تمدن کی ترقی نے جب آرٹ اور ذوق جمال (Aesthetics) کے مہذب ناموں سے عریانی اور لذات نفس کی بندگی کو سراہنا شروع کر دیا تو شہوانی جذبات کا اشتعال بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا اور فطرت کے راستہ سے تجاوز کر کے

یونانیوں کو خلاف وضع فطرت میں تسکین کی جستجو کرنی پڑی۔ آرٹ کے ماہروں نے اس جذبہ کو مجسموں میں نمایاں کیا۔ معلمین اخلاق نے اس کو دو شخصیتوں کے درمیان ''دوستی کا مضبوط رشتہ'' قرار دیا۔ سب سے پہلے دو یونانی انسان جو اس قدر کے مستحق سمجھے گئے کہ ان کے اہل وطن نے ان کے مجسمے بنا کر ان کی یادیں تازہ رکھیں وہ ہر موڈیس اور ارسٹوگیٹن تھے جن کے درمیان غیر فطری محبت کا تعلق تھا۔

تاریخ کی شہادت تو یہی ہے کہ اس دور کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا دوسرا دور نصیب نہیں ہوا۔

روم

یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا وہ اہل روم تھے یہاں پھر وہی اتار چڑھاؤ کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے جو اوپر آپ دیکھ چکے ہیں۔ رومی لوگ وحشت کی تاریکی سے نکل کر جب تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو ان کے نظام معاشرت کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنے خاندان کا سردار ہے اس کو اپنے بیوی بچوں پر پورے مالکانہ حقوق حاصل ہیں بلکہ بعض حالات میں وہ بیوی کو قتل کر دینے کا بھی مجاز ہے۔

جب وحشت کم ہوئی اور تمدن و تہذیب میں رومیوں کا قدم آگے بڑھا تو اگرچہ قدیم خاندانی نظام بدستور قائم رہا۔ مگر عملاً اس کی سختیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی اور ایک حد تک اعتدالی حالت پیدا ہوتی گئی۔ رومی جمہوریت کے زمانہ عروج میں یونان کی طرح پردے کا رواج تو نہ تھا۔ مگر عورت اور جوان نسل کو خاندانی نظام میں کس کر رکھا گیا تھا۔ عصمت و عفت، خصوصاً عورت کے معاملہ میں ایک قیمتی چیز تھی اور اس کو معیار شرافت سمجھا جاتا تھا۔ اخلاق کا معیار کافی بلند تھا۔ ایک مرتبہ رومی سینٹ کے ایک ممبر نے اپنی بیٹی کے سامنے اپنی بیوی کا بوسہ لیا تو اس کو قومی اخلاق کی سخت توہین سمجھا گیا اور سینٹ میں اس پر ملامت کا ووٹ پاس کیا گیا۔ عورت اور مرد کے تعلق کی جائز اور شریفانہ صورت نکاح کے سوا کوئی نہ تھی۔ ایک عورت اسی وقت عزت کی مستحق ہو سکتی تھی جب کہ وہ ایک خاندان کی ماں (Matron) ہو۔ بیسوا طبقہ اگرچہ موجود تھا۔ اور مردوں کو ایک حد تک اس طبقہ نے ربط رکھنے کی آزادی بھی دی تھی مگر عام رومیوں کی نگاہ میں ان کی حیثیت نہایت ذلیل تھی اور اس سے تعلق رکھنے والے مردوں کو بھی اچھی طرح نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل روم کا نظریہ عورت کے بارے میں بدلتا چلا گیا۔ اور رفتہ رفتہ نکاح و طلاق کے قوانین اور خاندان نظام کی ترکیب میں اتنا تغیر رونما ہوا کہ صورت حال سابقہ حالات کے بالکل برعکس ہو گئی۔ نکاح محض ایک قانونی معاہدہ (Civil contract) بن کر رہ گیا۔ جس کا قیام و بقا فریقین کی رضامندی پر منحصر تھا۔ ازدواجی تعلق کی ذمہ داریوں کو بہت ہلکا سمجھا جانے لگا۔ عورت کو وراثت اور ملکیت مال کے پورے حقوق دے دیئے گئے اور قانون نے اس کو باپ اور شوہر کے اقتدار سے بالکل آزاد کر دیا۔ رومی عورتیں معاشی حیثیت سے نہ صرف خود مختار ہو گئیں بلکہ قومی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ بتدریج ان کے حیطہ اختیار میں چلا گیا۔ وہ اپنے شوہروں کو بھاری شرح سود پر قرض دیتی تھیں۔ اور مالدار عورتوں کے شوہر عملاً ان کے غلام بن کر رہ

جاتے تھے۔ طلاق کی آسانیاں اس قدر بڑھیں کہ بات بات پر ازدواج کا رشتہ توڑا جانے لگا۔ مشہور رومی فلسفی و مدبر سنیکا (4 ق م تا 65) سختی کے ساتھ رومیوں کی کثرت طلاق پر ماتم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب روم میں طلاق کوئی بڑی شرم کے قابل چیز نہیں رہی۔ عورتیں اپنی عمر کا حساب اپنے شوہروں کی تعداد سے لگاتی ہیں، اس دور میں ایک عورت یکے بعد دیگرے کئی کئی شادیاں کرتی جاتی تھی۔ مارشل (43ء تا 104ء) ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو دس خاوند کر چکی تھی۔ جودنیل (60ء تا 130ء) ایک عورت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے پانچ سال میں آٹھ شوہر بدلے۔ سینٹ جروم (340ء تا 420ء) ان میں سب سے زیادہ ایک باکمال عورت کا حال لکھتا ہے جس نے آخری بار تیسواں شوہر کیا تھا اور اپنے شوہر کی بھی وہ اکیسویں بیوی تھی۔ اس دور میں عورت اور مرد کے غیر نکاحی تعلق کو معیوب سمجھنے کا خیال بھی دلوں سے نکلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے معلمین اخلاق بھی زنا کو ایک معمولی چیز سمجھنے لگے۔ کاٹو (Cato) جس کو 184 ق م میں روم کا محتسب اخلاق مقرر کیا گیا تھا۔ صریح طور پر جوانی کی آوارگی کو حق بجانب ٹھہراتا ہے۔ سرو جیسا شخص نوجوانوں کے لئے اخلاق کے بند ڈھیلے کرنے کی سفارش کرتا ہے حتیٰ کہ اپکٹیٹس (Epictetus) جو فلاسفر رواقیئن (Stoics) میں بہت ہی سخت اخلاق اصول رکھنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا کہ ''جہاں تک ہو سکے شادی سے پہلے عورت کی صحبت سے اجتناب کرو۔ مگر جو اس معاملہ میں ضبط نہ کر سکیں انہیں ملامت بھی نہ کرو۔''

اخلاق اور معاشرت کے بند جب اتنے ڈھیلے ہوگئے۔ تو روم میں شہوانیت عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی اور عریانی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں گھروں کی زینت کے لئے ضروری ہوگئیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ نصیب ہوا کہ قیصر ٹائبیریس (14ء تا 37ء) کے عہد میں معزز خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور اور طوائف بننے سے روکنے کے لئے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ فلورا (Flora) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے بر سر عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کئے جاتے تھے اور عوام و خواص میں وہی ادب بے حد مقبول ہوتا تھا۔ جس میں استعارہ کنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔

بہیمی خواہشات سے اس قدر مغلوب ہو جانے کے بعد روم کا قصر عظمت ایسا پیوند خاک ہوا کہ پھر اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہی۔

مسیحی یورپ

مغربی دنیا کے اس اخلاقی انحطاط کا علاج کرنے کے لئے مسیحیت پہنچی اور اول اول اس نے بڑی اچھی خدمات سرانجام دیں۔ فواحش کا انسداد کیا۔ عریانی کو زندگی کے ہر شعبے سے نکالا۔ قحبہ گری کو بند کرنے کی تدبیریں کیں۔ طوائف اور مغنیہ اور رقاصہ عورتوں کو ان کے پیشے سے توبہ کرائی۔ اور پاکیزہ اخلاقی تصورات

لوگوں میں پیدا کئے۔ مگر عورت اور صنفی تعلقات کے بارے میں آبائے مسیحین جو نظریات رکھے تھے وہ انتہا پسندی کی بھی انتہا تھے اور ساتھ ہی فطرت انسانی کے خلاف اعلان جنگ بھی۔

ان کا ابتدائی اور بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے۔ مرد کے لئے معصیت کی تحریک کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ ہے تمام انسانی مصائب کا آغاز اسی سے ہوا ہے اس کا عورت ہونا ہی اس کے شرمناک ہونے کے لئے کافی ہے۔ اس کو اپنے حسن و جمال پر شرمانا چاہئے کیونکہ وہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کو دائما کفارہ ادا کرتے رہنا چاہئے کیونکہ وہ دنیا اور دنیا والوں پر لعنت اور مصیبت لائی ہے۔ ترتولیاں (Tertullian) جو ابتدائی دور کے ائمہ مسیحیت میں سے تھا۔ عورت کے متعلق مسیحی تصور کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے، وہ شجر ممنوعہ کی طرف سے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر، مرد کو غارت کرنے والی ہے۔''

کرائی سوسٹم (Chrysostum) جو مسیحیت کے اولیاء کبار میں شمار کیا جاتا ہے عورت کے حق میں کہتا ہے

ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت۔ ان کا دوسرا نظریہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کا تعلق بجائے خود ایک نجاست اور قابل اعتراض چیز ہے۔ چاہے وہ نکاح کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو ا۔ خلاق کا یہ راہبانہ تصور پہلے اشراقی فلسفہ (Neo-Platonism) کے زیر اثر مغرب میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ مسیحیت نے آکر اسے حد کو پہنچا دیا۔ اب تجرد اور دوشیزگی معیار اخلاق قرار پائی اور تاہل کی زندگی اخلاقی اعتبار سے پست اور ذلیل سمجھی جانے لگی۔ لوگ ازدواج سے پرہیز کرنے کو تقویٰ اور تقدس اور بلندی اخلاق کی علامت سمجھنے لگے۔ پاک مذہبی زندگی بسر کرنے کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ یا تو آدمی نکاح ہی نہ کرے یا اگر نکاح کر لیا ہے تو میاں اور بیوی ایک دوسرے سے زن و شوہر کا تعلق نہ رکھیں۔ متعدد مذہبی مجلسوں میں یہ قوانین مقرر کئے گئے کہ چرچ کے عہدہ دار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے نہ ملیں۔ میاں اور بیوی کی ملاقات ہمیشہ کھلی جگہ میں ہوں اور کم از کم دو غیر آدمی موجود ہوں۔ ازدواجی تعلق کے نجس ہونے کا تخیل طرح طرح سے مسیحیوں کے دل میں بٹھایا جاتا تھا۔ مثلاً ایک قاعدہ یہ تھا کہ جس روز چرچ کا کوئی تہوار ہو اس سے پہلے کی رات جس میاں بیوی نے یکجا گزاری ہو وہ تہوار میں شریک نہیں ہو سکتے۔ گویا انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے، جس سے آلودہ ہونے کے بعد، وہ کسی مقدس مذہبی کام میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہے۔ اس راہبانہ تصور نے تمام خاندانی علائق، حتیٰ کہ ماں اور بیٹے تک کے تعلق میں تلخی پیدا کر دی، اور ہر وہ رشتہ گندگی اور گناہ بن کر رہ گیا جو نکاح کا نتیجہ ہو۔

ان دونوں نظریات نے نہ صرف اخلاق اور معاشرت میں عورت کی حیثیت حد سے زیادہ گرادی۔ بلکہ تمدنی قوانین کو بھی اس درجہ متاثر کیا کہ ایک طرف ازدواجی زندگی مردوں اور عورتوں کے لئے مصیبت بن کر رہ گئی۔ اور

دوسری طرف سوسائٹی میں عورت کا مرتبہ ہر حیثیت سے پست ہو گیا۔ مسیحی شریعت کے زیر اثر جتنے قوانین مغربی دنیا میں جاری ہوئے۔ ان سب کی خصوصیات یہ تھیں:

1) معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے بس کر کے مرد کے قابو میں دے دیا گیا۔ وراثت میں اس کے حقوق نہایت محدود تھے اور ملکیت میں اس سے بھی زیادہ محدود۔ وہ خود اپنی محنت کی کمائی پر بھی اختیار نہ رکھتی تھی بلکہ اس کی ہر چیز کا مالک اس کا شوہر تھا۔

2) طلاق اور خلع کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی۔ زوجین میں خواہ کتنی ہی ناموافقت ہو باہمی تعلقات کی خرابی سے خواہ گھر نمونہ جہنم بن گیا ہو۔ مذہب اور قانون دونوں ان کو زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ بعض انتہائی شدید حالات میں زیادہ سے زیادہ جو تدارک ممکن تھا، وہ صرف یہ تھا کہ زوجین میں تفریق (Separation) کرا دی جائے۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے بس الگ کر دیئے جائیں۔ الگ ہو کر نکاح ثانی کرنے کا حق نہ عورت کو تھا نہ مرد کو۔ درحقیقت یہ تدارک پہلی صورت سے بھی بدتر تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو وہ دونوں راہب اور راہبہ بن جائیں، یا پھر تمام عمر بدکاری کرتے رہیں۔

3) شوہر کے مرنے کی صورت میں بیوی کے لئے اور بیوی کے مرنے کی صورت میں شوہر کے لئے نکاح ثانی کرنا سخت معیوب بلکہ گناہ قرار دیا گیا تھا۔ مسیحی علماء کہتے تھے کہ یہ محض حیوانی خواہشات کی بندگی اور ہوس رانی ہے۔ ان کی زبان میں اس فعل کا نام "مہذب زناکاری" تھا چرچ کے قانون میں مذہبی عہدیداروں کے لئے نکاح ثانی کرنا جرم تھا۔ عام ملکی قوانین میں بعض جگہ اس کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی۔ اور جہاں قانون اجازت دیتا تھا۔ وہاں بھی رائے عامہ جو مذہبی تصورات کے زیر اثر تھی اس کو جائز نہ رکھتی تھی۔

جدید یورپ

اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کے فلاسفر اور اہل قلم نے جب سوسائٹی کے خلاف فرد کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھائی اور شخصی آزادی کا صور پھونکا تو ان کے سامنے وہی غلط نظام تمدن تھا۔ جو مسیحی نظام اخلاق و فلسفہ زندگی اور نظام جاگیرداری (Feudal Sytum) کے منحوس اتحاد سے پیدا ہوا تھا اور جس نے انسانی روح کو غیر فطری زنجیروں میں جکڑ کر ترقی کے سارے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اس نظام کو توڑ کر ایک نیا نظام بنانے کے لئے جو نظریات جدید یورپ کے معماروں نے پیش کئے تھے۔ ان کے نتیجے میں انقلاب فرانس نمودار ہوا اور اس کے بعد مغربی تہذیب و تمدن کی رفتار ترقی ان راستوں پر لگ گئی۔ جن پر بڑھتے بڑھتے وہ آج کی منزل پر پہنچی ہے۔

اس دور جدید کے آغاز میں صنف اناث کی پستی اٹھانے کے لئے جو کچھ کیا گیا۔ اجتماعی زندگی پر اس کے

خوشگوار نتائج مرتب ہوئے۔ نکاح وطلاق کے پچھلے قوانین کی سختی کم کی گئی۔ عورتوں کے معاشی حقوق، جو بالکل سلب کر لئے گئے تھے۔ بڑی حد تک انہیں واپس کر دیئے گئے ان اخلاقی نظریات کی اصلاح کی گئی جن کی بنا پر عورت کو ذلیل وحقیر سمجھا جاتا تھا۔ معاشرت کے ان اصولوں میں ترمیم کی گئی جن کی وجہ سے عورت فی الواقع لونڈی بن کر رہ گئی تھی۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیمی وتربیت کے دروازے مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی کھولے گئے۔ ان مختلف تدابیر سے رفتہ رفتہ عورتوں کی وہ قابلیتیں جو غلط قوانین معاشرت اور جاہلانہ اخلاقی تصورات کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں ابھر آئیں۔ انہوں نے گھروں کو سنوارا۔ معاشرت میں نفاست پیدا کی۔ رفاہ عامہ کے بہت سے مفید کام کئے۔ صحت عامہ کی ترقی، نئی نسلوں کی عمدہ تربیت، بیماروں کی خدمت اور فنون خانہ داری کی نشوونما، یہ سب کچھ اس بیداری کے ابتدائی پھل تھے۔ جو تہذیب نو کی بدولت عورتوں میں رونما ہوئی لیکن جن نظریات کے بطن سے یہ نئی تحریک پیدا ہوئی تھی۔ ان میں ابتدا ہی سے افراط کا میلان موجود تھا۔ انیسویں صدی میں اس میلان نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مغربی معاشرت بے اعتدالی کی دوسری انتہا پر پہنچ گئی۔

نئی مغربی معاشرت کے تین ستون

یہ نظریات جن پر نئی مغربی معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے تین عنوانوں کے تحت آتے ہیں:

1) عورتوں اور مردوں کی مساوات

2) عورتوں کا معاشی استقلال (Economic Independence)

3) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط

ان تین بنیادوں پر معاشرت کی تعمیر کرنے کا جو نتیجہ ہونا چاہئے۔ بالآخر وہی ظاہر ہوا۔

1 مساوات کے معنی یہ سمجھ لئے گئے۔ عورت اور مرد نہ صرف اخلاقی مرتبہ اور انسانی حقوق میں مساوی ہوں، بلکہ تمدنی زندگی میں عورت بھی وہی کام کرے جو مرد کرتے ہیں اور اخلاقی بندشیں عورت کے لئے بھی اسی طرح ڈھیلی کر دی جائیں جس طرح مرد کے لئے پہلے سے ڈھیلی ہیں۔ مساوات کے اس غلط تخیل نے عورت کو اس کے ان فطری وظائف سے غافل اور منحرف کر دیا۔ جن کی بجا آوری پر تمدن کی بقا، بلکہ نوع انسانی کی بقا کا انحصار ہے۔ معاشی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں نے ان کی شخصیت کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ انتخابات کی جدوجہد، دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت، آزاد تجارتی وصنعتی پیشوں میں مردوں کے ساتھ مقابلہ، کھیلوں اور ورزشوں کی دوڑ دھوپ، سوسائٹی کے تفریحی مشاغل میں شرکت، کلب اور اسٹیج اور رقص وسرود کی مصروفیتیں۔ یہ اور ان کے سوا اور بہت سی ناکردنی وناگفتنی چیزیں، اس پر کچھ اس طرح چھا گئیں کہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں بچوں کی تربیت، خاندان کی خدمت، گھر کی تنظیم ساری چیزیں اس کے لائحہ عمل سے خارج ہو کر رہ گئیں۔ بلکہ ذہنی طور پر وہ ان مشاغل، اپنے اصلی فطری مشاغل

سے متنفر ہوگئی۔ اب مغرب میں خاندان کا نظام جو تمدن کا سنگ بنیاد ہے بری طرح منتشر ہو رہا ہے، گھر کی زندگی جس کے سکون پر انسان کی قوت کارکردگی کی نشوونما کا انحصار ہے۔ عملاً ختم ہو رہی ہے۔ نکاح کا رشتہ، جو تمدن کی خدمت میں عورت اور مرد کے درمیان بداخلاقی میں مساوات قائم کر دی ہے۔ وہ بے حیائیاں جو کبھی مردوں کے لئے بھی شرمناک تھیں، اب وہ عورتوں کے لئے شرمناک نہیں ہیں۔

عورت کے معاشی استقلال نے اس کو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے۔ اب اس نئے قاعدے سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائے اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے۔ اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی میں بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ربط ایسا باقی نہیں رہا جو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو اور ظاہر ہے کہ محض شہوانی خواہشات کا پورا کرنا کوئی ایسا کام نہیں کہ جس کی خاطر مرد اور عورت لامحالہ اپنے آپ کو ایک دائمی تعلق ہی کی گرہ میں باندھنے اور ایک گھر بنا کر مشترک زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ جو عورت اپنی روٹی کماتی ہے اپنی تمام ضروریات کی خود کفیل ہے اپنی زندگی میں دوسرے کی حفاظت اور اعانت کی محتاج نہیں ہے وہ آخر محض اپنی شہوانی خواہش کی تسکین کے لئے کیوں ایک مرد کی پابند ہو؟ کیوں اپنے اوپر بہت سی اخلاقی اور قانونی بندشیں عائد کرے؟ کیوں ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے؟ خصوصاً جب کہ اخلاقی مساوات کے تخیل نے اس کی راہ سے وہ تمام رکاوٹیں بھی دور کر دی ہوں جو اسے آزاد شہوت رانی کا طریقہ اختیار کرنے میں پیش آسکتی تھیں تو وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے آسان اور پر لطف اور خوشنما راستہ چھوڑ کر قربانیوں اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدا ہوا پرانا دقیانوسی (Old Fashioned) راستہ کیوں اختیار کرے؟ گناہ کا خیال مذہب کے ساتھ رخصت ہوا۔ سوسائٹی کا خوف یوں دور ہو گیا کہ سوسائٹی اب اسے فاحشہ ہونے پر ملامت نہیں کرتی بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ آخری خطرہ حرامی بچے کی پیدائش کا تھا، سو اس سے بچنے کے لئے منع حمل کے ذرائع موجود ہیں۔ ان ذرائع کے باوجود حمل قرار پا جائے تو اسقاط میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو بچے کو خاموشی کے ساتھ قتل کیا جا سکتا ہے اور اگر کم بخت جذبہ مادری نے (جو بدقسمتی سے ابھی بالکل فنا نہیں ہو سکا ہے) بچے کو ہلاک کرنے سے روک بھی دیا۔ تو حرامی بچے کی ماں بن جانے میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ "اب کنواری ماں اور ناجائز مولود" کے حق میں اتنا پروپیگنڈہ ہو چکا ہے کہ جو سوسائٹی ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی جرات کرے گی اسے خود تاریک خیالی کا الٹا الزام اپنے سر لینا پڑے گا۔

یہ ہے جس نے مغربی معاشرت کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں آج ہر ملک میں لاکھوں جوان عورتوں تجرد پسند ہیں۔ جن کی زندگیاں آزاد شہوات رانی میں بسر ہو رہی ہیں، ان سے بہت زیادہ عورتیں ہیں جو عارضی جذبات محبت کے زور شادیاں کر لیتیں۔ مگر چونکہ اب شہوانی تعلق کے سوا مرد اور عورت کے

درمیان کوئی ایسا اختیاری ربط باقی نہیں رہا ہے جو انہیں مستقل وابستگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس لئے مناکحت کے رشتہ میں اب کوئی پائیداری نہیں رہی۔ میاں اور بیوی جو ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں۔ آپس کے تعلقات میں کسی مراعات باہمی اور کسی مدارات کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ نری شہوانی محبت کے جذبات بہت جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک ادنیٰ وجہ اختلاف بلکہ بسا اوقات صرف سرد مہری ہی انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں کا انجام طلاق یا تفریق پر ہوتا ہے۔ منع حمل، اسقاط، قتل اولاد، شرح پیدائش کی کمی اور ناجائز ولادتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بڑی حد تک اسی سبب کی رہین منت ہے۔ بدکاری، بے حیائی اور امراض خبیثہ کی ترقی میں بھی اسی کیفیت کا بڑا دخل ہے۔

مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عورتوں میں حسن کی نمائش، عریانی اور فواحش کو غیر معمولی ترقی دی ہے۔ صنفی میلان (Sexual Attracticat) جو پہلے ہی فطری طور پر مرد اور عورت کے درمیان موجود ہے اور کافی طاقتور ہے۔ دونوں صنفوں کے آزادانہ میل جول کی صورت میں بہت آسانی کے ساتھ غیر معمولی حد تک ترقی کر جاتا ہے پھر اس قسم کی مخلوط سوسائٹی میں قدرتی طور پر دونوں صنفوں کے اندر یہ جذبہ ابھر آتا ہے کہ صنف مقابل کے لئے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر (Attractive) بنیں اور اخلاقی نظریات کے بدل جانے کی وجہ سے ایسا کرنا معیوب بھی نہ رہا ہو۔ بلکہ اعلانیہ شان دلربائی پیدا کرنے کو مستحسن سمجھا جانے لگا۔ حسن و جمال کی نمائش رفتہ رفتہ تمام حدود کو توڑتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ برہنگی کی آخری حد تک پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت مغربی تہذیب میں پیدا ہوگئی ہے۔ صنف مقابل کے لئے مقناطیس بننے کی خواہش عورت میں اتنی بڑھ گئی ہے اور اتنی بڑھتی چلی جارہی ہے کہ شوخ و شنگ لباسوں، غازوں سرخیوں اور بناؤ سنگھار کے نت نئے طریقوں سے اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ بیچاری تنگ آکر اپنے کپڑوں سے باہر نکل پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات تار تک لگا نہیں رہنے دیتی۔ ادھر مردوں کی طرف سے ہر وقت ھل من مزید کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جذبات میں جو آگ لگی ہوئی ہے، وہ حسن کی ہر بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے اور مزید بے حجابی کا مطالبہ کرتی ہے ان غریبوں کی پیاس بھی بڑھتے بڑھتے تونس بن گئی ہے جیسے کسی کو لو لگ گئی ہو اور پانی کا ہر گھونٹ پیاس کو بجھانے کے بجائے اور بھڑکا دیتا ہو۔ حد سے بڑھی ہوئی شہوانی پیاس سے بے تاب ہو کر بیچارے ہر وقت ہر ممکن طریقے سے اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ ننگی تصویریں، یہ صنفی لٹریچر، یہ عشق و محبت کے افسانے، یہ عریاں اور جوڑواں ناچ، یہ جذبات شہوانی سے بھری ہوئی فلم۔ آخر کیا ہیں؟ سب اسی آگ کو بجھانے...... مگر دراصل بھڑکانے...... کے سامان ہیں۔ جو اس غلط معاشرت نے ہر سینے میں لگا رکھی ہے اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے اس کا نام اپنوں نے رکھا ہے آرٹ!''

یہ گھن بڑی تیزی کے ساتھ مغربی قوموں کی قوت حیا کو کھا رہا ہے۔ یہ گھن لگنے کے بعد آج تک کوئی قوم نہیں بچی۔ یہ ان تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو کھا جاتا ہے جو قدرت نے انسان کو زندگی اور ترقی کے لئے عطا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ہر طرف سے شیطانی محرکات میں گھرے ہوئے ہوں، جن کے جذبات کو ہر آن ایک نئی تحریک اور ایک نئے اشتعال سے سابقہ پڑے جن پر ایک سخت ہیجان انگیز ماحول پوری طرح چھا گیا ہو، جن کے خون کو عریاں تصویریں، فحش لٹریچر، ولولہ انگیز گانے، برانگیختہ کرنے والے ناچ، عشق و محبت کی فلمیں، دل چھینے والے زندہ مناظر اور صنف مقابل سے ہر وقت مڈبھیڑ کے مواقع پیہم ایک جوش کی حالت میں رکھتے ہوں وہ کہاں سے وہ امن، وہ سکون اور وہ اطمینان دلا سکتے ہیں جو تعمیری اور تخلیقی کاموں کے لئے ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے ہیجانات کے درمیان ان کو اور خصوصاً ان کی جوان نسلوں کو وہ ٹھنڈی اور پرسکون فضا میسر ہی کہاں آسکتی ہے جو ان کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی نشوونما کے لئے ناگزیر ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی تو بہیمی خواہشات کا دیو، ان کو دبوچ لیتا ہے اس کے چنگل میں پھنس کر وہ پنپ کیسے سکتے ہیں۔

فکر انسانی کی المناک نارسائی

تین ہزار سال کے تاریخی نشیب و فراز کی یہ مسلسل داستان ایک بڑے خطہ زمین سے تعلق رکھتی ہے۔ جو پہلے بھی دو عظیم الشان تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکا ہے اور اب پھر جس کی تہذیب کا ڈنکا دنیا میں بج رہا ہے۔ ایسی ہی داستان مصر، بابل، ایران اور دوسرے ممالک کی بھی ہے اور خود ہمارا ملک ہندوستان بھی صدیوں سے افراط و تفریط میں گرفتار ہے۔ ایک طرف عورت داسی بنائی جاتی ہے مرد اس کا سوامی، پتی دیو یعنی مالک و معبود بنتا ہے۔ اس کو بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بیوگی میں اولاد کی مملوکہ بن کر رہنا پڑتا ہے، اسے اپنے شوہر کی چتا پر بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اس کو ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس پر نکاح کے انتہائی سخت قوانین مسلط کئے جاتے ہیں جن کے مطابق وہ اپنی رضا و مرضی اور پسند کے بغیر ایک مرد کے حوالہ کی جاتی ہے اور پھر زندگی کے آخری سانس تک اس کی ملکیت سے کسی حال میں نہیں نکل سکتی اس کو یہودیوں اور یونانیوں کی طرح گناہ اور اخلاقی و روحانی پستی کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی مستقل شخصیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جب اس پر ہر ایک کی نگاہ ہوتی ہے تو اسے بہیمی خواہشات کا کھلونا بنا لیا جاتا ہے۔ وہ مرد کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے اور ایسی سوار ہوتی ہے کہ خود بھی ڈوبتی ہے اور اپنے ساتھ ساری قوم کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ لنگ اور یونی کی پوجا، یہ عبادت گاہوں میں برہنہ اور جوڑواں مجسمے، یہ دیوداسیاں (Religious Prostitunes) یہ ہولی کے کھیل اور یہ دریاؤں کے نیم عریاں اشنان۔ آخر کس چیز کی یادگاریں ہیں؟ اس بام مارگی تحریک کی باقیات غیر صالحات ہی تو ہیں جو ایران، بابل، اور روم کی طرح ہندوستان میں بھی تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی کے بعد وبا کی طرح پھیلی اور ہندو قوم کو صدیوں کے لئے تنزل اور انحطاط کے گڑھے میں پھینک گئی۔

اس داستان کو غائر نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے معاملے میں نقطہ عدل کو پانا اور اسے سمجھنا اور اس پر قائم ہونا، انسان کے لئے کس قدر دشوار ثابت ہوا ہے۔ نقطہ عدل یہی ہوسکتا ہے کہ ایک طرف سے عورت کو اپنی شخصیت اور اپنی قابلیتوں کی نشو ونما کا پورا موقع ملے اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صلاحیتوں کے ساتھ انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء میں اپنا حصہ ادا کر سکے مگر دوسری طرف اس کو اخلاقی تنزل اور انحطاط کا ذریعہ اور انسانی تباہی کا آلہ نہ بننے دیا جائے۔ بلکہ مرد کے ساتھ اس کے تعاون کی ایسی سبیل مقرر کر دی جائے کہ دونوں کا اشتراک عمل ہر حیثیت سے تمدن کے لئے صحت بخش ہو۔ اس نقطہ عدل کو دنیا صدہا برس سے تلاش کرتی رہی ہے۔ مگر آج تک نہیں پا سکی۔ کبھی ایک انتہا کی طرف جاتی ہے اور انسانیت کے پورے نصف حصہ کو بیکار بنا کر رکھ دیتی ہے کبھی دوسری طرف انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور انسانیت کے دونوں حصوں کو ملا کر غرق مئے ناب کر دیتی ہے۔ نقطہ عدل ناپید نہیں، موجود ہے۔ مگر ہزاروں سال افراط وتفریط کے درمیان گردش کرتے رہنے کی وجہ سے لوگوں کا سر کچھ اتنا چکرا گیا ہے کہ وہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ پہچان نہیں سکتے کہ یہی تو وہ مطلوب ہے جسے ہماری فطرت ڈھونڈ رہی تھی۔ اس مطلوب حقیقی کو دیکھ کر وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اس پر آوازے کستے ہیں اور جس کے پاس وہ نظر آتا ہے الٹا اسی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مثال اس بچے کی سی ہے جو ایک کوئلے کی کان میں پیدا ہوا ہو اور وہیں جوانی کی عمر تک پہنچے۔ ظاہر ہے اس کو وہی کوئلے کی ماری ہوئی آب وہوا اور وہی کالی کالی فضا عین فطری چیز معلوم ہوگی اور جب وہ کان سے نکال کر باہر لایا جائے گا تو عام فطرت کی پاکیزہ فضا میں ہر شے کو دیکھ کر اول اول ضرور ہوگا مگر انسان آخر انسان ہے اس کی آنکھیں کوٹھے کی چھت اور تاروں بھرے آسمان کا فرق محسوس کرنے سے کب تک انکار کر سکتی ہیں؟ اس کے پھیپھڑے گندی ہوا اور صاف ہوا میں آخر کب تک تمیز نہ کریں گے۔

(بحوالہ: ''پردہ'' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

عورت نامہ

خواتین اسلام کے نامور واقعات

ایک معصوم لڑکی کی دیانت وحق گوئی

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے غلام اسلم کے ہمراہ مدینہ منورہ میں رات کو گشت کر رہے تھے۔ ایک مکان سے آواز آئی۔ ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا دے۔ لڑکی نے کہا۔ امیر المومنین نے ابھی تو تھوڑے ہی دن ہوئے منادی کرائی ہے کہ دودھ میں پانی ملا کر فروخت نہ کرو۔ عورت نے کہا۔ اب نہ یہاں امیر المومنین ہیں نہ منادی کرنے والا۔ لڑکی نے کہا۔ یہ دیانت کے خلاف ہے کہ روبرو تو اطاعت کی جائے اور غائبانہ خیانت۔ یہ گفتگو سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بہت محفوظ ہوئے۔ لڑکی کی دیانت اور اس کی حق گوئی پر خوش ہو کر (جو درحقیقت انہی کے حق پرست عہد حکومت کا نتیجہ تھی) اپنے بیٹے عاصم سے اس کی شادی کر دی۔ اس لڑکی کے بطن سے ام عاصم پیدا ہوئیں جو عمر بن عبدالعزیز جیسے نیک بخت اور عابد و زاہد خلیفہ کی والدہ تھی۔

ام سنان کی آزادانہ گفتگو

معاویہ کی طرف سے مروان گورنر مدینہ تھا اکثر لوگ اس کی خودرائیوں اور سختیوں کے شاکی تھے۔ مگر دربار معاویہ میں کسی کو شکایت کی جرات نہ تھی۔ مروان نے ایک لڑکے کو کسی قصور پر یا کسی بہانے سے قید کر دیا۔ اس کی دادی ام سنان بنت حشمہ مروان کے پاس پہنچی اور اس کی بے گناہی اور اپنی ضعیفی کا اظہار کیا مگر مروان نے ایک نہ سنی۔

آخر کار وہ تنگ آ کر معاویہ کے دربار میں گئی۔ اپنا حسب نسب بیان کیا۔ امیر معاویہ نے پہچان کر کہا تو وہی تو نہیں جو ہم پر تبرا کرتی تھی اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلہ پر برانگیختہ کرتی تھی۔

ام سنان...... اے معاویہ! عبد مناف کی اولاد کو اخلاق پاکیزہ اور علم وسیع دیا گیا ہے وہ واقف ہو کر انجان نہیں بنتے اور علم کے بعد سفاہت اختیار نہیں کرتے اور عفو کے بعد انتقام نہیں لیتے۔

امیر معاویہ...... بے شک ہم ایسے ہی ہیں مگر کیا تم وہی تو نہیں ہو۔ اس نے اپنے اشعار میں علی المرتضیٰ کی مدح اثناء اور ان کے مخالفین کی تضحیک کی تھی۔ اور کچھ اشعار بھی جو ام سنان نے لکھے تھے سنا دیئے۔

ام سنان...... بے شک یہ اشعار میرے ہی ہیں۔ لیکن میں امید کرتی ہوں کہ آپ ہمارے لئے (علی کے بعد) بہتر خلیفہ ثابت ہوں گے۔

امیر کے درباری نے جو پاس ہی بیٹھا تھا ام سنان کے کچھ اور اشعار پڑھے جو بہت زیادہ سخت الفاظ میں تھے۔ امیر کا دل مکدر ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر ام سنان نے کہا۔

اے امیر المومنین! تیرے ایسے ہی مصاحبوں نے مسلمانوں کو تجھ سے ناراض کر رکھا ہے۔ ان کی باتوں کو جو خودغرضی اور جھوٹی خوشامد پر محمول ہوتی ہیں حقیر جان اور ان کو اپنا مقرب نہ بنا اگر تو ایسے مصاحبوں سے بچتا رہے گا۔ تو خدا کا قرب نصیب ہونے کے علاوہ مومنوں کے دلوں میں تیری جگہ ہوگی۔ تو ہمارے دلی خیالات سے واقف ہے، ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو منہ پر تعریف کریں اور پیٹھ پیچھے برا بھلا کہیں جو چیز ہمارے دلوں میں جاگزین تھی۔ ہم اس کو تجھ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ لیکن اب جبکہ وہ نہیں ہے تو ہم علی کے بعد تجھ کو بھی اور لوگوں کی نسبت زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

امیر معاویہ: اور لوگوں سے تیرا کیا مطلب ہے؟

ام سنان: مروان بن الحکم اور سعید بن العاص جو تجھے اور تیری حکومت کو بدنام کر رہے ہیں۔

امیر معاویہ: میرے ساتھ محبت اور عقیدت کی کیا وجہ ہے؟

ام سنان: تمہارے حلم کی وسعت اور تمہارے عفو و درگزر کے سبب سے۔

امیر معاویہ: یہاں کیوں کر آنا ہوا؟

ام سنان: مروان حاکم مدینہ کی شکایت لے کر آئی ہوں نہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرتا ہے اور نہ شریعت کے موافق فیصلے، خلق خدا اس سے تنگ ہے۔ میرا پوتا بھی اس نے جیل میں ڈال دیا ہے میں دار خواہی کے لئے اس کے پاس گئی تھی۔ مگر وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت اور حنظل سے بھی زیادہ کڑوا نکلا۔ اب میں مجبور ہو کر اس دربار میں آئی ہوں جہاں مروان کی نسبت زیادہ عفو اور درگزر کی امید ہے۔

امیر معاویہ نے کاتب (میر منشی) کو اشارہ کیا کہ رہائی کا حکم لکھ کر ام سنان کے حوالے کر دو اور اس کی صاف گوئی اور اظہار حق و صداقت میں بے خوفی اور بے جگری کی وجہ سے پانچ ہزار درہم زاد راہ کیلئے، ایک اونٹ سواری کے لئے دے کر اس کو رخصت کیا۔

خلیفہ مامون الرشید

مامون کے دربار میں ولی عہد کے خلاف ایک بیوہ عورت کی آزادانہ فریاد

دولت عباسیہ کا وہ تاجدار مامون الرشید جس نے نوشیرواں کے عدل اور حاتم کی سخاوت کو دنیا کے دل سے فراموش کر دیا۔ سلطنت بغداد پر جلوہ افروز ہے شہزادہ عباس مامون الرشید کا بڑا لڑکا طائفۃ الملل کے قریب شکار میں مصروف ہے۔ غروب ہونے والے آفتاب کی شعاعیں آب دجلہ کے قدموں میں لوٹ رہی ہیں۔ طائران خوش الحان کے نغمہ میں منہمک جو دریا پر وداع روز روشن کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ ایک حسین عورت پانی کا گھڑا بھر رہی تھی۔ عباس اس کو دیکھ کر آگے بڑھا اور پوچھا۔

تو کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟ کیا ایسے غیر آباد مقامات پر بھی جہاں پہاڑ اور جنگلوں کے سوا کچھ نہیں ہے حسن جنم لے سکتا ہے۔ شہزادہ اپنا فقرہ ختم کر کے دیکھتا ہے تو غیور حسینہ کے چہرہ پر بل آ چکا تھا۔ اس کا

چہرہ غصہ سے تمتا اٹھا۔ اس نے شہزادہ کا سوال حقارت سے ٹھکرا دیا اور آگے بڑھ گئی۔

باپ کی عظیم الشان حکومت کا بھوت عباس کے سر پر سوار تھا حکم دیا کہ اس مغرور عورت کا حسب نسب معلوم کرو اور میری طرف سے نکاح کا پیغام دو۔ نوکر چاکر اس عورت کے پیچھے روانہ ہوئے۔ شہزادہ نے اپنا شکار ملتوی کر دیا اور خیمہ میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ آدھی رات اس الجھن میں گرفتار رہا۔ کبھی خیمہ سے باہر آتا تھا اور کبھی اندر، اتنے میں ایک خادم نے آ کر عرض کیا۔

عورت خاندان برامکہ کی لڑکی مغیرہ بنت ازدوار ہے۔ وہ دو بچوں کی ماں اور حسین ابن موسیٰ کی بیوہ ہے۔ اس کے ورثاء میں سے اب کوئی زندہ نہیں۔ صرف دو معصوم بچے ہیں۔ نکاح کا پیغام اس کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ آپے سے باہر ہوگئی اور یہ الفاظ کہے......

''ہارون ہماری جانیں تباہ کر چکا۔ اب مامون ہماری عزت کے درپے ہے لیکن عباس یاد رکھے کہ اس کی شہزادگی کو اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی دہلیز پر دونوں ہاتھوں سے مسل دوں گی۔''

رات کا پردہ دنیا کے چہرے سے اٹھا۔ ادھر صبح صادق آل برامکہ کی بربادی کا نوحہ کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ ادھر طالفۃ النمل کے ایک مختصر سے مکان میں مغیرہ نے نماز فجر سے فراغت پا کر چھوٹے بچے کو کلیجے سے لگا کر پیار کیا اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شہزادہ عباس کا پیغام ایک قاصد کے ذریعہ اس کے کان میں پہنچا۔

شہزادہ عباس کا غصہ تیری جان اور مال خاک میں ملا دے گا یہ مکان ضبط کیا جاتا ہے اور تجھ کو دو گھنٹے کی اجازت ہے یہ مکان خالی کر دے۔''

مغیرہ یہ پیغام سن کر دروازے پر آئی اور قاصد سے کہا عباس اس وقت کو بھول جائے جب میرے دادا جعفر کا سر اس کے دادا ہارون کے سامنے رکھا گیا اور اس بے گناہ قتل نے آل برامکہ کو دو، دو دانوں کا محتاج کر دیا۔ لیکن برامکی بیبیاں مظالم عباسیہ کو جس تحمل سے برداشت کرتی آئی ہیں تاریخ اس کو فراموش نہیں کر سکتی۔'' اتنا کہہ کر مغیرہ ایک سفید ردا سر پر ڈال کر دونوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی۔

دوسری صدی ہجری ختم ہونے کے قریب ہے، مامون الرشید کا دربار گرم ہے مامون کے پہلو میں عباس تخت نشین ہے امرا اور وزراء خاموش بیٹھے ہیں کہ مظلوم مغیرہ جس کا چہرہ چودھویں کے چاند کو شرماتا تھا۔ لیکن اب ضعیفی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ دربار شاہی میں پہنچی اور کہا۔

ایک بیوہ کا مکان صرف اس لئے کہ وہ اپنی عصمت کی محافظ تھی سلطنت عباسیہ کو مبارک ہو لیکن مامون الرشید! ایک دن اس بادشاہ کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی سلطنت کبھی فنا نہ ہوگی۔ ایک ظالم کی تیرے پاس فریاد لائی ہوں انصاف کر اور داد دے۔''

تمام درباری، عورت کا منہ تکنے لگے مگر کسی کو اتنی ہمت نہ تھی کہ بادشاہ کی موجودگی میں اس سے بات کر سکتا۔ مامون الرشید نے عورت سے کہا اس ظالم کا نام بتا کہ وہ کون ہے۔ عورت ہنسی اور کہا۔ شہزادہ عباس، جو تخت

شاہی پر آپ کے برابر بیٹھا ہے۔ آج مسلمان دنیا بھر کے عیوب کا مخزن ہو جائیں مگر یہ مردہ قوم کبھی زندہ تھی۔
مامون کا چہرہ اتنا سنتے ہی غصہ سے سرخ ہو گیا اس نے چوبدار کو حکم دیا کہ عباس کو اس عورت کے برابر کھڑا کر دے تاکہ مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی امتیاز نہ رہے۔

شہزادہ عباس خاموش تھا اور ہر سوال کے جواب میں رک رک کر ایک آدھ بات کہہ دیتا تھا۔ مغیرہ دھڑلے سے اپنی داستان مصیبت بیان کر رہی تھی۔ اس کے چہرے سے عصمت کا خون ٹپک رہا تھا یہاں تک کہ اس کی زبان سے یہ لفظ نکلے۔

''عباس! یہ صحیح ہے کہ تو مامون الرشید کا لڑکا اور سلطنت کا مالک ہے لیکن یہ ہاتھ منتظر تھے اس وقت کے کہ اگر تو اپنی دھن میں آگے بڑھ کر قریب پہنچتا تو تیری گردن خاک میں ملا دیتے۔ آل برامکہ کی دولت عباسیوں نے پامال کر دی مگر ہماری عصمت وہ دولت ہے کہ ہم عباس سلطنت کو اس پر قربان کر دیں۔''

وزرائے سلطنت مغیرہ کی جرات پر متعجب ہوئے اور کہا یہ بے باکی آداب شاہی کے خلاف ہے ادب سے گفتگو کرو۔

مامون نے کہا، اس کو مت روکو یہ حق رکھتی ہے کہ جو کچھ اس کے منہ میں آئے کہے، یہ صرف اس کی صداقت ہے۔ جس نے اس کی زبان کو تیز اور اس کے حوصلہ کو بلند کر دیا اور عباس کی کمزوری ہے۔ جس نے اس کو گونگا بنا دیا۔
اسی وقت پانچ تھیلیاں اشرفیوں سے بھری ہوئی اپنے ہاتھ سے لے کر مامون الرشید نے مغیرہ کے قدموں میں ڈال دیں اور نہ صرف اس کا مکان واپس کر دیا بلکہ ایک جلیل الشان محل قصر عباس مغیرہ کو عطا فرما کر درخواست کی کہ وہ شہزادے کا قصور معاف کر دے۔

ایک غریب بیوہ عورت کی جرات بادشاہ کے حضور میں

سلطان ملک شاہ ایک مرتبہ اصفہان میں جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ کسی گاؤں میں قیام ہوا۔ وہاں ایک غریب بیوہ کی گائے تھی جس کے دودھ سے تین بچوں کی پرورش ہوتی تھی۔ شاہی آدمیوں نے اس گائے کو ذبح کر کے خوب کباب بنائے۔ غریب بڑھیا کو خبر ہوئی وہ بدحواس ہو گئی۔ شاہی آدمیوں کا مقابلہ کرنا دور کی بات، کوئی داد فریاد سننے کو تیار نہ تھا۔ اس پر لاوارث اور ایک غریب عورت۔ ساری رات اس نے پریشانی میں کاٹی۔ صبح ہوئی تو دل میں خیال آیا کہ کوئی نہیں سنتا تو نہ سہی کیا بادشاہ بھی نہ سنے گا۔ جس کو خدا نے غریبوں کو ظالموں سے نجات دینے کے لئے اتنی بڑی سلطنت دی ہے۔ بادشاہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ معلوم ہوا بادشاہ فلاں راستے سے شکار کو نکلے گا۔ چنانچہ زندرود (اصفہان کی مشہور نہر) کے پل پر جا کر کھڑی ہو گئی جب سلطان پل پر آیا تو بڑھیا نے ہمت اور جرات سے کام لے کر کہا۔

''اے الپ ارسلان کے بیٹے! میرا انصاف اس نہر کے پل پر کرے گا یا پل صراط پر، جو جگہ پسند ہو انتخاب کر لے۔
بادشاہ کے ہمراہی یہ بے باکی دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ بادشاہ گھوڑے سے اتر پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

اس عجیب وغریب اور حیرت انگیز سوال کا اس پر خاص اثر ہوا اور بڑھیا سے کہا۔

پل صراط کی طاقت نہیں ہے میں اسی جگہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہو کیا کہتی ہو۔ بڑھیا نے اپنا سارا واقعہ بیان کیا۔ بادشاہ نے لشکریوں کی اس نالائق حرکت پر افسوس ظاہر کیا۔ اور ایک گائے کے عوض میں اس کو ستر گائیں دلائیں اور مالا مال کر دیا اور جب اس بڑھیا نے کہا تمہارے عدل وانصاف سے میں خوش ہوں اور میرا خدا اور رسول خوش ہے تو گھوڑے پر سوار ہوا۔

واہ! کیا زمانہ تھا کہنے والے کیسے آزاد خیال تھے اور سننے والے کیسے عالی حوصلہ! اگر موجودہ تہذیب وشائستگی کے زمانہ میں کوئی شخص اس طرح حاکم کی سواری روک لے اور اس سے ایسی آزادانہ گفتگو کرے تو پاگل خانے بجھوا دیا جائے۔

بادشاہ اور غریب عورت کا مقدمہ، قاضی کی کچہری میں

الحکم باپ کے مرنے پر 796ء مطابق 180 ہجری میں تخت پر بیٹھا اور 820ء یعنی پچیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ الحکم سے لوگوں کو بہت کچھ توقعات تھیں۔ وہ حکمرانی کے قابل تھا۔ مگر طبیعت کا بڑا سخت تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے دشمنوں کے تین سو سروں کو اپنے محل میں لٹکوایا تھا۔ اس لئے اس کے سامنے کسی کو بولنے کی طاقت نہ تھی۔ بایں ہمہ اس کے عہد حکومت میں جرات وحق گوئی اور فیاضی کا ایک بے نظیر واقعہ گزرا ہے جو "تاریخ اسپین" میں تو بڑی تفصیل سے درج ہے مگر یہاں خلاصتاً درج کیا جاتا ہے۔

الحکم کو ایک مرتبہ ایسی جگہ بنگلہ بنانے کا خیال ہوا جو آب وہوا کے لحاظ سے تو بہت اچھی جگہ تھی۔ لیکن ایک بیوہ عورت کے قبضہ میں تھی۔ جو اپنی کٹیا بنا کر وہاں زندگی کے دن کاٹ رہی تھی، خلیفہ نے اس کا مکان خریدنا چاہا لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ آخر زبردستی وہ جگہ لے لی گئی۔ بادشاہ نے وہاں ایک خوشنما بنگلہ تعمیر کرایا۔ عورت ہر چند کہ بیوہ تھی اور غریب بھی۔ لیکن اسلام نے جو حقوق مساوات وآزادی کے عطا کئے تھے ان سے آگاہ تھی۔ اس نے محکمہ قضا میں بادشاہ پر استغاثہ دائر کر دیا اور قاضی سے کہا ایک غریب بیوہ عورت کا مقابلہ بادشاہ سے ہے انصاف کی توقع کم ہے۔ لیکن اگر تم آزادی اور جرات اور اپنے اختیارات سے جو تم کو حاصل ہیں انصاف کرو گے تو میں کبھی اپنے حق سے محروم نہیں رہ سکتی۔

قاضی نے کہا اے بڑھیا! بے فکر رہ، میں عدل وانصاف کی کرسی پر، بادشاہ اور ایک غریب عورت کو ایک ہی نظر سے دیکھوں گا۔"

قاضی بادشاہ کی تند مزاجی اور اس کی طبیعت کی تلخی سے واقف تھا۔ اس نے ضابطہ اور قانون کے ساتھ دوسری تدابیر سے بھی کام لینا چاہا۔ چنانچہ جب بادشاہ بنگلہ اور محل کو ملاحظہ کر رہا تھا اور باغات کو دیکھ رہا تھا تو قاضی ایک گدھا مع خالی بورے کے ہانکتا ہوا خلیفہ کے پاس لے گیا۔ اور اس سے اجازت طلب کی کہ میں اس جگہ کی مٹی لینے آیا ہوں خلیفہ نے اجازت دے دی۔

جب قاضی نے بورا مٹی سے بھر لیا تو خلیفہ سے کہا کہ مجھے تھوڑی سی مدد دیجئے کہ میں بورے کو گدھے پر رکھ لوں۔ خلیفہ قاضی کے تمسخر پر خوش ہوتا رہا۔ بوجھ اٹھانے میں اس نے مدد دی لیکن بہت بھاری ہونے کی وجہ سے بورا اٹھا نہ سکا۔

قاضی نے کہا کہ جب آپ ایک بورے کا بوجھ دوسرے کی مدد سے بھی نہیں اٹھا سکتے تو اس دن جب احکم الحاکمین ذرہ ذرہ حساب لے گا اور جب عدل وانصاف گدا و بادشاہ اور فقر و غنی سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دے گا اور جب گدڑی پوش اپنے اعمال حسنہ کی وجہ سے ناانصاف بادشاہوں پر سبقت لے جائیں گے تو آپ ساری زمین کا بوجھ کس طرح اٹھائیں گے اور جب قیامت کے دن وہ غریب بڑھیا جس کا مکان زبردستی چھین کر اور گرا کر آپ نے یہ محل تیار کرایا ہے خدا کی جناب میں جو آہ مظلوماں دادرسی کی خاطر اجابت و قبولیت کو استقبال اور پیشوائی کے لئے دور تک آگے روانہ کر دیتا ہے، اپنا استغاثہ پیش کرے گی تو آپ وہاں کیا جواب دیں گے۔

خلیفہ الحکم قاضی کی یہ تقریر سن کر کانپ اٹھا اور اس کی حق گوئی و جرات کی تعریف کی اور چونکہ اس زمین پر جو اس نے زبردستی حاصل کی تھی اور اب محل تیار ہو چکا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے وہ محل مع باغات و تمام ساز و سامان جو لاکھوں روپوں کی ملکیت کا تھا اس غریب بڑھیا کو دے دیا جس سے وہ مالا مال ہو گئی۔

ایک بڑھیا کی دیدہ دلیری سلطان کے سامنے

سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں کوچ بلوچ (کرمان کے پہاڑی جرگوں کے قزاقوں نے رباط اور دیر کچھن (اصفہان) میں ڈاکہ ڈالا۔ ایک بڑھیا کا مال اسباب بھی لٹ گیا اس نے سلطان سے فریاد کی۔

آپ خدا کی طرف سے ہمارے محافظ و نگہبان ہیں۔ یا میرا مال دلایئے یا اس کا معاوضہ عطا کیجئے۔

سلطان نے کہا کہ خبر نہیں کہ دیر کچھن کہاں ہے! بڑھیا بولی اے سلطان! اس قدر ملک فتح کرو کہ ان کے جغرافیہ سے واقفیت رہ سکے اور ان کا انتظام ہو سکے۔

سلطان نے اس جواب کو تسلیم کر کے پھر کہا یہ لوگ کہاں سے آئے تھے اور کون تھے۔ بوڑھیا نے کہا کوچ بلوچ کے ڈاکو تھے۔ جو کرمان کے قریب ہے۔ سلطان نے کہا وہ ملک تو میری سرحد سے باہر ہے اس کا میں کیا انتظام کر سکتا ہوں۔ بڑھیا نے کہا کیا اسی عدل وانصاف پر شہنشاہی کا دعویٰ ہے وہ بادشاہ کیا جو اپنی سلطنت کا انتظام نہ کر سکے اور وہ چرواہا کیسا جو اپنی بکریوں کو بھیڑیوں سے نہ بچا سکے۔ اس میں میرا تنہا اور ضعیف ہونا اور آپ کا فوج اور لشکر رکھنا دونوں برابر ہیں۔

سلطان محمود نے جب بڑھیا کے یہ جوانمردانہ، کپکپا دینے والے کلمات سنے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کو بہت کچھ دے، دلا کر رخصت کیا اور بوعلی الیاس امیر کرمان کو لکھا کہ مفسدوں اور ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے ہمارے حضور بھیج دو یا مال ڈکیتی برآمد کر کے قزاقوں کو پھانسی دے دو تا کہ آئندہ وہ میرے ملک میں لوٹ مار نہ کر سکیں ورنہ یاد رکھو کرمان، بمقابلہ سومنات بہت نزدیک ہے۔

امیر کرمان سلطان کے خوف سے ایک جرار فوج لے کر گیا دس ہزار بلوچی قتل ہوئے اور بے انتہا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ امیر ابو علی نے سامان غزنی بھجوا دیا۔ سلطان نے منادی کرا دی۔ کہ جن لوگوں کا نقصان ہوا ہے وہ آ کر اپنا مال پہچان لیں۔ تمام لوگ ملک سے آتے رہے اور اپنا مال پہچان کر لے جاتے تھے۔ سلطان نے ایک اور کام یہ کیا کہ ملک سے ہر قسم کی خبریں منگوانے کے لئے پرچہ نویس مقرر کر دیئے تا کہ حاکموں کے ظلم وستم اور تغافل اور ملک کے حالات کی خبر ملتی رہے۔

ایک بڑھیا کی آزادی اور جرات نے ملک کو کس قدر فائدہ پہنچایا کہ ڈاکوؤں سے بھی ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی اور چھینا ہوا مال بھی واپس آ گیا۔ (نظام الملک طوسی حصہ دوم صفحہ 256)

ملکہ ہند اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی اور گھر کے کام کاج کرتی ہے

اس زمانہ میں اور اب بھی بادشاہوں کی کئی کئی بیگمات ہوتی ہیں لیکن ناصر الدین ان بادشاہوں میں نہ تھا جو بادشاہ قرآن شریف اور دیگر کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنی روزی کماتا ہو وہ بیگمات، لونڈیاں اور باندیاں اس کثرت سے کس طرح رکھ سکتا ہے۔ اس کی ایک ہی بیگم سلیمہ نام کی تھی۔ جس کے پاس نہ کوئی لونڈی تھی۔ نہ باندی علاوہ گھر کے کام کاج کے وہ کھانا بھی اپنے ہاتھ سے پکاتی تھی، ایک دن روٹی پکاتے پکاتے اس کا ہاتھ جل گیا۔ اس نے بادشاہ سے کہا کم سے کم ایک ماما تو رکھ دو کہ روٹی پکانے سے نجات ملے باقی گھر کے کام میں خود کر لیا کروں گی۔

بادشاہ نے کہا بیگم! گو میں بادشاہ ہوں لیکن سلطنت کے روپیہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے کہ وہ رعایا کا مال ہے اور رعایا کی بہبود ہی میں صرف ہونا چاہئے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں میری آمدنی جیسا کہ تم سے مخفی نہیں ہے بہت قلیل ہے۔ اتنی گنجائش نہیں کہ ایک خادمہ بھی رکھ سکوں۔ آخر غریب آدمیوں کی بیویاں بھی اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی ہیں۔ دنیا میں یہ چند روزہ تکلیف ہے اس کو برداشت کر لو خدائے پاک تم کو اس کا اجر دے گا۔

اللہ اکبر! ایسا نیک دل، رعایا پرور امین، خدا کا خوف رکھنے والا مرنج ومرنجاں بادشاہ کہاں نصیب ہوتا ہے یہ بادشاہ درحقیقت انسان کے قالب میں ایک فرشتہ تھا۔ 663 ہجری میں یہ عدل پرور بادشاہ بیمار ہوا اور 11 جمادی الاول 664 ہجری 1266 عیسوی کو دہلی میں انتقال کر گیا۔

دانش مند ماں کا جواب اپنے ناعاقبت اندیش بیٹے کو

شیر شاہ سوری کا اقبال جوں جوں بڑھ رہا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں نکبت ومصائب کا شکار ہو رہا تھا۔ انہی دنوں مرزا ہندال اس کے بھائی نے خود بادشاہ بننے کا ارادہ کیا۔ ہمایوں نے شیخ بہلول ایک بزرگ کو مرزا کے پاس بھیجا کہ اس کو سمجھا کہ اس فساد سے باز رکھے اور سمجھائے کہ اس وقت ہمیں اپنی متفقہ طاقت سے دشمن کا مقابلہ کرنا چاہئے نہ کہ گھر ہی میں پھوٹ ڈال دیں۔ مرزا کے پاس خوشامدیوں کا جھمگٹا تھا کوئی قلمدان وزارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کسی کو جاگیرات کی توقع تھی، کوئی سپہ سالاری کا خواستگار تھا۔ ان کے کہنے پر مرزا نے شیخ کو قتل کرا دیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔

مرزا کی ماں انماچہ بیگم کو خبر ہوئی بیٹے کی خودسری پر بہت افسوس کیا۔ بیٹا جب بادشاہ بن کر دعائے خیر اور مبارک باد لینے کے لئے ماں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ ماتمی لباس پہنے بیٹھی ہے۔ مرزا نے کہا اُس خوشی میں ماتمی لباس کیوں پہنا ہے؟

ماں نے کہا کہ فتنہ سازوں اور ناعاقبت اندیشوں کی جماعت نے تجھ کو راہ صواب سے گمراہ کر کے ہلاکت اور لعنت کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے اس لئے تیرے ماتم میں میں نے پہلے ہی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ چنانچہ آخر وہی ہوا جو دانشمند ماں نے کہا تھا۔

بیگم کی وفاداری اپنے اندھے اور تباہ حال خاوند کے ساتھ

میرزا شاہ حسین نے بابر کے بیٹے کامران میرزا کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی تھی، جب بابر مر گیا تو ہمایوں کو اس کے بھائیوں عسکری اور کامران نے سخت تکلیفیں پہنچائیں تو ہمایوں نے آخر تنگ آکر 960 ہجری میں اپنے بھائی کامران مرزا کو اندھا کرا دیا۔

اس کے بعد کامران مرزا سفر حجاز پر روانہ ہونے کیلئے سیدھا ٹھٹھا (سندھ) میں اپنے خسر شاہ حسین کے پاس پہنچا۔ اس نے سفر سے منع کیا لیکن مرزا نے کہا اب میرا یہاں رہنا بیکار و دشوار ہے شاہ حسین کی بیٹی اور مرزا کی بیوی جو چک بیگم بھی مرزا کے ساتھ تیار ہو گئی۔ باپ نے اور دوسرے رشتہ داروں نے بہت سمجھایا کہ اس کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کرتی ہے مگر بیگم نہ مانی وہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور آخر جہاز پر سوار ہو گئی۔ باپ نے آخری مرتبہ آدمی بھیجے کہ سمجھا بجھا کر لے آئیں وہ نہ آئی تو وہ خود گیا۔

وفادار بی بی نے باپ سے کہا جب میرزا خوشحال اور بادشاہ تھا جب تو مجھے اس کے حوالہ کیا اور اب کہ وہ خستہ حال اور اندھا اور ادبار میں گرفتار ہے یہاں تک کہ کوئی اس کے ٹوٹے دل کو تسلی دینے والا بھی نہیں مجھ کو اس سے جو میرا خاوند میرا مجازی خدا ہے جدا کرتے ہو یہ کس ملک کا آئین وفاداری، کس قوم کا دستور مروت اور کس مذہب کی انوکھی تعلیم ہے۔

باپ کا دل بیٹی کی اس سعادت مندانہ گفتگو سے بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بہت کچھ مال دولت دے کر حسرت وافسوس کے ساتھ رخصت کیا۔ میرزا نے 964 ہجری میں حجاز ہی میں انتقال کیا۔ (تاریخ ہند مولوی ذکاء اللہ مرحوم و تاریخ سندھ ص 151)

(بحوالہ: تاریخ حریت اسلام کے ناقابل فراموش واقعات) (محمد دین فوق)

آزادیٔ نسواں کی بازگشت

عصرِ حاضر میں آزادیٔ نسواں

عصر جدید میں آزادیٔ نسواں کے نعرے مغربی ممالک میں سننے میں آتے ہیں۔ مغربی تحریکیں مرد اور عورت میں تعاون کے بجائے بیزاری پیدا کر رہی ہیں۔ یہ آزادی بے راہ روی اور فحاشی سکھاتی ہے۔ اس تحریک کی بازگشت مسلمان ممالک بشمول پاکستان میں سنائی دیتی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو حقوق عطاء کئے۔ تاکہ صالح معاشرہ تشکیل پا سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو دھرم اور بدھ مت میں عورت کو بدی کی جڑ کہا گیا ہے۔ یونان اور قدیم روم میں عورت کی سماجی اور معاشرتی حیثیت کم تھی۔ بابل اور ایران میں بھی عورت پستی کی حالت میں گزار رہی تھی۔ عرب معاشرے میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا نکاح اور طلاق پر پابندی نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے عورت اور مرد کے باہمی حقوق و فرائض واضح کئے۔ مرد کو عورت پر برتری نہیں۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر 1 ملاحظہ ہو:

"یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء"

ترجمہ: "اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے تم کو ایک جان سے تخلیق کیا اور اسی نے بنایا اس کا جوڑا اور ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں۔"

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" (آیت 228)

ترجمہ: "اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا ان پر حق ہے موافق دستور ہے۔ صالح عمل کے ثواب میں دونوں برابر ہیں۔"

"من عمل صالحاً من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبہ و لنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون" (سورۃ النحل: 97)

ترجمہ: "جس نے نیک کام کیا چاہے وہ مرد ہو یا عورت اور وہ یقین ہے (مومن ہے) تو پھر ہم اسے جلا دیں گے اور بدلے میں دیں گے ان کو ان کا حق، بہتر کاموں پر جو وہ کرتے تھے۔"

اسلام نے نامحرم رشتوں کی وضاحت فرمائی۔ عورت پر پردہ کی پابندی لاگو کی۔ نامحرم تو کجا محرم کے سامنے بھی باریک لباس کی زیبائش ممنوع قرار دی۔ اندرون خانہ اور بیرون خانہ عورتوں کے لئے اصول اور ضوابط تشکیل

دیئے گئے۔عورت کو معاشرے میں جائز حق دلایا گیا۔اس کے ساتھ ساتھ تربیت اولاد کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔

اسلام نے لڑکی کی پیدائش کو نزول رحمت قرار دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لاتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاتے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو نہ مارنے کا حکم دیا۔حجتہ الوداع کے موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے حسن سلوک کی تلقین فرمائی۔قرآن کریم نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا۔

دنیا کی اکثر اقوام میں بیوہ کی کوئی حیثیت نہ تھی،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ کو وراثت کا حق دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماسوائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا،بیوگان سے نکاح فرمایا۔

اسلام نے اگر مرد کو طلاق کا حق دیا ہے تو عورت کو خلع کا حق بھی دیا ہے۔مردوں کو طلاق کا حق ضرور ہے لیکن اسے ابغض الحلال (یعنی حلال چیزوں میں سب سے بری) کہا۔حضور اکرم ﷺ نے باندیوں سے بھی حسن سلوک کی اعلیٰ روایات قائم کیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام ایمن رضی اللہ عنہا کو ''اے اماں'' کہہ کر پکارتے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم نسواں کی تلقین فرمائی۔حضرت خولہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے خطبے سنتیں۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وعظ فرماتیں،حضرت شفاء رضی اللہ عنا نے حضرت حفصہ کو کتابت سکھائی ام سلمہ اور ام ورقہ حفاظ تھیں۔تفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ماہر تھیں۔امہات المومنین کے علاوہ ام عطیہؓ،اسماءؓ،فاطمہؓ بنت قیس وہ صحابیات تھیں۔جنہوں نے کثیر احادیث روایت کیں۔حضرت رفیدہؓ نے سامان جراحی کے ساتھ اپنا خیمہ مسجد نبویؐ کے پاس لگایا تھا۔

اسلام ہنگامی حالت میں عورت کو معاش کی بھی اجازت دیتا ہے

حضرت خولہؓ،حضرت حلیکہؓ اور اسماءؓ تجارت کرتی تھیں۔حضرت سودہؓ کھالوں کی دباغت کا کام جانتی تھیں۔

جہاد میں ہنگامی طور پر حضرت عمارہؓ نے غزوہ احد میں،حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے غزوہ خندق میں ام سلیمؓ نے غزوہ حنین میں اور کعبہ بنت سعدؓ نے غزوہ احزاب اور غزوہ خیبر میں حصہ لیا تھا۔غزوہ احد کے موقع پر حضرت فاطمہؓ نے بھی خدمات سرانجام دیں۔حضرت عائشہؓ اور ام سلیطؓ بھی جنگ احد میں شامل تھیں۔

اسلام نے طبقہ نسواں کو بہت سے حقوق عطا فرمائے مگر ساتھ ہی ساتھ فرائض بھی لازم قرار دیئے۔

اسلام نے عورت کے حقوق متعین کئے۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حقوق نسواں کے سب سے بڑے نقیب ہیں۔اسلام نے غلامی کا خاتمہ کیا اور کنیزوں کو حقوق دیئے۔عورت کو جائیداد کا حق ملا،تعلیم کا حق ملا اور عورت کو بطور ماں،بطور بہن،بطور بیٹی اور بطور بیوی حقوق ملے۔

جائیداد کا حق

برطانیہ جیسے ملک میں 1882ء تک خواتین کو جائیداد کا حق نہیں تھا جبکہ اسلام نے 1400 سال پہلے

خواتین کو وراثت کا حق دیا۔ خواتین کی وراثت کے حصص قرآن حکیم نے مقرر فرمائے۔ سورہ النساء کی آیت 7 میں ارشاد ہے:

للرجال نصیب ماترک الوالدان والا قربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر نصیبا مفروضا.

ترجمہ: ''مردوں کو بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ کر مریں والدین اور ناتے والے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں۔ والدین اور ناتے والے اس تھوڑے میں یا بہت میں حصہ مقرر کیا ہوا۔''

تعلیم کا حق

اسلام نے خواتین کو تعلیم کا حق دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة''

ترجمہ: ''حصول علم مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔''

عورت بطور ماں

اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ ارشاد ربانی ہے:

وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احساناً اما یبلغن عندک الکبر احدھما اوکلھما فلا تقل لھما اف ولا تنھر ھما وقل لھما قولا کریما

(سورۃ بنی اسرائیل آیت: 23)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے چکا دیا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ کبھی پہنچ جاوے تیرے سامنے ان میں ایک یا دونوں، تو ان کو اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑک کر، اور ان سے ادب سے بات کرو۔'' اسلام میں والدین میں سے ماں کا درجہ زیادہ قرار دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے قدموں تلے جنت کی خوش خبری سنائی۔ قرآن نے والد کے ساتھ والدہ کا بھی بیٹے کی جائیداد میں حصہ مقرر کیا۔

عورت بطور بیٹی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹیوں کے حقوق متعین فرمائے۔ ترمذی شریف میں ارشاد ہے۔

''لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ کے درمیان پردہ ہے۔''

عورت بطور بیوی

اسلام نے بیویوں کے حقوق و فرائض مقرر فرما دیئے۔ خواتین کو مہر، نان ونفقہ اور مساوات کا حق دیا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ انسانی اور اخلاقی اعتبار سے عورتوں کو مردوں کے مساوی قرار دیا۔

تقویٰ اور فلاح دارین کا جو معیار مرد کے لئے ہے وہی عورت کے لئے ہے۔

انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض
(سورۃ آل عمران:195)

ترجمہ: ”میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہو۔“
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الدنیا کلھا متاع وخیر المتاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

ترجمہ: ”تمام دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک بیوی ہے۔“

عورت بطور بہن

اسلام نے بہن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا۔ خواتین کے ساتھ حسن سلوک کی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے وعظ کے لئے ایک علیحدہ دن مقرر فرمایا۔

اسلام نے خواتین کی ترقی کے لئے حسب ذیل مواقع فراہم کئے ہیں:

ا۔ تعلیم کا حق:

اسلام نے تعلیم نسواں سے کبھی نہیں روکا۔ بلکہ خواتین کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی تاکہ وہ پڑھ لکھ کر اچھا گھرانہ تشکیل دے سکیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے جتنے مواقع مرد کے لئے ہیں اتنے ہی خواتین کے لئے ہیں۔ ان کی ترقی میں کوئی امر مانع نہیں۔ اچھی تعلیم ہوگی تو ماں اپنے بچے کی اچھی تربیت کر سکے گی ماں کی گود بچے کی تربیت کا گہوارہ ہوتی ہے۔

۲۔ ملازمت اور تجارت:

اسلام عورت پر معاش کمانے کی ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر ناگزیر مجبوریوں میں ملازمت بھی کر سکتی ہے اور جائز تجارت بھی۔ مگر اپنے دائرہ کار اور پردے کی مکمل پابندی کے ساتھ۔ آج کل تو مہنگائی اس قدر زیادہ ہے کہ خواتین کو ملازمت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اسلام اس ضمن میں حائل نہیں ہوتا۔

۳۔ عسکری خدمات:

اسلام خواتین کی عسکری خدمات کا بھی قائل ہے (مگر اپنے دائرہ کار اور پردے کی مکمل پوری پابندی کے ساتھ) حضرت ام سلمہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ام عطیہؓ نے باقاعدہ جنگوں میں شرکت کی اور زخمیوں کو پانی پلایا۔ حضرت ام عطیہ نے تو 7 لڑائیوں اور غزوات میں حصہ لیا۔

۴۔ قاضی بن سکتی ہیں:

خواتین اسلام کی رو سے قاضی بھی بن سکتی ہیں لیکن صرف خواتین کے مقدمات نپٹانے کے لئے۔ خواتین کے لئے اگر علیحدہ عدالتیں ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ وہ انصاف کے مطابق کام کر سکیں۔

۵۔عائلی معاملات:

گھریلو معاملات میں اسلام نے عورت کو حق مہر دیا، جائیداد دی، نان ونفقہ دیا اور اس کے عائلی حقوق کا تحفظ کیا۔اس کی عزت کی حفاظت اس حد تک کہ ناجائز تہمت لگانے والے کو قذف کی سزا 80 کوڑوں کی شکل میں دی۔

۶۔چند پابندیاں اور حقوق نسواں:

اسلام فتنہ آور، فتنہ نظر، فتنہ خوشبو اور فتنہ عریانی سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔عورت پر جائز پابندیاں بھی لگاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ پردہ کرے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے چاردیواری میں قید نہیں کرتا۔اسے ترقی کے مواقع دیتا ہے۔ اگر معاشی مجبوریاں ہوں تو اس صورت میں اسلام عورت کو ملازمت وغیرہ کی اجازت دیتا ہے۔اسلام نے خواتین کی غلامی ختم کی۔عورتیں آزاد ہوئیں اور انہیں اپنے وہ حقوق ملے جو گزشتہ صدیوں میں انہیں میسر نہیں تھے۔

۷۔خواتین اور کفالت عامہ کا نظام:

اسلام نے خواتین کو معاشی لحاظ سے مضبوط کیا۔کفالت عامہ کے نظام کے تحت انہیں وظائف ملے۔یتیم بچیوں کی نگہداشت ہوئی۔انہیں وظائف ملے اور بیوگان کی دادرسی ہوئی۔آج سے 1400 سال پہلے اسلام نے آزادی نسواں کا تصور دیا۔ان تعلیمات کی گونج حجۃ الوداع میں ملتی ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اے لوگو!"تمہارا عورتوں پر حق ہے اور ان کا تم پر حق ہے اور میں تمہیں عورتوں سے حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔"

(بحوالہ: جدید دور کے مسائل اور ان کا حل (قرآن اور سیرت طیبہ کی روشنی میں) (ڈاکٹر لیاقت علی نیازی)

آزادی نسواں اور عائلی نظام

مغربی دنیا کا یہ پروپیگنڈا کہ اسلامی معاشرے عورتیں مجبور اور مظلوم ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماڈرن عورت معاشرے کے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔عفت وحیا سے عاری مغربی خواتین نے عائلی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔پروفیسر جان ایل ایسپازیٹو اپنی تصنیف "اسلام صراط مستقیم" (Islam the Straight path) مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی 1992ء میں صفحہ 94 پر اسلامی احکامات کے نسوانی بہبود وفلاح کے حسین پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے، عورت کو سورۃ النساء کی آیت 7`11 اور 176 کے ذریعے وراثت کے حقوق ملے جبکہ یورپ کو اس سے مشابہ قانونی حقوق انیسویں صدی میں دیئے گئے۔مغرب میں خصوصاً اور غیر مسلم دنیا میں عموماً لوگ جو جرم اور اخلاقی بے راہ روی سے تنگ آچکے ہیں اہل اسلام کی ازدواجی زندگی کو بہت رشک سے دیکھتے ہیں۔تہذیب مغرب کی وجہ سے مردوں اور عورتوں کی مفروضہ مساوات اور اختلاط کی وجہ سے کروڑوں گھرانے ٹوٹ چکے ہیں۔جہاں لاکھوں بچوں نے دردناک بدسلوکی اور مادری اور پدری شفقت سے محرومی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔

نیوز ویک کے 16، جولائی 1990ء کے شمارے میں ایک مضمون ملاحظہ ہو اس کا عنوان ہے عورتیں حملے کی

زد میں Women in Assault۔ اس مضمون کے مطابق امریکہ میں ہر سال تیس یا چالیس لاکھ عورتوں پر جسمانی تشدد ہوتا ہے۔ ہر اٹھارہ سیکنڈ کے بعد ایک عورت پر جسمانی تشدد کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں مقیم ہر چار عورتوں میں سے تین، کم از کم ایک مرتبہ پر تشدد جرم کا نشانہ بنتی ہیں اگر عورت کی عزت و ناموس کو بچانا ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عائلی نظام کو لاگو کرنا ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مغربی ممالک میں خاندان کا ادارہ تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ مخلوط محفلوں اور عفت وحیاء کے فقدان کی وجہ سے ایک عالمی اخلاقی فساد پیدا ہو چکا ہے۔ مخلوط محفلوں اور عفت وحیاء کے فقدان کی وجہ سے ایک عالمی اخلاقی فساد پیدا ہو چکا ہے۔ وہاں خاندان جس تیزی سے اجڑ رہے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار کی روشنی میں لگایا جا سکتا ہے۔

نمبر شمار	نام ممالک	سال	جو شادیاں ہوئیں	طلاق کے اعداد و شمار
1	ڈنمارک	1985ء	58378	29,322
		1988ء	32080	14717
		1989ء	30894	15152
2	آسٹریلیا	1990ء	1,16,9,45	42635
3	ریاستہائے متحدہ امریکہ	1980ء	23,90,252	11,89,000
		1989ء	24,91,236	10,07578
		1990ء	21,62,000	11,17,000
4	سوئٹزرلینڈ	1988ء	45,700	12,700
		1990ء	46,603	13183
5	ناروے	1986ء	20513	7891
		1988ء	21744	8772

(the States man year Book 1992-93 Edited by Brian
Hunter ماخذ 1395`482` (مذکورہ بالا بحوالہ صفحات

باقی یورپ میں بھی حالت اس سے ابتر ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے جو عملی نمونہ پیش کیا۔ وہ انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے۔ سرورِ کائناتؐ نے عورت کو ماں کے روپ میں، بیوی کے روپ میں، بہن اور بیٹی کے روپ میں جو مقام عطا فرمایا وہ قابل رشک بھی ہے اور عدیم المثال بھی۔ اسلام میں خاندان کا ادارہ اقرباء کے حقوق کی پاسبانی کرتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ارشاد ہے۔

''اور ماں باپ سے حسن سلوک سے پیش آؤ اور قرابت داروں سے۔'' (آیت 83)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کی احسن انداز میں تربیت کی ترغیب دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص دو بچیوں کی پرورش کر کے انہیں جوان کر دے تو قیامت کے دن، میرے اس قدر قریب ہوگا۔ جس قدر یہ انگلیاں'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتایا۔''

اہل مغرب نے اگر خاندان کے ادارے کو بچانا ہے تو اب بھی وقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عائلی نظام کو اپنایا جائے۔[1]

بیجنگ کانفرنس اور اسلامی حقوق نسواں

بیجنگ کانفرنس میں آزادی نسواں کے نعرے لگتے رہے ہیں۔ خواتین کی نمائندوں کا کہنا ہے کہ عالمی طور پر بالعموم اور مسلم ممالک میں بالخصوص خواتین کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً:

i) خواتین کو ملازمت کرنی ہو تو ان کے خلاف متعصبانہ قوانین عمل میں لائے جاتے ہیں، ان کی تنخواہ یا مزدوری مردوں کے برابر نہیں۔ کارخانوں میں بالخصوص یہ امتیاز برتا جاتا ہے۔

ii) خواتین کی آبادی دنیا میں 50% ہے مگر انہیں تجارت کا حق نہیں۔ زرعی شعبے میں عورتوں کی حالت ابتر ہے۔ مناسب مزدوری بھی نہیں ملتی۔

iii) تعلیم کے میدان میں ان کے لئے مواقع مردوں کے مقابلے میں کم ہیں۔

iv) کئی ممالک میں تو انہیں ووٹ کا بھی حق حاصل نہیں۔

v) مذہب بھی خواتین کے بارے میں ایسے قوانین عطا کرتا ہے جس سے مردوں کی حاکمیت قائم ہوتی ہے، عورتوں کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے اور انہیں مردوں کے برابر حقوق نہیں ملتے۔

انقلاب فرانس 70-1860ء کے بعد آزادی نسواں کی تحریک پیدا ہوئی۔ 1900ء کے بعد اور پھر 50-1940ء کے بعد دنیا کے کئی ممالک میں حقوق نسواں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ جنگ عظیم اول اور دوم کے اثرات خواتین پر بری طرح پڑے۔ انہیں مجبوراً معاشی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کارخانوں اور دفتروں کا رخ کرنا پڑا۔ یہ بیوگان معاشی لحاظ سے پریشان تھیں۔

سیاسی نظام میں امریکہ اور سویڈن میں 40-1920ء کے دوران خواتین کو ووٹ کا حق ملا۔ پرتگال میں عورت کو ووٹ ڈالنے کا حق 76-1972ء کے دوران ملا۔ اس لحاظ سے آزادی نسواں کے نقیب حق بجانب ہیں۔ خواتین کو عالمی سطح پر یہ حقوق ضرور ملیں۔ اسلام میں تو عورت کے ووٹ کا حق حضرت عثمانؓ کے انتخاب میں دے دیا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا کے مشورے پر عمل کیا۔ یہ ووٹ کی ایک قدیم شکل تھی۔ اسلام سے دور حاضر کی خواتین کو اس ضمن میں گلہ نہیں ہونا چاہئے۔

تعلیم کے میدان میں خواتین کی حالت ابتر ہے۔ اسلام اس ضمن میں خواتین کی تعلیم پر کوئی پابندی نہیں

لگاتا۔ نہ ہی اسلام خواتین کو تجارت سے روکتا ہے۔ لیکن وہ مادر پدر آزاد تجارت کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ یا تو خواتین کے دائرہ کار میں اپنی تجارت کرے یا پھر کسی مرد کے کاروبار میں اپنا حصہ ڈالے۔ جیسا کہ حضرت خدیجہ کرتی تھیں۔ چین میں اب بھی خواتین تجارت میں آ رہی ہیں۔ جاپان، امریکہ اور یورپ وغیرہ میں خواتین کی تنخواہیں اور کارخانوں وغیرہ کی مزدوری مردوں کے مقابلے میں قریباً نصف ہے۔ یہ خواتین کے خلاف سراسر ناانصافی ہے۔ اسلام میں خواتین کو معاش یا روزی کمانے کا حق ہے اگر ان کے معاشی حالات خراب ہوں تو اس صورت میں۔ ہاں عورتوں اور لڑکیوں کو تعلیم دینے کے شعبے میں وہ معاشی مجبوریاں نہ ہونے کے باوجود ملازمت کر سکتی ہیں۔ لیکن مکمل پردہ داری کے ساتھ۔ اسلام میں کہیں بھی یہ تصور نہیں ہے کہ خواتین پر ظلم ہو۔ اور ان کی مزدوری نصف ہو مردوں کے مقابلے میں۔ اسلام تو معاشی معاملات میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔

مسلم ممالک میں خواتین کے حقوق کی تحریکیں

جہاں تک آزادی نسواں کا تعلق ہے، اسلام نے انہیں 1400 سال پہلے حقوق عطا فرمائے تاہم کئی اسلامی ممالک میں ان کے حقوق تلف ہوئے۔ دراصل یہ ان ممالک کے سماجی اثرات تھے۔ جو ان کے قوانین پر اثر انداز ہوئے اور خواتین کو جائز اسلامی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ مفتی محمد عبدہ، نے مصر میں خواتین کے حقوق کی تحریک چلائی۔ ان کے شاگرد قاسم امین نے 1899ء میں خواتین کے حقوق کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس کا عنوان تھا۔ (تحریر المرۃ) یعنی عورت کی آزادی...... اس کتاب سے حقوق نسواں کی بازگشت اب بھی سنی جا رہی ہے۔ ترکی میں 76-1839ء کے دوران خواتین کو حقوق ملے لیکن کمال اتاترک نے مغرب سے مرعوب ہو کر ان کے لئے قانون سازی کی۔ تاہم وہاں 1858ء میں پہلی دفعہ لڑکیوں کے لئے سیکنڈری سکول کھولا گیا۔ لبنان میں ایک دانش ور خاتون مونا فیاض نے ماضی قریب میں ہی یہ تحریک چلائی کہ اہل مغرب کی ثقافتی یلغار سے بچا جائے۔ اس سے مسلم خواتین کو آزادی نہیں ملتی بلکہ اس سے ہماری ثقافت تباہ ہوتی ہے۔ ہمیں ایسی آزادی نہیں چاہئے۔ ایران میں انقلاب سے پہلے ایسے مادر پدر آزاد حقوق نسواں کے بارے میں اشرف پہلوی نے کاوشیں کیں۔ انڈونیشیا میں بھی آزادی نسواں کی بات چل نکلی دنیائے عرب کی زینب فیاض نے آزادی نسواں کی تحریک شام اور اسکندریہ میں چلائی اور ایک اخبار ''النیل'' شائع کیا...... ایران میں قراۃ العین طاہرہ نے تعدادازدواج اور پردہ کے خلاف 51-1815ء کے دوران تحریک چلائی۔

انقلاب ایران 1978ء کے بعد ایران میں خواتین پر پردے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ نیز وہاں یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی کہ وہ جج نہیں بن سکتیں۔ الجیریا میں 132 سالہ فرانسیسی دور غلامی کے بعد 1962ء میں جب اسے آزادی ملی تو خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق ملا۔ عائلی معاملات میں ایسے قوانین وضع ہوئے جو اسلامی طرز پر تھے۔ خواتین کو یہ حق ملا کہ وہ مرد کی دوسری شادی کی صورت میں طلاق لے سکتی ہیں۔ مرد طویل مدت کے لئے قید ہو جائے یا بیمار ہو جائے یا طویل عرصہ تک عورت کے حقوق پورے نہ کر سکے تو عورت عدالت سے طلاق لے سکتی

ہے۔ مصر نے اقوام متحدہ کے کنونشن 1985ء میں خواتین کے خلاف تعصب کی مخالفت کی تھی۔ ممبر کی حیثیت سے دستخط کیئے اور عائلی معاملات میں خواتین کو مردوں کے برابر حقوق دیئے۔ تیونس میں حبیب بورقیبہ نے بھی خواتین کے حقوق انہیں دلائے 1982ء میں کویت کی قومی اسمبلی نے بھی آزادی نسواں کی بات کی اور خواتین کو جائز حقوق کی مخالفت کی۔ تاہم دی آکسفورڈ انسائیکلو پیڈیا آف دی اسلامک ورلڈ کے فاضل مقالہ نگار کے مطابق مندرجہ ذیل ممالک میں خواتین کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کی طرف توجہ دی گئی۔ اقوام متحدہ کی 1989ء کی رپورٹ کے مطابق لڑکیوں کی تعلیمی حالت کا اندازہ ان اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے:

بنگلہ دیش اور پاکستان

(i) پرائمری سکولوں میں لڑکیوں کا اندراج = 29% (دوران 1980ء)

(ii) سیکنڈری سکولوں میں لڑکیوں کا اندراج = 70%

(iii) اردن میں لڑکیوں اور خواتین میں ناخواندگی کی شرح = 90%

(بحوالہ انسائیکلو پیڈیا مذکورہ بالا، جلد چہارم، ایڈیٹر ان چیف جان۔ ایل۔ ایس پی زیتو، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 1995ء ایڈیشن، صفحات 36`335)

ایسے کئی اسلامی ممالک میں خواتین گھر کے کام کاج میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ گھریلو زندگی کا مرکز ومحور ہیں۔ ایسے ممالک میں اب بھی خواتین کا یہی روایتی رول ہے۔ یعنی امور خانہ داری۔

وہ مسلم خواتین جو اپنے ممالک سے باہر ہیں مثلاً یورپ، امریکہ میں، انہوں نے بھی آزادی نسواں کی تحریکیں چلا رکھی ہیں۔ اس ضمن میں چند مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ برطانیہ میں 1992ء میں مسلم اور ہندو خواتین نے برطانیہ کی خواتین سے مل کر ایک آزادی نسواں کی تنظیم بنائی ہے۔ 1992ء میں شمالی امریکہ میں بھی مسلم خواتین نے ایک ایسوسی ایشن تشکیل دی ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احمد لیلیٰ کی کتاب (ویمن اینڈ جنڈر ان اسلام، مطبوعہ نیو ہیوین 1992ء)

ایران اور عراق کی خواتین فیملی پلاننگ کے خلاف ہیں وہ کہتی ہیں کہ جنگ میں مردوں کی اموات سے اب انہیں زیادہ اولاد کی ضرورت ہے تاکہ آبادی وہاں بڑھے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جین سمتھ (Jane Smith) کی کتاب ......:

(مطبوعہ لندن 1980ء، women in Contemorary muslim Societies)

بیجنگ کانفرنس میں اس امر اور حقیقت کو واضح کرنے کی ضرورت تھی کہ اسلام نے ہمیشہ حقوق نسواں کا تحفظ کیا ہے مادر پدر آزادی عورتوں کے لئے بربادی کا مژدہ ہے۔ اس سے ان کی عائلی زندگی اور زیادہ تباہ ہوگی۔ جیسے یورپ میں تباہ ہوچکی ہے جائز حقوق خواتین کو ملنے چاہئیں۔

(بحوالہ: جدید دور کے مسائل اور ان کا حل قرآن اور سیرت طیبہ کی روشنی میں ڈاکٹر لیاقت علی نیازی)

عورت جب اسلام سے روشناس ہوئی

زندگی کی طرف واپس آنے والے!

کل میں نے ڈھیر سارے نئے کپڑے خریدے۔ نئی پتلونیں، نئے اسکرٹ، نئے بلاؤز، نہ جانے کیا کیا۔ رات کو تھک ہار کر واپس آئی اور تازہ خریداری کو دوبارہ کھول کر دیکھے بغیر ہی سوگئی۔ آج صبح اٹھی۔ منہ ہاتھ دھوتے دھوتے وضو ہی کر ڈالا اور پھر جی میں آئی کہ چلو آج نماز بھی پڑھ ڈالو۔ میں نے پورے التزام کے ساتھ سر ڈھانپا اور نماز شروع کر دی۔ نماز کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے کل کے خریدے ہوئے پیکٹ کھولنا شروع کئے اور سارے کپڑے باری باری دیکھنا شروع کئے۔ کپڑے مجھے عجیب لگے۔ اسکرٹ گھٹنوں سے اوپر تک تھے۔ شرٹس اور بلاؤز روغیرہ آدھے سے بھی کم۔ میں بڑی دیر تک ان کپڑوں میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتی رہی سر ابھی تک نماز والے دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس جائزے کے دوران میں موذن کی آواز سنائی دی۔ صبح سے بیٹھی تھی، ظہر ہو گئی۔ مجھے اچنبھا سا ہوا لیکن مزید حیران ہوئے بغیر میں دوبارہ اذان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اذان کے الفاظ دل میں اترتے جا رہے تھے۔ اذان ختم ہوئی تو میں بے اختیار اٹھی اور ظہر کی نماز کے لئے اللہ اکبر کہتے ہوئے نیت باندھ لی۔ نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میری زبان سے ایسی دعا کے الفاظ نکلنے لگے جو نہ میں نے کبھی پہلے کہے تھے نہ سنے تھے: "رب انی فقیرة لها انت فی غنی عنه" (پروردگار میں اس چیز کی از حد محتاج ہوں جس سے تو بالکل بے نیاز ہے) میں کہے جا رہی تھی اور روئے جا رہی تھی آنسو تھمنے سے پہلے ہی یہ قسم میں کھا چکی تھی کہ جو دوپٹہ نماز کے لئے اوڑھا ہے اور اب کبھی نہ اترے گا میں نے کل خریدے ہوئے تمام ملبوسات ایک طرف رکھے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔

یہ روداد ہے مصر کی مشہور **34** سالہ اداکارہ فریدہ سیف النصر کی! جس نے بیسیوں فلموں، سٹیج ڈراموں اور ٹی وی ڈراموں میں حصہ لیا۔ فلمی دنیا میں صف اول کی اداکاراؤں میں شامل ہوئی ہر طرح کے کردار کے لئے لیکن دل کی دنیا بدلی تو چند ثانیوں میں، گزشتہ ساری زندگی پر ندامت ہونے لگی۔ اور دل میں ایک ہی جوت جاگ اٹھی کہ کسی طرح اپنی سابقہ زندگی کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے کس طرح خود کو ایک بدلا ہوا انسان ثابت کر کے اللہ کی رضا کا حق دار ہوا جا سکتا ہے؟

فریدہ اس نئے سفر میں تنہا نہیں۔ گزشتہ تھوڑے ہی عرصہ میں عالم عرب کی اور خاص طور پر مصری اداکاراؤں کی ایک بڑی تعداد فلموں سے توبہ کر کے اسلامی تہذیب اپنا چکی ہیں اور عریانی اور اخلاقی انحطاط کی تاریکیوں سے

نکل کرنور ہدایت میں آ چکی ہے۔ جس ہفتے میں فریدہ نے توبہ کی عین اسی ہفتے میں مصری سینما کی دو چوٹی کی اداکاراؤں سہیر رمزی اور سحر حمدی نے بھی اس عالم تاریک کو خیر باد کہنے کا اعلان کرتے ہوئے پردہ اختیار کرلیا۔

سہیر رمزی کا کہنا ہے کہ ''گزشتہ تقریباً ایک سال سے وہ اسی شش و پنج میں اور سوچ وبچار میں تھی کہ اس عذاب سے کیسے نجات حاصل کروں؟ اللہ کا شکر ہے کہ اب مسلسل عذاب کا طوق میرے گلے سے نکل چکا ہے۔

واضح رہے کہ سہیر ماضی کی وہ اداکارہ ہے جس نے اپنی فلمی زندگی میں ہر طرح کے فضول کردار اپنائے۔ اعلان توبہ کے وقت بھی وہ ایک ٹی وی سیریل ''لمس محبت'' میں بنیادی کردار ادا کرنے کی تیاری میں مصروف تھی۔ اس ڈرامے میں اسے اپنے آخری خاوند فاروق الغیشانی (جن سے وہ ایک سال قبل طلاق لے چکی تھی) کے ساتھ کام کرنا تھا۔ مگر ڈرامے کی ریکارڈنگ شروع ہونے سے قبل ہی دنیائے دل تبدیل ہوگئی اور اس نے فلمی دنیا کے تمام کنٹریکٹ منسوخ کردیئے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی سابقہ زندگی سے متعلق کوئی گفتگو یا کوئی انٹرویو دینے سے بھی منع کردیا۔ سہیر رمزی نے توبہ کے بعد مختصر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''فلمی ستاروں میں شمولیت، شہرت کے آسمانوں کو جا چھونا یا دولت کے انبار لگالینا، یہ سب کچھ خاک میں مل جاتا ہے۔ باقی رہ جانے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ میں اب صرف اس کی رضا کی طالب رہونگی۔''

سحر حمدی مصری گلیمر کی ایک بہت معروف رقاصہ تھی۔ انہوں نے بھی اپنی سابقہ زندگی سے برات کا اعلان کر دیا ہے۔ اور سہیر کی طرح رضائے الٰہی کی طلب میں مصروف ہیں۔ توبہ کرنے والی فنکاراؤں نے ایک روایت قائم کرلی ہے کہ جب بھی کوئی نئی ساتھی ان کے ساتھ آ ملے وہ اس کے اعزاز میں ایک پروگرام ترتیب دیتی ہیں جس میں پورے قرآن کریم کی اجتماعی تلاوت ہوتی ہے اور آنے والی تائبہ ساتھی کا استقبال کیا جاتا ہے۔ یہ تمام گروپ مل کر مختلف علمائے کرام سے لیکچر سنتی ہیں اور مشہور قاری خلیل الحصری کے نام سے منسوب الحصری مرکز میں باقاعدہ اجتماعات منعقد کرکے اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوتی ہیں۔ جن سے مشہور علمائے کرام محمد الغزالی، اسماعیل صادق جیسے اساتذہ خطاب کرتے ہیں اور محترمہ زینب الغزالی بھی اکثر پروگرام میں شرکت کرتی ہیں۔

مشہور مغنیہ یاسمین الغیام سے توبہ کے بعد پوچھا گیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں آپ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد تائب ہوچکی ہے۔ اس پر آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟ یاسمین نے ایمان تازہ میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا ''نادان بچہ اگر روٹھ کر شفیق ماں کی آغوش سے دور چلا جائے تب تو حیرت ہو لیکن اگر وہی بچہ ماں کی گود میں واپس آجائے تو اس پر کیسی حیرت؟''

اب تک توبہ کرنیوالی اداکاراؤں میں جو نام سامنے آئے ہیں ان میں چند بڑے بڑے نام یہ ہیں: مدیحہ کامل، لیلیٰ طاہرہ، سوسن بدر، شہیرہ، شازیہ، غصاف شعیب، شمس البہارودی، نسرین، امیرہ، ہالہ فواد، بالرالصافی، مدیحہ حمدی، کیلیا الغزالی، عبدالرزاق اور حضا ثروت۔ ان اداکاراؤں، رقاصاؤں اور مغنیات کے علاوہ اب حال

ہی میں ایک فلم پروڈیوسر ماجدہ حمید بھی پردہ اپنا چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک لبنانی مغنیہ عروب بھی اس چکا چوند عالمی تاریکی سے نکلنے کا اعلان کر چکی ہیں۔ مصری فلمی صنعت کی بہت سی خواتین کے ساتھ مرد اداکار بھی اسلامی تہذیب اپنائے ہوئے اختلاط وفساد کی دنیا سے نکل رہے ہیں۔

قرآن کریم نے سابقہ اقدام کا ذکر کرتے ہوئے جس قوم کا بار بار کر کیا ہے وہ اسی سرزمین سے تعلق رکھتی تھی۔ اس قوم بنی اسرائیل نے شر اور بدی کی انتہا فرعون کو بھی دیکھا اور اس کے ظلم وستم سہے اور خیر وحق کی لازوال مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیکھا اور ان پر ایمان لا کر فرعون کے ظلم سے نجات پائی۔

ان سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جمالِ وعدل کے پیکر بھی اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ تاریخ اسلام میں حکومت عباسیہ کا تخت بھی یہیں سجا اور خلافت عثمانیہ میں بھی مصر ہی کا کلیدی کردار رہا۔ دور حاضر میں حسن البناء شہید اور سید قطب جیسے داعیان حق بھی اسی خاک سے اٹھے اور جمال عبدالناصر جیسے سفاک داعیان قوم پرست یہیں فرعونیت کے زعم میں مبتلا ہوئے۔ اب اس وقت بھی مصر ہی تمام عرب ممالک میں اسلامی تحریکوں کے وجود کا مرکز ومحور بلکہ قائد ہے اور مصری ثقافت وتفریح کے نام پر پوری عرب دنیا میں اباحیت کا منبع اور پرچارک بھی۔ لیکن حالیہ تبدیلیاں مکمل ووسیع تبدیلی کی خبر دے رہی ہیں۔

(ماخوذ از ''عظمت کے مینار'' صفحہ 153 تا 157)

سحر جلال کی گلیمر کی دنیا سے واپسی

گلیمر کی دنیا، رنگ اور خوشبو کی دنیا، شور اور ہنگامے کی دنیا، نمود ونمائش کی دنیا، دولت اور شہرت کی دنیا۔ جہاں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش میں دیوانہ وار بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ جہاں شہرت کی ہوس نے بہت سوں کو ''جنون'' میں مبتلا کر رکھا ہے۔ بہت سے لوگ اپنا سب کچھ کھو کر بھی آگے مزید آگے بڑھنے کے خواہش مند ہیں۔ ان سب کے پیچھے ہمارے ذرائع ابلاغ کا ہاتھ ہے جنہوں نے اسکرین کی دنیا کو بہت خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے۔ کسی ڈرامے میں کوئی معمولی کردار ادا کرنے والی دوشیزہ کو بھی آئیڈیل بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس کے انٹرویوز شائع اور نشر کیے جاتے ہیں اور اب تو اور کسی نہ کسی عنوان سے کسی نہ کسی چیلنج کے نام پر شرفا کی باحیاء بیٹیوں کو اسکرین پر مدعو کیا جاتا ہے اور وہ بالکل فلمی رقاصاؤں کی طرح تھرکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یہ دنیا جو باہر سے بہت خوبصورت اور بہت روشن ہے اس کے پیچھے کیسے اندھیرے ہیں۔ کیسی تاریکی ہے۔ ان شور اور ہنگاموں کے بیچ میں رہنے والوں کے اندر کتنا سناٹا ہے کوئی نہیں بتاتا۔ اس لیے کہ جو جاتا ہے وہ پلٹ کر نہیں آتا۔ اور انہیں راستوں میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک نام جو ایک عرصہ تک ٹیلی ویژن کی زینت بنا رہا۔ جس نے ٹیلی ویژن کے لیے لکھا بھی اور اداکاری بھی کی۔ وہ سحر جلال ہیں جو عرصہ ہوا اسکرین پر نظر نہیں آ رہیں۔ کچھ روز قبل صبح کی نشریات ''سویرے سویرے'' میں ان کا انٹرویو دیکھا تو پتہ چلا کہ انہوں نے شو بزنس کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے اور وہ سچائی کے راستوں کی تلاش میں ہیں۔ اب وہ اسکرین کی فنکارہ نہیں بلکہ داعی الی الخیر

ہیں:۔

لیکن یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کون ہے جو دولت اور شہرت کا راستہ چھوڑ کر، گلیمر کی دنیا چھوڑ کر، دولت اور شہرت سے دامن چھڑا کر حق اور سچائی کا امین بن جائے! اور اسی تجسس میں میں جان پائی کہ:۔

''وہ اسکول کے زمانے سے ریڈیو اور ٹی وی پر آتی تھیں اور بچوں کے پروگرام سے جب بڑوں کے پروگرام میں آئیں تو پنڈی کی مصروف ترین فنکارہ بن گئیں۔ پھر حالات و واقعات نے ان کو کراچی پہنچا دیا اور انہوں نے پی آئی اے (PIA) آرٹس اکیڈمی جوائن کر لی اور اکیڈمی میں رہ کر وہ پاکستانی وفد کے ساتھ وہاں ہفتوں رہیں جہاں پاکستانی سفارت خانہ تک نہ کھلا تھا۔ اس طرح دنیا گھومنے اور دنیا دیکھنے کے بے شمار مواقع انہیں میسر آئے۔ ایک لڑکی کا گھر سے باہر قدم نکالنا اور وہ بھی اس انداز سے۔ پورے خاندان میں ان کے خلاف محاذ کھل گیا۔ لیکن یہ مخالفتیں ان کی راہ میں مزاحمت نہ کر سکیں اور جوانی کی طاقت زمانے کی طاقت سے نبرد آزما ہو گئی۔ دوران سروس میں وہ جو ڈرامے کرتی تھیں ان کے لیے پی ٹی وی باقاعدہ PIA سے اجازت لیتا تھا۔ انہوں نے ٹی وی پر کئی مشہور سیریل کیں جن میں شمع، انتظار فرمائیے، دوسری لڑکی اور سنگ چور مقبول ہوئیں۔ وہ کافی عرصہ تک غائب رہ کر دوبارہ اسکرین پر آجاتی تھیں۔ اس دفعہ پھر پروڈیوسر کو ایمرجنسی میں ان کی ضرورت پڑ گئی۔ پروڈیوسر کالیں دیتے رہے اور وہ ایمرجنسی میں دستیاب نہ ہوئیں۔

اللہ نے ہر انسان کے اندر ایک زندہ انسان پیدا کر دیا ہے اور وہ اس کا ضمیر ہے۔ وہ ضمیر جو کبھی نہ کبھی ضرور آوازیں دیتا ہے اور کسی نہ کسی موڑ پر ملامت کرتا ہے...... اگر انسان اس کو تھپک تھپک کر سلا نہ دے، اپنے اندر کی آواز کو سن کر اپنے باہر کے شور میں دبا نہ رہے، اگر اس لمحے میں وہ ضمیر کی آواز پر کان دھر لیتا ہے اور سچائی کی تلاش کی پکار سن لیتا ہے تو اسے عرفان ذات حاصل ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنی ذات کی تلاش کے سفر میں شروع ہو جاتا ہے۔ سحر جلال کی زندگی میں بھی وہ لمحہ آ چکا تھا جب انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ:۔

''گلیمر کی دنیا ایک سراب ہے۔ انسان جتنا آگے بڑھتا ہے تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں بہت کچھ کھو کر جو چند کھوٹے سکے ملتے ہیں ان کی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں۔ یہاں کے شور اور ہنگامے انسان کے اندر کے انسان کو سلا دیتے ہیں۔ یہاں ہر دم قہقہے لگانے والے، لائٹوں کے درمیان رہنے والے اپنے اصلی روپ کے اوپر ایک اور مصنوعی روپ سجانے والے در حقیقت اندر سے بڑے اداس، بڑے تنہا، بڑے ویران اور بہت ٹوٹے ہوئے لوگ ہیں۔ اور بلاشبہ پکارنے والا جب پکارتا ہے تو وہی ہے جو دلوں کی پکار سنتا ہے اور جواب دیتا ہے۔ جو شکستہ دلوں کا قرار ہے اور در حقیقت دلوں کو اطمینان تو اللہ ہی کے ذکر سے ہوتا ہے'' قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل کرنا شروع کر دی کہ سیدھا راستہ اور سچا راستہ، صراط مستقیم کہیں ہے تو وہ یہیں ہے۔ انہیں اللہ نے توفیق دی کہ سیدھا اور سچا راستہ انہوں نے دیکھا اور یہ کہ سچائیوں کو جان کر اور حقیقتوں سے آشنا ہو کر صرف اپنی اصلاح ہی نہ کریں بلکہ اس مقصد حیات کے شعور کو آگے منتقل کریں۔ انہوں نے اسلام آباد اور پنڈی کے اسکولوں میں

باقاعدہ درس دینا شروع کر دیا ہے۔ وہ قرآن اور حدیث سے روز قیامت کے درس تیار کرتی ہیں۔ SLC سکول میں باقاعدہ درس دیتی ہیں۔ اسکول کی انتظامیہ نے ان کے جذبے سے متاثر ہو کر ہفتہ میں ایک پیریڈ درس وتبلیغ کے لیے مختص کر دیا ہے۔ وہ آرمی سکول، فوجی فاؤنڈیشن سکول اور گرائمر سکول میں درس دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ان راستوں پر بھی انہیں بہت دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ لوگوں کی طرف سے بہت طنز واستہزاء کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت سے لوگ ان کے اس مشن کی مخالفت کرتے ہیں لیکن وہ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ ''سفر ہے شرط......''

درس دیتے دیتے وہ آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جتنی مشکل وہ دنیا تھی اس سے زیادہ مشکلات اس راستے پر ہیں اور بقول ان کے کہ انہوں نے اپنے آپ کو حالات کی بھٹی میں ڈال دیا ہے اور کیونکہ اپنی ذات کی تطہیر کے لیے اور معاشرے کی اصلاح کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بظاہر یہ نیک کام ہے لیکن جو اس مشن کو لے کر چلتا ہے اس کے راستے میں کیسے کیسے روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ کیسی کیسی مشکلات پیدا کی جاتی ہیں؟ یہ اس راہ کے راہی ہی جانتے ہیں۔

وہ ہر صورت میں اپنی سابقہ زندگی کی تلافی چاہتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ اس بھٹی میں سلگتے سلگتے اگر میں اپنے رب سے جاملوں اور کامیاب ہو جاؤں تو میں سمجھوں گی میں نے کچھ نہیں کھویا۔ یہی کسک ان کا قیمتی سرمایہ ہے۔

نئی نسل جس طرح گلیمر کی دنیا کی طرف بھاگ رہی ہے اس پر انہیں بہت ملال ہے اس لیے انہوں نے اسکولوں کو اپنا ٹارگٹ بنایا ہے اور وہاں جا کر وہ بتا رہی ہیں کہ سب دھوکہ ہے بہت لمبا اور تھکا دینے والا سفر ہے لیکن آخر میں سب کچھ سراب ہوتا ہے۔ کوئی بھی تقریب ہو ان کی گفتگو کا موضوع یہی ہوتا ہے کہ نئی نسل کو عریانی اور فحاشی کو جو سیلاب بہائے لے جا رہا ہے اس کے آگے بند کیسے باندھا جائے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں اپنے تلخ تجربات ومشاہدات سے دوسروں کی زندگی ترتیب دینا چاہتی ہوں۔ انہیں ان سرابوں کی حقیقت بتانا چاہتی ہوں جن میں نوجوان اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں، داؤ پر لگا رہے ہیں۔

وہ کل بھی بے کل تھیں اور آج بھی بے کل ہیں۔ کل حقیقتوں کی تلاش میں اور آج حقیقتوں کے منکشف ہو جانے پر۔ وہ کہتی ہیں کہ اگر میں اپنی تمام تر کوششوں سے کسی ایک فرد کو بھی اس راستے پر جانے سے دوں تو یہی پچھلی زندگی کی تلافی ہوگی۔

میرا خیال ہے کہ سحر صدیقی، سیدہ زاہدہ اور پھر سحر جلال جیسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ گھٹاٹوپ اندھیروں میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے انہیں روشنیوں کو عام کرنے کی ضروری ہے اور دنیا کو نمود ونمائش اور کھوٹے سکوں کی بجائے جو آخرت کے خریدار ہیں، جو حق کے داعی ہیں۔ وہی ہمارا سرمایہ حیات ہیں۔ اس بھٹکتے ہوئے معاشرے کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

(ماہنامہ ''خواتین میگزین'' لاہور شمارہ نومبر 1996ء صفحہ 13-14) (محترمہ افشاں نوید)

”میں نے اداکاری کیوں چھوڑی؟“

راحیلہ آغا (پاکستانی فلموں کی سابقہ ہیروئن)

راحیلہ آغا کی والدہ جو کہ فلموں کی مقبول ترین ہیروئن بننے کے لئے فلم انڈسٹری میں داخل ہوئی، مگر باوجود کوشش کے جب وہ خود فلمی ہیروئن نہ بن سکی تو اس نے فلم انڈسٹری ہی کے ایک ٹیکنیشن سے شادی کرلی۔ ان کے ہاں جب بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے اس کی تربیت اسی انداز سے کی کہ جوان ہونے تک اس کے اندر فلمی ہیروئن بننے کے تمام اوصاف پیدا ہو جائیں۔ جب ان کی بیٹی راحیلہ آغا نے جوانی میں قدم رکھا تو اس کے والدین اسے فلم انڈسٹری میں بھرپور انداز میں لے گئے۔ راحیلہ آغا کی خوبصورتی فلمسازوں اور ہدایت کاروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم عرصہ میں اسے نامور ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن جب وہ کیمرہ کے سامنے آئی تو اس نے اپنے اندر کی عورت کو تڑپتے دیکھا۔ وہ کسی صورت میں بھی کام کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ مگر والدین کی سختی نے آخرکار اسے یہ کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ کئی فلموں میں کام کرنے کے بعد اسے جہاد افغانستان کے موضوع پر بننے والی فلم بارود کا تحفہ میں ایسی افغان لڑکی کا کردار ادا کرنے کی آفر ہوئی جس کا باپ وطن کا غدار ہوتا ہے اور باوجود کوشش کے اپنی بیٹی کے دل سے جذبہ حب الوطنی نہیں نکال سکتا۔ آخرکار جب بیٹی کو پتہ چلتا ہے کہ اس کا غدار باپ مجاہدین اور افغانستان کو کوئی بہت بڑا نقصان پہنچانے کی نیت سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جا رہا ہے تو وہ مجاہد کا روپ دھار کر اپنے باپ کے سامنے کلاشنکوف لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جب اس کا باپ اس کے سامنے التجا کرتا ہے اور اسے یاد دلاتا ہے کہ ”تم کیا کر رہی ہو! تمہارے سامنے تمہارا باپ کھڑا ہے“ تو بیٹی جواب دیتی ہے کہ ”کون باپ اور کس کا باپ! جس کا رشتہ دین اور وطن سے نہ رہے اس سے ہر رشتہ ٹوٹ جاتا ہے“ اور پھر باپ کو جہنم رسید کر دیتی ہے۔

راحیلہ آغا نے بتایا کہ یہی وہ سین تھا جس کو پکچرائز کرواتے ہوئے میرے دل میں روشنی پیدا ہوئی اور میں نے اپنے ان والدین سے بغاوت کا فیصلہ کرلیا، جو مجھے ”عریانیت وفحاشی“ کو فروغ دینے کے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ اس کے علاوہ فلم کے پروڈیوسر رانا طارق مسعود اور مصنف وہدایت کار ”سعید رانا“ کے بلند کردار اور خصوصاً افغانستان میں مجاہد بھائیوں کے رویہ اور حالات نے میرے اس جذبے کو تقویت بخشی۔

بس یہیں سے راحیلہ کی زندگی میں تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اس بغاوت کے بعد وہ شادی کر کے اب ایک مومن عورت کی طرح اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ آج کل اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ ”اٹلی“ میں مقیم ہیں۔ وہ ایک ماہ کے لئے پاکستان تشریف لائیں تو ”خواتین میگزین“ کی طرف سے میں نے ان سے خصوصی ملاقات کی۔ اس

ملاقات میں ان کے ساتھ جو گفتگو ہوئی وہ قارئین کی نذر ہے:

سوال: آپ نے فلم انڈسٹری چھوڑنے کا فیصلہ کب اور کیسے کیا؟

جواب: جب میں افغانستان گئی تو مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم افغانستان جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں افغان بارڈر کے قریب لے جایا جائے گا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہمیں باقاعدہ افغانستان کے اندر لے جایا گیا ہے جہاں پہلے پہل تو بڑا خوف محسوس ہوا۔ تاہم آہستہ آہستہ یہ کیفیت نہ رہی۔ ہمیں افغانستان میں پانچوں وقت نمازیں ادا کروائی جاتیں۔ صبح درس قرآن ہوتا۔ وہاں میں نے مجاہدین کے ایسے ایسے واقعات سنے کہ ایمان کی عجیب کیفیت خود اپنے اندر محسوس کی۔

افغانستان سے واپسی پر میں فیصلہ کر چکی تھی کہ افغان جہاد پر بننے والی اس فلم کے علاوہ کسی فلم میں کام نہیں کروں گی پھر میں نے شادی کر لی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم لوگ جو زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اسلام سے سراسر بغاوت ہے۔ انہی دنوں میں مجھے بڑی بڑی آفرز ہوئیں مگر میں نے سب ٹھکرا دیں۔ میں نے سوچا کہ اتنی اچھی سرزمین سے ہو کر آئی ہوں اگر پھر سابقہ زندگی کی بے ہودگیاں اختیار کر لیں تو یہ شہداء کے خون سے غداری ہو گی۔

سوال: اب آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟

جواب: اب میں اٹلی میں مقیم ہوں اور میری کوشش یہ ہے کہ میرے بچے دینی تعلیم سے ضرور آراستہ ہوں اور وہ صحیح مسلمان کی زندگی اختیار کریں میرے والدین نے مجھے واپس فلمی دنیا میں لانے میں ہر ممکن کوشش کی وہ اپنے طور پر بڑے بزنس سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن فلمی دنیا چھوڑنے کا میرا فیصلہ اٹل تھا۔ اور اب میں بڑی خوشیوں بھری زندگی بسر کر رہی ہوں۔

سوال: کیا آپ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش سے آگاہ کریں گی؟

جواب: میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اپنی پہلی زندگی کا کفارہ اس دنیا میں ادا کر کے جاؤں اور آخرت میں مجھ سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو جائیں۔ میری آخری فلم کے پروڈیوسرز کے طرز عمل سے مجھے پتہ چلا کہ انسان کا مقصد اس دنیا کی زندگی میں نہایت اہم کردار ہے اور اس کی زندگی بے مقصد نہیں ہے۔ اس مقصد زندگی سے مزید آگہی کے لئے میں اٹلی میں خود بھی دین سیکھ رہی ہوں اور دوسری عورتوں کو بھی دینی تعلیمات سے آگاہ کرتی ہوں۔

سوال: آپ پاکستان کے الیکٹرانک میڈیا کے نئے کردار کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

جواب: آج کل پاکستان ٹی وی جو پالیسی لے کر چل رہا ہے یہ نوجوان نسل کو دین اور اسلام سے دور کرنے کا سبب بن رہی ہے اس کے نتیجے میں وہ اللہ کے سپاہی بننے کے بجائے شیطان کے چیلے بن رہے ہیں۔ ٹی وی کے ان بے ہودہ پروگراموں کے خلاف آواز اٹھانا ہر مسلمان مرد و عورت کا فرض ہے۔ قلم اور زبان کے جہاد میں تو

جس قدر ممکن ہو ہر مسلمان کو حصہ لینا چاہئے تاکہ اس سیلاب کے سامنے کے یہیں بند باندھ دیا جائے۔ قبل اس کے کہ یہ ہم سب کے ایمان بہا کر لے جائے۔

سوال: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ فلم انڈسٹری سے کوئی اچھا کام لیا جاسکتا ہے؟

جواب: فلم انڈسٹری ان لوگوں کے سپرد کر دی گئی ہے جو شیطان کے چیلے اور جہالت کا پلندہ ہیں۔ ان لوگوں نے پیسہ کمانے کے لئے شیطانی ہتھکنڈے اختیار کر رکھے ہیں۔ یہ میڈیا بھرپور انداز اور قوت کے ساتھ لوگوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ایسے میں لازم ہے کہ اصلاحی اور معاشرتی موضوعات پر فلمیں تیار کی جائیں اور فلمیں، ڈرامے ایسے پیش کریں کہ اس سے زندگی کا مقصد اور اسلام کی اہمیت اجاگر ہو ایران کی فلم انڈسٹری کی واضح مثال ہے کہ انہوں نے عورت کو پردے میں رکھ کر بڑی اچھی فلمیں تیار کی ہیں انہی فلموں کے ذریعے سے انہوں نے اپنی قوم کو منظم کر رکھا ہے۔ موجودہ دور میں ہمارے گھر میں میڈیا موجود ہے ہم اپنی مرضی کے نہیں بلکہ طاغوت کی مرضی کے پروگرام دیکھ رہے ہیں جبکہ بچے کی اولین درس گاہ و تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے مگر یہ الیکٹرانک میڈیا کا کرشمہ ہے کہ آج ماں کی گود میں پڑا ہوا بچہ بھی طاغوت کی سکرینی درس گاہ (ٹیلی ویژن) کا طالب علم ہے اور مائیں بچے کی تربیت کو نہ سمجھتے ہوئے انہیں اکثر ٹی وی کی سکرین کے سامنے لے کر بیٹھ جاتی ہیں یا انہیں ٹی وی کے سامنے چھوڑ دیتی ہیں تاکہ وہ خود اطمینان سے گھریلو کام کرلیں۔ یہی ان ماؤں کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ مستقبل میں اس روش کے جو بہت سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے وہ تو الگ ہیں مگر ہمیں حشر میں جواب دہی کے لئے بھی تیار رہنا ہوگا۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج مسلم معاشرے کو ایک عام اسلامی نظریاتی سکول یا یونیورسٹی جس میں چند طلبہ یا طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔ اس سے زیادہ ضرورت ایک اسلامک آئیڈیل ٹیلی ویژن نیٹ ورک بنانے کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کے علاوہ بالخصوص اسلام کو پسند کرنے والے گھرانوں میں ایک چینل تو ایسا دیکھنے کو ملے جس سے آپ اپنا احتساب یا تزکیہ نفس کرتے رہیں اس سے نہ صرف ہم غیر مسلم معاشروں تک اسلام کا پیغام پہنچا سکیں گے بلکہ ہم اپنے بچوں کو بھی دشمن کے ''میڈیا کے دور مار میزائل'' کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھ سکیں گے۔

سوال کیا آپ کی طرح دوسری ہیروئنیں بھی دینی فطرت کی طرف واپس لوٹ سکتی ہیں۔ یا ایسی کوئی کوشش کامیاب ہوسکتی ہے؟

جواب: میں پاکستان کی فلم انڈسٹری میں رہی ہوں۔ میں وہاں پر موجود خواتین کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ جب میں فلم انڈسٹری میں کامیابی کی منزلیں طے کر رہی تھی اور میرا مقصد زندگی سینما کی سکرین پر نمبرون بن کر راج کرنا تھا۔ تب تک میرے آگے پیچھے میرے اشارے پر جان قربان کرنے کے دعویدار بھی موجود تھے اور والدین کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ میں تب بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ حاصل کر کے اپنا بہت بڑا نقصان کر رہی ہوں یہی کیفیت میرے ساتھ کام کرنے والی ہیروئنیں رکھتی

تھیں۔ جب ہم آپس میں بیٹھتیں تو ان خواتین پر رشک کرتیں جو چادر اور چار دیواری کے تحفظ میں ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ کاش! ہمارا بھی کوئی گھر ہو۔ ہمارا بھی ایسا شوہر ہو جو اس گھر میں ہمیں چادر اور چار دیواری کا تحفظ دے سکے۔ آپس میں ہماری گفتگو کا حاصل یہ ہوتا کہ ہم دوسروں کی خواہش پر یا حادثاتی طور پر زندگی کی جو راہ اپنا چکی ہیں۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ آج بھی کسی فنکارہ کو چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا بھرپور یقین دلایا جائے اور اسے دین کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی جائے تو آپ محسوس کریں گی کہ وہ شاید اسی دن کے انتظار میں تھی اگر ہم اس طرف تھوڑی سی توجہ دیں تو ہمیں مایوسی نہیں ہوگی آپ یہ مت سمجھیں کہ آپ اس کا پورا جائزہ لیں گے۔ تو آپ کو اس کے پیچھے اس کا رشتہ دار، عزیز یا کوئی بڑی مونچھوں والا پٹھان اس کی خواہش کے خلاف یہ سب کام اس سے بزور کراتے ہوئے نظر آئے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شہرت اور دولت کے نشے میں ''سرور'' میں اس زندگی کی عادی ہو جائے۔

سوال: پردے کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب: بات یہ ہے کہ جب میں فلم میں کام کرتی تھی تو میری خواہش تھی کہ میری طرف اٹھنے والی نگاہوں میں سے کسی ایک کی نگاہ میں تو تقدس جھلکتا ہوا ملے۔ مگر مجھے ہر نگاہ میں شیطانیت نظر آتی تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں ایک بکاؤ مال ہوں۔

اگرچہ میرے چہرے پر خوشی کا جھوٹا تاثر ہوتا تھا۔ مگر میرے دل و دماغ میں ایک خوف طاری ہوتا تھا۔ جیسے میں جنگل کے لاتعداد بھیڑیوں کے درمیان تنہا عورت ہوں۔ مگر الحمدللہ! جب سے اللہ نے مجھے دین کا شعور دیا ہے اور میں نے باقاعدہ پردہ کرنا شروع کر دیا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس پردے کی آڑ میں اللہ نے مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ مجھے اس سے سکون ملا ہے ایک سرور کی کیفیت ملی ہے جو صرف اور صرف اللہ کے ذکر ہی میں غرق ہو کر ملتا ہے۔ یہ نہ تو شہرت کی بلندیوں پر انسانوں کو ملتا ہے اور نہ دولت کی فراوانی سے حاصل ہوتا ہے آج جب ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں چاروں طرف جرائم ہی جرائم نظر آتے ہیں۔ اگر اس گہرائی پر غور کریں تو آپ کو سب سے نمایاں عنصر عورت کی بے پردگی اور نمائش حسن نظر آئے گی۔ جب ایک عورت بے پردہ ہو کر گھر سے نکلتی ہے تو دراصل وہ شیطان کی آلہ کار بن کر نکلتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کا اخلاق بگڑتا ہے اس کے بعد وہ سنگین جرائم کا ارتکاب بھی کر گزرتے ہیں جبکہ باپردہ عورتیں دیکھ کر پاکیزگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

سوال: ان دنوں میں آپ کے مطالعے میں کون کون سی کتب ہیں؟

جواب: مولانا مودودیؒ کی کتاب دینیات اور دیگر کتب کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ تفہیم القرآن بھی پڑھ رہی ہوں، زینب الغزالی کی ''زنداں کے شب و روز'' بھی پڑھ چکی ہوں۔ جس سے بڑا حوصلہ ملا ہے اور پتہ چلا ہے کہ ایک مسلمان کا معاشرے میں حقیقی رول کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت صنف نازک ہے مگر ایک مسلمان عورت

صنفِ نازک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عزائم کے حوالے سے فولادی دیوار ہے زینب الغزالی جیسی مجاہدہ خاتون اور دوسری ان جیسی خواتین کے حالاتِ زندگی موجودہ دور کی خواتین میں عام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: پاکستانی خواتین کے نام پیغام؟

جواب: مائیں اپنے بچوں کو ٹی وی اسکرین سے بچائیں۔ کسی بھی قوم کی عورت قوم کو بناتی یا بگاڑتی ہے اگر عورت اپنے بچوں کی صحیح تربیت پر توجہ دے تو وہ دراصل معاشرے کی اصلاح کے لئے ایک اہم کارنامہ انجام دیتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے چاہئے کہ اپنے اردگرد کی خواتین مغرب سے متاثر ہو کر بے پردہ یا نیم عریاں ہو کر فخر محسوس کر رہی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے خاندان کی غیرت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہی ہیں بلکہ معاشرے کو بھی تباہی کی راہ پر لے جا رہی ہیں۔ ان خواتین کو بھی ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی ضرورت ہے عین ممکن ہے کہ یہی مغرب زدہ خواتین مستقبل میں اسلام کی قابلِ فخر مجاہدات بن جائیں۔

(ماخوذ از ماہنامہ ''خواتین میگزین'' لاہور، شمارہ مئی 1996ء صفحہ 9`10۔ 57`58) (غفران الرحمٰن)

رائل پارک جانے کی غلطی میں بھی کر چکی ہوں

یہ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والی ایک گمنام خاتون کی کہانی ہے جو وی۔ سی۔ آر پر فلمیں دیکھتے دیکھتے فلموں میں کام کرنے کے شوق میں رائل پارک پر پہنچ گئی تھی پھر یہ خاتون ''فلمی دنیا'' میں ایڈجسٹ ہونے سے کس طرح بچیں اور کیسے محفوظ طور پر گھر پہنچیں، یہ معلوم کرنے کے لئے ان کی اپنی بیان کردہ یہ کہانی ذیل میں مطالعہ کیجئے۔ انہوں نے آغاز میں ''میں نے اداکاری کیوں چھوڑی؟'' کے عنوان سے اداکارہ راحیلہ آغا کے جس مون کا حوالہ دیا ہے وہ اس آرٹیکل کے بعد آ رہا ہے۔

میں نے جب ''خواتین میگزین'' میں ''میں نے اداکاری کیوں چھوڑی؟'' کے عنوان سے راحیلہ آغا کا انٹرویو پڑھا تو اس میں مجھے دو باتوں نے چونکا کر رکھ دیا: ایک تو فلم ''بارود کا تحفہ'' اور دوسرا فلمساز رانا طارق مسعود، دراصل میری زندگی میں یہ دو نام بہت اہم ہیں میں نے ضروری سمجھا کہ میں وہ واقعہ جس کی وجہ سے آج یہ زندگی گزار رہی ہوں آپ کو ضرور لکھوں۔ جو خاص طور پر ہماری وہ نوجوان لڑکیاں جو شوبز کی چکا چوند سے متاثر ہو کر اپنی زندگی برباد کرنے یہاں چلی آتی ہیں۔ شاید ان کے لئے میری یہ تحریر مشعلِ راہ ہو واقعہ درج ذیل ہے:

''اس دن ہمارے گھر میں خوشی کی انتہا نہ رہی جب میرا بڑا بھائی روزگار کے لئے ملک سے باہر گیا۔ اور پھر چند ماہ بعد ہی ہمارے گھر میں ہماری ضروریات سے زیادہ پیسے آنے شروع ہو گئے پہلے ہم تین وقت کے کھانے کو ترستے تھے مگر اب انواع واقسام کے کھانے ہر وقت ہمارے گھر میں پکتے تھے۔ تمام رشتہ دار ہمارے گھر کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ میرے والدین کے علاوہ ہمارے گھر میں ہم تین بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ میں بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ میرے والد ایک ریٹائرڈ سکول ماسٹر تھے۔ ان کے کندھوں پر ہم سب کا بوجھ تھا۔ جیسے تیسے کر کے انہوں نے ہمارے بڑے بھائی کو باہر بھجوایا۔ اس دن ہمارے گھر میں سب پھولے نہیں سما رہے

تھے جب دو سال بعد بھائی چھٹی پر گھر واپس آئے تو اپنے ساتھ بڑا ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، رنگین ٹیلی ویژن، فریج اور کئی دوسری چیزیں لے کر آئے۔ اب کیا تھا۔ ہم تھے اور وی سی آر پر انڈین فلموں کی بھرمار، تبصرے تھے۔ تو انڈین اداکاراؤں اور اداکاروں کے۔ ہر جگہ، ہر خاندان فنکشن میں یہی اداکاروں کے تذکرے تھے۔ آخر میرے دل میں بھی ایک کامیاب ترین اداکارہ بننے کا خیال سمایا۔ یہ خیال تقویت اختیار کر کے ادارہ بن گیا اور پھر میں نے نہایت سوچ و بچار کے بعد ایک کامیاب اداکارہ بننے کے لئے ہر رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب میں نے اس کا ذکر اپنی چند قریبی سہیلیوں سے کیا تو انہوں نے مجھے بہت سمجھایا۔ مگر مجھ پر صرف ایک ہی بھوت سوار تھا اور پھر ایک رات میں نے گھر سے زیورات اور نقدی (جو کہ قریباً دو لاکھ روپے کے قریب بنتی تھی) اٹھائی اور لاہور کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ مجھے یہ یاد تھا کہ لاہور کے لکشمی چوک میں فلم کے بڑے بڑے دفتر قائم ہیں اور پھر میں نے اخبارات میں بھی ان کے بارے میں پڑھا ہوا تھا۔ لاہور پہنچ کر میں لکشمی چوک گئی اور وہاں رائل پارک کی گلیوں میں گھوم پھر کر فلمی دفاتر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مجھے اس طرح گلیوں میں پھرتے دیکھ کر چند اوباش غنڈے میرے پیچھے لگ گئے۔ میں ان کے آگے تیز تیز چلتی ہوئی ایک بلڈنگ میں داخل ہو کر بلا سوچے سمجھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آخری منزل پر سیڑھیوں کے ساتھ ہی مجھے ایک فلمی دفتر پر بڑا سا نام "بارود کا تحفہ" لکھا ہوا ملا اور میں گھبرائی گھبرائی سی اس دفتر میں داخل ہو گئی۔ وہاں میں نے چپڑاسی سے پوچھا کہ مجھے اس فلمساز جس کا نام میں پڑھ چکی تھی رانا طارق مسعود صاحب سے ملنا ہے۔ اس نے مجھے بٹھایا اور دفتر کے ساتھ والے کمرے میں اس نے رانا صاحب کو بتایا کہ کوئی خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔ رانا صاحب نے اسے کہا کہ اندر بھیج دیں۔ میں سہمی سہمی، ڈری ڈری سی اندر چلی گئی۔ سامنے ایک نوجوان جس کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی، بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ آیئے! تشریف رکھئے۔ میں خوفزدہ سی بیٹھ گئی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ مجھے فلمساز رانا طارق مسعود سے ملنا ہے۔ اس نے کہا کہ فرمایئے! میں ہی رانا طارق مسعود ہوں۔ میں بہت حیران ہوئی۔ میرے ذہن میں تو فلم پروڈیوسر کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ کہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، متکبر چالیس پینتالیس سالہ لمبا تڑنگا سا کوئی شخص ہو گا جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھے گا۔ مگر یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ ابھی تک سامنے بیٹھے شخص نے میری طرف ایک دفعہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ غالباً کوئی اسکرپٹ پڑھنے میں مشغول تھا۔ میں الجھے الجھے اور ملے جلے سے خیالات کے ساتھ وہاں بیٹھی دیوار پر لگے ہوئے بڑے بورڈ پر لگی فلم "بارود کا تحفہ" کی تصاویر دیکھ رہی تھی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ اس شخص کو کس طرح قائل کروں گی؟ اتنے میں انہوں نے نگاہیں نیچے رکھے ہی مجھ سے پوچھا کہ محترمہ! فرمایئے آپ کس کام کے لئے تشریف لائی ہیں؟ پہلے تو میں جھجکی مگر فوراً ہی میں نے اپنا اصل مدعا انہیں بیان کرنا شروع کر دیا کہ میں فلموں میں کام کر کے ایک کامیاب ہیروئن بننا چاہتی ہوں۔

میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں ان کے جواب کا انتظار کر رہی تھی کہ اتنے میں دفتر کا چپڑاسی میرے لئے کولڈ ڈرنک لے آیا اور میرے سامنے رکھ دی۔

رانا صاحب نے اسے کہا کہ جاؤ اور پر تکلف چائے لے کر آؤ۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی کہ دال گلتی نظر آتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد رانا صاحب پھر مخاطب ہوئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کو فلمی ہیروئن بننے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ میں نے ان کو بتایا کہ میرے بھائی جان کچھ عرصے قبل گھر میں بیرون ملک سے وی سی آر لے کر آئے میں نے اس پر بے شمار فلمیں دیکھی ہیں۔ مجھے سری دیوی اور بابرہ شریف بہت پسند ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی ان کی طرح ہیروئن بن کر دنیا میں اپنا نام پیدا کروں۔

"کبھی آپ نے سوچا ہے کہ فلم کی سکرین پر جب آپ اچھل کود کر رہی ہوں گی تو آپ کے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر کیا بیتے گی؟ رانا صاحب نے چبھتا ہوا سوال کر ڈالا۔ مگر میں کہاں شکست ماننے والی تھی۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ میں تمام کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی شوق کی تکمیل کے لئے قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ تو گویا آپ اس شوق پر اپنے والدین کی عزت اور غیرت کو قربان کرنے سے بھی گریزاں نہیں۔ رانا صاحب کے اس سوال نے میرے اندر کی ضد کو ہوا دی۔

میں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ کچھ حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے اور پھر مجھے یقین ہے کہ میں جب پردہ سیمین کی ایک بڑی ہیروئن بن جاؤں گی اور میرے پاس دولت کی ریل پیل ہو گی تو بالیقین میرے گھر والے مجھ پر فخر کریں گے۔ میری یہ بات سن کر رانا صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگے "تو گویا فلمی ہیروئن بننے کے لئے آپ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔"

میں نے پُر عزم ہو کر کہا: "کیوں نہیں، میں اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے راستے میں پڑے ہوئے کانٹے بھی اپنی پلکوں سے چن لوں گی۔" بہت خطرناک ارادے لگتے ہیں آپ کے؟ رانا صاحب گویا ہوئے۔ اتنے میں لڑکا پر تکلف لوازمات کے ساتھ چائے لے کر آ گیا، میں چائے بنانے لگ گئی۔ جب چائے بن گئی تو میں نے رانا صاحب سے کہا کہ آپ بھی اپنی سیٹ کے بجائے یہاں میرے ساتھ آ کر چائے پئیں۔ میں حیران تھی کہ میرے اندر یہ جرات کیسے پیدا ہو گئی کہ میں اتنی بے باکی سے ہر بات کہہ رہی تھی۔ رانا صاحب اٹھ گئے اور میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ گفتگو کرنے لگے دوران گفتگو انہوں نے غیر محسوس انداز میں مجھ سے یہ بات اگلوالی کہ میرا تعلق کس شہر سے اور کس گھرانے سے ہے۔ پھر انہوں نے مجھے روشنیوں کی اس دنیا کی تاریکی کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ انہوں نے بتایا۔ فلم انڈسٹری میں بہت سے ایسے لوگ اور گروہ بھی موجود ہیں جو اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ جو لڑکیاں فلم میں کام کرنے کے شوق میں گھر سے بھاگ آتی ہیں انہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں سے روشن مستقبل کے سنہرے سپنے دکھا کر یہ یقین دلا دیتے ہیں کہ ان کے خوابوں کی تعبیر صرف انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ سب سے پہلے تو وہ ان سے مال بٹورتے ہیں جو وہ گھروں سے لے کر آئی ہوتی ہیں۔ پھر چند دن ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور تحفظ فراہم کرتے ہیں اس کے بعد

پہلے تو بہلا پھسلا کر خود ان کی عزت سے کھیلتے ہیں اور پھر انہیں مجبور کر کے اور بلیک میل کر کے دوسرے لوگوں کو پیش کرتے ہیں۔ اس طرح آبرو کو نیلام کر کے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ پھر وہ لڑکیاں نہ گھر کی رہتی ہیں نہ گھاٹ کی بلکہ ایک مجبور و بے بس کٹھ پتلی کی طرح ان کے حکم کی غلام بن کر رہ جاتی ہیں۔'' رانا صاحب یہ باتیں کر رہے تھے مگر مجھ پر ان کی کسی بھی بات کا اثر نہ تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس شخص کو سیڑھی بنا کر منزل پا لوں گی۔

انہی باتوں کے دوران رانا صاحب نے ایک ایسے گروہ کا بھی بتایا کہ وہ لوگ لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر فلم میں کام دینے کا لالچ دے کر سٹوڈیو میں لے آتے ہیں اور پھر زبردستی ان کی انتہائی گری ہوئی اخلاق سوز فلمیں بنا کر تمام زندگی بلیک میل کرتے ہیں۔

اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ ایک لمحے کے لئے تو میں چونکی، پھر میں نے گھر کے بارے میں سوچا کہ اگر میں واپس بھی جاؤں تو گھر والے مجھے مار ڈالیں گے۔ میں نے رانا صاحب کو بتایا کہ میں ہر قیمت پر فلموں کی کامیاب ہیروئن بننا چاہتی ہوں۔ رانا صاحب کہنے لگے۔ تمہاری مرضی مگر تم لاہور سے باہر کے شہر کی ہو۔ اس لئے تمہاری رہائش کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ میں نے پرس کھول کر ان کے سامنے ڈھیر کر دیا جس میں دو لاکھ روپے اور گھر کے تمام زیورات تھے۔ میں نے رانا صاحب سے کہا کہ یہ رقم رکھ لیں اور میرے لئے فلیٹ کا بندوبست کر دیں۔ میں وہاں رہ لوں گی مگر آپ میرے ساتھ رہیں گے کیونکہ میں اکیلی لڑکی پورے فلیٹ میں نہیں رہ سکتی۔ دل ہی دل میں میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اس شخص کو ہر قیمت پر ہر طرح سے سیڑھی بنا کر اپنی منزل کو پہنچ جاؤں گی۔

رقم اور زیورات دیکھ کر رانا صاحب نے کہا: ''آپ انہیں پرس میں رکھئے اور کسی کو مت بتائیے میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر کچھ دیر کی معذرت کر کے وہ دفتر سے باہر چلے گئے۔ اور لڑکے سے کہہ گئے کہ دفتر کے اس کمرے میں کسی کو مت آنے دینا۔ لڑکا برتن اٹھا کر چلا گیا۔ اور میں اٹھ کر بڑے غور سے دیوار پر آویزاں فلم کے فوٹو اسٹیٹ کو دیکھنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ خود کو ان پوسٹروں پر محسوس کرنے لگی نیز خیالات میں اپنے اردگرد لوگوں کا رش محسوس کرنے لگی عالم تصور میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہر شخص میری ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا اور آٹوگراف لینے کے لئے بے چین۔ میں خود پر فخر کر رہی تھی کہ میرے آگے پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں ہیں۔ میرے بنگلے پر پروڈیوسروں کی لائنیں لگی ہوئی ہیں ہر شخص مجھے اپنی فلم میں کاسٹ کرنا چاہتا ہے۔

میں یہی سوچ رہی تھی کہ اتنے میں دروازہ لاک ہوا اور میرا حسین خواب ٹوٹ گیا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں گلا کھنکھارتے ہوئے رانا صاحب کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے بتایا کہ آج ہماری فلم کی شوٹنگ ہے لہٰذا تم بھی ہمارے ساتھ شوٹنگ پر چلو گی اور باقی سلسلہ شوٹنگ سے واپس آ کر دیکھیں گے تم وہاں جا کر دیکھو گی کہ شوٹنگ کیا ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے؟ اور پھر شوٹنگ بھی آؤٹ ڈور کی ہے۔ میں دل ہی دل میں یہ بات سن کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ آج میری برسوں پرانی حسرت پوری ہو رہی تھی کہ میں نے منزل کو پا لیا ہے

خیر تھوڑی دیر بعد ایک صاحب آئے اور انہوں نے رانا صاحب کو بتایا کہ نیچے گاڑی تیار ہے باقی یونٹ لوکیشن پر جا چکا ہے میں آپ کو لینے آیا ہوں رانا صاحب نے مجھے چلنے کو کہا اور پھر ہم دفتر سے نیچے اتر کر گاڑی میں بیٹھ گئے گاڑی روانہ ہوئی میں تمام راستہ سنہرے مستقبل کے سپنوں میں کھوئی رہی۔ مجھے کوئی ہوش نہ تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں تو خود کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھی کہ مجھے اتنی آسانی سے منزل مل گئی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ رانا طارق مسعود کی ہر خواہش کا احترام کروں گی اسے کسی بات سے نہیں روکوں گی یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک اس شخص نے مجھ سے کسی بھی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔

پھر گاڑی جب ایک جھٹکے سے رکی تو میں گاڑی کے باہر دیکھ کر حیران رہ گئی یہ تو میرا ہی شہر تھا اور اس شہر کی وہی آبادی تھی جہاں پر ہمارا گھر تھا۔ جہاں ہماری گاڑی رکی تھی اس سے دو گلیاں چھوڑ کر ہی تو ہمارا گھر تھا۔ اب مجھے بہت غصہ آیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس رانا کے بچے کو قتل کر دوں، کچا چبا جاؤں۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے، یہ تو مجھے شوٹنگ دکھانے لایا تھا۔ مگر اس نے یہ کیا کیا؟ مجھے میرے شہر بلکہ میرے محلے میں لے آیا ہے اب میں سوچ رہی تھی کہ میرے ماں باپ کو جب پتہ چلے گا تو ان کی کیا حالت ہوگی! میری ماں شاید صدمہ سے مر ہی نہ جائے۔ میرے بھائی مجھے نہیں چھوڑیں گے وہ مجھے قتل کر دیں گے میری بہنیں جیتے جی مر جائیں گی۔ میں عجیب ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ گھر سے بھاگ کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ اب تک یہ بدنامی میرے گھر کو میرے خاندان کو تباہ و برباد کر چکی ہوگی۔ کہ اچانک رانا صاحب کی کرخت آواز میرے کانوں میں گونجی جن کی گفتگو پہلے بڑی ملائم اور لطیف تھی کہ ”چلو اٹھو! اترو گاڑی سے“ میں گھبرا کر گاڑی سے نیچے اتری پھر وہ ہمارے جاننے والوں کے ایک گھر میں مجھے لے گئے وہ ان کے جاننے والے بھی تھے میں گھر کے اندر گئی انہوں نے مجھے خواتین کے پاس بھیج دیا اور کہا کسی کو مت بتانا نارمل رہنا۔ میں ڈری ڈری سہمی سہمی وہاں کمرے میں ٹھہری رہی۔ مجھے وہاں کسی نے بھی کوئی احساس نہ ہونے دیا۔ رانا صاحب جن کے گھر میں ہم گئے تھے۔ ان صاحب کو لے کر نہ جانے کہاں چلے گئے اور کوئی ایک گھنٹہ بعد واپس آئے اور مجھ سے ملے انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے والدین اور بہنیں بھائیوں کو ابھی تک پتہ نہیں چلا تم مسز آصف کے ساتھ اپنے گھر جاؤ۔ یہ خاتون بتا دیں گی کہ یہ تم کو بازار لے گئیں تھیں وہاں دیر ہوگئی میں ڈرتے ڈرتے گھر گئی جیسے ہی میں گھر میں پہنچی، میری ماں میرے گلے لگ کر خوب روئی والد صاحب بھی اندر ہی اندر شدید کرب میں مبتلا تھے۔ سب بہنیں بھائیوں نے مجھے محسوس نہ ہونے دیا مسز آصف نے میرے والدین سے کہا کہ میں اسے ایک شادی میں لے گئی تھی اور مجھے افسوس ہے کہ دیر ہو گئی۔

اس رات میں بہت روئی۔ اس فرشتہ صفت انسان رانا طارق مسعود کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ اور میں محسوس کر رہی تھی کہ جیسے وہ شخص مجھے بھیڑیوں کے چنگل سے نکال کر کس حکمت سے گھر پہنچا گیا ہے اس نے نہ

صرف مجھ پر بلکہ میرے پورے خاندان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے اور پھر اس کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ میرے گھر آنے کے اگلے روز ہی میرے بھائی نے وی سی آر، ٹیلی ویژن اور ٹیپ ریکارڈر کو توڑ ڈالا اور پھر گھر والوں نے ایک ماہ بعد ہی میری شادی کر دی۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں وہ انتہائی نیک اور رحمدل انسان ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میرے تین بچے ہیں۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں نہایت پرسکون گھر اور خوش گوار ماحول میں رہ رہی ہوں آج بھی جب مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے تو بے اختیار ''رانا طارق مسعود'' جیسے عظیم انسان کے لئے میرے دل سے دعا نکلتی ہے آج اگر میں خوش وخرم زندگی بسر کر رہی ہوں تو اس نیک دل اور شریف النفس انسان کی وجہ سے ورنہ شاید آج میں غلط ہاتھوں میں پہنچ کر نہ جانے برائی کی کس دلدل میں کھوگئی ہوتی یا پھر ''اس بازار'' میں پہنچ کر اپنے خاندان کی غیرت کا جنازہ بن جاتی۔

میری شادی کے قریباً ایک سال بعد میری ماں نے بتایا کہ رانا طارق مسعود تمہیں آصف صاحب کے گھر پہنچا کر آصف صاحب کے ہمراہ ہم سے ملنے آئے تھے اور انہوں نے نہایت پیار سے ہمیں بتایا کہ آپ کی بیٹی الحمدللہ! خیریت سے ہے اور اسی طرح ہماری حفاظت میں ہے جس طرح ہماری سگی بہن ہو۔ مگر تمہارے بھائی نے جب کہا کہ مجھے بتائیں وہ کہاں ہے؟ میں اس بے غیرت کو قتل کر دوں گا تو انہوں نے نہایت حکمت وتدبر سے اور نرمی سے تمہارے بھائی کو سمجھایا کہ ''ابھی تک اس کے جانے کی بات صرف تم لوگوں کو پتہ ہے اور آپ کی عزت اور ناموس محفوظ ہے، جب تم اسے قتل کر دو گے تو یہ بات ہر شخص کی زبان پر ہوگی اور پھر تمہاری دوسری بہنیں جب تھانے کچہری میں لوگوں کے پاس جائیں گی تو کیا ان کی عزت محفوظ رہے گی؟ گویا دراصل تمہارا یہ قدم خاندان کی بربادی اور عزت وناموس کا جنازہ نکالے گا اور پھر یہ وڈیو اور ٹیلی ویژن تم نے ہی تو لا کر دیئے تھے جس پر فلمیں دیکھ کر اس پر فلم ایکٹرس بننے کا جنون طاری ہوا۔ سب سے پہلے آپ کو اپنے گھر کی اصلاح اور اپنی اصلاح کی ضرورت ہے یہ میرا آپ کو مخلصانہ مشورہ ہے اگر آپ مجھے محسن سمجھتے ہیں تو اس لڑکی کو بالکل شبہ بھی نہ ہونے دیجئے گا۔ آپ کو اس کے عمل کا پتہ چل گیا ہے نیز جتنی جلدی ممکن ہو اس کی شادی کر دیں۔'' آج جب میں نے راحیلہ آغا کا انٹرویو پڑھا کہ اس نے اداکاری کیوں چھوڑی؟ تو میں سوچ رہی تھی کہ جس عظیم انسان کی فلم میں اس نے کام کیا، واقعی اس کے بعد اسے اداکاری چھوڑ ہی دینی چاہئے تھی۔

آج میرے گھر میں نہ ٹی وی ہے اور نہ ہی وی سی آر وغیرہ اپنی دینی بہنوں سے میری درخواست ہے کہ وہ اس بات پر ضرور دھیان رکھیں کہ ان کے بچے ٹی وی یا وی سی آر پر کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا ان میں کوئی منفی کردار بننے کا جذبہ تو پیدا نہیں ہو رہا؟ خاص طور پر اپنی بیٹیوں پر پوری توجہ دیں ان میں دین اسلام کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کریں ان میں حلال وحرام کی تمیز پیدا کرنے کی کوشش کریں اور ان کے قلب وذہن میں پردے کا شعور پیدا کریں کیونکہ پردہ عورت کو بہت سی برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔''

(ماخوذ از ماہنامہ ''خواتین ڈائجسٹ'' شمارہ جولائی 1996ء صفحہ 48 تا 50)

نجاح سلام کی توبہ

(نجاح سلام 1934ء میں بیروت کے ایک دینی گھر میں پیدا ہوئی۔ان کے دادا نے عبدالرحمن سلام لبنان کے مفتی تھے لیکن ان کے والد محی الدین چونکہ موسیقی سے شغف رکھتے تھے۔ اور لبنان کے مشہور موسیقاروں میں شمار ہوتے تھے لہذا انہوں نے اپنی بیٹی میں اس رجحان کو پروان چڑھایا اور اپنے ساتھ ریڈیو لبنان جس میں وہ موسیقی کے ڈائریکٹر تھے۔ پر متعارف کرایا۔ 1947ء میں مصر کا مشہور گائیک و موسیقار عبدالوہاب جب لبنان آیا تو اس نے نجاح سلام کی آواز کو پسند کیا اور انہیں قاہرہ آنے کی دعوت دی۔ جہاں اس صدی کی پانچویں دہائی میں وہ نہ صرف مشہور گانے والیوں میں شامل ہوئی بلکہ اس نے متعدد فلموں میں بھی کام کیا۔انہیں لبنان کا اعلیٰ ترین اعزاز لبنانی صدر الیاس اہروی ان کی فنی خدمات کے باعث دے چکے ہیں)

48 سال تک دنیائے فن سے وابستگی اور اڑھائی ہزار نغمات الاپنے والی لبنانی فنکارہ نے حال ہی میں پردہ کرنے کا فیصلہ کر کے اپنے مداحوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے نجاح بنت سلام نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب صرف دینی قصیدے یا ملی نغمے گانے کے علاوہ جذبات کو انگیز کرنے والے گیت نہیں گائیں گی۔

ذیل میں ان سے لیا گیا انٹرویو نذر قارئین کیا جاتا ہے:

سوال: کیا یہ فیصلہ کہ آپ پردہ کریں گی، جذباتی فیصلہ ہے یا سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے؟

جواب: ہر فیصلے کا ایک خاص وقت اور خاص لمحات ہوتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بہت عرصے سے خود میں حجاب اختیار کرنے کا داعیہ پاتی تھی۔اگر آپ میری ذاتی زندگی جاننا چاہیں تو دراصل میں اندر سے ایک پردہ دار خاتون رہی ہوں۔ دنیا انسان کو بچپن ہی سے اچک لیتی ہے اور اس کی چکا چوند کا شکار رہتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کے کسی خاص مرحلے میں وہ چونکتا ہے اور اپنی اصلاح کر لیتا ہے یہی لمحات اس کی زندگی کے حقیقی مفید لمحات ہوتے ہیں۔ میں نے 13 سال کی عمر سے گانا شروع کیا تھا لیکن ہمیشہ سے نماز و روزہ کی پابند رہی ہوں بلکہ آٹھ سال کی عمر سے لے کر آج تک بفضل تعالیٰ میں نماز اور روزے اور دیگر فرائض پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔ ہمیشہ سے دینی کتابوں کا مطالعہ اور فاضل علماء کے مواعظ سننا بھی میرا شوق رہا ہے جن کی بدولت میں شعوری طور پر اس فیصلے تک پہنچ پائی ہوں کہ مجھے اللہ کی بندگی اس طرح بجالانی چاہئے جیسے کہ وہ چاہتا ہے نہ کہ جیسا ہم چاہتے ہیں۔

میری شوبز زندگی میں بھی میرا تعلق اپنے رب سے کبھی منقطع نہیں رہا ہے۔ میرا فن اور میری فنی زندگی ہمیشہ خرافات سے دور رہی ہے۔کبھی کوئی اخلاقی طوفان ان میں نہیں اٹھا۔ میں ہمیشہ گندگی سے دور رہنے کے لئے سرگرداں رہی ہوں۔

سوال: کیا آپ کی پچھلی زندگی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غلطی پر مبنی تھی؟

جواب: کلی طور پر ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں البتہ ہمیشہ میں کسی کمی کو محسوس کرتی رہی ہوں۔ میرے خیال میں پردہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ لوگوں سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں یا اپنے اور ان کے درمیان دیوار حائل کر دیتے ہیں۔ میں ہمیشہ اپنی نمازوں میں اللہ سے دعائیں کرتی ہوں کہ وہ میرے ایمان کو مضبوط فرما دے اور میرا خاتمہ خیر پر فرمائے۔ اس نے اپنے فضل سے مجھے پہلے ہی مال اور اولاد کی نعمت سے نوازا ہوا ہے اور میرت بھی بے پایاں دی ہے۔ میں صدق دل سے بتانا چاہتی ہوں کہ احساس ندامت کے باعث مسلسل گریہ و زاری کرتی تھی۔ مسلسل آنسو بہتے تھے اور میں اپنی ذات کا محاسبہ کرتی تھی۔ باوجود اس کے کہ کبھی بھی میری زندگی میں برائی در نہیں آئی بلکہ میں نے تمام عمر وقار اور حشمت کے ساتھ بسر کی ہے۔ کبھی لباس زیب تن نہیں کئے جن سے جسم کی نمائش ہوتی ہو۔

سوال: کیا کسی اور نے بھی اس فیصلے پر پہنچنے میں آپ کی مدد کی ہے؟

جواب: میرے نفس نے میری سب سے زیادہ مدد کی ہے، میرا یہ فیصلہ دل کے نہاں خانے سے ابھرا ہے۔ دینی کتب کے مطالعہ نے مجھے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا سکھایا اور علمائے دین اور اہل علم نے میرے طرز حیات پر بہت مثبت اثرات ڈالے ہیں۔ بالاختصار میں ذاتی طور پر خود یہ صلاحیت پہلے سے رکھتی تھی کہ اچھائی کو اپنا لوں اور اپنے رب کریم کے بتائے ہوئے رستے پر چل سکوں۔

سوال: آپ کب سے دینی درس وغیرہ سن رہی ہیں؟

جواب: میں نے ساری زندگی اسلام کی کتب کا مطالعہ کیا ہے اور جید علماء کے درس سنے ہیں۔ خاص طور پر تفسیر و حدیث کی کتب اور فقہ میں سید سابق کی کتاب ''فقہ السنہ'' کا تسلسل سے مطالعہ کیا ہے جب بھی نماز پڑھتی تو ہمیشہ پردہ کرنے کی طرف رجحان بڑھتا رہتا تھا۔ لیکن ہمیشہ شیطان غالب آتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر اپنے فضل سے مجھے شیطان پر غلبہ عطا فرما دیا۔

سوال: کیا آپ کے حجاب نہ اوڑھنے میں شہرت بھی حائل رہی ہے؟

جواب: نہیں، شہرت تو کبھی بھی میرے اور پردے کے درمیان حائل نہیں رہی۔ اطلاعاً یہ بھی بتا دوں کہ میری بیٹیاں ہمیشہ سے ہی پردہ کرتی ہیں اور جب اللہ نے چاہا تو مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرما دی۔ جس پر میں اس کی شکر گزار ہوں۔

علاوہ ازیں میرا یہ خیال ہے کہ جو افراد میری آواز کے قدردان ہیں وہ میری صلاحیت اور فن کے قدردان ہیں نہ کہ میرے خارجی مظہر اور شکل وصورت کے، میری ذاتی رائے یہ ہے کہ میرا پردہ کرنا ان کی نظر میں میرے احترام کو مزید بڑھانے کا باعث ہوگا۔ میرے لئے شہرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ اللہ کی محبت کسی بھی چیز سے زیادہ اہمیت وطاقت رکھتی ہے۔

سوال: جب آپ نے حج کی ادائیگی کا فیصلہ کیا تو پھر پردہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا؟

جواب: میں 1967ء میں حج کے لئے جانا چاہتی تھی، لیکن بیماری کے باعث نہ جا سکی۔ پھر پچھلے سال جب میں حج کے لئے بالکل تیار تھی تو میرے سابقہ شوہر محمد سلمان وفات پا گئے اور میری ایک بیٹی بہت زیادہ بیمار ہو گئی۔ جس کی وجہ سے ایک بار پھر یہ فریضہ ادا نہ ہو سکا۔ اس سال میں نے اپنی بیٹیوں۔ سمر، دریم اور اپنے بعض رشتہ داروں کے ساتھ حج کی تکمیل کی۔ لیکن پردہ کا ارادہ حج سے پہلے کا تھا۔ ہاں البتہ جب میں طواف کعبہ اور صفا ومروہ کر رہی تھی اس کے بعد جب میں مدینہ منورہ آئی تو میرا ایمان مضبوط ہو چکا تھا، اس فیصلے میں میری مدد ایک ڈاکٹر صاحبہ جو دین سے گہرا مطالعہ رکھتی تھیں نے بھی کی ہے ان کے لیکچر نے تو بس مجھے آخری فیصلہ کرنے پر تیار کر دیا۔ جب انہوں نے کہا کہ مسلمان کی زندگی میں وقت کی بہت اہمیت ہے اور پرہیز گاری اختیار کرنی چاہئے اس سے پہلے کہ موت اس وقت کے خاتمے کا اعلان کر دے۔

حج کے بعد جب سمر مجھے مبارک باد دے رہی تھی تو میں نے اسے بتایا کہ مجھے پردہ کرنے کی مبارک باد بھی دو۔ جب اس نے مجھے مبارک باد دی تو میرے شعور کی گہرائیوں میں ربانی الہام ابھرا، جس نے مجھے مضبوط سے مضبوط تر کر دیا۔ میری بیٹی میرے اس فیصلے پر اتنی خوش ہوئی کہ شکر کے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میرے سر پر بہت بڑا بوجھ تھا جو بفضل تعالیٰ اتر گیا۔

سوال: تو کیا آپ فن کی دنیا کو خیر باد کہہ دیں گی؟

جواب: میرا دنیائے فن کو چھوڑنا فن کو چھوڑنے کے مترادف نہیں، میں صرف دینی قصائد اور ملی نغموں تک ہی خود کو محدود کر رہی ہوں اور ایسے فن کو خیر باد کہہ رہی ہوں جس میں صرف جذبات و سفلی خواہشات کو انگیز کرنے کا سامان کیا جاتا ہے

سوال: مستقبل میں آپ اس پر کس طرح عمل درآمد کرنے کا پروگرام رکھتی ہیں؟

جواب: میں کسی بھی ملی نغمے کو گانے سے پہلے، کسی بھی قصیدے کو پڑھنے سے پہلے اس کی شاعری وغیرہ کو خود منتخب کروں گی اور جو میرے معیار پر پورا اترتا ہوگا۔ صرف اسے ہی گاؤں گی۔ میں صرف ان نغموں کو الاپوں گی جو پردہ "نجاح سلام" کے لئے بہتر ہوں، اس کے شایان شان ہوں۔ میں ہوٹلوں وغیرہ میں گانے سے اجتناب کروں گی اور صرف فن کے معروف مقامات مثلاً قاہرہ کا اوپیرا وغیرہ میں گانے پر اکتفا کروں گی اور وہ بھی قصائد دینیہ وملی ترانے۔

سوال: آپ ان فنکاراؤں کو کچھ کہنا چاہیں گی جو پردہ نہیں کرتیں؟

جواب: میں ان سب کو پردہ کرنے کی دعوت دیتی ہوں کہ وہ شعوری قناعت کے ساتھ خود فیصلہ کریں اور ان میں سے جو دینی زندگی کی متلاشی ہوں انہیں میں اپنے گھر میں ہفتہ وار درس قرآن میں آنے کی دعوت دیتی ہوں۔ (یہ انٹرویو سعودی عرب کے روزنامہ "عکاظ" میں شائع ہوا ہے)

(ماخوذ از ہفت روزہ "فرائیڈے اسپیشل" کراچی شمارہ 4 ستمبر 1998ء) (طارق نور الٰہی، تجوک)

دین کی طرف لوٹنے والی خوش قسمت خواتین

امینہ اسلمی، امریکہ

امینہ اسلمی وہ امریکی خاتون ہیں۔ جنہوں نے مئی 1977ء میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس سے پہلے وہ متشدد عیسائی تھیں۔ وہ امریکی ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بچوں اور سماجی بہبود سے متعلق پروگرام پیش کرتی تھیں۔ اور ٹیلی ویژن کے بعض پروگراموں پر انہوں نے انعامات بھی حاصل کئے۔ اس وقت امینہ اسلمی بچوں کے لئے ایسے رسالے نکالنے میں مشغول ہیں جن میں اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا جا سکے۔

برطانیہ کے ایک سفر کے موقع پر ان سے انٹرویو لیا گیا:

سوال: آپ کے قبول اسلام کا بنیادی سبب کیا ہے؟

جواب: مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے دوران میں، میں عین اس وقت اسلام سے واقف ہوئی جب کمپیوٹر کی تعلیم کے لئے امریکہ کے ایک سینٹر میں میں نے اپنا نام درج کروایا۔ میرے ہی سیکشن میں بعض عرب بھی تھے۔ میں ان کو صرف اس لئے ناپسند کرتی تھی کہ وہ مسلمان ہیں، اسی وجہ سے میں نے اپنے سیکشن تبدیل کروا کر ایسے سیکشن میں داخلہ کروانا چاہا جس میں کوئی عرب مسلمان نہ ہو، میں نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مجھے عجلت سے کام لینے سے روکا اور برداشت کرنے کی تلقین کی۔ اب میں نے یہ خیال کیا کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے مجھ کو ان کی ہدایت کے لئے منتخب کیا ہو۔ میں نے ان عربوں سے کہا کہ تم سب جہنم میں جاؤ گے۔ عیسٰی مسیح علیہ السلام کی وفات تمہاری ہی وجہ سے ہوئی۔ میں نے قرآن کو خریدا کہ اس کو انہیں کے خلاف استعمال کروں اور دو سال تک اس کا مطالعہ کرتی رہی تاکہ کچھ غلطیاں ملیں۔

اسی دوران میں ایک مرتبہ عربوں کی ایک جماعت نے میرے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جب دروازہ کھولا تو انہیں میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ اسلام قبول کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا: ہرگز نہیں میں تو پختہ طریقہ سے مسیحیت پر کاربند ہوں میں اسی امید میں اسلام کے خلاف گفتگو کرتی رہی کہ ان کو ہدایت ہو اور ان تمام امور کا تذکرہ میں نے ان سے کیا جن کو میں سلبی تصور کرتی تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے جس کا نام عبدالعزیز شیخ تھا۔ اسلام کے محاسن بڑی تفصیل سے بیان کئے اور میری تلخ گفتگو کو وہ لوگ برداشت کرتے رہے اور خوش اسلوبی کے ساتھ اسلام کی دعوت دیتے رہے انہوں نے انتہائی بردباری اور اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ دوسری طرف قرآن کے مطالعہ کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے شراب پینا اور خنزیر کھانا چھوڑ دیا۔ لیکن ابھی اسلام کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرسکی تھی۔

سوال: آپ کے خیال میں وہ کون سے حقیقی اسباب ہیں جو مغربی عورت کو اسلام میں دلچسپی لینے پر مجبور کر

دیتے ہیں باوجود یہ کہ اسلام پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھتا ہے؟

جواب: مغربی عورت کی زندگی بڑی محنت ومشقت کی زندگی ہے تمام لوگ اس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اچھی عورت بنے، اچھی ماں، اچھی آفیسر، اچھی ملازم بنے اور عورت کی آزادی کے لئے ہمارے یہاں کافی اسکول وکالجز ہیں اور ہر کالج مختلف امور پر توجہ دیتا ہے۔ عورت ان تمام دعوؤں اور مطالبوں کے درمیان حیران ہے۔ اس کی کوئی شخصیت نہیں اور نہ اس کی کوئی اپنی مرضی ہے۔ ایسی صورت میں مغربی عورت قرآن پڑھتی ہے اور اسلام میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں اس کو علم ہوتا ہے تو اس پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام نے عورت کو مکمل حقوق عطا کئے ہیں اور یہ حقوق سینکڑوں سال پہلے عورت کو دیئے گئے ہیں جب کہ عورت کی آزادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ پھر قرآن ہمیں عورت کے حقیقی معنی سے آشنا کرتا ہے۔

اسلام ان سوالوں کا جواب دیتا ہے کہ مثلاً عورت کی اپنے معاشرہ میں کیا ذمہ داری ہے؟ خاص طور پر اپنے والدین کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں اس کے کیا اختیارات ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے انتہائی محبوب شوہر سے اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لے۔

سوال: لیکن بعض مغرب پرست عرب یہ بات کہتے ہیں کہ مغربی عورت آزاد ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

جواب: مغربی عورت آزاد نہیں ہے بلکہ اس پر بہت سی پابندیاں ہیں۔ جو آزادی نسواں کے نام سے اس پر لگائی جاتی ہیں اور یہ مطالبے اس کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ وہ ایسے نظام میں رہے۔ جس میں مرد کو حاکمیت حاصل ہو جاتی ہے تاکہ وہ کامیاب ہو جائے۔ یہ ایسا مطالبہ ہے کہ جو عورت کو عورت سے زیادہ مرد کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ تو یہ آزادی کہاں ہوئی؟ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچوں کی پرورش کے لئے اس کو موقع نہیں ملتا جس کی وجہ سے بچے آوارہ گھومتے گروہوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی چیز ماں کو بے چین کر دیتی ہے اور اس کے اندر احساس گناہ پیدا کرتی ہے اگر کوئی عورت اپنے آپ کو اپنے بچوں کی تربیت سے فارغ کر لیتی ہے تو اس کا معاشرہ اس کو کمتر اور میڈیا مثالی عورت کے لئے پیش کرتا ہے۔ وہ تصورات عام عورت کے تصور کے منافی ہیں۔ یہی چیز اس کے اندر بے چینی پیدا کر دیتی ہے، اس لئے ہر عورت چاہتی ہے کہ وہ ویسے ہی ہو جائے جیسی تصویر مثالی عورت کی میڈیا میں پیش کی جاتی ہے لیکن ہر عورت اس کی استطاعت نہیں رکھتی۔

سوال: عرب ملکوں میں مغربی طرز پر عورت کی آزادی کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟

جواب: میں مغربی عرب ملکوں کا دورہ کروں گی مثلاً کویت وغیرہ اور میرے دورے کے اسباب میں سے ایک سبب عرب اور مسلمان عورتوں کو ان مدارس کی تقلید سے بچانا ہے جو مغربی عورت کی آزادی کے نام سے قائم ہیں۔ میں اسلام قبول کرنے سے پہلے آزادی کی داعی تھی اور میں اس سلسلے کی دعوت کا مفہوم اچھی طرح سمجھتی

ہوں۔ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ مسلمان عورتیں اس بات سے بخوبی واقف ہو جائیں کہ مغربی عورت آزاد نہیں ہے بلکہ مغربی نظام میں مجبور ہے اور حقیقی آزادی جس کو وہ تلاش کر رہی ہے۔ وہ اس کو صرف اور صرف اسلام عطا کرتا ہے۔ عرب ممالک میں جو لوگ عورت کی آزادی کا پرچار کر رہے ہیں وہ مغرب میں عورت کی آزادی کے مفہوم کو نہیں جانتے اور حقیقت میں وہ اسلام سے بھی واقف نہیں ہیں۔

سوال: آپ نے ایک مدت تک امریکہ کے ٹیلی ویژن میں کام کیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ امریکی میڈیا مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟

جواب: امریکی میڈیا موضوعی انداز رکھتا ہے لیکن مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو اس انداز میں پیش نہیں کرتے جس انداز سے میڈیا چاہتا ہے۔ میڈیا کے ساتھ وہ معاملہ کرنا نہیں جانتے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کے اپنے بیانات اور تشریحات اختلاف رکھتے ہیں اور اس کا اظہار ٹیلی ویژن پر بھی ہوتا ہے، اس کی وجہ سے امریکی عوام پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (یعنی جو لوگ اسلام کے بارے میں کچھ واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اسلام سے قریب ہوتے ہیں۔ وہ پس و پیش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یوں اسلام قبول کرنے میں یہ چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں) بسا اوقات امریکی عوام اسلام کے بارے میں ایسے لوگوں سے معلومات حاصل کرتے ہیں جن کا ذکر اسلام کے بارے میں ایسے لوگوں سے معلومات حاصل کرتے ہیں جن کا ذکر اسلام کے بارے میں صاف نہیں ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی بات اُن کے ذہن کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ اس لئے مسئلہ امریکی میڈیا کا نہیں خود مسلمانوں کا ہے۔

سوال: مغربی ملکوں میں اسلام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: مسلمانوں کے انتشار کے باوجود اسلام جلد ہی یورپ میں ترقی کرے گا۔ اب یورپ میں ایسے مسلمان پائے جانے لگے ہیں جو اپنے ملکوں ملکوں کی عادات واطوار کو چھوڑ کر حقیقی اسلام کو پیش کرنے لگے ہیں۔ بہت سے مسلمان تعلیم یافتہ لوگوں سے خطاب کرنے کا طریقہ جان گئے ہیں اسی وجہ سے اسلام مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے لیکن یہاں لوگوں کے دلوں میں ایک غلط بات بیٹھ گئی ہے کہ اسلام کو غریب لوگ ہی قبول کرتے ہیں یا مختلف مشکلات میں گرفتار اشخاص ہی اسلام قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اسلام قبول کرنے والے اکثر وہ لوگ ہیں جو یونیورسٹیوں سے فارغ شدہ ہیں یا سیاسی، صحافتی، قانونی میدانوں میں قدم رکھنے والے حضرات اور یہی چیز مستقبل میں اسلام کے منظر کو اور بہتری عطا کرے گی۔

سوال: یورپ میں غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کا کونسا بہتر طریقہ ہے؟

جواب: سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ ہم، لوگوں کے لئے اسلامی تعلیمات کا آئینہ ثابت ہوں۔ سوالوں کا جواب دینے کے لئے کافی علم ہونا چاہئے کیوں کہ مسلمانوں کی اکثریت دین اسلام سے ناواقف ہے اور ان کے پاس کوئی ایسی شخصیت ہے نہ کوئی ایسا موقف جو اسلام کے سلسلہ میں مددگار ثابت ہو۔

یہی چیز میرے دل کو تڑپا رہی ہے کہ ہم ان کو اسلام سے واقف کرائیں۔

سوال: اس کانفرنس کے بارے میں جو ابھی حال ہی میں بیجنگ میں منعقد ہوئی تھی، آپ کا موقف کیا تھا؟ اور مزید یہ کہ اس کانفرنس کے مقصد سے بھی آگاہ کریں؟

جواب: میں نے کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا اور اس کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا۔ بائیکاٹ اس وجہ سے نہیں کیا کہ میرے پاس دعوت نامہ نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے کئی دعوت نامے مجھے موصول ہوئے تھے۔ لیکن میں نے کانفرنس میں شریک ہونے سے اس لئے انکار کیا تھا کہ کانفرنس نے اسلامی نقطہ نظر کے بارے میں سننے سے پہلے ہی انکار کیا تھا۔ میں اس کانفرنس کے ذمہ داروں میں سے اکثر سے ملاقات کر چکی تھی اور اکثر سے میں واقف بھی تھی۔ نیز میں ان میں سے اکثر کو منحرف اور اخلاق مخالف جانتی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر میں کانفرنس میں شریک ہوئی تو گویا میں نے کانفرنس کی قانونی حیثیت تسلیم کر لی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض مسلمان عورتوں نے کانفرنس میں شرکت کرنے میں فخر محسوس کیا۔ کیونکہ وہ کانفرنس کا مطلب نہ سمجھ سکیں، عورت کی آزادی کے غلط دعوؤں اور اسلام سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ اس کانفرنس سے متاثر ہو گئیں۔

سوال: آپ عورت کی آزادی کی داعیوں میں رہی ہیں اور اس زمانہ میں آپ کی متعدد سرگرمیاں بھی جاری رہی ہیں اپنے تجربات کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات فراہم کیجئے۔

جواب: میں اپنی زندگی کے اس مرحلے میں یہ اعتقاد رکھتی تھی کہ مرد اور عورت کے درمیان مقابلہ ہے اور میرا کام یہ ہے کہ میں مردوں کی طرح ہو جاؤں حتیٰ کہ میں ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھ سکوں۔ جو کام مرد کرتا ہے میں یہ سمجھتی تھی کہ میں بھی اس کے کرنے پر قادر ہوں لیکن جب وہ مجھ سے کسی چیز میں بھی فوقیت لے جاتا تو میں یہ سمجھ لیتی کہ وہ میرا دشمن ہے یہ جاننے کے بعد کہ عورت ہونا فخر کا باعث ہے اور ماں ہونا بھی فخر کا باعث ہے میں نے اسلام قبول کر لیا۔ میں پہلے اپنے آپ کو سب کے سامنے محصور پاتی تھی۔ اب ایک خاندان کا ایک باعزت اور محفوظ فرد کی حیثیت رکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مرد و عورت میں سے ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے ان کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے اور ان دونوں کی زندگی بعض کی بعض کے ساتھ رحمت ہے جس کے بارے میں قرآن بھی بیان کرتا ہے۔

مشرقی معاشرہ میں اگر عورت حقوق سے محروم ہوتی ہے تو بعض سماجی یا انفرادی کوتاہیوں کی وجہ سے نہ کہ اسلام کی تعلیمات کی وجہ سے جو بہت واضح ہیں۔

(ماخوذ از ماہنامہ ''خواتین میگزین'' لاہور، شمارہ نومبر 1996، صفحہ 11-12-49 تحریر: ہشام عوضی ترجمہ مسعود حسن حسنی)

محترمہ مریم جمیلہ (امریکہ)

محترمہ مریم جمیلہ نیویارک (امریکہ) کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ قبول اسلام سے قبل ہی وہ عام امریکی و یہودی خواتین کی ڈگر سے ہٹ کر پاکیزہ طور واطوار اور باوقار زندگی کی حامل تھیں۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ پاکستان آگئیں اور انہوں نے معمولی قسم کی قابل قدر علمی و دینی خدمات انجام دی ہیں۔ اب تک ان کی ایک درجن سے زیادہ انگریزی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ جو اپنی وقعت، سند اور مضامین وخیالات کی گہرائی ومعنویت اور وسیع اثرات کی وجہ سے دنیا بھر کے علمی حلقہ سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں ان کی تصانیف میں:

Islam and Modernism

Islam In Theory and Practice

Western civilisation Condemns itself

(دو جلدیں) وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل کا مضمون محترمہ موصوفہ کی متعدد خودنوشت تحریروں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

قرآن سے میرا تعارف عجیب وغریب طریقے سے ہوا۔ میں بہت چھوٹی تھی جب میرے کانوں میں موسیقی سے غیر معمولی رغبت ہوگئی۔ مختلف گیتوں اور کلاسیکل اور پیرا کے ریکارڈ پہروں میری سماعت کو لوریاں دیتے رہتے۔ چنانچہ میری عمر تقریباً گیارہ برس کی تھی جب ایک روز محض اتفاق سے میں نے ریڈیو پر مغربی موسیقی سن لی جس نے دل ودماغ کو مسرت کے ایک عجیب احساس سے بھر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ میں فرصت کے لمحوں میں بڑے اشتیاق سے عربی موسیقی سنتی۔

حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ پسند اور ذوق کا دھارا بدل گیا۔ میں اپنے والد کے ساتھ نیویارک کے شامی سفارت خانے میں گئی اور عربی موسیقی کے بہت سے ریکارڈ لے آئی۔ انہیں میں سورہ مریم کی بے حد دل نواز اور فردوس گوش تلاوت بھی تھی۔ جو ام کلثوم کی نہایت سریلی آواز میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ (یاد رہے کہ ام کلثوم بنیادی طور پر قاریہ تھی اس بدبخت نے گلوکارہ کا ذلیل پیشہ بعد میں اختیار کیا) اگرچہ میں ان گیتوں کی فہم سے بے خبر تھی مگر عربی زبان کی آوازوں اور سروں سے بے پناہ محبت ہوگئی تھی۔ سورۃ مریم کی تلاوت تو مجھے مسحور کر دیتی تھی۔

عربی زبان سے اس گہرے لگاؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے عربوں کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ خصوصاً عربوں اور یہودیوں کے تعلق پر ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں حاصل کرتی اور دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ اگرچہ عقائد کے اعتبار سے یہودی اور عرب ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں مگر یہودی عبادت خانے میں فلسطینی عربوں کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے۔ ساتھ ہی عیسائیوں کے رویے نے بھی مجھے بہت مایوس کیا۔ میں نے عیسائیت کو

پیچیدہ اور لا ینحل مسائل کے گورکھ دھندے کے سوا کچھ نہ پایا اور چرچ نے مختلف اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی و تہذیبی قباحتوں کے ساتھ جس لامتناہی مصالحت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس نے خصوصاً مجھے بہت پریشان کیا۔ میں نے یہودی اور عیسوی عبادت خانوں کو بہت قریب سے دیکھا اور دونوں کو منافقت اور بدی کی دلدل میں ڈوبے ہوئے پایا۔

میں نسلاً یہودی تھی، اس لئے یہودیت کا مطالعہ کرتے ہوئے جب میں نے محسوس کیا کہ اسلام تاریخی اعتبار سے اس کے بہت قریب ہے تو فطری طور پر اسلام اور عربوں کے بارے میں جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا اور عربی زبان کی محبت نے اس اشتیاق کو دوچند کر دیا۔

1953ء کے موسم گرما میں، میں سخت بیمار پڑ گئی، میں صاحب فراش تھی کہ جب ایک شام میری والدہ نے پبلک لائبریری جاتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کوئی کتاب تو نہیں منگوانا چاہتی۔ میں نے قرآن کے ایک نسخے کی فرمائش کی۔ وہ آتے ہوئے جارج سیل کا ترجمہ لے آئیں اور یوں قرآن سے میرے رابطے کی ابتداء ہوئی۔ جارج سیل اٹھارویں صدی کا عیسائی عالم اور مبلغ تھا مگر سخت متعصب اور تنگ نظر۔ اس کے ترجمے کی زبان مغلق ہے اور حاشیوں پر بلا ضرورت اور سیاق وسباق سے ہٹ کر ابیضاوی اور زمخشری کے حوالے دیئے گئے ہیں تا کہ عیسوی نقطہ نظر سے انہیں غلط ثابت کیا جا سکے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تو میں اسے بالکل نہ سمجھ سکی۔ قرآن مجھے بائبل کی بے ہنگم کہانیوں کے غیر مربوط ملغوبے سے کچھ ہی بہتر نظر آیا مگر میں نے اس کا مطالعہ ترک نہ کیا اور اسے تمام دن اور رات تقریباً مسلسل پڑھتی رہی حتیٰ کہ تھک کر ادھ موا ہو گئی۔

اسی عرصے میں قسمت نے یاوری کی اور کتابوں کی ایک دکان پر میں نے محمد مارما ڈیوک پکتھال کا ترجمہ قرآن دیکھا۔ جونہی میں نے اس کتاب کو کھولا، ایک زبردست انکشاف نے میرا استقبال کیا۔ زبان کا حسن اور بیان کی فصاحت مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ دیباچے کے پہلے ہی پیرے میں مترجم نے بہت خوبصورت طریقے سے وضاحت کی ہے کہ یہ قرآنی مفاہیم کو......

جیسا کہ عام مسلمان اسے سمجھتے ہیں انگریزی زبان میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے اور جو شخص قرآن پر یقین نہیں رکھتا اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ دنیا کا کوئی ترجمہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا وغیرہ۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ جارج سیل کا ترجمہ ناگوار کیوں تھا؟ اللہ تعالیٰ پکتھال مرحوم کو بے پایاں رحمتوں سے نوازے۔ انہوں نے برطانیہ اور امریکہ میں قرآن کو سمجھنا آسان بنا دیا ہے اور میرے سامنے بھی روشنیوں کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ میں نے توریت کی تنگ اور جامد قوم پرستی کے مقابلے میں قرآن کی ہمہ گیر بین الاقوامیت کا مشاہدہ کیا۔ ازلی اور حتمی قدروں کے لئے میری بے قراری کو سکون مل گیا۔ میں نے اسلام میں ہر وہ اچھی چیز، سچی اور حسین چیز پالی جو زندگی (اور موت) کو معنی اور مقصد عطا کرتی ہے، جبکہ دیگر مذاہب میں حق مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے اس کے گرد کئی طرح کے حصار کھینچ دیئے گئے ہیں۔ قرآن اور

اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعے سے مجھے یقین ہو گیا کہ عربوں نے اسلام کو سربلندی عطا نہیں کی بلکہ یہ اسلام ہے جس کے طفیل عرب دنیا بھر میں کامیاب و بامراد ہوئے۔

میری علالت کا سلسلہ برسوں محیط رہا۔ حتیٰ کہ 1959ء میں مکمل صحت یاب ہو کر میں نے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ پبلک لائبریری نیویارک کے شعبہ شرقیات (اورنٹیل ڈویژن) میں گزارنا شروع کیا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے انگریزی ترجمے کی چار ضخیم کتابوں کا تعارف حاصل ہوا۔ یہ کلکتہ کے مولانا فضل الرحمٰن کی کاوش کا نتیجہ تھیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ حدیث کے متعلقہ حصوں سے شناسائی کے بغیر قرآن پاک کا مناسب اور مفصل ادراک ممکن نہیں ظاہر ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم (جن پر براہ راست وحی نازل ہوتی تھی) کی رہنمائی اور تشریح کے بغیر کلام الٰہی کو کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ حدیث کو نہیں مانتے وہ دراصل قرآن کے بھی منکر ہیں۔

مشکوٰۃ کے تفصیلی مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت میں ذرا برابر شبہ نہ رہا کہ قرآن وحی الٰہی ہے۔ اس بات نے اس امر کو تقویت دی کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ قرآن زندگی کے بارے میں تمام بنیادی سوالات کا ایسا مسکت، ٹھوس اور اطمینان بخش جواب دیتا ہے۔ جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

میں بچپن میں موت کے تصور سے سخت خوف زدہ رہتی تھی۔ یوں بھی ہوتا کہ آدھی رات کو موت کے ڈر سے زور زور سے چلانے لگتی۔ اکثر والدین سے دریافت کرتی کہ مجھے موت کیوں آئے گی اور مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ تو وہ جواب دیتے کہ موت بہر حال اٹل حقیقت ہے مگر میڈیکل سائنس جس انداز میں ترقی کر رہی ہے عین ممکن ہے اس سے تمہاری عمر سو سال سے بھی زیادہ ہو جائے تاہم وہ زندگی بعد موت کے تصور کو سختی سے مسترد کر دیتے اور قیامت یا جنت و دوزخ کو محض واہمہ قرار دیتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے والدین اصلاح یافتہ (یعنی ترامیم پسند) یہودی تھے جو بڑی حد تک مسیحی معاشرے میں جذب ہو چکے تھے۔ امریکہ میں رہنے والے یہودیوں کی غالب اکثریت اصلاً روسی ہے۔ مگر ہمارا گھرانہ جرمن تھا۔ ہم لوگ روسیوں کی طرح جبر و تشدد کے تحت نہیں نکالے گئے تھے۔ بلکہ سو سوا سو سال پہلے اقتصادی ترقی کی تلاش میں اپنی مرضی سے امریکہ آئے تھے چنانچہ میرے والدین اور اقرباء اپنے عبادت خانوں کو سینا گاگ کے بجائے ٹیمپل کہا کرتے تھے۔ جہاں عبادت بھی پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی طرز پر ہوا کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ سوائے شادی بیاہ کے بندھنوں کے ہمارے گھرانے میں راسخ العقیدہ یہودیوں والی کوئی بھی فکری یا عملی بات نہ تھی اور امریکی معاشرت کی عام دہریت اس پر ہر لحاظ سے اثر انداز ہو چکی تھی۔

دوسرا سبب اس خالص مادی نقطہ نظر کا یہ تھا کہ توریت، تلمود اور انجیل میں عقیدۂ آخرت بہت ہی مبہم ہے اور تمام پیغمبروں، ولیوں اور نیک لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا اسی دنیا میں ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور

پر حضرت ایوب علیہ السلام پر آزمائش آتی ہے ان کے بیٹے انتقال کر جاتے ہیں ان کی جائیداد و مال و متاع تباہ ہو جاتا ہے اور خود سخت تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ جاتے ہیں اور بیزاری کے عالم میں خدا سے شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ وہ نیک لوگوں کو مصیبت میں گرفتار کر دیتا ہے۔ یہ کہانی اس انجام پر منتج ہو جاتی ہے کہ بالآخر ان کا مرض بھی جاتا رہتا ہے اور بچے اور مال و متاع بھی دوبارہ مل جاتا ہے۔ مگر آخرت کے امکانی نتائج کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تلمود تو برملا اس امر کا پرچار کرتی ہے کہ "بدترین زندگی موت سے اچھی ہے۔"

انہی وجوہ کی بناء پر میرے والدین بھی عام لوگوں کی طرح زندگی کے محض دنیاوی اور مادی رخ کے قائل تھے زندگی کا مقصد خوش رہنا اور عیش کرنا ہے۔" وہ میری باتوں کے جواب میں کہا کرتے "خوبصورت و آرام دہ مکان ہو، بنیادی سہولتیں ہوں۔ دوستوں کا حلقہ ہو اور تفریح کے مختلف سامان ہوں تو زندگی مثالی ہے اور بس" سوچنے کا یہی وہ سطحی نقطہ نظر تھا جو پورے معاشرے میں جاری و ساری تھا۔ مگر میری سوچ اس عام دھارے سے مختلف تھی۔ بہت بچپن ہی سے میں "اہم اور بنیادی چیزوں" کی تکمیل کی فکر کرتی تھی۔ حتیٰ کہ موت سے پہلے اس امر کا یقین چاہتی تھی کہ میں نے اپنی زندگی گناہوں یا فضولیات میں نہیں گزاری۔ سنجیدگی ہمیشہ میری سوچوں کی ہمرکاب رہی ہے۔ چنانچہ ہمعصر طرز زندگی پر حاوی چھچھورے پن سے مجھے شدید نفرت تھی۔ میں آغاز ہی میں ان باتوں سے متنفر تھی۔ جو میری سوسائٹی میں قدر و منزلت سے دیکھی جاتی تھیں۔ میرا ردعمل ہر اس بات کے خلاف بڑا شدید ہوتا تھا۔ جو احمقانہ اور سطحی ہو، غیر واقعی اور غیر شائستہ ہو یا تصنع پر مبنی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ریڈیو، ٹیلی وژن اور سینما سے کوئی رغبت نہ تھی۔ مغربی لٹریچر، آرٹ، موسیقی اور رقص و سرود مجھے کبھی نہیں بھائے۔ میں دولت کی نمائش کو اور عیش و عشرت کی زندگی کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتی رہی۔ میرے دل میں یہ تاثر رفتہ رفتہ بڑا طاقتور ہو چکا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو انسانی زندگی میں اولیت اور برتری حاصل نہیں ہے۔ بلکہ دونوں کے ڈانڈے غیر انسانی سرحدوں سے ملتے ہیں۔ سکول کی تعلیم کے دوران میرے پسندیدہ موضوع تاریخ اور لسانیات رہے اور دونوں میں میں نے خاصا عبور حاصل کیا۔ بلوغت کے زمانے میں میری ہم جماعت لڑکیوں کے پسندیدہ مشاغل فیشن ایبل لباس، بناؤ سنگھار، مخلوط رقص، پارٹیاں یا ہم عمر دوست لڑکوں سے تنہائی میں ملاقاتیں۔ مگر میں نے ان حالات میں اپنے اوپر جبر کر کے اپنی حفاظت کی۔ شراب یا سگریٹ پینے سے انکار کیا۔ ممکن حد تک سادہ لباس پہنا تاکہ صنف مخالف کے لئے میرے اندر کشش یا جاذبیت کم سے کم تر ہو جائے۔ اپنے آپ کو لئے دیئے رکھا نتیجتاً کتابوں اور مختلف قسم کے گہرے فکری مشاغل سے میری دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔

میرے والد نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ دنیا میں کوئی قدر دائمی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے ہمیں بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو بدل لینا چاہئے تو میرے دل نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور میری یہ پیاس بڑھتی ہی چلی گئی کہ مجھے وہ چیز ملے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہو اور خدا کا شکر ہے کہ جب میں نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا تو میری پیاس بجھ گئی اور مجھے میری مطلوبہ چیز مل گئی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ اللہ کی رضا کے لئے جو بھی نیک کام کیا

جائے گا۔کبھی ضائع نہ ہوگا اور دنیا میں اس کا کوئی صلہ نہ ملے تب بھی آخرت میں اس کا انعام یقینی ہے۔اس کے مقابلے میں قرآن نے بتایا ہے کہ جو لوگ کسی اخلاقی ضابطے کے بغیر زندگی گزارتے ہیں اور خدا کی خوشنودی کو پیش نظر نہیں رکھتے۔دنیاوی زندگی میں خواہ وہ کتنے ہی کامیاب ہوں مگر آخرت میں صریح خسارے میں رہیں گے۔اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہمیں ہر فضول اور بے فائدہ کام ترک کر دینا چاہئے۔جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہو۔

قرآن کی ان تعلیمات کو میرے سامنے مزید واضح اور روشن حدیث اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ نے کیا جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ فرمایا کہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کا ایک ایک پہلو مثالی ہے۔ایک بچے کی حیثیت سے ایک باپ کی حیثیت سے،ایک پڑوسی،ایک تاجر، ایک مبلغ،ایک دوست،ایک سپاہی اور ایک فوجی جرنیل کے اعتبار سے،ایک فاتح،ایک منصف،ایک قانون ساز،ایک حکمران اور سب سے بڑھ کر اللہ کے ایک عاشق صادق کے لحاظ سے وہ خدا کی کتاب کی ہو بہو مثال تھے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دن بھر کی مصروفیات کی تفصیل نے مجھے بہت متاثر کیا۔وہ دن کا ایک لمحہ ضائع نہ کرتے اور سارا وقت اللہ اور اس کی مخلوق کے لئے وقف رکھتے ان کا اپنی بیویوں سے سلوک نہایت منصفانہ اور مثالی تھا۔انصاف اور عدل اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ان کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جائز ضرورت کے تحت ایک غلام کی درخواست کی تو اسے تقویٰ کی تلقین کی اور اپنے کنبے پر دیگر مسلمانوں کی ضرورتوں کو ترجیح دی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کا مقصد عیش پسندی نہیں بلکہ ''کامیابی'' قرار دیا۔چنانچہ آپ کی تعلیم کے مطابق جو شخص آخرت کی کامیابی کے لئے بالارادہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اسے اس جذباتی سکون کے نتیجے میں خوشی اور مسرت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔جو ہزار مادی عیش کے بعد بھی نہیں ملتی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ دنیاوی زندگی سے بے نیاز تھے۔وہ روزمرہ کی ضروریات زندگی کا خاص خیال رکھتے تھے۔شگفتہ مزاج اور خوش بیان تھے۔بچوں کے ساتھ کھیل بھی لیتے تھے۔مگر اصل توجہ کے قابل انہوں نے آخرت کی زندگی ہی کو سمجھا اور مادی اور روحانی زندگی میں حد درجہ توازن پیدا کر دیا۔

قرآن اور حدیث کے علاوہ میں نے اسلام پر متعدد دوسرے تراجم بھی پڑھے مثلاً کتاب الہدایہ جو اسلامی فقہ کی تشریح ہے امام غزالی کی ''احیاء العلوم فی الدین'' کے جستہ جستہ حصے،مقدمہ ابن خلدون،علامہ اقبال کی نظمیں اور محمد اسد کی خود نوشت روڈ ٹو مکہ۔موخر الذکر نے میرے احساسات کو فیصلہ کن مرحلے تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔اس کتاب میں بتایا گیا کہ آسٹریلیا کے ایک یہودی نے مغربی تہذیب کی کھوکھلی اقدار کو کس طرح ٹھکرایا اور اسلام میں اس کو کس طرح اپنی تشنگی کا سامان ملا۔

مطالعہ اور جستجو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ میری اعصابی حالت بڑی تیزی سے خراب ہونی شروع ہوگئی۔ میں صاحب فراش ہو کر رہ گئی اور مکمل طور ناکارہ ہوگئی۔ ہر علاج آزمایا گیا۔ ایک سال تک نفسیاتی اور طبی دونوں طرح کا معالجہ ہوا مگر بے سود۔ دوسرے سال صرف نفسیاتی علاج پر اکتفا کیا گیا۔ مگر مرض بڑھتا ہی چلا گیا۔ بالآخر مجھے دماغی امراض کے شفاخانے میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں مجھے دو سال سے زیادہ عرصہ قیام کرنا پڑا۔ میری بیماری نے ڈاکٹروں کو بالکل عاجز کر دیا اور ایک مرحلے پر انہوں نے تشخیص و معائنہ بھی بند کر دیا۔ مختصر یہ کہ میں اس وقت طبی نقطہ نظر سے لاعلاج ہو چکی تھی مگر کچھ ہی عرصہ بعد میں معجزانہ طور پر شفایاب ہونے لگی۔ میری شفایابی کو طبی علاج معالجے کا مرہون منت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نہ میری قوت ارادی بہت زیادہ طاقت ور ہوگئی تھی۔ میرا صحت یاب ہونا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کرم کا نتیجہ تھا۔

جب میں نے اپنے والدین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مجھے ہسپتال سے واپس لے جانے کا بندوبست کریں اور اس کے بعد میں گھر آ گئی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اسلام کے اثرات عملاً اپنی زندگی پر غالب کروں گی۔ ابتداً میں نے اپنے طور پر نیویارک کے اسلامی مرکز میں مسلمانوں سے ملاقات اور تبادلہ خیال کی راہیں پیدا کیں۔ اور بڑی خوشی ہوئی کہ جن لوگوں سے میرا رابطہ ہوا وہ بہترین لوگ تھے۔ اسلامی مرکز کی مسجد میں، میں نے مسلمانوں کو نماز ادا کرتے دیکھا اور اس مشاہدے نے میرے اس یقین کو پختہ کر دیا کہ صرف اسلام ہی مکمل آسمانی مذہب ہے باقی مذاہب میں سچائی کے محض منتشر اجزاء موجود ہیں۔

اب میں اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ اسلام بہر صورت دین حق ہے اور اسلام ہی میں دور حاضر کی تہذیبی برائیوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے کی صلاحیت موجود ہے، چنانچہ میں نے نئے نظریات اپنائے۔ ان کے اظہار کے لئے میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ مضامین، انگلستان، جنوبی افریقہ، ترکی، سوئٹزرلینڈ، سیلون، بھارت اور پاکستان کے مختلف انگریزی جرائد میں شائع ہوئے۔ سب کا موضوع اور مرکزی خیال ایک ہی تھا۔ یعنی اسلام اور مغربیت کے مختلف پہلوؤں سے بحث کر کے دونوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا تھا۔ خصوصیت سے میں نے ان نام نہاد جدید اصلاحات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جن کا مقصد اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کرنا ہے ان مضامین میں، میں نے یہ ثابت کیا کہ مغرب کی جدید تہذیب کس طرح نظری و عملی پہلوؤں سے اسلام سے متصادم ہے اور ان دونوں میں کسی مرحلے پر مصالحت نہیں ہو سکتی۔ میں محمد اسد کی کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ میرا خیال ہے یہ کتاب اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہر حال میرے مضامین محمد اسد صاحب کی کتاب سے نسبتاً زیادہ براہ راست قسم کے تھے اور ان میں، میں نے اصل مسئلہ پر ذرا تفصیل سے بحث کی تھی۔ میرے مضامین کی اشاعت نے دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان راہنماؤں سے مراسلت اور خط و کتابت کی راہیں پیدا کر دیں۔ انہی حضرات میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی

شامل تھے۔انہوں نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا:

''آپ کی ذہنی پریشانیوں اور صدمات کی سرگزشت میں میرے لئے کوئی غیر متوقع بات نہیں۔اگر کوئی فرد اردگرد کے معاشرتی ماحول سے مسلسل ٹکراتا ہوا گزر رہا ہو۔اور اسے کہیں سے معمولی سی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میسر نہ آئے تو ایسے حالات میں اس کے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اعصاب کا برقرار رہنا غیر معمولی اور غیر فطری بات ہوگی۔آپ کے رجحانات، آپ کا ذوق، آپ کے نظریات وتصورات اور آپ کی عادات واطوار ساری چیزیں آپ کی سوسائٹی سے متصادم ہیں۔جن حالات نے آپ کو ماہر نفسیات یا شفاخانہ امراض دماغی تک پہنچایا وہ آپ کے اندر کسی نفسیاتی خلل کا نتیجہ نہیں بلکہ آپ اور آپ کے ماحول کے درمیان جو واضح عدم مطابقت اور تصادم موجود چلا آ رہا ہے۔ان سے ایسے حالات کا پیدا ہونا بالکل فطری امر ہے، جس سوسائٹی میں آپ رہ رہی ہیں۔وہ آپ کو اس عورت کی حیثیت سے کبھی قبول ہی نہیں کرسکتی جو حیثیت آپ کے پیش نظر ہے۔وہاں تو آپ کی ہر خوبی کو خامی ہی تصور کیا جائے گا۔''

اگر آپ پاکستان آجائیں تو یہاں آپ اپنے آپ کو بہت سے ہم خیال لوگوں کے درمیان محسوس کریں گی۔ علاوہ ازیں یہاں لاہور میں بعض صالح نوجوان بھی مل سکتے ہیں، جنہیں آپ دائمی رفیق حیات بنا سکتی ہیں۔ آپ یقیناً کسی مغرب زدہ ''اعتدال پسند'' سے شادی کرنا پسند نہیں کریں گی۔ بلکہ آپ کو حقیقی مسرت کسی مسلمان نوجوان کو رفیق حیات بنانے ہی سے حاصل ہوگی۔ میں امید کروں گا کہ آپ اپنے والدین پر یہ واضح کردیں کہ کیوں آپ کے لئے امریکہ میں مزید قیام ناممکن ہوگیا ہے اور آپ کی بھلائی اور فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ آپ پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کرلیں آپ اپنے والدین کو یہ بھی بتادیں کہ جس شخص نے آپ کو یہ نازک قدم اٹھانے کا مشورہ دیا ہے۔اس نے صرف یہ رائے دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ مستقبل کی تمام ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار ہے۔اگر آپ کے والدین مجھ پر اعتماد کریں تو انشاء اللہ آپ کے اس اعتماد کو بھی دھچکا نہیں لگے گا۔

میں نے مولانا کو حسب ذیل جواب دیا:

''یہ خدا کا کرم ہے کہ آپ میری دستگیری فرمار ہے ہیں۔خدا کا شکر ہے۔اب میں تنہا جدوجہد کرنے پر مجبور نہیں ہوں میں آپ کی پیش کش قبول کرتی ہوں اور تہہ دل سے آپ کی شکر گزار ہوں اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔''

اس کے بعد میں نے نیویارک سے ایک یونانی مال بردار جہاز میں کراچی تک کا سفر کیا۔منزل مقصود تک پہنچنے کا یہی کم خرچ ممکن ذریعہ ہوسکتا تھا۔یہ سفر تقریباً چھ ہفتے تک جاری رہے۔جہاز کے مسافر اور عملہ کے لوگ چونکہ اخلاقی اور روحانی طور پر انتہائی پست لوگ تھے اس لئے دوران سفر مجھے زندگی کے بعض تلخ ترین تجربات سے گزرنا پڑا۔

پورٹ سوڈان میں تو مجھے اس قدر خطرہ محسوس ہوا کہ اپنے تحفظ کی خاطر پولیس کی نگرانی کی درخواست کرنا پڑی۔ بہر حال اسکندریہ، پورٹ سوڈان اور جدہ میں میرے ساتھ مسلمان بھائیوں نے جو حسن سلوک کیا وہ باعث صد مسرت اطمینان تھا۔ اس سے میری کدورت کا غبار یک گونہ چھٹ گیا۔

جب میں کراچی پہنچی تو وہاں مولانا مودودیؒ کے معتقدین اور احباب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بے حد خاطر مدارت کی۔ چند روز بعد بذریعہ طیارہ کراچی سے لاہور پہنچی اور مولانا مودودیؒ کے گھر قیام کیا۔ میں مولانا کی بچیوں کی ہم عمر تھی اس لئے مجھے اس گھر میں اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد میرا نکاح جماعت اسلامی کے ایک سرگرم اور مخلص رکن محمد یوسف خاں سے ہوگیا۔ خاں صاحب پہلے سے شادی شدہ اور عیال دار تھے۔ مگر میں نے اس رشتے کو بخوشی قبول کرلیا کہ جاہلیت کے ہر شعار کی نفی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت کی پیروی میرا مقصد حیات ہے بحمد اللہ تعالیٰ میں اپنے نئے گھر میں مسرت وسکون کی زندگی گزار رہی ہوں اور آج تک کسی الجھن یا پریشانی کا شکار نہیں ہوئی۔

(بحوالہ۔ ہم کیوں مسلمان ہوئے۔ عبدالغنی فاروق)

موہنی (پاکستان)

یہ ایک ہندو جوڑے کے قبول اسلام کی سچی اور واقعاتی کہانی ہے جسے تنویر احمد خان صاحب نے سیارہ ڈائجسٹ کے ''قرآن نمبر'' کے لئے رقم فرمایا۔ اس کہانی پر مصنف کو انعامی مقابلے کا دوسرا انعام ملا تھا۔ ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے شکریئے کے ساتھ قرآن پاک کے اس روح پرور معجزے کو قارئین کی نذر کیا جارہا ہے۔ (مولف)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا تھا اور ہندوستان سے مسلمان اور پاکستان سے غیر مسلم نقل مکانی کررہے تھے۔ قصہ سندھ کے ایک قصبے کا ہے جہاں صرف میاں بیوی پر مشتمل ایک ہندو گھرانہ رہتا تھا۔ ان کے پڑوسی مسلمان تھے۔ دونوں خاندان آپس میں بڑے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔

فرقہ وارانہ فسادات کی شدت بڑھنے لگی تو ایک روز ہندو گھرانے کے سربراہ نند لعل نے اپنے مسلمان پڑوسی احمد سے کہا ''بھائی! میرا ارادہ ہے کہ اب ہمیں ہندوستان چلے جانا چاہئے۔ اگرچہ دل تو نہیں چاہتا کہ اس جگہ کو چھوڑیں جہاں پیدا ہوئے ہیں اور پلے بڑھے ہیں۔ مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے حالات بہت بگڑ گئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو ہمارا نقصان ہوجائے۔''

احمد نے کہا: ''نند! کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہمارے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

مگر نند لال کا دل خوف وہراس کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ وہ احمد کی باتوں سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے گھر میں اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ ہم موقع ملتے ہی بھارت چلے جائیں گے تم تیاری مکمل رکھنا۔

اس گفتگو کو کئی روز گزر گئے۔ ایک دن نند لعل کے برادر نسبتی کا خط آیا کہ ہم لوگ بھارت جارہے ہیں آپ

لوگوں کا کیا ارادہ ہے اگر تیار ہوں تو اکٹھے چلیں گے۔ نند لعل کا برادر نسبتی خاصی دور رہتا تھا۔ نند لعل نے اپنے برادر نسبتی کا خط اپنے پڑوسی کو بھی دکھایا اس سے رائے طلب کی کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ احمد نے مشورہ دیا کہ تم لوگ گھر کی تیاری مکمل رکھو اور خود سالے کے پاس جا کر معلومات کر آؤ پھر جو پروگرام بنے اسی پر عمل کرو۔ نند لعل نے یہ تجویز پسند کی اور بیوی کو بالکل تیار رہنے کا حکم دیا کہ خود اپنے سالے سے ملنے چلا گیا۔

نند لعل کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ عمر اس کی پچیس چھبیس سال کی تھی مگر اولاد نہ ہونے اور صحت اچھی ہونے کی وجہ سے سولہ سترہ سال کی لگتی تھی۔ احمد ایک عرصہ سے اس پر نگاہ رکھتا تھا۔ مگر اس سے کوئی ایسی ویسی بات کرنے کی جرات نہ کر سکا تھا۔ اب اسے ایک موقع مل گیا۔ نند لعل اپنے سالے سے ملنے چلا گیا اور اپنی بیوی کو تیار رہنے کا حکم دے گیا تو احمد نے فائدہ حاصل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس نے تانگہ لیا اور شام کو ہانپتا کانپتا نند لعل کے دروازے پر پہنچ گیا اندر سے نند لعل کی بیوی موہنی نے پوچھا" بھائی کون ہو، کیا کام ہے؟

''میں احمد ہوں بھابی!'' احمد نے جواب دیا۔ بھائی نند لعل آٹھ بجے آنے والی گاڑی سے آ رہے ہیں ان کے ساتھ ہی آپ کے بھائی بھی ہیں ان کا ارادہ سیدھے کھوکھراپار جانے کا ہے۔ وہ یہاں نہیں رکیں گے۔ انہوں نے مجھے پیغام بھجوایا ہے کہ میں آپ کو ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دوں۔ آپ ضروری چیزیں، زیورات اور کپڑے لے لیں اور تیار ہو کر فوراً باہر آ جائیں۔

موہنی احمد کو ایک عرصے سے جانتی تھی۔ دونوں پڑوسی تھے اور ان کے باہمی تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ پھر بھارت جانے کی باتیں بھی روز ہی ہوتی تھیں۔ اس نے احمد کی باتوں کو سچ جانا اور ضروری تیاری کے بعد باہر آ کر تانگے پر بیٹھ گئی۔

ریلوے اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ مگر تانگہ بہت دیر سے چل رہا تھا۔ اس سے موہنی کو کچھ شک گزرا اس نے منہ سے پلو اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو راستہ ہی بدلا ہوا پایا۔ اس نے احمد سے پوچھا بھائی! ہم کدھر جا رہے ہیں یہ تو اسٹیشن کا راستہ نہیں ہے۔''

گھبراؤ نہیں بھابی!'' احمد نے عیاری سے جواب دیا۔ ہم نے جان بوجھ کر جنگل کا راستہ اختیار کیا ہے تاکہ عام سڑک پر ہمیں لوگ نہ دیکھ سکیں اور کوئی پریشان نہ کر سکے۔ ہم تھوڑی دیر میں اسٹیشن پر پہنچنے والے ہیں۔''

موہنی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اچانک تانگہ رک گیا احمد نے ہوس ناک لہجے میں کہا" پیاری! اب اتر بھی آؤ۔ کب تک دل کو تڑپاتی رہو گی۔ تم نہیں جانتی ارمان اس وقت کا کتنے سالوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ موہنی نے گھبرا کر دیکھا چاروں طرف خوفناک جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ سارے معاملے کو سمجھ گئی اور لجاجت سے بولی" احمد! میں نے تمہیں بھائی اور تم نے مجھے بہن بنایا ہوا ہے کچھ شرم کرو اور اس مقدس رشتے کی لاج رکھو۔''

مگر احمد پر شیطان سوار تھا۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ موہنی کو کھینچ کر تانگے سے اتارا اور دست درازی شروع کر

دی۔موہنی نے اس کے چنگل سے بچنے کی بہت کوشش کی اور پورے عزم کے ساتھ اپنی عزت کو بچانے کی تگ ودو کرنے لگی۔اس نے رحم طلب نگاہوں سے تانگے والے کی طرف دیکھا۔مگر اس کی نگاہوں میں بھی ہوس کے شعلے ناچ رہے تھے۔اس نے ہاتھ جوڑ کر احمد سے درخواست کی ''احمد خدا کے واسطے مجھے برباد نہ کرو۔میں کہیں کی نہ رہوں گی تمہیں تمہارے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ، میری عزت نہ لوٹو میرے زیورات لے لو، مگر مجھے چھوڑ دو۔

لیکن احمد ہوس کی مستی کا شکار تھا۔اس نے موہنی کی درخواست پر کان نہ دھرے اور اسے وحشیانہ انداز میں اٹھا کر ایک ٹیلے کے پیچھے لے چلا۔موہنی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر احمد کے طاقتور بازوؤں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔آخری چارۂ کار کے طور پر اس نے احمد کے کندھے میں دانت گاڑھ دیئے۔وہ بلبلا اٹھا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی موہنی ایک طرف کو بھاگ اٹھی۔احمد نے تھوڑی دیر توقف کیا۔مگر پھر زخمی بھیڑیئے کی مانند نئے جوش کے ساتھ اس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا اور تھوڑی دور جا کر اسے دوبارہ دبوچ لیا اور وحشیانہ انداز میں اس کے کپڑے پھاڑنے لگا۔اب موہنی برہنہ ہو گئی تھی۔مگر عزت بچانے کا احساس اب تک اس میں زندہ تھا۔اچانک اس نے اپنی گردن پر ہاتھ ڈالا اور ایک تعویذ نوچ کر احمد کے سامنے کر دیا۔احمد! اس میں تمہاری پاک کتاب قرآن مجید کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔یہ تمہارا قرآن ہے۔اسی کے صدقے میں مجھے معاف کر دو۔ میری عزت نہ لوٹو میری عصمت برباد نہ کرو۔''

مگر احمد نے وہ تعویذ موہنی کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دیا اور لپک کر موہنی کو پکڑ لیا اور قریب تھا کہ وہ اپنے ناپاک عزائم کو عملی صورت دے ڈالے کہ اچانک اس کی چیخیں نکل گئیں۔اس کے جسم میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی اور موہنی کے جسم پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

موہنی آزاد تھی۔اس نے حیرت اور اچنبھے کے ساتھ دیکھا کہ احمد کا بدن ایک طرف کو ڈھلک رہا ہے اس کے نظروں کے سامنے ایک سیاہ ناگ احمد کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔اور اس کی پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا۔تھوڑی دیر میں احمد تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔سانپ اپنا کام ختم کر کے جا چکا تھا۔

یہ منظر تانگے والے نے بھی دیکھا۔وہ بھاگتا ہوا آیا اور تعویذ اٹھا کر چومنے لگا۔پھر اس نے اپنی چادر موہنی کے جسم پر ڈال دی۔اس سے رو رو کر معافی مانگی اور اسے تانگے میں بٹھا کر شہر کی طرف چل دیا۔

راستے میں موہنی نے بتایا کہ سات سال سے میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوتی تھی میری ایک مسلمان سہیلی نے یہ تعویذ لا کر دیا تھا اور اس نے بتایا کہ اس میں سورۃ یاسین اور پانچ اور آیات چھپی ہوئی ہیں۔موہنی عقیدت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی کہ اسے قرآن کی قوت کا اندازہ ہو گیا ہے۔قرآن عزتوں کا محافظ ہے یہ اس وقت دستگیری کرتا ہے جب سارے سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اتفاق سے آٹھ بجے والی ٹرین سے نند لعل واپس آ گیا۔وہ بڑا پریشان تھا کہ موہنی کہاں گئی۔اسے یہ پتہ چل

گیا تھا کہ احمد اسے تانگے میں بٹھا کر کہیں لے گیا مگر پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ اسی جستجو میں رات کے تین بج گئے حتیٰ کہ موہنی واپس گھر پہنچی اور اپنے خاوند کو ساری کہانی سنائی۔

دوسرے ہی دن نند لعل نے اور موہنی نے ہندوستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انہوں نے قرآن کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے اور ان کے اسلامی نام محمد علی اور عائشہ رکھے گئے اب ان کے چار بچے ہیں اور وہ بڑی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ (بحوالہ: ہم کیوں مسلمان ہوئے۔ عبدالغنی فاروق)

محترمہ ثریا

''جناب ریحان خان امریکہ کی ایسٹرن مشی گن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں ان کی ایک نوجوان سفید فام شاگرد ثریا نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے اور اپنے آپ کو اسلامی لباس سمیت دینی تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیا ہے ریحان خان صاحب اس لڑکی کے لباس اور باوقار دینی اطوار سے بہت متاثر ہوئے۔ اس سے انٹرویو کی صورت میں گفتگو کی اور شمالی امریکہ میں مسلمانوں کے ایک ماہوار جریدہ ''یونٹی ٹائمز'' (شمارہ مارچ 1990ء) میں شائع کرا دیا۔ انٹرویو کا یہ تراشہ برادر عزیز جناب سید وقار علی کاری صاحب (مقیم امریکہ) نے بھجوایا ہے اس کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

سوال: قبول اسلام سے قبل آپ کے مذہبی رجحانات کیا تھے؟

جواب: میرا تعلق ایک پروٹسٹنٹ عیسائی خاندان سے ہے جس کے سب افراد مذہب سے دور ہیں لیکن میں بچپن ہی سے مذہب کی جانب رجحان رکھتی تھی، چنانچہ میری عمر دس سال کی تھی جب میں نے اپنے پڑوسیوں سے فرمائش کی کہ وہ اتوار کو چرچ جایا کریں تو مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں چنانچہ میں وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ گرجا جانے لگی اور جب ہائی سکول میں پہنچی تو عیسائیت کی مختلف شاخوں اور فرقوں کے بارے میں علم حاصل کرنے لگی اس سلسلے میں میں نے کیتھولک مذہب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا اور...... '' Methodist ''Presby Terian'' اور '' Jehovah`s Witness, Mormons جیسے مذاہب کے بارے میں بھی ضروری مطالعہ کیا مگر افسوس کہ میری روح پیاسی کی پیاسی رہی۔ میرا وجدان جو کچھ طلب کرتا تھا۔ مجھے کہیں نہ ملا مثال کے طور پر میرا ضمیر کہتا تھا کہ اس کائنات کا خالق و مالک وحدہ لاشریک ہے جبکہ عیسائیت کے سب فرقے ابہام کا شکار ہیں۔

سوال: اس صورت حال میں دین اسلام سے آپ کا تعارف کیسے ہوا اور کب ہوا؟

جواب: میں ہائی سکول میں پڑھ رہی تھی۔ جب مجھے مشرق وسطیٰ کے بارے میں خاصی تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور اسی حوالے سے پہلے پہل ''اسلام اور مسلم'' کے الفاظ سے میری شناسائی ہوئی۔ مگر سکول کے زمانے میں میری معلومات کا دائرہ بس یہیں تک محدود رہا۔ کالج میں پہنچی تو خوش قسمتی سے وہاں مشرق

وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے مسلمان طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان سے ملاقاتیں ہوئیں تو اسلام سے تعارف حاصل ہوا اور میں اس مذہب کے اس پہلو سے بہت متاثر ہوئی کہ یہ عیسائیت اور یہودیت کی طرح جز وقتی (پارٹ ٹائم) مذہب نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے اسلام چونکہ دن اور رات کے ایک ایک لمحے میں رہنمائی کرتا ہے اور عیسائیت کی مانند اس کی رفاقت کا دائرہ ایک ہفتے میں محض ایک گھنٹے تک محدود نہیں ہوتا اس لئے جب ایک شخص اسے عملی طور پر اختیار کرے تو اس کی زندگی میں نظم وضبط، سلیقہ اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے اور اسلام کی دوسری خوبی یہ تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ایک مکمل دین اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ میں نے اسے دل وجان سے قبول کر لیا۔

سوال: اور اس کا ردعمل آپ کے خاندان پر کیا ہوا؟

جواب: خاندان کے ہر فرد کا ردعمل مختلف نوعیت کا تھا۔ میرے والد کا سلوک مجھ سے بہت ہی مشفقانہ رہا ہے چنانچہ اگرچہ میں نے اسلام قبول کرنے کے ساتھ اپنا لباس بھی تبدیل کر لیا اور عام طرز زندگی کو یکسر نیا رنگ دے ڈالا مگر ان کی محبت اور سلوک میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ ایسا ہوا کہ ایک بار میری ایک پھوپھی آئی اور اس نے مجھے خوب برا بھلا کہا، مجھے سنکی اور قنوطی ہونے کے طعنے دیئے تو میرے والد نے میری مدافعت کی تاہم میری والدہ کا طرز عمل خوش گوار نہ تھا اور وہ میری زندگی کے انقلاب پر قطعی خوش نہ ہوئی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض دشواریوں کے باوجود میں خوش نصیب ہوں کہ اپنے والدین کے ہاں رہ رہی ہوں اور مجھے ان پریشانیوں سے سابقہ نہیں پڑا جس کی عموماً توقع کی جاتی ہے۔

سوال: میں حیران ہوں کہ آپ کے اندر اتنا بڑا اقدام کرنے کی جرات کیسے پیدا ہو گئی؟

جواب: آپ کی بات درست ہے کہ امریکہ کے اس ماحول میں جہاں مادیت کا دور دورہ ہے اور عیش پرستی اور تفریح پسندی ہی کو زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے وہاں اسلام قبول کرنا اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا بے حد مشکل کام ہے چنانچہ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے ہزار بار سوچا کہ میرے والدین مجھ سے کیا سلوک کریں گے؟ میری تعلیم کا کیا بنے گا؟ اور میں اپنے احباب میں کیسے زندہ رہوں گی؟ چنانچہ اس نوعیت کے خدشات نے مجھے بہت سخت پریشان کئے رکھا مگر طویل اور گہرے غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایک وقتی اور عارضی پریشانی کے مقابلے میں جو اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں پیش آ سکتی تھی۔ مسلمان نہ ہونے کے نتائج ذہنی اور روحانی اعتبار سے زیادہ گھمبیر ہو سکتے ہیں چنانچہ میں نے اللہ سے خوب دعائیں کیں اس سے مدد اور اعانت طلب کی اور واقعی اللہ نے میری دعائیں سن لیں اور حیرت انگیز طور پر مجھے وہ ہمت عطا کی اور حوصلہ عطا ہوا کہ میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے قابل ہو گئی۔

سوال: آپ تو ابھی نوعمر ہیں آپ کا کیا خیال ہے آپ واقعی اس فیصلے پر مستقل مزاجی سے قائم رہیں گی؟

جواب: مجھے یقین ہے کہ میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہو گی۔

اندازہ کریں جب میں قبول اسلام کے لئے ایک مسجد میں گئی تو وہاں کے خطیب اور امام نے مجھ پر ذرا بھی دباؤ نہ ڈالا بلکہ مشورہ دیا کہ میں پہلے اسلام کے بارے میں خوب مطالعہ کرلوں اور اگر اس کے بارے میں کوئی معمولی سا بھی اعتراض ہے تو سوالات کر کے اسے رفع کرلوں پھر اسلام قبول کرلوں، اس کے برعکس جن دنوں میں کیتھولک مذہب کا مطالعہ کر رہی تھی ایک مرتبہ میں کیتھولک چرچ میں گئی تو میرے جاننے والوں نے بہت اصرار کیا کہ میں اس مذہب کو فوراً قبول کرلوں۔

مجھے اس امر کا بھی اعتماد ہے کہ چونکہ میں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا ہے اور میرے شعور نے مسترد کیا ہے۔ اسی لئے میں نے جس مذہب کا انتخاب کیا ہے وہ ہر لحاظ سے بہترین اور عقل کے عین مطابق ہے اسی طرح میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں نے دو سال کے عرصے تک خوب جم کر اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے اور بہت سے لوگوں سے اس کے بارے میں گفتگوئیں کیں، اس لئے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام قبول کرنے میں نہ تو کسی جذباتیت اور عجلت پسندی کا عمل دخل ہے نہ اس سے کوئی دنیاوی مفاد وابستہ ہے میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور انشاء اللہ اس پر عمر بھر ثابت قدم رہوں گی۔

سوال: آپ نے اسلام قبول کر کے کیا حاصل کیا ہے؟

جواب: اعداد و شمار کے حوالے سے یادو اور دو چار کے انداز میں یہ بتانا کہ مسلمان ہو کر میں نے یہ اور یہ کچھ حاصل کیا ہے۔ خاصا مشکل کام ہے تاہم اسلام قبول کر کے سب سے بڑی کامیابی یہ ملی کہ زندگی میں وقار اور ڈسپلن کا چلن پیدا ہوا، شب و روز کو مقصدیت نصیب ہوئی اور وہ خلا کی کیفیت جو دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی۔ ختم ہوگئی، پھر یہ نعمت بھی کچھ کم نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت انسان کے اندرون کو سکون اور تزکیہ سے مالا مال کرتے ہیں۔ روح میں رفعت اور مقاصد میں بلندی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان سخت سے سخت حالات میں پریشانی اور مایوسی سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل نے میری زندگی کے ہر پہلو کو مثبت طور پر تبدیل کیا ان میں سے بعض تبدیلیاں واضح اور انقلابی نوعیت کی ہیں۔ جبکہ بعض کا تعلق ذہن اور ارادے سے ہے اور وہ اسی نسبت سے لطیف اور غیر نمایاں ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے بالوں کو ڈھانپا ہوا ہے، امریکہ کے عریاں ماحول میں آپ کو یہ کیسا لگتا ہے؟

جواب: اس ضمن میں میرے وہی احساسات ہیں جو ایک باعمل مسلمان عورت کے ہو سکتے ہیں میں نے اپنا سر ڈھانپ کر دراصل اس ماحول کی آلودگیوں کے خلاف تحفظ حاصل کیا ہے اور عام عورت نیم برہنگی کی وجہ سے جس خوف اور سراسیمگی کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے۔ اس سے خاصی حد تک نجات پالی ہے۔ پھر میرا سر ڈھانپنا ایک قسم کا اعلان بھی ہے کہ میں مسلمان ہوں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں اللہ نے جو حکم دیا ہے۔ میں اس کی پیروی کر رہی ہوں۔

سوال: آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے کہ امریکہ میں جو لوگ اپنا مذہب تبدیل کرتے ہیں ان کی غالب

اکثریت اسلام کے آغوش میں آتی ہے؟

جواب: میرا یقین ہے کہ جو بے شمار لوگ اسلام کی طرف لپکے لپکے چلے آ رہے ہیں انہیں اس امر کا احساس ہو گیا ہے کہ موجودہ مغربی طرز زندگی نہ تو اخلاقی قدروں کی پرورش کرتی ہے نہ یہ کسی باوقار اور صاف ستھرے اسلوب حیات کو پروان چڑھاتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اسلام کی صورت میں وہ ایسی صداقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ جو انہیں بلند ترین اخلاقی معیارات عطا کرتی ہے اور ان معیارات کو حاصل کرنے کا وہ مطمع نظر دیتی ہے جو حقیقت پسندی پر مبنی ہے فطری ہے اور باوقار بھی۔ خاص اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اسلام مغرب کی تنگ نظری سے بہت بلند و بالا ہے اور انسانوں کو مادیت اور نسل پرستی سے ہٹا کر خالص انسانی شرف کی بنا پر مخاطب کرتا ہے۔

سوال: امریکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی اکثریت سیاہ فاموں پر مشتمل ہے آپ کے خیال میں یہ مبارک پیغام سفید فاموں تک رسائی حاصل کرنے میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکا؟

جواب: اس معاملے میں میں کوئی ماہرانہ رائے نہیں دے سکتی تاہم میرا ایک نقطہ نظر ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں وہ بالعموم موجودہ نظام کے ستم زدہ ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امریکہ میں بے چارے سیاہ فام بڑے ہی مظلوم ہیں اور جب وہ دائرہ اسلام میں آتے ہیں تو انہیں حقارت اور ظلم و جور کی بجائے محبت، مساوات اور احترام ملتا ہے تو ان کی پریشان اور افسردہ روحوں کو قرار مل جاتا ہے۔

سیاہ فاموں کے اسلام کی طرف لپکنے کا ایک سبب اور بھی ہے وہ جان گئے ہیں کہ افریقہ میں ان کے آباؤ اجداد کا مذہب اسلام تھا اور جب انہیں زبردستی اغوا کر کے امریکہ لایا گیا تو ان سے یہ نعمت چھین لی گئی چنانچہ اسلام قبول کر کے دراصل وہ اپنے اصل دین کی طرف لوٹتے ہیں۔

سوال: امریکہ کے اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ یہ واویلا کرتے نہیں تھکتے کہ اسلام کا رویہ عورت کے معاملے میں غیر مناسب ہے۔ آپ ایک تعلیم یافتہ سفید فام خاتون ہیں اس کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب اتنے تھوڑے وقت میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ موضوع تو ایک کتاب کا متقاضی ہے مختصراً کہوں گی کہ یہ بات حقیقت کے برعکس ہے اور یہ الزام عموماً ان لوگوں کی طرف سے دہرایا جاتا ہے جو اسلامی تعلیمات سے یکسر بے خبر ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ جب اسلامی معاشرت میں مرد اور عورت کا میدان کار الگ الگ ہے تو لازماً عورت ظلم کا شکار ہوتی ہے حالانکہ معاملہ ایسا ہر گز نہیں ہے۔

اس کے برعکس...... میں اپنے ملک کی صورت حال پیش کرتی ہوں یہاں برابری اور مساوات کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ معاشرے میں عورت وہ سب کچھ کرے جو مرد کرتا ہے۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ عورت مرد کی طرح کماتی بھی ہے اور گھر کا بھی سارا کام کرتی ہے جہاں مرد اس کے ساتھ شراکت نہیں کرتا، پھر ظاہر ہے مساوات کہاں رہی؟ اور جن گھرانوں میں ماں اور باپ دونوں کام کرتے ہیں وہاں بچوں کا جو حال ہوتا ہے۔ وہ ظلم اور استحصال

کی ایک افسوس ناک مثال ہے۔اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔یورپ کے ذرائع ابلاغ اور اخبارات عام طور پر عالم اسلام کی حکومتوں کے طرز عمل اور مختلف افراد کے ذاتی رویے سے سمجھ لیتے ہیں کہ یہی کچھ اسلام کی تعلیم ہے۔حالانکہ ایسا نہیں ہے ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات پر ان کی صحیح روح کے ساتھ عمل کریں اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کے سچے ترجمان بنیں۔

سوال: امریکہ میں جو غیر مسلم خواتین اسلام قبول کرنا چاہتی ہیں ان کے نام آپ کا پیغام کیا ہے؟

جواب: ان بہنوں کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کریں اور خوب توجہ سے غور وفکر کریں۔ میں اسی راستے سے اسلام کی منزل مقصود پر پہنچی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ خوف زدہ ہرگز نہ ہوں۔اگر آپ نے صراط مستقیم تک پہنچنے کا ارادہ کرلیا تو اللہ اپنے فضل سے آپ کی مدد فرمائے گا۔

سوال: آپ میری لائق شاگرد ہیں۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ مستقبل میں آپ اپنی صلاحیتوں کو خدمت دین کے لئے کس طرح کام لائیں گے؟

جواب: میرا ارادہ ہے کہ میں کسی اسلامک اسکول کی ٹیچر بن جاؤں۔اپنے شاگردوں تک اسلام کی سچی تعلیم منتقل کروں اور دوسرے لوگوں تک بھی اسلام کا سچا پیغام پہنچاؤں۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔

(بحوالہ: ہم کیوں مسلمان ہوئے۔عبدالغنی فاروق)

محترمہ خدیجہ (آسٹریلیا)

محترمہ خدیجہ نے جولائی 1980ء میں منصورہ میں میاں طفیل محمد قائد تحریک اسلامی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔دو ماہ کے بعد وہ آسٹریلیا چلی گئیں اور اگست 1981ء میں دوبارہ پاکستان آئیں اور یہیں 29 ستمبر کو وفات پا گئیں۔ راقم الحروف نے ان سے قبول اسلام کے چند ہی روز بعد منصورہ میں ملاقات کر کے ذیل کا انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔وہ مکمل باپردہ اسلامی لباس میں ملبوس تھیں۔

سوال: براہ کرم سب سے پہلے اپنا تفصیلی تعارف کرا دیجئے۔

جواب: اسلام قبول کرنے سے پہلے میرا نام مس مارلینا گارسیا تھا میرا آبائی وطن برازیل تھا۔مگر میرے والد ڈاکٹر آرتھر ایڈورڈ گارسیا جو ایک ماہر معالج تھے۔ برطانوی فوج کے میڈیکل کور میں اعلیٰ افسر تھے اور برما میں تعینات تھے۔ میں وہیں 1929ء میں پیدا ہوئی۔ میٹرک تک تعلیم رنگون میں حاصل کی۔ پھر والد صاحب نے ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی اور کیلیفورنیا میں رہائش اختیار کرلی۔ وہاں انہوں نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کردی جو بڑی کامیابی سے چلنے لگی مگر افسوس کہ جلد ہی انہیں، موت کی طرف سے بلاوا آ گیا۔اس وقت میری

عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی والدہ اس صدمے سے جانبر نہ ہوسکیں اور دو تین سال کے اندر اندر وہ بھی وفات پا گئیں۔

میں دنیا میں یک وتنہا رہ گئی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ بہن بھائی کوئی نہ تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری میں ہمیشہ سے ایک اچھی سٹوڈنٹ تھی والد مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور یونیورسٹی آف میڈیسن کے لئے کیلیفورنیا سے گریجویشن کر لی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اس لئے مختلف اخبارات میں وقائع نگاری اور مضمون نویسی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور پرائیویٹ پریکٹس کے ساتھ ساتھ شراب، تمباکو نوشی اور دیگر منشیات کے خلاف لیکچر بھی دینے لگی۔ ان لیکچروں کے سلسلے میں مجھے امریکہ اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دنیا بھر کی سیاحت کی۔ حتیٰ کہ بالآخر میں نے آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ وہیں کلینک بنالیا اور فری لانسر صحافی کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ اس سے مجھے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔

سوال: اسلام سے آپ کب اور کیسے متعارف ہوئیں؟

جواب: میرا آبائی مذہب عیسائیت ہے۔ میں کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتی تھی مگر سچی بات ہے کہ اس مذہب نے مجھے کبھی متاثر نہ کیا۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے تھے اور میں پادریوں اور دیگر متعلقہ لوگوں سے بحث کرتی تھی مگر کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملتا تھا۔ مثال کے طور پر تثلیث کا عقیدہ اتنا مہمل اور مضحکہ خیز ہے کہ کوئی باہوش انسان اسے قبول نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ یہ بھی بتاتی چلوں کہ میرے ضمیر نے مجھے شراب نوشی اور عیش پرستی سے دور رکھا ہے۔ میں نے کبھی گوشت نہیں کھایا، کافی تک نہیں پی۔ سبزیوں اور پھلوں کے جوس پر گزارہ کرتی رہی ہوں میرا وجدان کہتا تھا کہ جو انداز یورپ نے اختیار کر رکھا ہے یہ خلاف فطرت ہے۔

چنانچہ تلاش حق کی خاطر میں نے دیگر مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ مثلاً جواڈازم، کنفیوزم اور ہندومت، مگر کسی سے بھی میری تسکین نہ ہوئی اس ضمن میں میں نے اسلام کے بارے میں بھی کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے اچھے اصولوں سے میں متاثر تو ہوئی مگر تصویر واضح نہ ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ان کتابوں کے مصنف یورپ کے متعصب عیسائی تھے اس لئے میں اپنے دل میں اسلام کے بارے میں نرم گوشہ رکھنے کے باوجود اس سے دور رہی۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے محترمہ مریم جمیلہ کی کتب کا مطالعہ کیا اور پھر جب 1960ء کے لگ بھگ صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ میں پاکستان آئی اور مریم جمیلہ سے ملی تو میں ان کی سادگی اور شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ انہوں نے ایک ایسے شخص سے شادی کی جو پہلے ہی شادی شدہ تھا اور اس کے بچے بھی تھے۔ وہ اپنی ضعیف العمر ساس کی خوب خدمت کرتیں اور خاموشی اور وقار کے ساتھ خدمت دین میں مصروف رہتی ہیں۔ مریم

جمیلہ نے مجھے مولانا مودودیؒ سے بھی متعارف کرایا۔ اور ان کی ایک کتاب ''ٹو ورڈز انڈرسٹینڈنگ اسلام'' پڑھنے کو دی۔ اس کتاب سے مجھے اسلام کا بھرپور تعارف حاصل ہوا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ اسلام ایک وسیع اور فطری مذہب ہے، توحید کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے اور نظر آنے والی ہر چیز خدا کی وحدانیت پر شاہد عادل ہے۔ آسٹریلیا واپس جا کر میں اپنے آپ کو اسلام قبول کرنے کے لئے تیار کرنے لگی۔ مگر بدقسمتی سے ایک روز ایک حادثہ رونما ہوا۔ میں گر پڑی اور ٹخنے کے قریب سے میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں ایک عرصے تک ہسپتال کے بستر پر پڑی رہی۔ اس عالم میں صرف خدا کی یاد اور دعا ہی ایک سہارا تھا۔ جس نے مجھے دوبارہ صحت یاب کیا۔ میں دوسری مرتبہ پاکستان آئی۔ مریم جمیلہ سے ملی، قبول اسلام کی خواہش ظاہر کی اور انہی کے مشورے پر منصورہ آ کر میاں طفیل محمد صاحب کی وساطت سے اس مقدس اور عظیم نعمت سے سرفراز ہوئی ہوں۔ اس سعادت پر میں اللہ کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

سوال: آپ کے اس فیصلے پر آپ کے خاندان اور سوسائٹی پر کیا ردعمل ہوگا؟

جواب: جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ میرا کوئی خاندان نہیں۔ میں نے شادی نہیں کی اور اس کا سبب یہ تھا کہ یورپ کے معاشرے میں مرد عورت سے خلوص کا رشتہ ہرگز نہیں رکھتے۔ وہ عورت کو کھلونا اور تفریح اور عیش پرستی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور مجھے ان کی ان حرکتوں سے بیزاری رہی ہے۔ مجھے کوئی مخلص اور انسانی قدروں کا حامل مرد نظر ہی نہیں آیا اس لئے میں شادی نہیں کر سکی۔

بہر حال جہاں تک عام ملنے والوں اور سوسائٹی کا تعلق ہے تو میں جانتی ہوں کہ ان کا ردعمل خوش گوار نہیں ہو گا۔ وہ ناک بھوں چڑھائیں گے مضحکہ اڑائیں گے، مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ یوں بھی اب میں آسٹریلیا میں نہیں رہنا چاہتی۔ واپس جا کر فلیٹ بیچوں گی اور مصروفیات کو سمیٹوں گی اور پاکستان یا سعودیہ چلی جاؤں گی۔ میری خواہش ہے کہ میری باقی ماندہ زندگی مدینہ میں گزرے یا لاہور میں۔ میں مکہ معظمہ جا کر حج کرنے کا فوری ارادہ بھی رکھتی ہوں یوں بھی شاید آپ جانتے ہوں کہ آسٹریلیا کی معاشرتی زندگی میں عام یورپ کی طرح سکون اور چین نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ چوری، قذاقی اور جرائم کی بھرمار ہے۔ بچے بوڑھے، عورتیں منشیات کے عادی ہیں۔ جنسی بے راہ روی آخری حدوں کو پھاند چکی ہے اور معمولی بات پر مکان جلا دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کچھ بعید نہیں کہ میں واپس جاؤں تو اپنا فلیٹ جلا ہوا دیکھوں سڈنی میں تھوڑی دیر کے بعد فائر بریگیڈ کی موٹریں شور مچاتی بھاگتی دکھائی دیتی ہیں اور یہ وہاں کی زندگی کا المناک معمول بن گیا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں تبلیغ اسلام کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: صرف ایک اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے کردار اور عملی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لیں۔ یورپ کا انسان اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ اس کے مذہب میں اتنی سکت نہیں کہ اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس کی تہذیب نے پوری زندگی کو جہنم میں بدل دیا ہے، اس کی روح پیاسی ہے اور یہ پیاس اسلام اور صرف اسلام ہی

بچا سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ عام مسلمان اسلامی زندگی سے دور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب یورپ کا تعلیم یافتہ انسان اسلام کے بارے میں پڑھتا ہے تو وہ اس کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ مگر جب عالم اسلام کی ناگفتہ بہ صورت حال کو دیکھتا ہے تو وہ پریشان اور مایوس ہو کر اسلام سے دور رہتا ہے۔ اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مسلمان اسلام کو صحیح معنوں میں عملی طور پر اختیار کریں تب پورا امریکہ و آسٹریلیا اور جاپان سمیت اسلام کی آغوش میں آ رہے گا۔

سوال: کوئی ایسی اسلامی شخصیت جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو؟

جواب: جی ہاں! میں محترم مریم جمیلہ سے بے حد متاثر ہوئی ہوں انہوں نے اپنی قدیم خاندانی ملکی روایات کو ترک کر کے مکمل اسلامی انداز اپنا لیا ہے۔ وہ بہت ہی سادہ و خاموش زندگی بسر کرتی ہیں۔ خاوند اور ان کی نوے سالہ بوڑھی والدہ کی خدمت کرتی ہیں بچوں کی شفقت ومحبت سے پرورش کرتی ہیں اور ملنے والوں سے بہت ہی تپاک سے پیش آتی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ایسی گراں قدر کتابیں لکھی ہیں جنہوں نے ایک طرف مغربی تہذیب کا ملمع اتار پھینکا ہے اور دوسری جانب اسلام کی حقانیت واضح اور روشن کر دی ہے۔ میں دیکھ کر حیران ہوئی ہوں کہ محترمہ جمیلہ ٹی وی نہیں دیکھتیں۔ میک اپ اور آرائش کے سامان کی پرواہ نہیں کرتیں۔ تعیشات سے بے نیاز ہیں۔ میں نے اس خاتون کو عظمت کی بلندیوں پر دیکھا ہے اور انہی کی کتابوں اور شخصیت سے متاثر ہو کر اسلام کے حلقے میں آئی ہوں میں اس عظیم عورت کی شکر گزار ہوں اور اسے سلام کرتی ہوں۔

سوال: مولانا مودودیؒ کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب: میرے دل میں مولاناؒ کا بے حد احترام ہے میں نے قبول اسلام سے پہلے ان کی کتابیں بھی پڑھی تھیں اور اسلام کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں ان کے احترام میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات میں اضافہ کرے اور ان کے مشن کو کامیابی عطا کرے۔ آمین

سوال: کوئی پیغام جو آپ پاکستانی مسلمانوں کو دینا چاہتی ہیں؟ خصوصاً خواتین کو۔

جواب: میں اپنی مسلمان خواتین بہنوں تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ اسلام کے نظام عدل کو اختیار کریں اور جو طریق زندگی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے وضع کیا ہے۔ وہی اختیار کریں۔ میں نے شلوار قمیص، چادر اور برقعے سے بڑھ کر اچھا لباس خواتین کے لئے کوئی نہیں دیکھا۔ اسی سے خواتین کی عزت ہے اور یہی چیز معاشرے کو مختلف قباحتوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے، میں ان تک یہ بات پہنچانا چاہتی ہوں کہ یورپ میں عورتوں کا لباس انتہائی لچر اور توہین آمیز ہوتا ہے، خدا کے لئے اس کی نقالی سے بچیں اور پردے کا وہ انداز اختیار کریں جس کی تلقین اسلام نے کی ہے۔

وضاحت...... محترمہ مس خدیجہ کے بارے میں یہ امر خاصا ایمان پرور ہے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا تو انہیں نیم

بے ہوشی کی حالت میں ''یوسی ایچ'' میں داخل کرایا گیا۔ تین چار روز کے بعد انہیں ہوش آیا اور پتہ چلا کہ وہ یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال کے بستر پر پڑی ہے تو وہ سخت برہم ہوگئیں۔ بار بار کہتی رہی کہ مر جاؤں گی مگر کسی عیسائی کے ہاتھ سے دوائی نہیں کھاؤں گی وہ کرب سے کہتی تھی۔ کیا میں نے عیسائیت ترک کر کے اس لئے اسلام قبول کیا ہے کہ مجھے عیسائیوں کے ہسپتال میں موت آئے۔ اس نے بے حد اصرار کیا کہ مجھے جلد از جلد اس ہسپتال سے نکالا جائے۔ پھر اسے دوسرے ہسپتال میں منتقل کیا گیا۔ جہاں وہ 29 ستمبر 1981 کو خالق حقیقی سے جا ملی۔ اسی شام منصورہ میں میاں طفیل محمد ہی نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور عقیدت واحترام سے قریبی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ یوں اس کی یہ خواہش عجیب وغریب طریقے سے پوری ہوگئی کہ وہ آسٹریلیا چھوڑ کر مستقلاً پاکستان میں مقیم ہونا چاہتی ہے۔

(بحوالہ: ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' عبدالغنی فاروق)

محترمہ فاطمہ ہیرین (جرمنی)

میری پیدائش 1934ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں جرمنی میں ایک نئے فیشن کی ابتداء ہوئی تھی۔ لوگ ہر طرح کے چرچ (کیتھولک یا پروٹسٹنٹ کی رکنیت ترک کر کے Gottg Lubig کا مسلک اختیار کر رہے تھے۔ جس کا مطلب ہے خدا پر برائے نام اعتقاد تو رکھنا مگر اعمال کی بنیاد اور عمارت اس کے بالکل برعکس ہونا۔ میں سات برس کی تھی کہ ایک روز ایک بڑی عمر کی لڑکی نے مجھے بتایا کہ ''خدا کا کہیں وجود نہیں ہے'' اس عمر میں مجھے وہ لڑکی خاصی سمجھدار لگتی تھی۔ اس لئے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس سے قبل یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ کرسمس کے موقع پر ''سانتا کلاز'' کے نام سے جو بوڑھا خدا کی طرف سے کھلونے لے کر آتا ہے۔ وہ محض بچوں کا بہلاوا ہے اور بس۔ ان دونوں باتوں سے مذہب اور خدا پر میرا ایمان اٹھ گیا۔ اور یہ دنیا ہی میری توجہات کا مرکز بن گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دوسری عالمی جنگ شباب پر تھی۔ دن رات بموں کے خوفناک دھماکے کانوں کے پردے پھاڑتے رہتے۔ ماں چوبیس گھنٹے فوجیوں کے لئے دستانے اور جرابیں بناتی اور باپ کبھی کبھار ایک دن کے لئے گھر آتا اور پھر ہفتوں کے لئے غائب ہو جاتا۔ ہمارے پڑوس میں ایک بہت بڑا مکان تھا جو زخمیوں کے ہسپتال میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو اجنبی قسم کے لوگوں نے ہمارے مکان پر قبضہ کر لیا۔ جنگ کے موضوع پر امریکی فلمیں عام طور پر دکھائی جانے لگیں۔ جن کے مناظر مجھے رلا دیتے اور میرا دل پگھل کر موم ہو جاتا۔ ابھی میں یہ فیصلہ تو نہ کر سکی کہ حق پر کون ہے اور غلط کون، تاہم ہر چیز سے ظلم اور حماقت ٹپکتی نظر آنے لگی۔ ذہن میں بے شمار سوال پیدا ہوتے۔ مگر کسی کے پاس ان کا تسلی بخش جواب نہ تھا۔ اب مجھے خدا یاد آنے لگا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ کیتھولک چرچ میں نظر آتا تھا۔ نہ پروٹسٹنٹ عقائد میں اور نہ بظاہر پارسا قسم کے پادریوں میں۔ پھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان سارے عقائد کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی۔ وہ سراسر خلاف عقل اور ناممکنات

میں سے دکھائی دیتے تھے اور جن تعلیمات کا پرچار کیا جاتا تھا۔ وہ قطعی ناقابل عمل تھیں۔ ظاہر ہے میں اس عقیدے کو کیوں قبول کرتی کہ اگر میں اپنے گناہوں کا اقرار کر بھی لوں اور ان پر ندامت کا اظہار بھی۔ تب بھی مجھے ضرور سزا ملے گی۔

یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں کہ جرمنی کی تمام لڑکیوں میں سے میں ہی وہ پہلی لڑکی تھی۔ جو ایک ایسے یورپین نوجوان سے ملی جس نے سات برس پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا اور جب مجھے پتہ چلا کہ وہ اسلام کا پیروکار ہے تو میں نے اسلام کے متعلق جاننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ان دنوں تمام مذاہب کی طرف سے مایوس ہو کر میں روحانی طور پر اپنے آپ کو زخم خوردہ محسوس کر رہی تھی، چنانچہ جب اس نوجوان نے لفظ اسلام کی وضاحت کی یعنی بغیر کسی خارجی جبر کے اللہ کی حاکمیت کے آگے سر جھکا دینا۔ تو یوں لگا جیسے میرے اندر کوئی روشنی کروٹیں لینے لگی ہے۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ دنیا کی تمام مخلوقات یعنی انسان، حیوانات، اشجار وغیرہ اکل وشرب، افزائش بنیادی طور پر مسلمان ہیں اگر ان امور میں وہ خدائی قوانین کی خلاف ورزی کریں گے تو اپنا وجود کھودیں گے۔ یہ صرف انسان ہے جو روحانی طور پر بھی مسلمان ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس معاملے میں اس پر کوئی جبر نہیں ورنہ جہاں تک مادی ضرورتوں کا تعلق ہے وہ بھی خدا کے قانون کا اسی طرح پابند ہے جس طرح دیگر مخلوقات۔

یہ منطق بڑی زبردست تھی۔ اسے کوئی عقل سلیم کا مالک جھٹلا نہیں سکتا۔ اسلام کی دیگر تعلیمات میں بھی عقل عام کی یہی کارفرمائی نظر آئی اس کے بعد میں نے جرمن زبان میں اسلام پر وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو غیر متعصب اور منصف مزاج مصنفین نے لکھی تھیں۔ خصوصاً محمد اسد کی کتاب ''اے روڈ ٹو مکہ'' نے میرے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اور مجھے پتہ چل گیا کہ اسلام کی ہر تعلیم اپنے پس منظر میں کوئی نہ کوئی زبردست حکمت رکھتی ہے۔ ساتھ متذکرہ نوجوان جواب میرے شوہر ہیں کے لیکچر بھی جاری رہے وہ ہر سوال کا جواب شرح وبسط کے ساتھ دیتے۔ حتیٰ کہ خدا نے مجھے کلی اطمینان قلب عطا فرما دیا اور میں مسلمان ہو گئی۔

قلبی طور پر تو میں پہلے ہی مسلمان تھی اب میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ آیا میں اسلامی قوانین پر عمل بھی کر سکتی ہوں یا نہیں۔ چنانچہ قبول اسلام کے بعد 1959ء کا پہلا رمضان آیا تو میں نے روزے رکھنے کا عہد کر لیا۔ اس وقت مجھے یہ کام سب سے مشکل اور سخت لگتا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے سارے روزے پابندی سے رکھے اور یوں مجھے احساس ہو گیا کہ جب کوئی کام اللہ کی محبت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ اتنا مشکل نہیں رہتا۔ جتنا شروع میں دکھائی دیتا ہے۔

میرے قبول اسلام کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نے جرمنی چھوڑ کر کسی اسلامی ملک چلے جانے کا ارادہ کر لیا ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ جب تک ہم مالی طور پر آزاد اور خود مختار نہیں ہوں گے۔ ہم یہاں اسلامی اصولوں پر عمل نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر میرے خاوند ایک فرم میں ملازم تھے۔ انہوں نے ظہر کی نماز کے لئے صرف

پندرہ منٹ کی چھٹی کر لی تو ان کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی۔ پھر ان کے دفتر میں تین لڑکیاں سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتی تھیں اور پردے کے اسلامی تقاضے سخت مجروح ہوتے تھے۔ خود میرے لئے سوسائٹی میں باپردہ ہونا دشوار ہو گیا۔

ہم نے کئی اسلامی ملکوں میں ہجرت کی کوشش کی اور بالآخر یہ پاکستان تھا جہاں ہمیں پناہ ملی۔ یہاں میرے خاوند کو ایک معقول ملازمت مل گئی اور ہم اس نئے وطن میں چلے آئے میں نے اپنی والدہ، والد، بھائیوں اور بہنوں کو چھوڑا تھا۔ وطن اور اس کی رنگینیوں کو خیر باد کہا تھا اور یورپین معاشرے کی تمام تر آزادیوں اور لذتوں اور راحتوں کو ٹھوکر ماری تھی۔ مگر میں بہت خوش تھی اور نا قابل بیان قسم کا روحانی سکون محسوس کر رہی تھی۔

یہ ساری داستان سنانے کا مدعا تو یہ ہے کہ مغرب کی ساری چمک دمک اور خوشحالی اسلام کی نعمت خداوندی کے سامنے قطعی ہیچ ہے، اس میں روحانی خوشی ہے، اسی میں دنیاوی برکتیں ہیں اور اسی میں اخروی نجات ہے۔

وضاحت: محترمہ فاطمہ ہیرین اور ان کے خاوند ڈاکٹر عمر عبدالعزیز کراچی میں آکر مقیم تو ہو گئے مگر افسوس کہ وہ یہاں کے ماحول سے سخت بددل ہوئے اور چند ہی سالوں کے بعد جرمنی واپس چلے گئے اور آج کل وہیں دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ محترمہ فاطمہ ہیرین نے مولانا مودودیؒ کی ''دینیات'' کے علاوہ متعدد دینی کتابوں کا جرمن میں ترجمہ کیا ہے۔ دونوں میاں بیوی آج بھی راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان ہیں۔

(بحوالہ: ہم کیوں مسلمان ہوئے۔ عبدالغنی فاروق)

راجکماری جاوید بانو بیگم (ہندوستان)

کلکتہ کی مشہور نومسلم خاتون محترمہ جاوید بانو بیگم بنگال کے ایک ہندو راجہ کی صاحبزادی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کی حامل تھیں۔ انہوں نے کامل تحقیق کے بعد اسلام قبول کر لیا اور اس سلسلہ میں بہت سی تکلیفیں برداشت کیں۔ ذیل کی تقریر انہوں نے قبول اسلام کے بعد کلکتہ کے ایک جلسہ میں کی۔

برادران اسلام وخواہران دین! میں ایک نومسلمہ ہوں اور میں ایک سچے اور عالمگیر مذہب اسلام کو پا کر بہت ہی خوش ہوئی ہوں۔ میرا دل خوشی سے لبریز ہے اور میری دلی آرزو ہے کہ میں ہر انسان سے جس تک میری رسائی ہو۔ اپنے آقائے نامدار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق اور تعلیمات کا ذکر کروں۔

شاید آپ میرے تجربات کا مختصر خلاصہ جو مجھے تحقیق مذاہب کے سلسلہ میں پیش آئے سن کر مسرور ہوں گے۔ میں ہندو والدین کے گھر پیدا ہوئی مگر ہماری پرورش عیسائی اثر کے تحت ہوئی۔ ہندو مذہب کی مطلقاً کوئی واقفیت نہ تھی۔

میں نے 1924ء میں مذہب اور فلسفہ کا وسیع طور پر مطالعہ شروع کیا۔ میں ان کا مطالعہ عالم فاضل بننے کے لئے نہ کرتی تھی۔ بلکہ تحقیق حق میرا منشا تھا۔ میرے دل میں خدا تعالیٰ کے ایک مخلص اور صادق بندے کی طرح

عبادت کرنے کی تڑپ ہوئی تھی۔ میں نے بدھ مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکامی کا سامنا ہوا۔ عیسائیت کی طرف جو سمجھنے میں نہایت سیدھی سادھی معلوم ہوئی، رجوع کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے عیسائی پادریوں سے رابطہ کیا۔ تاہم مجھے کوئی ایسا راستہ نہ ملا جس سے میں دور حاضر میں عیسائیت کی ایک مخلص اور صادق متبع بن سکوں۔ گو بڑے بڑے دلائل و براہین پیش کیے جاتے تھے۔ لیکن میں عیسائی گرجوں کی لاتعداد فرقہ بندیوں میں ذاتی اغراض اور شخصی مطلب کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکی۔ اور بالکل ناامید ہو کر دوبارہ ہندو مذہب اختیار کر لیا۔

کیونکہ ویدوں کا فلسفہ ایک ایسے دماغ کے لئے جو مذہب کی کمزوریوں سے مضطرب اور متنفر ہو چکا ہو، ایک کافی وشافی سہارا تھا۔ لیکن ویدوں کی فلاسفی بھلا ہندوؤں کے لئے کیسے مفید ہو سکتی ہے کیونکہ جہاں تک عملی زندگی اور حقائق کا تعلق ہے۔ ہندو مغربی مہاراج کے زمانہ سے لے کر آج تک ویدانت سے اتنے ہی دور ہیں جتنا کہ اس فرضی مخلوق سے جس کا چاند میں ہونا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ویدوں کی پیروی کے لئے ایک ہندو پر لازم ہے کہ یا تو وہ موجودہ ہندو مذہب سے کنارہ کش ہو جائے یا تمدنی مصلح بن کر ان بے شمار فرقوں میں ایک اور فرقہ کا اضافہ کرے۔ جس کے اندر زمانہ حال میں ہندوستان ڈوبا جا رہا ہے۔ ہندوؤں کی حالت قابل رحم ہے۔ بڑی خامیاں اور نقائص روز افزوں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ان پر دوسرے مذاہب پیرو تبصرہ نہیں کرتے بلکہ ہندو خود ان کو آشکار کرتے رہتے ہیں۔ گاندھی مہاراج ہریجنوں کے لئے اپنی زندگی کو مہلک خطروں میں کیوں ڈالتے ہیں؟ مجلس قوانین کے ذریعہ بیوگان کی شادی کو جائز قرار دیا گیا ہے؟ سلطنت برطانیہ کے ایک قانون کے تحت رسم ستی کو کیوں روکا گیا؟ تمام تمدنی اصلاحات کو مجالس قوانین ساز کے ذریعہ کیوں دائرہ عمل میں لایا جاتا ہے؟ اس مذہب کا فائدہ ہی کیا جو دماغی نشو ونما اور تمدنی اصطلاحات کو دوسری تمام برائیوں سے محفوظ رکھنے سے عاجز ہے؟

مندرجہ بالا حقائق سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے سچے مذہب اسلام کو قبول کرنے میں کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ اسلام کے علاوہ اور کوئی مذہب دنیا میں ایسا نہیں جس کے عقائد کو اس کے پیرو ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ صحیح تسلیم کرتے ہیں آخر کار میں نے صداقت کو پا لیا۔ میں بہت ہی خوش ہوں اور میری روح مطمئن ہے کیا ہم آج کسی ایسی مذہبی یا تمدنی اصلاح کے درپے ہیں جس کی تائید قرآن پاک سے نہیں ہو سکتی؟ کیا ہمارے آقائے نامدار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام روحانی رہنماؤں میں ایک ایسی شخصیت نہیں جنہوں نے آزادی، اخوت و مساوات ایسے زریں عمل بتائے ہیں۔ جن کے ذریعے ہم صراط مستقیم پر چل کر نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ صرف اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جو روز مرہ زندگی میں ہمارا سچا رہنما ہو سکتا ہے کیا دنیا میں سوائے اسلام کے ایسا مذہب ہے۔ جس میں خدا کا نام عالمی زبان میں ہو؟ اللہ کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے خواہ وہ چینی ہوں یا ہندی یکساں ہے۔ السلام علیکم تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی ہونے کا سبق دیتا ہے خواہ کسی قومیت اور کسی ملک کے ہوں اور ان کی زبان ہو۔

کیا دنیا میں کسی مذہب کی الہامی کتاب اپنی فراخدلی اور فیاضی پر ناز کر سکتی ہے۔ سوائے ہمارے قرآن کریم

کے جس میں ہر ایک مسلمان کو کہا گیا ہے کہ ان کے لئے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

صرف اسلام ہی انصاف وانسانیت اور آزادی کا مذہب ہے جس کی مثال اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ ہمیں اسلامی اصولوں کے تحت جائیداد پر قابض ہونے کے لئے کونسل وقانون کے دروازے کھٹکھٹانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ تمام قوانین اب سے 1300 سو سال قبل ہم مسلمانوں کے لئے اتارے گئے تھے۔ آج کل مذاہب عالم جس مقصد کو اپنا نصب العین بنا کر اخلاقی اور تمدنی، معاشرتی فوائد کے لئے سرگرداں ہیں۔ وہ تمام فوائد مسلمانوں کے لئے جس دن سے قرآن مجید نازل ہوا موجود ہیں۔

میرے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ میں ایسے مذہب میں رہتی ہو جو ہماری موجودہ اور روزمرہ کی زندگی سے کوسوں دور ہے۔ میں کس طرح ایک مخلص ہندو یا عیسائی ہو سکتی تھی۔ جبکہ انسانی اصول اور تہذیب مجھے ان مذاہب کی تعلیمات کے بالکل مخالف کھڑا کرتے ہیں اگر کوئی مذہب ہمیں روزمرہ کی زندگی میں تسکین نہیں دے سکتا تو کیوں اسے مذہب کے نام سے موسوم کیا جائے یقیناً ایسے تمام مذاہب نامکمل ہیں۔ اگر ان میں ذرا بھر بھی صداقت موجود تھی تو وہ بھی اب زمانہ سے مفقود ہوئی جاتی ہے۔ میں نے اس صورت حال کو محسوس کیا اور اس پر غور کیا تو میرے لئے اسلام قبول کرنا ضروری ہو گیا۔ کیونکہ میں نے اس میں تمام صداقتیں دیکھ لیں۔

اسلام میں وہ ہر ایک بات پائی جاتی ہے جس کے دوسرے تمام مذاہب کے پیرو متلاشی ہیں۔ اسلام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں۔ میں یقین واثق سے کہتی ہوں کہ کوئی دوسرا مذہب اصلاح اور خوشی کا موجب نہیں ہو سکتا، سوائے اسلام کے جو خدا کی سچی محبت، انسانیت کی سچی الفت اور حقانیت پر مبنی ہے۔ اسلام کو کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے بنیادی اصول وحدانیت، حقانیت اور اخوت ومساوات بے حد معقول، موثر، مفید اور فطری ہیں۔ (بحوالہ: ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' مصنف عبدالغنی فاروق)

محترمہ فاطمہ (چیکوسلواکیہ)

سوال: آپ کا تعارف اور قبول اسلام کی وجوہات؟

جواب: میرا مسیحی نام مونیکا تھا۔ اسلامی نام فاطمہ۔ 2 ستمبر 1943ء کو چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں مغربی جرمنی میں رہائش اختیار کر لی۔ وہاں 21 اپریل 1963ء کو بیس برس کی عمر میں ایک ترک عالم استاد عمر کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

جہاں تک قبول اسلام کی وجوہ کا تعلق ہے تو بچپن ہی سے میرا ذہن غور وفکر کا عادی رہا ہے ہر معاملے کی عقلی توجیہہ پیش کرنا اور حالات وواقعات کی فلسفیانہ بنیادیں تلاش کرنا میرا پسندیدہ عمل تھا۔ اس پہلو سے جب اپنے مذہب عیسائیت پر غور کیا تو ذہن کو شدید دھچکے لگے اور یہ مذہب مجھے قطعی غیر عقلی اور غیر منطقی نظر آیا۔ گھبرا کر دوسرے مذاہب مثلاً یہودیت اور ہندومت کا مطالعہ شروع کر دیا۔ مگر دماغ نے انہیں قبول نہ کیا۔ گوہر مراد

اگرچہ ہاتھ نہ آیا مگر میرا وجدان کہتا تھا کہ خالق کائنات نے انسان کو ازلی ہدایت سے محروم نہیں رکھا اور میں اس ہدایت کو ایک روز ضرور پالوں گی۔

یہ وہ ایام تھے جب میرے والد چیکوسلواکیہ کو خیرباد کہہ کر مغربی جرمنی میں آباد ہو گئے تھے۔ مغربی جرمنی میں لاکھوں کی تعداد میں ترک باشندے کام کرتے ہیں۔ مذاہب کے معاملے میں میرا تجسس ان کے قریب لے گیا اور مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ یہ لوگ اپنے خاندانی و معاشرتی نظام کے اعتبار سے یورپ کے اندھیروں میں روشنیوں کے مینار دکھائی دیتے تھے اور یہیں سے میں ان کے مذہب اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے بارے میں میرا ابتدائی تاثر کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ کیونکہ میرے جاننے والے مسلمانوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے۔ جو محض موروثی طور پر اسلام سے منسوب تھے یا جو اسلام کی ایسی بگڑی ہوئی شکل سے وابستہ تھے جو مشرق میں رواج پا گئی ہے۔ اس کے باوجود میں ان کے بلند اخلاق سے متاثر ہوئی اور میں نے اسلام کو سمجھنے کے لئے اس کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ اسلام کے بارے میں کتب کا مطالعہ کیا۔ قرآن کا ترجمہ پڑھا اور ایک فاضل ترک استاد عمر سے طویل گفتگوئیں کیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسلام کی اصل تعلیمات اور مسلمانوں میں مروج رسوم و رواج ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اسلام بعینہ وہی مذہب ہے جس کی تلاش میرے وجدان اور روح کو ایک لمبے عرصے سے تھی۔

میں نے قرآن کریم میں پڑھا کہ اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا دل اسلام کے لئے کھول دیتا ہے، فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ اسلام مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کی بے میل اور پاکیزہ تعلیمات میری عقل اور فطرت کو اپیلیں کرنے لگیں۔ میرے لئے سب سے زیادہ پرکشش اسلام کا مثالی معاشرتی نظام تھا جو بلا تمیز و رنگ و نسل سب انسانوں میں برابری اور مساوات پر استوار ہے پھر روحانی اور دنیاوی معاملات میں بے پناہ آسانی اور رخصت اور دونوں کے تقاضوں کو توازن و اعتدال کے ساتھ انجام دینے کی ترغیب۔ علم و عقل کی یہ کارفرمائی کہ طلب علم مرد و عورت سب پر فرض ہے پھر عورت کو جب بلند مرتبہ اور عزت و احترام دیا گیا اس سے تو میری روح جھوم جھوم اٹھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا اور انسان کے درمیان بلاواسطہ تعلق ان سب چیزوں نے میرے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلسفی نہیں تھے اللہ کے رسول، سچے پیغمبر تھے۔ اسلام ان کے ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ وحی الٰہی کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے۔ جس کی طرف اللہ نے شروع ہی سے انسانوں کی رہنمائی کی ہے اور آج بھی صرف اسی مذہب میں یہ حوصلہ ہے کہ زمانے کے مسائل کا سامنا کر سکے اور دکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھے اس یقین کے فوراً بعد میں نے اسلام قبول کر لیا۔

سوال: آپ کے قبول اسلام کا ردعمل آپ کے خاندان اور حلقہ تعارف میں کیا ہوا؟

جواب: ردعمل مختلف نوعیت کا تھا۔ والدہ بے اختیار رو پڑیں اور مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے کہا: ''میری خواہش کا احترام اسلام قبول کرنے سے اہم اور باسعادت ہے'' میری دادی نے اسلام کے بارے میں

مجھ سے گفتگو کی اور اعلان کر دیا کہ یہ ایک عمدہ دین ہے۔ اسے قبول کر کے مونیکا نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ میری ایک سہیلی نے میرے اس عمل کو گناہ قرار دے کر مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے برملا استہزا اور طنز کا رویہ اختیار کیا۔ مگر میں نے کسی کے منفی ردعمل کا کوئی اثر نہ لیا۔ میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا اور اس سے بال برابر پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سوال: آپ کے خیال میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں اشاعت اسلام کا آسان طریقہ جو ایک مبلغ یا طالب علم اختیار کر سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے عمل اور کردار سے عمدہ مثال پیش کرے۔ اخلاقی اعتبار سے انحطاط پذیر یورپین معاشرے کا ایک فرد جب کسی شخص کو ایثار، شرافت، دیانت، بے غرضی اور انسانی احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھے گا تو یقیناً متاثر ہو گا اور اسلام کے قریب آنے کی کوشش کرے گا لیکن افسوس کہ اسلامی دنیا اس اہم معاملے کی طرف سے غافل ہے اور باعمل و باکردار مسلمان بننے کی کوششیں نہیں کی جاتیں۔ فروغ اسلام کے راستے میں ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اشاعت اسلام کے لئے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ مسلمان کسی تبلیغی اور اشاعتی اسلامی جماعت سے رہنمائی حاصل کریں اور اہل علم کے تعاون سے بھرپور دینی اور علمی معلومات سے مالا مال ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے لئے حالات بہت ہی سازگار ہیں اس میں ایک عالم گیر دین بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ اس دور کے انسان کی تمام روحانی و مادی ضرورتیں پورا کر سکتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے پیروکار اس موقع سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں؟ (بشکریہ خدام الدین 11 جنوری 1980ء)

بیگم مولانا عزیز گل......انگلستان

مولانا عزیز گل شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ساتھ مالٹا میں اسیر تھے۔ ایک انگریز عورت نے مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ پھر انہی کے مشورے اور خواہش سے مولانا عزیز گل سے شادی کر لی۔ یہ آپ بیتی اس نیک بخت مومنہ کی ہے۔ مولانا عزیز گل ابھی تک بقید حیات ہیں لیکن یہ خاتون اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ چکی ہیں۔

میں اپنے والد چارلس ایڈورڈ اسٹیفورڈ اسٹیل کی ساتویں لڑکی ہوں۔ میں 1885ء میں حیدر آباد سندھ میں پیدا ہوئی۔ میرے والد صاحب انصاف پسند اور بات کے پکے انسان تھے۔ انہیں ہندوستان اور ہندوستانی لوگوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو سندھی کہہ دیا کرتے تھے۔ ہماری خاندانی نسبتیں بڑی عظیم تھیں مگر ہمارے والد کا کہنا تھا کہ شرافت کا معیار کردار ہے نہ کہ خون۔ بہرحال میں چھ سال کی ہی ہوں گی کہ مجھے تعلیم کے لئے

انگلستان بھیج دیا گیا۔ مجھے سچی بات سے ہمیشہ پیار رہا۔ میں ہر بات کا سبب کھوجنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

میں ایک عیسائی کنبے میں پیدا ہوئی مگر عیسائی کسی ایک عقیدے میں بھی متفق نہیں ہیں۔ عیسائیوں کے بہت سے فرقے ہیں جو ایک دوسرے کو جہنمی کہتے ہیں اس لئے عیسائی مذہب مجھے گورکھ دھندا سا لگا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں مگر مجھے دعا سے بڑا شغف تھا اور میں اکثر ان دیکھے مالک سے لو لگا کر دعا کرتی تھی۔ جب میں جوان ہوگئی تو میں نے بائبل کو تنقیدی نظر سے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے بائبل کے بہت سے بیانات ایک دوسرے سے متضاد محسوس ہوئے۔ مجھے بائبل کے کلام خدا ہونے میں شک ہونے لگا۔

کچھ عرصہ کے بعد میری شادی ہوگئی۔ مگر میرے شوہر ایک دنیادار عیسائی تھے۔ وہ میرے فکر و خیال کے ساتھی نہ بن سکے۔ اس لئے میں نے فرصت کے وقت فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا مگر ان خیالی بھول بھلیوں سے مجھے کچھ نہ ملا۔

انہی دنوں میں اپنے والد کے پاس ہندوستان آئی میری 12 سالہ لڑکی اور 10 سالہ لڑکا میرے ساتھ تھے۔ یہاں مجھے ویدانت پڑھنے کا موقع ملا۔ مجھے اس کے پڑھنے سے بڑی تسکین ملی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ چیز مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ ویدانت کے مطالعے نے مجھے ہندو دھرم کے قریب کر دیا میں کچھ عرصہ کے لئے ایک ہندو خانقاہ میں مہمان بن کر رہی اور بالآخر ہندو ہوگئی۔ مجھے راجا کرشن کے ویدانتی سلسلے میں داخل کر لیا گیا۔ مگر مجھے یہ شرک سا محسوس ہوا۔ چنانچہ میرا یقین ہل گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ حقیقت ابھی اور آگے ہے۔

میں اسی زمانے میں بیمار ہوگئی اور مجھے علاج کے لئے فرانس جانا پڑا۔ وہاں میرے سات آپریشن ہوئے۔ ہر آپریشن پر موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی میں چاہتی تھی کہ موت کے لئے تیاری کر لوں۔ میں نے سوچا کہ دنیا ترک کر دوں اور آخرت کی تیاری میں لگ جاؤں لہذا میں واپس جب ہندوستان آئی تو میں نے سنیاس لے لیا۔ میں نے ایک سو آٹھ اپنشد پڑھے، لیکن یہ کیا...... یہاں بھی بائبل کی طرح ان گنت تضاد تھے۔ ان میں کون سی بات حق ہے اور کون سی غلط ہے۔ یہ کیسے معلوم ہو۔ میں ایک بار پھر الجھ گئی مجھے خوف ہو گیا کہ اسی ذہنی الجھن میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ سنیاس سے میری روحانیت نہیں بڑھ رہی ہے، بلکہ نفسیاتی کشمکش میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ یہ خانقاہ میں بیٹھ کر دھیان گیان کا وقت نہیں ہے بلکہ باہر نکل کر زخمیوں اور دکھیوں کی مدد کرنے کا وقت ہے۔ میں نے اپنے گروجی سے بات کی مگر انہوں نے کہا: ہم لوگ دنیادار نہیں ہیں تم جن باتوں کے کرنے کو کہہ رہی ہو۔ وہ سیاست کی باتیں ہیں ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔

مجھے ان کے سوچنے کے اس انداز پر حیرت ہوئی۔ میں انہیں تو خانقاہ چھوڑ کر زخمیوں کی مدد پر آمادہ نہ کر سکی، مگر خود خانقاہ سے نکل آئی۔ میں نے زخمیوں، مریضوں اور دکھیوں کی مدد کی اس سے دل کو چین ملا اور میں نے

طے کر لیا کہ روحانی ترقی انسانیت کی خدمت کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ خانقاہوں کی زندگی سے نہیں۔ چنانچہ میں نے آشرم کھولنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں نوجوان لڑکوں کی اخلاقی تربیت کی جائے۔ اس آشرم میں، میں نے ہندوستان کی قید نہیں رکھی۔ وہاں ایک مسلمان لڑکا داخلے کے لئے لایا گیا۔ یہ لڑکا اپنے والدین کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ میں نے سوچا جب تک میں مسلمانوں کے نظام حیات کے بارے میں معلومات حاصل نہ کروں میں اس لڑکے کی تربیت کا حق ادا نہ کر سکوں گی۔ اس نیت سے میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔

اب تک میں مسلمانوں سے ڈرتی تھی۔ میں سمجھتی تھیں کہ مسلمان ایک قسم کے ڈاکو ہوتے ہیں جو ہر قسم کا ظلم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کتاب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ یہ تو سراسر حق تھا اور دل میں اترتا چلا جاتا تھا۔ یہ عملی ویدانت تھا۔ آہ! میں اب تک کن اندھیروں میں تھی افسوس کہ یورپی مستشرقوں نے اسلام کی کتنی غلط تصویر پیش کی ہے۔ وہ مذہب جسے میں خون خوار بھیڑیوں کا مذہب سمجھتی تھی مکمل سچائی کا دین تھا۔ ''میرے اللہ میں اب کیا کروں۔ میں نے تو ساری زندگی اکارت کر دی'' میں نے سوچا میں ہندو ہی رہوں یا ہندو مت کو چھوڑ دوں۔ میں نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ یہ ایک طرح کی موت تھی قرآن مجھے زندگی کی طرف بلا رہا تھا۔ ایسی زندگی کی طرف جو آخرت کی زندگی کی بنیاد بنتی ہے مگر مشکل یہ تھی کہ میں ایک مقدس خانقاہ کی راہبہ تھی۔ لوگ مجھے پیار سے ماں کہتے تھے۔ میں مسلمان ہو جاؤں گی تو دنیا کیا کہے گی؟ مگر مجھے اپنی روح کو خلجان سے بچانا تھا۔ میں نے لوگوں کے کہنے کی پرواہ نہ کی۔ میں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

میرے گرو بھائی بڑے دہشت زدہ ہوئے۔ مگر میں نے انہیں بڑے خلوص سے بتایا کہ اصل ویدانت یہ ہے کہ جو میں قبول کر رہی ہوں۔ میرے گرو بھائیوں نے کہا کہ یہ کام مسلمان ہوئے بغیر بھی جاری رہ سکتا ہے۔ ویدانتی رہ کر بھی تم قرآن کی راہ اختیار کر سکتی ہو۔ یہ بھی ویدانت کا ہی سلسلہ ہو گا۔ لیکن یہ بات میرے دل میں نہ اتر سکی؟ میں سمجھ رہی تھی راما کرشن نے حقیقت کا راستہ نہیں اختیار کیا تھا بلکہ وہ خود ان کے ذہن کی اپج اور ایک بھرم تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نام نہاد صوفی نے انہیں یہ بھرم دلا دیا ہو۔ میرے ہندو دوستوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے آپ کو مسلمان نہ کہوں تو وہ مجھے آگرہ میں راما کرشن مشن کا مہنت بنا دیں گے، مگر مجھے دنیاوی لالچ نہ تھا۔ مجھے روح کے آرام کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے ان کی بات کو رد کر دیا۔

اب ایک مشکل آئی۔ مسلمانوں نے مجھے مسلمان ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ہمیں ہندو بنانے کے لئے نیا روپ دھارن کر رہی ہے۔ میں خود شبے میں پڑ گئی۔ میں قرآن کو اپنا ہادی و رہنما مان رہی تھی تو کیا یہ بات مسلمانوں کے لئے کافی نہ تھی۔ اپنے دل کی بے قراری دور کرنے کے لئے میں دیوبند ہو گئی۔ میری لڑکی میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں بے پردہ تھیں ہم نے مولانا حسین احمد مدنی سے ملاقات کی۔ اپنی بات ان کے سامنے رکھی اور پوچھا: ''کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟''

تم ''حقیقتاً'' مسلمان ہو!'' مولانا نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تمہیں اس میں شک کیوں ہے؟''

مولانا حسین احمد صاحب کی عظمت ہم دونوں کے دل میں بیٹھ گئی۔انہوں نے ہماری بہت خاطر کی۔بعد کو وہ ایک بار مجھ سے ملنے منگلوار بھی آئے تھے۔انہی کے ساتھ مولوی عزیز گل بھی تھے۔مولانا حسین احمد مدنی انہیں بہت چاہتے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ وہ دو دوست لڑکے ہوں۔وہ ایک دوسرے سے مذاق کرتے،ایک دوسرے کی ہنسی اڑاتے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو چڑاتے بھی تھے۔مجھے ان کی محبت پر رشک محسوس ہوتا۔

وہ دن بھر ہمارے پاس رہے۔جب وہ چلنے لگے تو میں نے مولانا حسین احمد صاحب سے کہا کہ وہ پھر تشریف لائیں۔اس پر انہوں نے کہا کہ میں تو زیادہ نہ آسکوں گا مگر عزیز گل کبھی کبھی آیا کریں گے۔چنانچہ مولوی عزیز گل صاحب آتے رہے۔مین ان سے پردہ اور دوسرے مسائل پر بلا جھجک بات چیت کرتی رہی۔شروع میں یہ سمجھتی تھی کہ یہ مولوی بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔مگر بعد کو پردے کی حقیقت مجھ پر کھلی تو میں ان کی وسعت نظر کی قائل ہوگئی۔

یہاں میں اسلام کے مطالعہ میں لگی ہوئی تھی کہ اچانک میرے شوہر کا خط آیا کہ اگر میں فوراً انگلستان نہ لوٹی تو وہ مجھے خرچ دینا بند کر دیں گے۔بچوں کی تعلیم کا خرچ مجھ سے وصول کریں گے اور مجھ سے تعلق توڑ لیں گے۔اس پر مجھے تعجب ہوا نہ افسوس۔میں مسلمان ہو چکی تھی اب میں کسی عیسائی شوہر کی بیوی کیسے رہ سکتی تھی۔رہا رزق تو یہ اللہ کی دین ہے۔کم یا زیادہ ملے گا ہی۔

عزیز گل صاحب کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے میرا ہاتھ تھامنے کی پیش کش کو قبول کرلیا۔میں جانتی تھی کہ ان کے یہاں غربت ہے افلاس ہے،پردہ ہے مگر میرے لئے تو یہی اللہ کی پسندیدہ جگہ تھی عزیز گل صاحب کے گھر مجھے زندگی کی حقیقی راحت ملی وہ نہایت شریف اور مہربان شوہر ثابت ہوئے۔

یوں بھی وہ سید ہیں اور انہوں نے سیادت کی لاج رکھی ہے ان کے اجداد عرب سے افغانستان اور افغانستان سے ہندوستان آئے تھے اور راہ حق کی مسافرت میں مشرق مغرب کے لئے ہماری راہ ایک تھی ہماری منزل ایک تھی،ہماری روحیں ہم آہنگ تھیں۔ہم دونوں اللہ کے پیارے نبی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا ارادہ لے کر اٹھے تھے،مجھے خوشی ہے کہ اس راہ میں میری بیٹی،میرا بھائی بیٹا اور میری بیٹی سب مجھ سے ہمدردی کرتے رہے۔انہوں نے مجھے حق کی راہ میں قدم بڑھانے سے بھی روکا نہیں۔میری زندگی کا ایک سفر ہے،وہ ''برسوں کی محرابوں'' سے گزر کر اسلام کی حسین وادی میں ختم ہو رہا ہے۔

(بشکریہ ''الفرقان''،لکھنؤ ''ایشیاء'' لاہور)

عورت اور عصمت کا انجام...... اسلام سے روگردانی کے بعد

مغربی تہذیب وتمدن

علی عزت بگوچ (صدر بوسنیا) کی وہ کتاب جس پر فرانس نے پابندی لگادی۔

اس سے مغربی تہذیب کی ایک جھلک

امریکہ جو دنیا کا امیر ترین ملک ہے 1965ء میں یہاں پچاس لاکھ جرائم کئے گئے۔ جبکہ آبادی میں اضافے کی نسبت خطرناک جرائم میں اضافے کی شرح چودہ گنا زیادہ تھی۔ جرائم میں اضافے کی شرح ایک سو اٹھتر فی صد تھی۔ جبکہ آبادی میں اضافے کی شرح تیرہ فیصد تھی۔ اس امیر ترین ملک میں ہر بارہ سیکنڈ کے بعد کوئی نہ کوئی جرم سرزد ہوتا ہے۔ ہر ایک گھنٹے بعد ایک قتل ہو جاتا ہے۔ ہر پچیس منٹ کے بعد زنا کا واقعہ ہو جاتا ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک ڈاکہ پڑتا ہے اور ہر ایک منٹ کے بعد ایک کار چوری ہوتی ہے۔ اس ملک میں جرائم کی رفتار اور رجحان میں خطرناک اضافہ ہو رہا ہے۔ 1951ء میں ایک لاکھ باشندوں میں تین اعشاریہ ایک قتل ہوتے تھے۔ 1960ء میں پانچ اور 1967ء میں نو قتل، گویا سولہ سال کے اندر اندر قتل ہونے والوں کی تین گناہ بڑھ چکی ہے۔

مغربی جرمنی میں 1966ء میں بیس لاکھ جرائم درج ہوئے اور 1970ء میں چوبیس لاکھ تیرہ ہزار۔ پچھلے دس برسوں میں عمداً قتل کئے جانے والے افراد کی تعداد میں 35 فیصد اضافہ ہوا۔ جبکہ اسکاٹ لینڈ میں اس مدت کے دوران خوفناک جرائم کی شرح میں سو فیصد اضافہ ہوا۔ 1962ء سے 1970ء تک قتل کی وارداتوں میں 98.6 فیصد اضافہ ہوا۔

عوام الناس کی آراء سے مرتب کئے جانے والے چند گوشواروں سے معلوم ہوا کہ اہل فرانس اپنی روزانہ مصروفیات میں دنگے فساد کو سرفہرست رکھتے ہیں۔ جرائم خصوصاً نوجوانوں سے سرزد ہونے والے جرائم میں انتہا اضافہ ہو رہا ہے۔ 1950ء سے 1960ء تک فرانس میں چوریوں کی تعداد میں ایک سو ستر فیصد اضافہ ہو اس طرح بلجیئم میں 1960ء سے 1978ء تک جرائم کی رفتار میں دگنا اضافہ ہو گیا۔

ستمبر 1973ء میں ماہرین جرائم کی ساتویں بین الاقوامی کانفرنس بغداد میں منعقد ہوئی۔ اس میں متفقہ طور پر اعتراف کیا گیا کہ تمام علاقوں میں جرائم کی تعداد میں ناقابل فہم حد تک اضافہ ہوا ہے۔ اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے امریکہ کے ماہرین جرائم نے یہ رائے دی کہ ہمارا معاشرہ گناہگاروں کا سمندر ہے اور ہر شخص کم یا زیادہ گناہ کار اور مجرم ہے اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ (اس سے بچنے کا راستہ اسلام ہے۔

جسے ماننے میں ان کا تعصب مانع ہے (راقم)

برطانیہ کے ایک خیراتی فلاحی ادارے (Offered Help) نے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں ان کے مطابق برطانیہ میں 1973ء میں چار لاکھ شرابی تھے اور ان میں اسی ہزار عورتیں تھیں۔ رپورٹ کے مطابق نشہ کرنے والی ہر دوسری عورت، نفسیاتی ہسپتال کی مریضہ بن جاتی ہے اور ہر تیسری عورت کا انجام خودکشی ہوتا ہے۔

یورپ میں شراب کا سب سے زیادہ استعمال فرانس میں ہوتا ہے اس کے بعد اٹلی اور روس میں شراب نوشی کے نتیجے میں واقع ہونے والی اموات کے گراف میں 44.3 کی موت شراب نوشی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جبکہ فرانس میں ہر لاکھ افراد میں 35 افراد شراب نوشی کی کثرت سے مرتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ہر لاکھ افراد میں 35 شراب نوشی سے مر جاتے ہیں۔

ہماری صدی میں شراب نوشی دولت منداور ترقی یافتہ ممالک کے لئے ایک عظیم مسئلہ بن چکی ہے پہلے لوگ شراب نوشی کا رشتہ جہالت اور قدامت اور غربت سے دوڑتے تھے۔ اور امید کی جاتی تھی کہ شاید کچھ بہتری ہو جائے۔ لیکن اب ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کی شناخت ہی ممکن نہیں ہے اور نہ ان کا ذکر ہی کیا جاسکتا ہے اور ان سماجی برائیوں کی علامات کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت سویڈن میں سب سے زیادہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ رائے ایک سویڈش ماہر کی ہے۔ سویڈن والوں کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ہر دسواں شخص خواہ مرد ہو یا عورت کثرت سے شراب نوشی کا عادی ہے۔ حکومت سویڈن نے الکحل کے استعمال پر بھاری ٹیکس اور اضافی سرچارج عائد کئے لیکن اس کے اثرات بہت معمولی تھے۔

عریانی اور برہنگی کی بھی یہی بنیادیں ہیں۔ فرانس، ڈنمارک اور جرمنی جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ مہذب کہتے ہیں...... عریانی اور برہنگی میں بھی ان کا نام سرفہرست ہے۔ 1975ء سے فرانسیسی سینما گھروں میں جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں ان کا نصف حصہ برہنہ فلموں پر مبنی ہوتا ہے۔ صرف پیرس شہر میں دو سو پچاس سینما گھر ان فحش فلموں کے لئے مخصوص ہیں۔ جو لوگ سدھار چاہتے ہیں وہ اس صورت حال سے پریشان ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے تمدنی و ثقافتی مراکز ہیں وہ جوئے کے مراکز بھی ہیں مثلاً داؤ ول، مونٹ کارلو، میکاؤ اور لاس ویگاس وغیرہ۔ بحر اوقیانوس کے اردگرد کسی بھی شہر میں ایک بڑے جوئے خانے میں چھ ہزار افراد تک سما سکتے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ 1965ء میں فرانسیسیوں نے ایک سو پندرہ ارب فرانک رقم اتفاقی انعام کی سکیموں پر لگائی جب کہ امریکہ میں پندرہ ارب ڈالر اس کام پر خرچ ہو چکے ہیں۔ ہنگری کا ہر تیسرا باشندہ لاٹری کے ٹکٹ خریدتا ہے۔ اتفاقی انعام اور لاٹری وغیرہ میں سب سے زیادہ دلچسپی سویڈن کے لوگ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اسرائیل اور ڈنمارک کے لوگ اس کے عادی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ان آباد اور خوشحال ممالک میں ایک اداس نسل ابھر آئی ہے جن کے پاس ہر چیز موجود ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں یہ لوگ عرف عام میں ''دھتکاری ہوئی نسل (ٹھکرائی ہوئی نسل) کہلاتے ہیں۔

جنہوں نے بے مقصدیت کے فلسفے کو پھیلا دیا، ہپی، کانوں کے ہڑتالی کارکن اور ایسے ہی دوسرے لوگوں نے تمام اصولوں اور تمام نظاموں کا مذاق اڑایا۔ اور ان کی سوچ اور طور طریقے دنیا کے تمام بڑے شہروں میں پھیل گئے۔

خودکشیوں کا تناسب اور نفسیاتی امراض کا گوشوارہ بھی اس ثقافت وتمدن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ نفسیاتی طریقہ علاج کے مطابق یہ عجیب بات سامنے آئی ہے کہ زندگی کے معیار کے بہتر سے بہتر ہونے کے ساتھ انسان کا اطمینان قلب رو بہ انحطاط ہے اور یہ شکایت ایک امریکی ماہر نفسیات نے کی ہے جن ممالک نے زیادہ ترقی نہیں کی وہاں خودکشیوں اور نفسیاتی امراض کے مریض بھی کم تعداد میں ہیں یہ بات ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے، کہ ترقی آخر کس مرض کی دوا ہے۔

امریکہ میں ہر ہزار میں چار افراد نفسیاتی اور دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل ہیں۔ نیویارک سٹیٹ میں دماغی ہسپتالوں میں داخل ہونے والے مریضوں کی تعداد 55 فی ہزار ہے اور تمام امریکی ہسپتالوں میں نصف بستر دماغی امراض کے مریضوں کے استعمال میں آتے ہیں۔ ہالی وڈ میں دماغی امراض کے مریضوں کی تعداد دنیا کے کسی بھی شہر سے زیادہ ہے۔

امریکی پبلک ہیلتھ سروس نے 1978ء میں ایک سرکاری رپورٹ شائع کی اس کے مطابق ہر پانچواں امریکی شدید ذہنی واعصابی صدمے کا شکار ہے۔ یا اس کے قریب پہنچنے والا ہوتا ہے اس نتیجے کی بنیاد معقول شواہد اور تجزیئے ہیں۔ 19 سے 79 سال کی عمر کے بالغ امریکیوں کا تجزیہ کیا گیا تو ان کی تعداد لاکھوں میں تھی اور یہ گیارہ کروڑ دس لاکھ امریکیوں کے نمائندے تھے۔ 1977ء میں تین کروڑ انیس لاکھ مریضوں کا ذہنی علاج ہوا۔ ایک کروڑ امریکی شراب پینے کی وجہ سے مختلف بیماریوں کا شکار ہوئے۔

سویڈن میں خودکشی کرنے والے، شراب پینے والے اور ذہنی امراض کے شکار لوگ بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ جبکہ قومی آمدنی، شرح تعلیم روزگار اور سماجی تحفظ کے معیار کے لحاظ سے بھی یہ ملک سب سے آگے ہیں۔ 1967ء میں سویڈن میں ایک ہزار سات سو دو خودکشیاں رجسٹرڈ ہوئیں۔ 1966ء کے سال میں سے یہ اضافہ 9 فیصد زیادہ تھا اور 1960ء سے تیس فی صد۔

1968ء میں عالمی ادارۂ صحت نے مختلف ممالک کے درمیان خودکشی کی شرح کے تناسب کے گوشوارے جنیوا سے شائع کئے۔ اس فہرست میں پہلی آٹھ پوزیشنیں مغربی جرمنی، آسٹریا، کینیڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، ہنگری، سویڈن، اور سوئٹزرلینڈ نے حاصل کیں۔

ان آٹھ ممالک میں مردوں کی فوتیدگی کی تیسری وجہ خودکشی ہے جن کی عمر 15 اور 25 سال کے درمیاں تھی۔ پہلی وجہ دل کی بیماری تھی اور دوسری وجہ کینسر کا مریض۔ یہ کہنا بہر حال ناانصافی ہوگا کہ یہ مظاہر صرف مغربی ثقافت کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید تمدن نے جس صورت میں جس جگہ بھی ترقی کی ہے اس کا نتیجہ بہر حال یہی برآمد ہوا ہے۔ امریکہ جرمنی برطانیہ یا سویڈن کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ جاپان کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اگر چہ وہ دنیا کے نقشے میں دوسری سمت پر واقع ہے اور اس کا منطقہ بالکل الگ ہے۔ جاپان کے معاملے میں اعداد وشمار اگر چہ

کچھ الگ ہیں تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہاں معاشرتی روایات اور خاندانی نظام کسی حد تک باقی ہے۔
(اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش ص 124 تا 134 سے ماخوذ)

امریکہ میں طالبات کی عصمت دری...... حیران کن اعداد و شمار

واشنگٹن پوسٹ کا کالم نگار تھامس لکھتا ہے کہ نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کے واقعات امریکہ میں خطرناک حد تک پہنچ چکے ہیں۔ امریکہ کی گیارہ ریاستوں میں ریسرچ سٹڈی کی گئی۔ اس ریسرچ کے جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں۔ ان کے مطابق عصمت دری کا شکار 50 فیصد خواتین کی عمر 18 سال سے کم ہے اور 25 فیصد تو 12 سال بھی کم عمر کی بچیاں ہیں۔ ریسرچ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ بچوں کے خلاف جنسی جرائم کی تعداد معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اکثر واقعات رپورٹ نہیں ہوتے یا پھر بیشتر واقعات میں گھر کے افراد، رشتے دار یا دوست ملوث ہوتے ہیں۔

امریکہ کی تین ریاستوں میں جسٹس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے کئے گئے سروے میں جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں ان کے مطابق بارہ سال سے کم عمر بچیوں میں سے 20 فیصد اپنے باپوں کی ہوس کا شکار ہوئیں۔ 24 فیصد کو رشتہ داروں اور 30 فیصد کو دوستوں نے شکار کیا۔ صرف 4 فیصد کو اجنبیوں نے عصمت دری کی۔ (بحوالہ: بیدار ڈائجسٹ'' ستمبر 94ء ص 90)

صدر متراں کی ناجائز بیٹی کا انکشاف

''پیرس فرانسیسی جریدے ''پیرس میچ'' نے انکشاف کیا ہے کہ صدر متراں (فرانسیسی صدر) کی ایک بیس سالہ بیٹی ہے اور صدر نے اسے اس کی ماں سمیت صدارتی محل میں رکھا ہوا ہے۔ جریدے نے متراں کی اپنی ناجائز بیٹی کے ساتھ ایک تصویر بھی شائع کی ہے۔ ''پیرس میچ'' میں چھپنے والے مضمون میں بتایا گیا کہ 78 سالہ کینسر کے مریض صدر نے کافی عرصے سے اس راز کو لوگوں سے چھپائے رکھا تاہم انہوں نے اس راز سے عوام کو آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور 4 نومبر 1994ء)

یورپ میں ''معصوم مجرموں'' کی تعداد؟

ٹیلی ویژن نے مغرب کے معصوم بچوں کو ڈکیتی اور چوری جیسے سنگین جرائم اور منشیات کی لعنت میں مکمل طور پر جکڑ کے رکھ دیا ہے، صرف جرمنی میں مجرم بچوں کی عمومی شرح 1990ء سے 1995ء کے درمیان بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ان بچوں کو خطرناک جرائم پر مجبور کرنے میں ٹیلی وژن کے متشدد پروگراموں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے کیونکہ ایک یورپی بچہ روزانہ اوسطاً چار گھنٹے ٹی وی کے سامنے گزارتا ہے۔ اس دوران میں کم از کم پچاس مناظر قتل کی وارداتوں کے دیکھتا ہے۔ ان مناظر کا اثر بچوں میں تشدد پسندی کے بڑھتے ہوئے

رجحانات کی صورت میں نکلا ہے۔ صرف ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں میں تشدد کا رجحان پندرہ فیصد تک پایا جاتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق جرمنی کے ایک تہائی بچے اب مسلح ہو کر درس گاہوں میں آئے ہیں۔ برلن پولیس کے مطابق شہر میں ہونے والے 45 فیصد تشدد جرائم 14 سے 18 سال تک کی عمر کے بچے کرتے ہیں جبکہ پانچ فیصد جرائم 14 سال سے بھی کم عمر کے بچے کرتے ہیں۔

امریکی سروے رپورٹوں کے مطابق تمام تر قوانین کے مطابق ایک امریکی بچہ تیرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنے ذہن میں ایک لاکھ مناظر کسی نہ کسی صورت میں محفوظ کر چکا ہوتا ہے، ان میں آٹھ ہزار مناظر قتل، خودکشی اور جنس پر مشتمل ہوتے ہیں۔ برطانوی رپورٹ کے مطابق ٹی وی کے مادر پدر آزاد پروگرام دیکھنے کے باعث برطانوی بچے دوسرے جرائم کے علاوہ منشیات کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ برطانوی بچے تیرہ سال کی عمر میں شراب نوشی شروع کر دیتے ہیں۔ جبکہ پندرہ سال کی عمر میں ان بچوں کی ایک چوتھائی تعداد منشیات کا استعمال شروع کر دیتی ہے۔ ان منشیات میں سب سے زیادہ استعمال چرس کا ہوتا ہے لڑکوں میں 28.1 فیصد چرسی ہوتے ہیں۔ جبکہ لڑکیوں میں چرس نوشی کی شرح 21.7 فیصد ہے رپورٹ کے مطابق یہ معصوم مجرم والدین کی عدم توجہی کے باعث اپنا زیادہ وقت ٹی وی کے سامنے گزارنے پر مجبور ہیں۔ واضح رہے کہ اخلاق بگاڑنے کے نتیجے میں بچوں کے عادی مجرم بن جانے کے خوف سے ان بچوں کے والدین حکومت کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں کہ خدارا ان جنسی اور تشدد آمیز فلمی مناظر کا ٹی وی پر دکھایا جانا بند کیا جائے۔ جرمنی کے ایک ہفت روزے نے انکشاف کیا ہے کہ اب تک دس لاکھ سے زائد افراد اس سلسلے میں ایک محضر نامے پر دستخط بھی کر چکے ہیں۔"

(بحوالہ "بیدار ڈائجسٹ" لاہور، جون 1995ء ص 37)

سفید فام کم عمر غنڈوں نے لیڈز میں خوف وہراس پھیلا رکھا ہے

پولیس اور عدالتیں، قانون کے ہاتھوں مجبور ہیں، پاکستانیوں کی زندگی اجیرن بنا دی گئی ہے۔

لیڈز میں پاکستانیوں کی اکثریت چیپل ٹاؤن اور ہیر ہلز کے علاقوں میں آباد ہے۔ جہاں افریقی نژاد ایفرو کریبین بھاری تعداد میں آباد ہیں۔ ان علاقوں میں نوعمر راہزنوں نے دہشت پھیلا رکھی ہے اوسطاً روزانہ تین افراد اس گینگ کا شکار بن رہے ہیں۔ پچھلے ماہ 76 افراد کو لوٹا گیا۔ جبکہ پچھلے سال کل 982 افراد اس علاقے میں لوٹ لئے گئے یا ان پر حملے کئے گئے۔ پولیس اور علاقے کے مکینوں کے لئے یہ صورت حال انتہائی تشویش ناک ہے۔ کیونکہ سیٹو سمتھ کا کہنا ہے کہ لوگ ان نوعمر ڈاکوؤں کے خوف سے ان پر انگلی اٹھانے کو تیار نہیں۔ ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ راہزنی کا شکار ہونے والے اکثر ان ڈاکوؤں کے اچھے بھلے شناسا ہوتے ہیں یا سکول فیلو رہ چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کو بھی لوٹ لیا جاتا ہے۔ چیپل ٹاؤن پولیس نے پچھلے سال مارچ میں راہزنی سکواڈ کی تشکیل کی تھی۔ جس نے پچھلے سال کے آخری 9 ماہ کے دوران 2000 افراد کو حراست میں لے لیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ جب تک لوگوں کی جانب سے تحریری سٹیٹ منٹ نہ ملے ہم مزید کارروائی نہیں کر سکتے۔

سراغ رساں سپرنٹنڈنٹ مسٹر فلپ جانسن کا کہنا ہے کہ راہزنوں کو گرفتار کر کے انہیں عدالتوں میں بھی پیش کیا جاتا ہے اور انہیں قانون کے مطابق جو معمولی سزا دی جاتی ہے وہ انہیں جرم سے باز رکھنے کے لئے ناکافی ہے (اب تو انہیں اسلام کا فلسفہ سزا سمجھ آ جانا چاہیے) اور وہ دوبارہ واپس آ کر وارداتیں کرتے ہیں۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ یہ حیرانگی کی بات نہیں کہ لوگ گواہی نہیں دیتے، کیونکہ انہیں دھمکی دی جاتی ہے کہ غنڈے واپس آ کر پھر حملہ کریں گے، چنانچہ پولیس اور مجسٹریٹ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے، بعض معاملات پر مجبور ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کم سن مجرموں پر قابو پا لینے کے لئے قانون از حد ضروری ہے۔ (بحوالہ جنگ لندن 93-11-6)

12 سالہ لڑکا 500 کاریں چوری کرنے کا ملزم

کار چوری میں ملوث زیادہ تر افراد کی عمریں 10 سے 20 سال کے درمیان ہیں۔

لندن برطانیہ میں کار کی چوری کے باعث ہر سال 102 ارب پونڈ کا نقصان ہوتا ہے۔ چلڈرنز سوسائٹی نے "پٹنگ دی بریکس آن کار کرائم" کے عنوان سے ایک تحقیق میں بتایا ہے کہ ہر سال 19 کروڑ پونڈ مقدمات پر خرچ ہوتے ہیں 1990ء میں 5 میں سے 4 افراد کی عمریں جن پر کاروں کی چوری کا جرم ثابت ہوا یا جنہیں تنبیہ کی گئی۔ 10 سے 16 سال کے درمیان تھی۔ کاروں سے متعلق جرائم میں نوعمر افراد ملوث ہوتے ہیں۔ زیادہ تر رات 8`9 بجے اور 11 بجے کے آس پاس ہوتے ہیں۔ ہوم آفس کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً 30 فیصد لوگ کاروں کو لاک کرنا بھول جاتے ہیں۔ جبکہ گلیوں میں پارک کی جانے والی 70 فیصد کاروں میں کوئی حفاظتی آلہ نصب نہیں ہوتا۔ رپورٹ کے مطابق ایک 12 سالہ لڑکے نے 500 کاریں چرانے کا دعویٰ کیا ہے۔

کار چور گروہوں کی صورت میں کام کرتے ہیں اور انہوں نے اپنے اخلاقی ضابطے بنا رکھے ہیں۔ بعض گروہوں میں "مینجر اور اسسٹنٹ مینجر" جیسے عہدے بھی ہیں۔ ایک نوعمر مجرم نے بتایا کہ بعض اوقات ہم کار روک کر پولیس کو سگنل دیتے ہیں تا کہ وہ ہمارا تعاقب کریں پولیس کا تعاقب سنسنی خیز ہوتا ہے۔" (بحوالہ "جنگ" لندن، 93-11-3)

بریڈفورڈ میں زیادہ تر جرائم نوعمر لڑکے کرتے ہیں

نوعمر مجرموں میں سے کئی، پہلی بار وارننگ کے بعد جرائم سے توبہ کر لیتے ہیں۔

"بریڈفورڈ میں بڑھتے ہوئے جرائم کی زیادہ ذمہ داری ان مجرموں پر ہے جن کی عمریں ابھی بلوغت کی حد تک نہیں پہنچیں۔ یہ بات ایک تازہ ترین رپورٹ میں بتائی گئی ہے۔ رپورٹ میں ڈزنی ڈزن کے نام سے ایک گروہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اوڈسل پولیس اسٹیشن کی تحویل میں بارہ ایسے گندے انڈے بھی ہیں جنہوں نے مجموعی طور پر اس وقت دو سو سے زائد جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اوڈسل پولیس اسٹیشن کی طرف سے کئے جانے والے خصوصی سروے کے بارے میں جو رپورٹ جاری کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ پولیس سٹیشن میں موجود ایک سولہ نوعمر ملزموں کے ریکارڈ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ ملزم چار سو سے زائد جرائم میں کسی نہ

کسی طرح شریک رہے ہیں۔ جبکہ ان ایک سولہ ملزموں میں سے بارہ ایسے ہیں جنہوں نے دوسو سے زائد جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ پولیس انسپکٹر ٹریور رابرٹس کا کہنا ہے کہ ایک سو سالہ ملزموں میں سے اکثریت ایسے ملزموں کی ہے جنہوں نے ایک آدھ بار جرم کیا۔ لیکن بارہ ملزم ایسے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا ہی جرم ہے۔ انہوں نے کہا کہ نوعمر مجرموں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ایک وارننگ ملنے کے بعد جرائم سے توبہ کر لیتے ہیں۔ لیکن جو اس راہ پر چل نکلتے ہیں۔ وہ محکمہ پولیس کے لئے ہی نہیں پورے معاشرے کے لئے دردسر بن جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس باقاعدگی سے بعض ایسے سیمینار منعقد کر رہی ہے جن کے ذریعہ نوجوان نسل کو جرائم کے تباہ کن نتائج سے باخبر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔'' (بحوالہ ''جنگ'' لندن 93-11-3)

200 جرائم میں ملوث 13 سالہ لڑکا رہا کر دیا گیا

لندن برمنگھم کی ایک عدالت نے مبینہ طور پر 200 سے زائد جرائم کے ذمہ دار 13 سالہ لڑکے کو پھر رہا کر دیا۔ پولیس کے مطابق 13 سالہ لڑکا پچھلے پانچ ماہ کے دوران چار بار مجسٹریٹوں کے سامنے پیش ہو چکا ہے۔ گزشتہ روز اس نے ایک ہوٹل کے باہر پارک کی گئی کار میں موجودہ گولف بیگ سے اشیاء چرانے کا اعتراف کیا تھا۔ (بحوالہ ''جنگ'' لندن 93-9-19)

دس سالہ بچے کا ساتھی طالبہ پر جنسی حملہ

''گلاسگو آئرشائر کا ایک دس سالہ بچہ مقامی ایجوکیشن کونسل کے لئے دردسر بن گیا ہے۔ یہ بچہ جس کا نام قانونی وجوہات کی بنا پر صیغہ راز میں رکھا گیا ہے اس کو سکول میں اپنی ساتھی طالبہ پر جنسی حملہ کرنے کے الزام میں ایک دوسرے سکول میں ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب نئے سکول کے بچوں کے والدین کو اس بچے کی اپنے سکول میں آمد کا علم ہوا، تو انہوں نے اپنے اجلاس منعقد کر کے اس پر شدید احتجاج کیا اور مقامی ممبر پارلیمنٹ اور ایجوکیشن اتھارٹی کو اس تمام مسئلے کا نئے سرے سے جائزہ لینے کے لئے خطوط لکھے ہیں۔ دریں اثناء گلاسگو کے نزدیک کلارکن پرائمری سکول کی انتظامیہ نے بچوں پر بڑھتے ہوئے جنسی حملوں کے واقعات کی بنا پر تمام طلبہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ سکول سے گھر کے سفر کے دوران اکیلے جانے کے بجائے گروپس کی شکل میں جائیں اور کسی بھی اجنبی شخص سے محتاط رہیں۔

(بحوالہ ''جنگ'' لندن 93-10-11)

16 سال سے کم عمر لڑکیوں کے بارے میں معلومات خفیہ رکھی جائیں

کم عمر لڑکیوں کو مانع حمل چیزیں دینے کے لئے والدین کی رضامندی ضروری نہیں: ڈاکٹروں کی ہدایت۔

''لندن کے ڈاکٹروں کو ہدایات کی گئی ہیں کہ وہ 16 سال سے کم عمر کی ایسی لڑکیوں کے بارے میں معلومات خفیہ رکھیں جو ان سے مانع حمل اشیاء لیتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کم عمر لڑکیوں کو مانع حمل چیزیں دینے کے لئے والدین کی رضامندی ضروری نہیں۔ ڈاکٹروں سے کہا گیا کہ اگر انہوں نے لڑکیوں کی خواہشات کا احترام نہ کیا

اور اس کی اطلاع والدین کو دی تو ان کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کی جائے گی۔ بتایا گیا ہے کہ 1991ء میں پندرہ سال سے کم عمر کم از کم 15 ہزار لڑکیاں جنسی طور پر سرگرم تھیں۔ ان میں سے 8 ہزار نے فیملی کلینک اور باقی نے اپنے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ 1990ء میں انگلینڈ اور ویلز میں ہر سو میں سے ایک لڑکی حاملہ ہوگئی جو یورپ میں ایک ریکارڈ تھا۔ یہ شرح ہالینڈ کے مقابلہ میں سات گنا زیادہ ہے۔ ہالینڈ میں کم عمر لڑکیوں کو آسانی سے مانع حمل اشیاء دستیاب ہیں۔

(بحوالہ ''جنگ'' لندن 93-11-6)

فحاشی کے کاروبار میں 16 برس سے کم عمر لڑکیوں کی دلچسپی میں اضافہ، گزشتہ برس 25 فی صد اضافہ ہوا، ویسٹ یارک شائر میں یہ تعداد 80 فیصد تک جا پہنچی ہے۔

''لندن کی سولہ سال سے کم عمر کی لڑکیاں جنہیں فحاشی کے کاروبار پر پولیس نے وارننگ دی ہے ان کی تعداد میں 1990ء کے مقابلہ میں گزشتہ سال 35 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ہوم آفس کے مطابق بعض علاقوں میں ان لڑکیوں کی تعداد میں خوفناک اضافہ ہوا ہے۔ ویسٹ یارک شائر، مانچسٹر اور کلیولینڈ میں یہ تعداد 80 فیصد بڑھی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ سکول کی عمر کی جو لڑکیاں اپنا جسم فروخت کرتی ہیں۔ ان کی تعداد میں کمی ہونی چاہئے تھی۔ لیکن ایسا محض اس لئے نہیں ہوا کہ پولیس انہیں سوشل سروسز کے محکمہ کے پاس بھیجنے کی بجائے تنبیہ کر کے چھوڑ دیتی ہے۔''

(بحوالہ ''جنگ'' لندن 93-8-6)

پانچ ماہ کی حاملہ راہزن لڑکی کو ایک سال قید

''گو تمہاری عمر چھوٹی، لیکن ریکارڈ برا ہے'' جج کے ریمارکس۔

''بریڈفورڈ۔ پانچ ماہ کی حاملہ سولہ سالہ لڑکی کو راہزنی کی چھ وارداتوں میں ملوث ہونے کے الزام میں ایک سال قید کا حکم دے دیا گیا ہے۔ بریڈفورڈ کراؤن کورٹ کے جج کینٹ جونز نے نوعمر حاملہ ماں کو سزا کا حکم سناتے ہوئے کہا ہے کہ گو تمہاری عمر بہت کم ہے۔ لیکن تمہارا ریکارڈ انتہائی برا ہے اور یہ بات ثابت کرتی ہے کہ تمہیں لوگوں کو لوٹنے اور خوفزدہ و ہراساں کرنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس سولہ سالہ حاملہ لڑکی کو (جس کا نام بعض قانونی وجوہات کی بنا پر ظاہر نہیں کیا جاسکتا) اپنی سزا کے یہ بارہ ماہ کم عمر بچوں کے ایک سینٹر میں گزارنے پڑیں گے۔ اس سے قبل استغاثہ کی طرف سے عدالت کو بتایا گیا کہ اس سولہ سالہ لڑکی نے اپنی ہی عمر کی لڑکیوں کی مدد سے ایک گروہ تشکیل دے رکھا تھا۔ جس کا کام نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کو مارنا پیٹنا، گالی گلوچ کرنا، اور انہیں خوفزدہ کرنا اور لوٹنا تھا۔ عدالت کو بتایا گیا کہ اس سولہ سالہ لڑکی کی سربراہی میں چلنے والے اس گروہ نے بہت ہی ایسی لڑکیوں کو خوفزدہ کر کے لوٹا جو یا تو اکیلے گھوم پھر رہی تھیں یا کسی بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھیں۔ عدالت کو یہ بھی بتایا گیا کہ گروہ نے لڑکیوں کو لوٹنے اور خوفزدہ کرنے کے واقعات کے دوران چاقو کا آزادانہ استعمال کیا۔ جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ گو راہزنی کی ان وارداتوں میں گروہ کے مختلف افراد۔۔۔

حصہ لیا، تاہم اس گروہ کا مرکزی کردار یہی ملزمہ تھی۔ ملزمہ نے اپنے اوپر لگائے گئے چھ الزامات کو تسلیم کر لیا۔"

(بحوالہ ماہنامہ "المذاہب" لاہور، اگست 94، ص 6-11)

برطانیہ کی جسم فروش ماڈل گرلز

"برطانیہ کی ماڈل گرلز جسم فروشی کے ذریعے سالانہ 80 سے 90 لاکھ پاؤنڈ کماتی ہیں۔ برطانوی مصنف مائیکل گراس نے اپنی تازہ ترین کتاب "ماڈل" میں انکشافات کئے ہیں کہ برطانیہ میں نوخیز اور خوبصورت لڑکیوں نے ماڈلنگ کو عصمت فروشی کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اور یہ دھندہ ایک مکمل صنعت کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس سے منسلک لڑکیوں کی آمدن کسی بھی بڑے بزنس کی سالانہ آمدنی سے کم نہیں اور بعض اوقات ان کی آمدنی اس سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ کتاب میں لکھا گیا ہے کہ یہ ماڈل اپنے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے پورا عملہ رکھتی ہیں اور خاص طور پر بے روزگار نوجوان لڑکے زیادہ سود مند ثابت ہوتے ہیں جو معمولی تنخواہ کے عوض "لین دین" کے معاملات انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔" (بحوالہ "بیدار ڈائجسٹ" لاہور، اکتوبر 1995ء)

طلاق دارالخلافہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو اب دنیا میں "طلاق دارالخلافہ" کا نام دیا جا رہا ہے۔ بک آف فیکلس 1977ء کے مطابق 1976ء کے پہلے چھ ماہ میں امریکہ میں 9,87,000 شادیاں ہوئیں، جب کہ 5,38000 طلاقیں انجام پائیں۔ یعنی ہر منٹ میں اوسطاً دو شادیاں طلاق کی صورت میں ختم ہو گئیں۔ لاس اینجلس میں ہر سال تقریباً 50,000 طلاقیں سرکاری طور پر عمل میں آئیں ہیں۔ ڈلاس کا اخبار "ڈلاس سائٹ" بتاتا ہے کہ 1975ء میں کل شادیاں 6801 ہوئیں۔ جبکہ طلاقوں کی کل تعداد 2875 تھی۔ جنگ عظیم دوئم سے پہلے امریکہ میں 18 شادیوں میں سے صرف ایک طلاق عمل میں آئی تھی۔ 1960ء تک بتدریج اضافہ ہوتا گیا، پھر 25 سال میں یہ اضافہ تین گنا ہو گیا۔ اب طلاق کی تعداد 11,60,000 سالانہ ہے۔ کینیڈا میں 1960ء میں 6980 طلاقیں ہوئیں۔ 1973ء میں طلاقوں کی تعداد بڑھ کر 36704 ہو گئی اور 1974ء میں طلاقوں کی تعداد 45019 ہو گئی۔

روس میں "سوویٹ" ڈائجسٹ کے مطابق تقریباً اڑھائی لاکھ شادیاں ہر سال انجام پاتی ہیں، جب کہ تقریباً 2000 طلاقیں روزانہ، یعنی تین عدد شادیوں کے مقابلہ میں ایک طلاق حاضر، 1980ء کے وسط میں شرح طلاق کچھ یوں ہے۔ جرمنی 1`30`000 سالانہ، روس 9,40,000 سالانہ، جاپان 1,78,000 سالانہ برطانیہ 1,59,000 سالانہ، فرانس 1`0`7`000 سالانہ آسٹریلیا میں 43000 سالانہ، ہانگ کانگ میں 17 شادیوں میں ایک طلاق۔ لیکن اب یہ تعداد دگنی ہو گئی ہے۔ برطانیہ میں گزشتہ ایک دہائی میں شرح طلاق 100 فیصد سے بڑھ کر اب 328 فیصد ہو گئی ہے۔ برطانیہ میں گزشتہ دس برسوں میں طلاق کی شرح تگنی ہو گئی ہے۔ سویڈن میں ہر پانچ منٹ بعد تین طلاقیں ہو جاتی ہیں۔ ڈنمارک اور جرمنی میں طلاقوں میں حیرت انگیز

اضافہ ہو رہا ہے افریقی ممالک بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ جاپان میں ہر چار منٹ بعد ایک طلاق۔ چائنا مارننگ پوسٹ کے مطابق چین میں شرح طلاق تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

(بحوالہ ماہنامہ ''کلام حق'' گوجرانوالہ، اپریل مئی 1994ء ص 12)

ناجائز بچوں کا یہ ہولناک تناسب

امریکہ کے ایک دانش ور (Charles Murray) نے امریکہ کو ایک چونکا دینے والا انتباہ کیا ہے یہ انتباہ ایسا ہے جو ایک تجزیہ نگار (Jahn Onicinsky) کے مطابق تلخ ہے اس لئے حکمرانوں کو ہضم نہ ہو گا۔ مرے کا کہنا ہے کہ امریکہ برائیوں کی دلدل میں پھنس چکا ہے مثلاً بڑھتے ہوئے جرائم، منشیات، غربت، ناخواندگی، لوگوں کا بے گھر ہونا، وغیرہ ایک اور ایسا مسئلہ ہے جوان سب سے زیادہ شدید اور نتائج کے لحاظ سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ اسی برائی سے دوسری برائیاں جنم لیتی ہیں اور یہ برائی ہے۔ سفید فام لوگوں میں ناجائز بچوں کی بھرمار۔

1960ء میں یہ برائی کالی نسل کی آبادی میں آئی تو سینیٹر موئی ھن نے خطرے کی گھنٹی بجادی اور کہا کہ اگر اس برائی کو نہ روکا گیا تو سیاہ فام گھرانے اجڑ جائیں گے۔ موئی ھن کے انتباہ پر توجہ نہ دی گئی، حکمرانوں نے اس کے انتباہ پر توجہ نہ دی، بلکہ اس کا مذاق اڑایا گیا لیکن اب وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ٹھیک کہتا تھا، حکمرانوں کے انتباہ پر توجہ نہ دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تک اربوں نہیں بلکہ کھربوں ڈالر کا نقصان اسی وجہ سے ہو چکا ہے۔

اب یہ برائی سفید فام لوگوں میں پھیل رہی ہے۔ 1991ء میں 12 لاکھ ناجائز بچے پیدا ہوئے۔ کل پیدا ہونے والوں میں ناجائز بچوں کی تعداد 30 فیصد رہی ہے۔ سیاہ فام ناجائز بچے 32 فیصد پیدا ہوئے اور سفید فام 22 فیصد۔ مرے کا کہنا ہے کہ امریکی معاشرہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ اگر اس بدی کو نہ روکا گیا تو اس میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ اور پھر رہے سہے خاندانی نظام کے پرزے اڑیں گے، جرم میں بے تحاشا اضافہ ہوگا۔ خاندان کو اگر بچایا نہ گیا تو سب کچھ جل کر خاک ہو جائے گا۔ مضبوط خاندانی نظام کے بغیر کوئی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔''

(بحوالہ: ''بیدار ڈائجسٹ'' از محمد اسلم ترین صاحب ص 21 ' 22 مئی 1994ء)

جس سفر سے اب مغرب کی واپسی ہو رہی ہے ہم اس سفر کا تیزی سے آغاز کر رہے ہیں۔ کاش ہم مغرب کے انجام سے عبرت حاصل کرتے اور ہمارے دین نے ہمیں جو مضبوط خاندانی نظام عطا کیا ہے ہم اس کی افادیت سے مغرب کو بھی آگاہ کرتے ہیں۔

1۔ دیار مغرب کے نرالے انداز، اچھائی برائی دونوں کے لئے کھلی آزادی
2۔ مغربی تہذیب، سب سے پہلے غیرت سے عاری کرتی ہے۔
3۔ آٹھ سالہ بچی کو ماں پوچھتی ہے کہ بیٹی بستر میں ''کنڈوم'' رکھ لیا ہے نا!
4۔ چھ سالہ بچی کو استاد کہتا ہے، تمہیں جانگیہ پہن کر سوئمنگ پول میں نہانا ہوگا۔

5۔ یورپ کی اس دلدل میں دولت کی آس میں جانے والے مسلمانوں کی حالت زار

آزادی بہت خوبصورت لفظ اور وہ عظیم نعمت ہے کہ جس کی صحیح قدر ایک غلام ہی بتا سکتا ہے۔ مگر یہ بات بہر حال مسلم ہے کہ آزادی کے ساتھ اگر ذمہ داری شامل نہ ہو تو بعض اوقات یہی آزادی وبال جان بن جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سے آج کا یورپ دوچار ہے۔ یورپ کو اس بات پر بہت ناز ہے کہ ان کا معاشرہ صحیح معنوں میں ایک آزاد معاشرہ ہے اگر ان کا دعویٰ سو فیصد مبنی بر حقیقت بھی تسلیم کر لیا جائے، پھر بھی بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج یورپ کا معاشرہ صرف آزادی نہیں، بلکہ مطلق آزادی کے دائرے میں سفر کر رہا ہے، جہاں اگر اچھائی، نیکی اور حسن و خوبی کے لئے مکمل آزادی ہے تو اسی درجہ میں برائی، فحاشی، عیاشی کو بھی آزادی حاصل ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے کسی بھی تہذیب کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور اسے روکنا کسی کے بھی بس کی بات نہیں اور بہت جلد یہ تہذیب، تاریخ کے صفحات کی زینت بن کے رہ جاتی ہے۔ نیکی کی افزائش و آزادی اور بدی پہ قدغن و پابندی سے ہی معاشرہ ترقی کی منازل کی طرف گامزن رہ سکتا ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جسے اہل مغرب کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ وہاں اچھائی اور برائی کا امتیاز ختم ہو چکا ہے نیکی اور بدی کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں رہی ہم یہ بات محض تحریر کی چاشنی کے لئے نہیں کہہ رہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ سابق امریکی صدر امریکہ بل کلنٹن ہم جنس پرستی کا حامی ہے۔ اس کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی اپنے بیٹے سے بدفعلی کرے یا اپنی بیٹی کے کنوارپن سے لطف اندوز ہو، کوئی بہن اپنے بھائی کو جنسی تلذذ سے سرشار کرے یا کوئی ماں اپنے بیٹے کی اٹھتی جوانی سے محظوظ ہو، کوئی مالک اپنی کتیا سے بدذاتی کرے، یا کوئی خاتون اپنے کتے، گدھے یا سور سے سرشار ہو۔

جس معاشرہ میں پرائمری سکول کی بچیوں کے بستوں سے مانع حمل گولیاں برآمد ہوں، جس سوسائٹی میں ماں اپنی سکول جاتی آٹھ سالہ بچی کو بطور یاددہانی پوچھے کہ بیٹی بستے میں کنڈوم رکھ لیا ہے نا؟ جس دیس میں نوجوانوں کو ''تفریح'' کے نام پر خاص الاؤنس دیا جائے۔ سکولوں میں مخلوط رقص کی کلاس میں شرکت لازمی ہو۔ نیم برہنہ لڑکے لڑکیاں اکٹھے پیراکی کریں، زنا کے مواقع قدم قدم پر میسر ہوں اور ترغیبات کا دور دورہ ہو۔ جس ملک میں محافظ انجیل، چرچ کا سپریم گورنر اور سربراہ کلیسائے انگلستان، تاج برطانیہ، مرد کے مرد سے مکروہ و مردود فعل کو بقلم خود قانوناً جائز قرار دے۔ وہاں کی تہذیب کا جنازہ اٹھنے کی پیشن گوئی اگر کر دی جائے تو کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے، ہاں البتہ حیرت تو ان مسلمانوں پر ہوتی ہے جو محض دولت کی چاہت میں مشرقی ممالک سے جا کر امریکہ و یورپ میں جا بسے ہیں اور پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی نئی نسل اسلامی تعلیمات پر عمل کرتی نظر آئے۔ ان کی اس خواہش پر تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز گوئی کہ ۔ دامن تر مکن ہشیار باش

(تختے سے باندھ کر دریا کی گہرائی میں ڈالنے کے بعد کہتے ہو کہ دامن تر نہ ہونے پائے یہ ممکن ہی نہیں۔)

ایسے ہی مسلمانوں کا المیہ، لندن سے محمد اسماعیل صاحب یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''میں نے برسٹل میں ایک گھر پر دستک دی، تو ایک 19 سالہ خوبصورت نوجوان نکلا، جس کا نام عاصم تھا اور وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا:

''کلمہ آتا ہے؟''

اس نے کہا:

''جب مسجد جاتا تھا تو چھ کلمے سارے یاد تھے اب تو کوئی بھی یاد نہیں۔''

پوچھا: ''نماز کا کیا حال ہے؟''

بولا: ''فرصت ہی نہیں ملتی''

میں نے کہا: ''مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہے؟''

جواب ملا: ''مجھے معلوم نہیں۔''

اس تکلیف دہ صورت حال پر دل کٹ کر رہ گیا۔

کئی اور مختلف عمر کے نوجوانوں اور بچوں سے ملا۔ سبھی کا جواب یکساں، اکثریت اردو میں بات نہیں کر سکتی اور بعض تو سمجھ بھی نہیں سکتے، حالانکہ ان کے والدین اردو بولنے والے تھے۔ پاکستان میں ان کے والدین کے دل میں انگریزی کی عظمت مقتدر طبقے نے پیدا کی تھی۔ بچوں نے دیکھا ہوگا کہ والدین کے دل میں اپنی زبان کی عزت ہے، نہ اہمیت تو انہوں نے اسے قابل التفات ہی نہ سمجھا اور اس طرح وہ ان تمام روایات، واقعات، تاریخ سے یکسر محروم ہو گئے۔ جو ان کے اسلامی اور مشرقی تشخص کی بقاء کے لئے ناگزیر تھے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اچھے خاندان اور سلجھے ہوئے خیالات کے دین دار آدمی تھے۔

کہنے لگے۔

''میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ بہت نیک اور فرمانبردار، وہ میرے ساتھ پابندی سے مسجد جاتا اور قرآن بھی پڑھتا تھا مگر پھر اس نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی، وہ ایک آہ بھر کر بولے، آپ کو تو یہاں کا قانون معلوم ہے اٹھارہ سال کے بعد بچے آزاد ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اب مجھ سے الگ رہتا ہے شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ نماز قرآن اور روزہ تو اب دور کی بات ہے۔

ایک اور صاحب جو سنجیدہ، متین ہیں۔ اپنا نام احمد سے بدل کر آرمر کر لیا۔ بیٹوں میں سے کسی کا نام سیٹو ہے تو کسی کا اینتھونی، انہوں نے اپنا دین تبدیل نہیں کیا۔ کبھی کبھی ترک وطن پر افسوس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیکن مال اور زندگی کے عیش نے ان کی تمام قدریں پامال کر دی ہیں۔

ایک مسجد میں چھ سات نوجوان کھڑے تھے۔
پوچھا: ''کیوں کھڑے ہو؟''
ایک بولا: تم نے نماز میں شرکت نہیں کی؟
بولے: ہم مسلمان نہیں ہیں۔
ایک نوجوان اسپتال میں کام کر رہا تھا اور اسی کے کالر پر اس کا نام ''کیون اللہ'' لکھا تھا۔
پوچھا۔ ''یہ نام کیسا؟''
ناراض ہو کر بولا۔ ''میں نے یہ نام نہیں رکھا۔''
عرض کیا کہ: بھائی! اللہ تو مسلمانوں کے نام کے ساتھ ہوتا ہے''
شرما کر بولا: میرا باپ ہندوستانی تھا۔

ہم جوان ملکوں میں آتے ہیں تو ہمارے دل میں ایک چور ہے جسے اپنے ساتھ یہاں لاتے ہیں اور وہ ہے انگریزوں کی عظمت، ان کے طور طریقوں، لباس و خوراک، علوم و فنون کا رعب۔ جو ہمارے دلوں میں ہوتا ہے اور بچے اسے محسوس کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہاں پاکستانی لڑکیوں سے کوئی انگریز لڑکا اگر ہنس کر بات کر لیتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ایک بالغ لڑکی اپنے انگریز عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ باپ نے حیلے بہانے سے اسے اغوا کر لیا اور گھر لے آیا۔ لڑکی نے پولیس کو فون کر دیا۔ باپ پر مقدمہ چلا اور اسے ڈیڑھ سال قید کی سزا ہوئی بیٹی فیصلہ سن کر غمگین ہوئی اور پھر اس نے چیخ مار کر اپنے عاشق کی گود میں سر ڈال لیا۔

یہاں مسلمان اور مشرقی لڑکیاں کالج جاتی ہیں۔ لیکن والدین انہیں تنہا سیر و تفریح کیلئے شام کے وقت آزاد نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ اب تو اکثر دن ہی میں، اسکول سے حاملہ ہو کر گھر آتی ہیں۔ بعض ''دقیانوسی'' خیال کے والدین اس سے پریشان ہوتے ہیں۔ ایک سکھ نے تو غیرت میں اپنی دو بیٹیوں کو بندوق سے ہلاک کر دیا۔ مگر غیرت کی یہ لو بھی اب بجھنے ہی والی ہے کیونکہ یہ ملک سب سے زیادہ جس چیز سے عاری کرتے ہیں وہ غیرت ہی تو ہے۔

چھ سالہ لڑکی اسکول جاتی ہے تو ماسٹر کہتا ہے کہ تمہیں سوئمنگ پول میں تیرنا ہوگا اور اس کے لئے پڈی پہننا ہو گی۔ اب ایسی بچی کو بھلا کیسے حیا آئے گی جبکہ اسے کمسنی ہی سے ننگے ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہی بچی جب اسکول جاتے آتے سر بازار نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو چمٹے ہوئے، بے تحاشہ بوسے لیتے ہوئے دیکھتی ہے تو اسے عفت کا کیا علم ہوگا۔ دکان میں جاتی ہے تو دیکھتی ہے کہ بے غیرت عورتیں اور مرد بے تکلفی سے ایک دوسرے کو ڈارلنگ یا ہنی کہہ کر پکارتے ہیں تو اس بچی کو جو مفہوم سمجھ میں آئے گا اس کا تصور مشکل نہیں۔ ہم اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ یہاں لوگ ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

لیکن یہ زندگی ایسی خود غرضی کی زندگی ہے جس میں جذبات کی تسکین اور نفسانی خواہشات کی پرورش نے انسانوں کو درندگی کی دہلیز پر کھڑا کر دیا ہے ایک سترہ سالہ گوری لڑکی کے بارے میں سنا، کہ تین بار شہ رگ کاٹ

کر خودکشی کرنے کی کوشش کر چکی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ آٹھ ماہ کی تھی۔ جب باپ نے ایک دوسری عورت کی خاطر اس کی ماں کو طلاق دے دی اور ماں نے ڈیڑھ برس کی عمر میں اس بچی کو بڑی بہن کے حوالے کر دیا اور خود کسی اور کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ یہ تو معمولی بات ہے یہاں ایک عورت کے نئے عاشق نے اس کی تین سالہ بچی کو اس لغزش پر کہ اس نے بغیر اجازت فرج سے چاکلیٹ کھالیا تھا۔ کمرے میں بند کر دیا، جہاں وہ بھوک پیاس سے بلک بلک کر اور تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ ماں کو بھی خیال نہ آیا کہ اپنی بچی کو بچائے۔

انہی دنوں ایک مرد کو تین ماہ کی بچی قتل کرنے کے الزام میں سزا ہوئی اس بچی کو یہ باپ ایک میز کی دراز میں اس طرح رکھتا تھا کہ جب رونے لگے تو دراز بند اور جب چپ ہو تو دراز کھول دے۔ ایک بار ڈاکٹروں نے اس کے چہرے پر مار کے آثار پائے۔ دوسری بار اس کی تین پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس کی ماں کو بھی سزا ہوئی۔ ایک اور باپ اپنی کمسن بچی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر اسے دریا برد کر دیتا ہے۔ چھوٹی بچیوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات جو عوام کے نگاہوں میں آئے ہیں، وہ اتنے زیادہ ہیں کہ سوسائٹی پریشان ہے اور اب تو قانون نے تسلیم کر لیا ہے کہ ماں باپ بچوں کی پرورش و پرداخت کے اہل نہیں چنانچہ سوشل ورکر بھی ان کی نگرانی کرتی ہیں۔

یہ واقعات اس خود غرضی اور نفس پرستی کی انتہا ہیں جس کی ابتدا اپنا معیار زندگی بلند کرنے کی جستجو میں انسان کو اس پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے والدین، گھر، عزیز و اقارب اور تہذیب و تاریخ چھوڑ کر غیر ملک میں چلا جائے یہاں آ کر ہم اپنی خود فریبی کی تسکین کیلئے بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں، نماز سکھاتے ہیں، عید بقرعید پر ہم مذہب لوگوں اور ہم وطن افراد کو جمع کرتے ہیں۔ مشاعرہ ترتیب دیتے ہیں اور ملکی فلمیں دیکھتے ہیں حالانکہ معلوم ہے کہ ہمارے بچے اب ہمارے نہیں، اس ملک کے بچے ہیں۔ ان کی زبان، ان کے خیالات، ان کے محبوب افراد، ان کی آرزوئیں، ان کی قدریں ہم سے مختلف ہیں۔ ہمارا دل رکھنے کو شاید وہ اردو میں بات بھی کر لیں اور اٹھارہ سال کی عمر تک سعادت مندی کا مظاہرہ بھی کریں۔ لیکن جب ان کی ترجیحات اور پسندیدگی اور ہماری آرزوؤں اور تمناؤں میں مقابلہ ہوا تو یہ نماز اور قرآن کا سارا ملمع اتر جائے گا۔ قلعی کھل جائے گی اور پھر ہم کف افسوس ملیں گے کہ ہمارے بچوں کو کیا ہوگیا۔

ہم لوگوں نے دو لقمے روٹی کی خاطر گھر چھوڑا، پھر پیٹ اتنا بڑا ہوا کہ اس میں کاریں، کوٹھیاں اور اسباب آسائش و آرائش گھس گئے۔ مگر بھوک وہیں کی وہیں رہی اور ہم نے کبھی حساب بھی نہیں لگایا کہ ہم نے کیا کھویا کیا پایا۔

اس پیٹ کے لئے ہم نے آنے والی نسلوں کی عزت، عصمت حیاء پاکیزگی، دین اور ایمان کا سودا کر لیا۔ اپنی دنیا بنانے کے لئے ان بچوں کی آخرت تباہ کر دی۔ اپنے آرام کے لئے دکھی روحوں کو ایسی بیماری میں مبتلا کر رہے ہیں۔ جس کا علاج ہیروئن میں ہے نہ شراب خانوں میں نہ قمار خانوں میں ہے۔ بیوی یا شوہر کیلنڈر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

خاندانی آبرو معاشرتی سرمایہ ہے جو صدیوں میں بنتا ہے اسکی حفاظت زبان اور تاریخ کرتی ہے۔ جب بھی اردو ندوہ اور علی گڑھ کی تاریخ لکھی جائے گی مولانا شبلی نعمانی کا نام ضرور آئے گا۔ جب بھی مورخ خلافت اور آزادی ہندوپاک کی تاریخ لکھے گا۔ تو علی برادران کے نام سرفہرست ہوں گے مگر معاشرتی سرمایہ معاشرے سے باہر منتقل نہیں ہوسکتا۔ مسلم معاشرے کا سرمایہ، مسلمانوں کے یہاں ہی رہے گا۔ اردو، فارسی، عربی میں رہے گا یہ سکہ یورپ اور امریکہ میں نہیں چلے گا۔

ہمارے بچے کی ماں جس زبان میں بھی بات کرے یہاں بچوں کی مادری زبان انگریزی ہے وہ اردو، فارسی، عربی پڑھ ہی نہیں سکتے تو تاریخ کیا پڑھیں گے انہیں اپنے آباؤ اجداد کا علم ہی نہیں ہوگا تو اس پر فخر کیا کریں گے ان سے اکتساب فیض کیا کریں گے وہ تو اپنا رشتہ ابراہم لنکن، جارج واشنگٹن اور لارڈ ولنگٹن سے جوڑیں گے۔

جو قومیں اپنی تاریخ بھلا دیتی ہے، تاریخ بھی انہیں بھلا دیتی ہے ہندوستان میں کول، بھیل، سنتھال قدیم ترین قومیں ہیں۔ لیکن آج وہ اچھوت ہیں ان کی تاریخ نہیں۔ امریکہ کے ریڈ انڈین یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ مگر ان کی بھی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ بڑی چیز ہے جب روٹس (Roots) شائع ہوئی۔ جس میں ایک سیاہ فام امریکی نے اپنے آباؤ اجداد کی تلاش میں گیمبیا کا سفر کیا اور اپنے قدیم رشتے معلوم کئے تو سیاہ فام آبادی میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا اور فرضی تاریخ بنا کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنی قوم کو نئے وقار اور نئے اعتماد سے شناسا کیا۔ ادھر انگلستان میں لاکھوں روپے خرچ کر کے اپنا شجرۂ نسب تیار کراتے ہیں۔

ہماری خاندانی تاریخ کے علاوہ مذہب کی بھی تاریخ ہے، ہمارے اولوالعزم اسلاف کی تاریخ ہمیں وہ سمت عطا کرتی ہے وہ شرف اور وقار دیتی ہے۔ جس کا حصول اور کسی طرح سے ممکن ہی نہیں۔ یورپ نے اس تاریخ کو مٹانے اور مسخ کرنے کی بڑی کوشش کی ہے مگر الحمدللہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ لیکن اب اس کا کام ہم خود آسان کر رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کو معلوم ہی نہیں کہ حضرت ابوذرؓ کون تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کے کارنامے کیا ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاریخ کو کیا دیا۔ طارق بن زیاد کون تھے اور موسیٰ بن نصیر نے کیا کارنامے انجام دیئے۔ انہیں اقبال کی خبر ہے نہ مولانا محمد علی جوہر کی۔ سراج الدولہ کی نہ ٹیپو سلطان کی۔ ہم ان بچوں کو روشن محلات سے نکال کر بدگمانی کے ایک ایسے جنگل میں دھکیل رہے ہیں۔ جہاں صرف تاریکی ہے اور ایک بے رحم جہد بقا۔ وہ چاہیں بھی تو اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکتے۔ نقاد حضرات فرمائیں گے کہ حالات پاکستان کے بھی کون سے بہتر ہیں۔ بداخلاقی اس ملک میں کیا کم ہے اور بے دینی کا ماحول کیا یہاں کم بے رحم ہے؟ مگر اس کے جواب میں ایک صاحب نے کیا خوب کہا کہ پاکستان میں اس کا امکان بہرحال ہے کہ ایک ملحد اور بے دین بھی آخری عمر میں تائب ہوکر ایک دین دار مسلمان بھی آخر عمر میں کفر اور الحاد پر اپنی زندگی ختم کرے۔''

(بحوالہ ہفت روزہ ''ختم نبوت'' کراچی 2 ستمبر 1994ء)

یہ امریکہ ہے، امریکی معاشرہ

ایشیاء اور افریقہ کے باشندوں میں امریکہ جانے کی تڑپ اور رجحان کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر امریکہ اپنی سرزمین کے دروازے ان ممالک کے شہریوں کے لئے مکمل طور پر کھول دے تو شاید یہ دونوں براعظم انسانوں سے مکمل طور پر خالی ہو جائیں۔ کیا امریکہ کی سرزمین واقعی خوابوں کی سرزمین ہے جہاں ہر فرد کو چلے جانا چاہئے۔ کیا وہاں کا معاشرہ واقعی ایسا ہے کہ وہاں جا کر رہنے سے انسان کی زندگی پر لطف ہو جاتی ہے۔ ذہنی سکون مل جاتا ہے اور ہر قسم کی آسائش میسر آ جاتی ہے۔ عمومی تاثر تو ایسا ہی ہے کہ وہاں جا کر ہر مسئلہ حل، مشکل دور اور پریشانی ختم ہو جاتی ہے، لیکن امریکہ کے معاشرے کی حقیقی تصویر ایسی نہیں ہے۔ آیئے امریکہ کے معاشرے کی حقیقی تصویر ان خبروں کے آئینے میں دیکھیں جو حال ہی میں اخبارات میں شائع ہوئی۔ واشنگٹن امریکہ کا دارالحکومت ہے۔ جہاں نوجوانوں کے لئے 16 جولائی سے رات کا کرفیو نافذ کرنے کے لئے بنائے گئے قانون پر واشنگٹن کے میئر نے دستخط کئے ہیں۔ اس قانون کے تحت سترہ سال اور اس سے کم عمر افراد کے لئے رات کے وقت باہر نکلنا غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کرفیو کا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کو رات کے وقت گھروں تک رکھنا ہے اور ایسے والدین اور سرپرستوں کو جو اپنے بچوں سے کرفیو کی پابندی نہیں کر سکیں گے جرمانے اور قید کی سزا دے دی جائے یہ کرفیو بڑھتے ہوئے جرائم پر قابو پانے کے لئے لگایا جا رہا ہے کیونکہ واشنگٹن ملک کا سب سے خطرناک شہر بنا گیا ہے۔ (بحوالہ روزنامہ ''خبریں'' 9 جولائی 1995ء)

17 جولائی کے روزنامہ خبریں میں بھی واشنگٹن کے بارے میں ایک اہم اور تفصیلی خبر شائع ہوئی ہے خبر میں بتایا گیا ہے کہ امریکی دارالحکومت واشنگٹن جتنا پرشکوہ اور عالیشان دارالحکومت ہے اتنا ہی بدترین شہر ہے۔ جو یکسر اخلاقی، سماجی اور حفظان صحت کے حالات میں انحطاط کا شکار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست پر سفید فاموں کا غلبہ ہے اور جبکہ شہری زندگی پر سیاہ فاموں کا غلبہ ہے۔ اس طرح شہر دو مختلف نسلوں کے نرغے میں آ کر فٹ بال کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ 20 برس پہلے شہر وفاقی حکومت کے ماتحت آتا تھا۔ لیکن کانگریس نے شہری بجٹ کے بارے میں کوئی قابل ذکر اقدام نہیں کیا جس کے نتیجے میں شہری زندگی کے جملہ امور بلدیاتی کنٹرول میں آ گئے۔ اس کے علاوہ 1970ء تک یہاں 71 فیصد سیاہ فام آباد تھے۔ جبکہ اب سیاہ فاموں کی تعداد 66 فیصد ہے۔ شہر جرائم کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ یہاں کے پولیس چیف نے محض اس لئے استعفیٰ دے دیا تھا کہ وہ کم پولیس نفری کے ساتھ جرائم کنٹرول نہیں کر سکتا۔ شہری آبادی کے 42 فیصد سیاہ فاموں کا مسکن جیل اور حوالات ہیں۔ منشیات فروش دندناتے پھرتے ہیں۔ گزشتہ پانچ ماہ کے دوران میں 1500 نوجوانوں کو ہم جنس پرستی کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے حتیٰ کہ شہر کے میئر میرین بھی منشیات کے الزام میں چار سالہ قید بھگت کر گزشتہ دنوں رہا ہوئے ہیں۔ زیادتی کے واقعات کا شمار نہیں۔ 24 گھنٹوں میں بے شمار لڑکے اور لڑکیاں زیادتی کا شکار ہوتے ہیں۔ حتیٰ

کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے مجرموں کے سامنے عاجز آ چکے ہیں۔ مالی معاملات کا حال یہ ہے کہ کروڑوں کا اسلحہ بنانے والے اور دنیا بھر کی تھانیداری کرنے والے امریکہ کی مالی حیثیت یہ ہے کہ ٹی ہال میں ٹائلٹ پیپر کا بل متعلقہ کمپنی کو ادا نہیں کیا جاسکا۔ مختصر یہ کہ امریکہ پوری دنیا کے مسائل میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اسے اپنے دارالحکومت کی بدحالی کی خبر نہیں۔

ایک خبر امریکہ کے تعلیمی اداروں کے بارے میں بھی پڑھ لیں۔ اس خبر میں بتایا گیا کہ امریکی سکولوں کے اہلکاروں نے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ چھوٹے بچوں کو ڈبہ کاٹنے والے چاقو نہ بیچے جائیں کیونکہ یہ چاقو ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے سکولوں میں تشدد کے واقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق امریکی سکولوں میں ہونے والے جرائم میں 30 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ نیویارک کے سکول چانسلر رامن کورٹائن سکولوں میں چاقو لانے پر پابندی یا تحفظ فراہم کرنے کی خواہش مند ہیں۔ کارٹائن نے بتایا کہ انہوں نے پچھلے چند سالوں میں طلبہ سے ایسے 782 چاقو پکڑے ہیں۔ جبکہ 45 آتشیں ہتھیار بھی طلبہ سے ملے ہیں۔ ان چاقوؤں کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ دھات کے آلات کی نشاندہی کرنے والے آلات جو عام طور پر نیویارک کے سکولوں میں لگائے گئے ہیں۔ یہ آلات بھی ان چاقوؤں کی نشاندہی نہیں کر سکتے اور بچے اپنی بیلٹوں میں چھپا کر یہ چاقو سکول لے جاتے ہیں۔ تعلیمی حکام کا کہنا ہے کہ پچھلے سال کے دوران میں سکولوں میں جرائم کے 8333 واقعات ہوئے ہیں۔ اور یہ وارداتیں کنڈرگارٹن سے کبر اعلیٰ کلاسوں تک ہوئیں۔ سکولوں میں ہونے والے جرائم میں چوری، زنا، جسمانی تشدد کی وارداتیں شامل ہیں۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر 38 پرنسپل احتجاجاً قبل از وقت مستعفی ہو چکے ہیں۔ (بحوالہ بیدار ڈائجسٹ ستمبر 95ء، ص 36)

امریکی معاشرہ، فحاشی، عریانی، جسمانی آزادی

ٹی وی اور نصاب تعلیم کا کردار

"ایک بات جسے دیکھ کر ایک مشرقی اور خاص طور مسلمان کا ذہن چکرا جاتا ہے۔ وہ ہے سر راہ لڑکے اور لڑکیوں کا بوس و کنار...... اگر کوئی منہ موڑ کر اور آنکھیں بند کر کے وہاں سے گزر بھی جائے تو گھر کے اندر یا جہاں کوئی اقامت گاہ ہے وہاں بھی یہ مناظر بلکہ اس سے بڑھ کر جنسی اختلاط کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ یوں کہ "الیکٹرانک میڈیا" یعنی ٹیلی ویژن گھر کے اندر موجود ہے۔ وہاں ایک نہیں سینکڑوں قومی، مقامی یا علاقائی سطح کے ٹیلی ویژن پروگراموں سے یلغار کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر چینل پر دن میں کسی نہ کسی وقت جنس کی تمام حدود و قیود کو پار کرنے والا پروگرام موجود ہوتا ہے۔ بوس و کنار یا عریاں مناظر تو بہت ہلکی قسم کی چیز ہے۔ جو ہر چینل پر دن بھر کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہتا ہے۔ عریانی، فحاشی اور ہوس ناکی کے یہ مناظر انسانی ذہن اور خاص طور پر نوجوان ذہن کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سارے کا سارا امریکی معاشرہ اسی کام پر لگا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ چینل تو ایسے ہیں جن پر تعلیمی (خاص طور پر انگریزی کی تدریس) اور

عیسائیت کا بڑی باقاعدگی سے درس دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کم و بیش دو درجن شو ایسے ہیں۔ جن میں امریکی معاشرے کے مختلف طبقوں میں پائی جانے والی اچھی بری باتوں مذہبی زندگی اور توہمات پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے ایسے پروگراموں میں گورڈل ایلیٹ شو ڈاکٹر دل ملر کا......The other side شو خواتین کے پروگرام جیسے لیزا اور ریکی شو کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ مقبول پروگرام ہیں۔ ڈاکٹر دل ملر کے پروگرام کو شائستہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے موضوعات تو ہم کی حدوں کو چھوتے ہیں۔ مثلاً روحوں کو بلانا، جادو ٹونا، اور اسے دور کرنا، موت کے منہ سے بچ کے زندہ ہو جانے والوں کے تجربات، بعض لوگوں کا دوبارہ پیدا ہونا۔ مرنے کے بعد بیوی یا خاوند کی روح کا آنا، اور اس کا بائبل یا عیسائی عقیدے سے رہنمائی۔ باقی پروگرام ازدواجی معاملات (جنہیں جنس کہنا زیادہ بہتر ہوگا) مثلاً بوڑھی عورتوں کی جوان لڑکوں سے شادی کے تجربات، ماں کا سولہ سترہ سالہ بیٹی یا بیٹے کے ہم عمر دوست کے عشق میں مبتلا ہونا۔ ایک بہن کا دوسری بہن کو طلاق دلوا کر خود اس مرد سے شادی کرنا یا دونوں بہنوں کا ایک ہی مرد کے ساتھ یا ماں بیٹی کا بیک وقت ایک ہی آدمی سے تعلقات استوار کرنا وغیرہ۔ ان پروگراموں میں پانچ چھ جوڑوں کو بلا کر حاضرین کی موجودگی میں سوال وجواب کئے جاتے ہیں۔ اور حاضرین کو بھی سوالات اور تبصرے کا حق ہوتا ہے ان سوالات کے درمیان بعض انتہائی قابل اعتراض اخلاقی باتیں بھی عورتیں اور مرد برملا کہتے ہیں اور تو اور گیارہ بارہ سالہ لڑکیاں اپنی بدکاری کے قصے مزے سے لے کر اور بڑی دیدہ دلیری سے اپنے ماں باپ کی موجودگی میں بیان کرتی ہیں۔ بلکہ والدین کے ٹوکنے پر احتجاج کرتی ہیں۔ حالانکہ امریکی قانون کے مطابق پندرہ سولہ سال سے کم عمر لڑکی کی شادی یا جنسی اختلاط قابل مواخذہ جرم ہے۔ اس ساری خرافات کے بیان کرنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ہمارے قارئین کو علم ہو جائے کہ امریکی معاشرے میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور اس میں رہ کر یا چل کر کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کا دائرہ حیاء میں رہنا یا عزت وعفت کو محفوظ رکھنا کس قدر دشوار ہے جہاں قدم قدم پر عصیاں پر مائل کرنے کیلئے نت نئی ترغیبات موجود ہیں۔

میں نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے۔ بہت ہی دبے دبے لفظوں میں کہا ہے ورنہ جو ماحول ہے اس میں پائی جانے والی غلاظت اس قدر زیادہ ہے کہ الفاظ وبیاں اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خرابی کا عالم یہاں تک۔ ہے کہ اب تو خود امریکیوں، سفید فام اور سیاہ فام قدامت پسندوں نے کھلی فحاشی کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اپنی مرضی کرنے اور اظہار رائے وعمل کی جو آزادی قانون و آئین کے سبب دیکھنے میں آرہی ہے۔ اس نے ساری مذہبی قدروں کو پامال کر دیا ہے اور جو کچھ ٹیلی ویژن پر دکھایا جا رہا ہے وہ ناقابل برداشت ہے کیلے فورنیا کے ایک اور شہر اور ینج میں ایک سفید فام امریکی خاتون نے تو مقامی کیبل ٹیلی ویژن کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے کہ اس کے تین اور چار سال کے دو بچوں نے جنسی مناظر ٹیلی ویژن پر دیکھنے کے بعد عجیب وغریب غیر شریفانہ حرکتیں شروع کر دیں۔ اس نے نہ صرف یہ کہا کہ ایسے فحش پروگرام بند کئے جائیں بلکہ اس نے عورتوں کی تنظیموں سے بھی کہا کہ وہ عورت کے تقدس کے لئے، گھر کا ماحول صاف ستھرا بنانے کے لئے ٹیلی ویژن پر

پابندیوں کا مطالبہ کریں اور اگر کہیں قانون میں سقم ہے تو اس کے دور کرنے کا بھی مطالبہ کریں۔اس کے نتیجے میں کچھ آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ بلکہ عورت کی پاکدامنی کا تذکرہ بھی ہونے لگا ہے آواز اٹھانے والے لوگوں میں عیسائی تنظیمیں بھی ہیں جو مذہب کے حوالے سے شادی سے پہلے عورت کے "باکرہ" ہونے کی بات اٹھا رہی ہے قطع نظر اس کے ایک اور بات جو اس کی محرک بنی ہے وہ ایڈز کی بیماری ہے۔

امریکی معاشرے میں جنسی اختلاط میں اضافہ کا سبب یہ بھی ہے کہ چھٹی جماعت سے تعلیمی اداروں میں جنسی امور سے متعلق باتیں شامل نصاب کر دی گئی ہیں۔جنہیں پڑھ کر یا جان کر ایک ناپختہ ذہن میں تحیر کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو کم عمری ہی میں اس پر عمل کرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔اس تحیر کے عملی جذبے کے لئے بھی سکولوں ہی میں ایسی باتیں بتائی جاتی ہیں اور مانع حمل اشیاء تقسیم کی جاتی ہیں۔ان حالات میں جب خود حکومت اور محکمہ تعلیم ہی نے بدکاری کے لئے سازگار ماحول پیدا کر رکھا ہے۔تو پھر یہ جاننے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اس پھیلتی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کا ذمہ دار کون ہے اور وہ کونسا ادارہ ہے جو اس کا انسداد کر سکے۔

(از کرامت علی خاں صاحب بحوالہ: نوائے وقت لاہور 22 دسمبر 1994ء)

خدائی قوانین سے بغاوت کا فطری انجام

لندن اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سربراہ سر پیٹر ایمرٹ نے کہا ہے کہ وہ برطانیہ میں تشدد کے جرائم سے اس قدر پریشان ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو اکیلے باہر جانے کی اجازت نہیں دیں گے انہوں نے کہا کہ اس سال 15 جولائی کو ویمبلڈن کامن میں ایک نوجوان خاتون ریچل قتل ہوئی۔عین اسی جگہ ان کی اہلیہ ایمرٹ روزانہ اپنے کتے کو لے جایا کرتی تھیں۔اور اس واقعہ سے چند منٹ قبل وہاں سے گزری تھیں اور ریچل کے قاتل نے اتفاقیہ اس کا انتخاب کیا تھا۔سر پیٹر کا کہنا ہے کہ عوام تو درکنار وہ اپنی اہلیہ کی حفاظت کرنے سے بھی بے بس ہیں۔انہوں نے کہا کہ گزشتہ دس سال میں جرائم میں اضافہ ہوا ہے اس کی ایک وجہ قانون کی کمزوریاں ہیں اس لئے انصاف کے حصول اور مجرموں کو مناسب سزا دینے کے لئے قانون میں تبدیلی لازمی ہو گئی ہے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لندن 20 دسمبر 1992ء)

فرانسیسیوں کا ظاہر و باطن

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تین ہزار فرانسیسی مرد اور عورتوں کے بارے میں ایک سروے کے بعد مشہور فرانسیسی محقق جیکوئس ڈیونڈ نے بتایا ہے کہ پیرس کے زیادہ تر مرد اور عورتیں ہفتے میں ایک بار بھی نہیں نہاتے۔ڈیونڈ نے بتایا کہ کم نہانے سے ایک فرانسیسی سال بھر میں صابن کی دو ٹکیاں صرف کرتا ہے۔سروے رپورٹ نے انکشاف کیا ہے کہ 30 فیصد فرانسیسی مرد ہفتے میں ایک بار بھی اپنا انڈرویئر تبدیل نہیں کرتے فرانس کو رومانس اور محبت کی سرزمین کہا جاتا ہے اور پیرس

کی خوشبوئیں اور عطریات دنیا بھر میں مشہور ہیں لیکن وہاں گندگی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص مہینے میں ایک بار نہا لے تو اسے پانی کا کیڑا سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف فرانس ہی کا حال نہیں پورے یورپ جس کا ظاہر اتنا حسین نظر آتا ہے۔ اندر سے سخت بدبودار ہے۔ یورپ میں عطریات اور خوشبویات کی فراوانی کی وجہ بھی شاید یہی ہے کہ وہ اپنی بدبو کو عطریات سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں عیسائی راہبوں کے نزدیک گندگی اللہ کو بہت پسند ہے اس لئے وہ عمر بھر نہیں نہاتے اور اپنی اس گندگی پر فخر کرتے ہیں ان راہبوں کے سر پر اگر جوئیں پڑ جائیں تو وہ انہیں اللہ کے

فرانسیسی صدر کی بڑی بیٹی شادی کے بغیر بچے کی ماں بن گئی

فرانسیسی صدر شیراک گزشتہ روز نانا بن گئے لندن کے روزنامہ ٹائمز کے مطابق شیراک کی بڑی بیٹی اور ان کے سیاسی مشیر کلاڈ نے شادی کئے بغیر ہی ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا۔“ (”جنگ“ لاہور 26 مارچ 96ء)

یہ ہے مغربی تہذیب کی معراج، جس کی طرف ہم للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہم بھی یہی حیوانی آزادی چاہتے ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر خود کو مسلمان کہلوانے سے بھی آزادی حاصل کر لینا چاہئے۔!

تہذیب جدید کے نتائج

عورت اور جدید سائنس

''مغربی سماج میں بگاڑ ہے تو مسلمانوں کے موجود سماج میں بھی بگاڑ ہے۔ اس کے باوجود آپ مغربی تہذیب کو غلط اور اسلام کو صحیح کیسے کہتے ہیں۔'' ایک شخص نے کہا۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں اس لئے کہ جس اعتبار سے ہم مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان تقابل کر رہے ہیں اس میں دونوں کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔ مسلم سماج کا بگاڑ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ عین اس کے اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ۔

مسلمانوں کے درمیان جو بگاڑ ہے وہ اصول اور عمل کے درمیان فرق ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ اصول اور حقیقت واقعہ کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے معاشرتی زندگی کے بارے میں مذہبی اصولوں کے بالمقابل کچھ دوسرے اصول وضع کئے اور قدیم اصول کے مقابلہ میں جدید اصول کی معقولیت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ زمین کے قابل لحاظ حصہ پر مغربی اقوام کا سیاسی اور مادی غلبہ قائم ہو گیا۔ انہیں یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ وہ قدیم اصول حیات کو رد کر کے جدید اصول حیات کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کی تشکیل کریں۔

مغربی اقوام کے غلبہ کے ساتھ ہی یہ عمل شروع ہو گیا۔ اب اس تجربہ پر سو سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ مگر عملی تجربہ اصول کی صداقت کو ثابت نہ کر سکا۔ اس تجربہ نے صرف یہ بتایا کہ مغرب نے انسانی زندگی کے جو نئے اصول وضع کئے تھے وہ حالات سے مطابقت نہ رکھتے تھے اصول اور حقیقت واقعہ کا یہ ٹکراؤ بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ مغربی زندگی میں شدید قسم کی ابتری پیدا ہو گئی جس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسلم سماج میں آج جو بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ مسلم سماج کو سابقہ اسلام کے اصولوں کی طرف لوٹایا جائے۔ مگر یہی بات مغرب کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ مغرب کا سماج اگر پیچھے کی طرف لوٹایا جائے تو اس کا لوٹنا عین انہی اصولوں کی طرف لوٹنا ہوگا، جن پر آج بھی وہ پوری طرح قائم ہے۔ جن لوگوں نے آزادانہ جنسی اختلاط کا نظریہ پیش کیا یا جنہوں نے عورت کو ہر مردانہ شعبہ میں داخل کرنے پر اصرار کیا، یا جنہوں نے یہ کہا کہ نکاح کا ادارہ ایک غیر ضروری بندھن ہے وہ آخر اپنے اصولوں کی طرف لوٹیں تو کس چیز کی طرف لوٹیں گے وہ اسی چیز کی طرف لوٹیں گے جس پر آج بھی وہ قائم ہیں۔ اور جس کے ہولناک نتائج سے وہ بالفعل دوچار ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اسلام کے چھوڑے ہوئے اصول کو دوبارہ اختیار کریں۔ جب کہ مغربی معاشرے کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ اصول کو ترک کر دے۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لئے یہاں ہم کچھ واقعاتی مثالیں پیش کریں گے۔

الٹی طرف سفر

امریکہ کا انگریزی ہفتہ وار ''ٹائم'' نہایت کثیر الاشاعت میگزین ہے وہ 95 ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس میگزین نے اپنی اشاعت 26 جنوری 1987ء میں امریکہ کے بارے میں ایک دل چسپ رپورٹ شائع کی ہے یہاں ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں ''پچھلے 25 سال کے اندر امریکہ میں خاتون کارکنوں کی تعداد بہت بڑھتی ہے۔ امریکہ میں اس وقت بچہ پیدا کرنے کی عمر کی خواتین کی 65 فیصد تعداد دفتروں میں کام کرتی ہے۔ ان میں سے 90 فیصد عورتیں وہ ہیں جو کارکردگی کے دوران حاملہ پائی گئی ہیں۔ عورتوں کے لئے یہ زبردست مسئلہ ہے...... کام کا بھاری بوجھ اٹھانا اور اسی کے ساتھ بیک وقت بچوں کی ماں بننا۔

اسی قسم کی ایک امریکی خاتون لیلین گارلینڈ ہے وہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی میں بطور رسپشنٹ کام کر رہی تھی۔ ملازمت کے دوران وہ حاملہ ہوگئی۔ چنانچہ اس نے 1982ء میں عارضی طور پر دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ تین مہینہ تک دفتر نہ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر تین ماہ بعد جب وہ دوبارہ دفتر آئی تو اس کو بتایا گیا کہ اب کمپنی میں اس کے لئے جگہ نہیں ہے۔ اس کی جگہ، دوسرے کارکن کے ذریعے پر کر لی گئی تھی۔

گارلینڈ نے 850 ڈالر ماہانہ کی سروس کھودی۔ وہ ایسے وقت میں بے روزگار ہوگئی جب کہ بچی کی پیدائش کے نتیجہ میں اس کے اخراجات کافی بڑھ چکے تھے۔ اس نے امریکہ کی فیڈرل کورٹ میں اپیل کی کہ کمپنی نے اس کو ملازمت سے برخواست کر کے اس کے ساتھ امتیاز کا برتاؤ کیا ہے مقدمہ چلتا رہا۔ گارلینڈ کے وکیل اور کمپنی کے وکیل نے ایک دوسرے کے خلاف دلائل پیش کئے۔ یہاں تک کہ پانچ سال بعد جنوری 1987ء میں امریکی سپرم کورٹ کے جسٹس تھرگڈ مارشل نے فیصلہ دیا کہ خاتون کارکن اگر حاملہ ہو جائے تو جس ادارہ میں وہ کام کر رہی ہے اس کو چاہیے کہ وہ اس کو چار مہینہ کی باضابطہ رخصت دے۔ اس فیصلہ نے امریکہ میں زبردست بحث چھیڑ دی ہے۔ ایک طرف آزادی نسواں کی حامی خواتین خوش ہیں کہ بچے کی پیدائش اور نگہداشت کے مسئلہ میں انہیں قانون کی حمایت حاصل ہوگئی۔ دوسری طرف امریکہ کے سنجیدہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ فیصلہ خواتین کے لئے مضر ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اس قسم کا تحفظ صرف خواتین کے حق میں امتیاز کو بڑھانے والا ثابت ہوتا ہے۔ یہ تدبیر ایسی ہے جو ہمیشہ الٹا نتیجہ ظاہر کرتی ہے:

لاس اینجلس کے مرچنٹس اینڈ مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر ڈون بٹلر نے کہا کہ یہ فیصلہ ایک مہلک فیصلہ ہے۔ اگر کمپنیوں کو اس طرح حاملہ خواتین کو چار مہینہ کی رخصت دینی پڑی تو وہ دیوالیہ پن کا شکار ہو جائیں گی۔ امریکی چیمبر آف کامرس کے اٹارنی لیمپ نے کہا کہ اس طرح عورت کے خلاف امتیاز اور بڑھ جائے گا۔ اس لئے بہت سی کمپنیاں یہ نہ چاہیں گی کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی عمر میں عورتوں کو اپنے یہاں ملازم رکھیں:

گارلینڈ کے مذکورہ معاملہ کی حمایت میں ایک مشہور خاتون لیڈر بیٹی فریڈان نے کہا کہ عورت اور مرد کے

درمیان برابری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں مردوں کے نمونہ پر پوری اتریں:۔

یہ دلیل بھی کیسی عجیب ہے، سوال یہ ہے کہ جب عورتیں اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے اتنی مختلف ہیں کہ وہ مردوں کے "ماڈل" کے مطابق نہیں بن سکتیں تو اس عجیب وغریب صنفی برابری کی کیا ضرورت ہے کہ عورتوں کو مردوں کی طرح ہر جگہ کام کے لئے کھڑا کر دیا جائے اور پھر جبری قوانین کے ذریعہ اس مصنوعی برابری کو قائم رکھا جائے۔ اسی طرح سلویا این ہیولٹ نے کہا کہ امریکہ کی عدالت عالیہ کے اس فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ ترین قانونی سطح پر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا کہ عورتوں کو دفاتر میں برابری کا مقام دلانے کے لئے ایک خاندانی سپورٹر کو وجود میں لانا ہوگا۔

یہ قدیم روایتی نظام کی معقولیت کا بالواسطہ اعتراف ہے جدید تہذیب نے یہ معیار پیش کیا تھا کہ مرد کو عورت کا سپورٹر نہیں ہونا چاہئے بلکہ خود عورت کمائے اور خود اپنی سپورٹر بنے۔ مگر جب اس اصول کو عمل میں لایا گیا تو معلوم ہوا کہ عورت سپورٹر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے اس سپورٹر کا نام "شوہر" تھا اور اب اس سپورٹر کا نام "کمپنی" ہے۔

قدیم روایتی ماحول جو مذہب کے زیر اثر بنا تھا۔ اس میں مرد بنیادی طور پر باہر کا کام کرتے تھے اور عورتیں بنیادی طور پر گھر کا کام۔ یہ دراصل ایک طرح کی تقسیم کار تھی۔ مگر جدید تہذیب نے اس کے متعلق کہا کہ یہ ایک صنف اور دوسری صنف کے درمیان امتیاز ہے چنانچہ زور وشور کے ساتھ آزادی نسواں کی تحریک چلی۔ عورتوں کو گھروں سے نکال کر دفتروں اور کارخانوں میں ڈال دیا گیا۔

مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس نئے انتظام میں مختلف قسم کی رکاوٹیں حائل ہیں مثال کے طور پر عورت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ حاملہ ہوتی ہے، وہ بچہ پیدا کرتی ہے اور پھر ایک مدت تک وہ باہر کے کام کے قابل نہیں رہتی اس مشکل کے حل کے لئے قانون بنایا گیا کہ عورت کو حمل اور رضاعت کے دوران خصوصی چھٹی دی جائے۔ مگر اس قسم کا لفظی کھیل وہ لوگ کر سکتے ہیں جو قانون ساز مجالس میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں۔ اس اصول کا تحمل وہ لوگ نہیں کر سکتے جن کو عملاً کارخانہ چلانا ہے۔ یا ایک دفتر کا انتظام کرنا ہے چنانچہ اب مالکوں اور خاتون ملازموں کے درمیان لامتناہی جھگڑے چھڑ گئے ہیں۔

حکومتی ادارہ اب تک اس نزاع میں بظاہر خواتین کا ساتھ دے رہا ہے تاکہ اس کے تہذیبی اصول کی عظمت باقی رہے۔ مگر حقیقت کے خلاف یہ جانب داری قابل عمل نہیں۔ حکومت اگر دفتروں اور کارخانوں سے کہے کہ وہ خاتون کارکنوں کو "چار ماہ" کی باتنخواہ چھٹی دیں تو کون ادارہ اس تہذیبی تعیش کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اداروں میں رجحان بڑھے گا کہ جوان عورتوں کو ملازمت میں نہ لیا جائے اور جب عورتیں بوڑھی ہو چکی ہوں گی تو وہ اپنے آپ کو ملازمتوں میں جانے سے روکیں گی۔ اس طرح مغربی سوسائٹی میں وہی چیز شدید تر صورت حال میں پیدا ہو جائے گی جس کو ختم کرنے کے لئے آزادی نسواں کی تحریک چلائی گئی تھی۔ یعنی صنفی امتیاز۔

مایوسی کا شکار

12`16 جنوری 1987ء کو نئی دہلی (وگیان بھون) میں ایک کانفرنس ہوئی اس میں پندرہ ملکوں کے فلسفی، سائنٹسٹ، مصنف و آرٹسٹ شریک ہوئے۔ اس پانچ روزہ کانفرنس کا عنوان تھا۔ ''نئے آغاز کی طرف''۔ اس کانفرنس کا اہتمام مرکزی حکومت ہند نے کیا تھا۔

اس عالمی کانفرنس میں مغربی دنیا کی کئی ممتاز خواتین بھی شریک ہوئیں۔ جو اب بڑھاپے کی عمر میں ہیں اور انہوں نے اپنی پوری زندگی آزادی نسواں کی تحریک چلانے میں گزاری ہے مگر اب وہ مایوسی کا شکار ہیں۔ آسٹریلیا کی جرمین گریر جو بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ ان کے بارہ میں انڈین ایکسپریس (14 جنوری 1987ء) کے نامہ نگار کے الفاظ یہ ہیں کہ آج کل وہ بہت دھیمی نظر آتی ہیں۔ ان کا وہ جوش جو ''فیمیل یونک'' نامی کتاب لکھنے کے وقت ان کے اندر تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر غائب نظر آتا ہے۔ جرمن گریر نے مغرب کی آزادی نسواں کی تحریک پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے کچھ مسائل حل کئے ہیں اور ہم کو کچھ نئے قسم کے مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔

جرمین گریر اپنی جوانی کی عمر میں اتنی آزاد خیال تھیں کہ وہ نکاح کے طریقہ کو ختم کرنے کی وکیل بنی ہوئی تھیں۔ مگر اب وہ بدل چکی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ شاید مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ماؤں کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ ہم نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ اور ان کو قدامت پرست سمجھ لیا۔ اب جب کہ ہم میں سے اکثر ماں بن چکی ہیں اور ہمارے ساتھ لڑکیاں ہیں تو اب ہم مسائل کو کسی قدر مختلف انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید اب ہم اپنی ماؤں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ مغرب کے پاس مرد اور عورت کے درمیان نابرابری کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔ مغربی عورت کا یہ خیال غلط ہے کہ پردہ دار عورتوں کو برابری حاصل نہیں ہے۔ اور وہ عورتیں جو بناؤ سنگھار کے ساتھ اور کھلے سر ہوتی ہیں وہ آزاد ہیں۔ اس فکر کو اب رد کر دیا جانا چاہئے انہوں نے کہا کہ نام نہاد مہذب مغرب میں بھی عورتوں کے مارنے کے واقعات موجود ہیں۔ مزید یہ کہ امریکہ اور انگلینڈ جیسے ملکوں میں بھی تنخواہ اور ملازمت کے معاملہ میں عورتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے انگلینڈ میں جرائم کی چوتھائی تعداد عورتوں کے خلاف تشدد سے متعلق ہے۔ امریکہ کی 15 فیصد عورتوں کو ان کے شوہر یا بوائے فرینڈ مارتے پیٹتے ہیں۔ (ٹیلی گراف 11 اکتوبر 1987ء)

فرانس کی رمز بلیمی اس معاملہ میں اور بھی زیادہ کھل کر بولتی ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ خواتین نے جو کچھ چاہا وہ پالیا مگر ان کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ انہوں نے کہا کہ عورتیں بہت مخصوص قسم کی اخلاقی اقدار رکھتی ہیں۔ انسانیت کے بارے میں وہ ایک مختلف نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کا نقطۂ نظر بہتر ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عورتوں کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو عورت ثابت کریں نہ کہ غیر حقیقی طور پر مرد بننے کی کوشش کریں۔

مذہب کی تعلیمات کے مطابق عورت کا ''ارل ماڈل'' یہ تھا کہ وہ گھر کو سنبھالے اور بچوں کی تربیت کرے۔
موجودہ زمانہ میں عورتوں کا رول ماڈل یہ بنایا گیا کہ وہ باہر کی زندگی میں نکلیں اور ہر شعبہ میں بالکل مردوں کی طرح کام کریں۔ یہ دوسرا ''رول ماڈل'' تجربہ کے بعد قابل عمل ثابت نہ ہوسکا۔ اپنے بڑھاپے کی عمر میں وہی مغربی خواتین پرانے رول ماڈل کی حمایت کر رہی ہیں۔ جنھوں نے اپنی جوانی کی عمر میں نئے رول ماڈل کی پرجوش حمایت کی تھی۔

کیا اس کے بعد بھی مذہب کے بتائے ہوئے رول ماڈل کی معقولیت پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔

دردناک انجام

پلین ٹروتھ ایک مشہور میگزین ہے وہ 87,50,000 کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔
اس ماہنامہ کی اشاعت ستمبر 1986ء میں صفحہ اول پر ایک امریکی لڑکی کی تصویر ہے جو حیرانی کے عالم میں بیٹھی ہوئی ہے اس لڑکی کا نام سالی (Sally) ہے میگزین میں اس لڑکی کا ایک خط شائع ہوا ہے، یہ ایک چھوٹا سا خط ہے مگر وہ جتنا چھوٹا ہے اتنا ہی زیادہ دردناک ہے۔ وہ مختصر خط یہ ہے:

ترجمہ: ''جب میری عمر آٹھ سال تھی تو میں نے پہلی بار ایک پندرہ سالہ لڑکے کے ساتھ جنسی فعل کیا۔ میں نے ایسا اس لئے کیا کہ میں اپنے والدین کی طرف سے محبت اور توجہ پانے سے محروم تھی۔ مجھے محبت کی ضرورت تھی مگر مجھے کبھی اپنے والدین کی محبت نہ مل سکی۔ (میرے اس حال کے باوجود) گھر کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور میں پندرہ سال کی عمر میں حاملہ ہوگئی میرے دوست لڑکے نے مجھے ملزم ٹھہرایا اور مجھ کو چھوڑ دیا۔ کوئی صورت میرے لئے باقی نہ رہی۔ میں پھنس کر رہ گئی۔ چنانچہ میں نے حمل ساقط کروالیا۔ اب میں کسی لڑکے سے تعلق قائم کرنے سے ڈرتی ہوں۔ ہر رات کو میں روتی رہتی ہوں یہاں تک کہ سو جاتی ہوں۔ (امریکہ میں ہر دومنٹ میں ایک کم عمر لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے)

پلین ٹروتھ کے مذکورہ شمارہ میں نیویارک کے اخبار نویس میں جارج ڈون کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں 15 سے 19 سال کے درمیان کی ہر ایک ہزار لڑکیوں میں 96 حاملہ پائی گئی ہیں۔

یہ انجام ہے فطرت سے انحراف کرنے کا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد اور عورت کی شکل میں بنایا۔ پھر مرد اور عورت کے تعلق کا نظام مقرر کیا۔ وہ نظام یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک خاص عمر کو پہنچ کر نکاح کرلیں پھر وہ مل کر ایک گھر بنائیں۔ اپنے بچوں کی تربیت کریں اور پرورش کریں۔ اسی طرح نسل انسانی چلائی جائے۔ مگر جدید مغرب نے آزادی کے تصور کو اتنا بڑھایا کہ عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو بھی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں مغرب کے معاشرہ میں بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ جن میں سے ایک وہ ہے۔ جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان آزادانہ اختلاط اور بے قید تعلق، فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ صنفی معاملہ میں عورت ''وحدت'' کو پسند کرتی ہے جب کہ مرد اس معاملہ میں طبعاً کسی قدر مختلف ہے۔ نتیجہ یہ

ہے کہ آزادانہ صنفی تعلق میں مانع بن جاتا ہے جو مرد سے زیادہ عورت کے لئے نفسیاتی ہلاکت کے ہم معنی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ قیمت عورت کو بھگتنی پڑتی ہے۔

آسٹریلیا کی مشہور آزادی پسند خاتون مسز جرمین گریر نے بڑی عمر کو پہنچ کر یہ اعتراف کیا کہ نوجوانی کی عمر میں آزادی نسواں کے لئے ان کا جوش وخروش حقیقت پسندانہ نہ تھا۔ انہوں نے ایک انٹرویو (انڈین ایکسپریس 14 جنوری 1987ء) میں کہا تھا:۔

آج جو چیز پریشان کن ہے وہ آزادیِ صنفی تحریک کے نتائج میں کم عمر لڑکیاں جو 12 اور 13 سال کی عمر سے مانع حمل گولیوں پر رہنے لگتی ہیں اور وہ لڑکیاں جو 15 اور 16 سال کی عمر میں حاملہ ہو جاتی ہیں ان کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ صنفی تعلق مرد کے لئے کافی مختلف معنی رکھتا ہے۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ محبت کریں اور چھوڑ دیں۔ جب یونیورسٹی جانے کا وقت آتا ہے تو وہ نہایت آسانی سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ عورتیں مرد سے زیادہ مختلف حساسیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے دفاع، اپنے دل اور اپنے وجود کے ساتھ محبت کرتی ہیں۔ ایک ٹوٹا ہوا رشتہ انہیں بالکل توڑ کر رکھ دیتا ہے میں نے یہ بات اپنے قریب کے لوگوں میں دیکھی ہے اور یہ دہشت ناک ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سوسائٹی میں بھی بگاڑ پایا جاتا ہے اور مغرب کی سوسائٹی میں بھی۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کا بگاڑ اسلامی اصول وقوانین پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ خود ان کے اصولوں پر عمل کی پیداوار ہے۔

مصنوعی مسائل

کیلی فورنیا کے ایک کروڑ پتی رابرٹ گراہم نے ایک انوکھا بینک قائم کیا۔ اس کا نام انہوں نے اسپرم بینک رکھا۔ اس ''بنک'' میں نوبل انعام یافتہ افراد کے مادہ منویہ کو حاصل کر کے محفوظ کیا جاتا ہے تا کہ اسکے ذریعے عورتوں کو بارآور کیا جائے اور زیادہ اعلیٰ ذہانت والے بچے پیدا کئے جائیں۔ باقی کا کہنا تھا کہ یہ بینک اس نے نااہل شوہروں کے لئے قائم کیا ہے۔ تاہم جدید خواتین کی اباحیت پسندی اس پابندی کو ختم کر رہی ہے۔ بہت سی خواتین نکاح کے بغیر بچہ پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ نیز وہ چاہتی ہیں کہ ان کی اولاد اعلیٰ استعداد کی مالک ہو۔ ایسی خواتین آزادانہ طور پر اس بینک کی خدمات حاصل کر رہی ہیں۔

انہیں خواتین میں سے ایک کیلی فورنیا کی ڈاکٹر آفٹن بلیک ہے۔ اس کی عمر اس وقت 44 سال ہے۔ اس نے مذکورہ نوبل اسپرم بینک سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے لئے جس قسم کی اولاد چاہتی تھی۔ اسی کے مطابق اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ نمبر 28 کا مادہ حاصل کرے۔ واضح رہے کہ اس بینک میں جن لوگوں کے مادۂ منویہ جمع کئے گئے ہیں۔ ان کو ان کے نام سے پکارا نہیں جاتا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو ایک نمبر دیا گیا ہے اور اسی خاص نمبر سے اس کو یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بلیک ''نمبر 28'' کے مادہ کو اپنے رحم میں داخل کر کے حاملہ ہوئی۔ مقررہ وقت پر اس کے یہاں ایک

لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اس نے ڈورون (Doron) رکھا۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی تحفہ یا عطیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ اب چار سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے اور اب وہ اسکول جانے لگا ہے۔ اس کی تصویر ہندوستان ٹائمز 7 ستمبر 1986ء میگزین صفحہ نمبر 4) پر شائع ہوئی ہے۔ ویکلی ٹیلی گراف کا نمائندہ آئن بروڈی مذکورہ خاتون سے اس کے لاس اینجلس (کیلی فورنیا) کے مکان پر ملا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر بلیک کی خوشیاں دھیرے دھیرے غم میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ باپ کے بغیر بچہ کی ولادت اس کے لئے طرح طرح کے مسئلے پیدا کر رہی ہے ان مسائل کی فہرست طویل میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود اب بولنے لگا ہے وہ بار بار پوچھتا ہے کہ میرے باپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر بلیک نے بتایا کہ ایک بار ایسا ہوا جبکہ ڈورون مجھ سے غصہ ہو گیا اس نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے تا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے۔

خاتون کے لئے شوہر کے بغیر اولاد حاصل کرنا پہلے ایک دل چسپ تجربہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب وہ نازک مسائل کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ مولود ڈورون اپنے لئے ایک باپ سے محروم ہے۔

فطرت کے نظام سے انحراف کے بعد آدمی کے لئے ایسے عجیب وغریب مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کا اس نے پہلے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

منا کحت نہ کہ مسافحت

ٹائم (نیویارک) انگریزی زبان کا مشہور ہفتہ وار میگزین ہے۔ وہ دنیا بھر کے تقریباً 95 ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کی اشاعت 6 ملین ہے۔ (ٹائم 2 فروری 1987ء)

اس میگزین کی ہر اشاعت میں ایک تحقیقی مضمون ہوتا ہے۔ جس کو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ٹیم خصوصی ریسرچ کے ذریعہ تیار کرتی ہے اس مضمون کو سرورق کا مضمون کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے اسی قسم کا ایک مضمون اس کے شمارہ 16 فروری 1987ء میں شائع ہوا ہے اس کا عنوان ہے "عظیم پژمردگی" اس مضمون میں مختلف پہلوؤں سے اس نئی بیماری کی تحقیق کی گئی ہے۔ جس کو ایڈز کہا جاتا ہے۔

ایڈز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک متعدی مرض ہے چنانچہ یہ مرض اب نئے قسم کے اچھوت پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ جو مرد یا عورت ایک بار ایڈز میں مبتلا ہو جائیں۔ لوگ ان سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ انہیں بھی یہ مرض لگ جائے گا۔ بعض مغربی ملکوں میں باربر شاپ پر اس قسم کے نشانات نظر آنے لگتے ہیں جن کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ شیو کے لئے یہاں نہ آئیں۔

حکومتی ذمہ داروں نے اس کو ایڈز ہسٹریا کہا ہے تاہم باربر حضرات کا کہنا ہے کہ مریض کے چہرہ کا پسینہ یا شیو کرتے ہوئے معمولی سا خون نکل آنا بھی بیماری کے پھیل جانے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لئے احتیاطی طور پر ایسے مریضوں سے بچنا ضروری ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا 19 فروری 1987ء)

ٹائم کے محققین کی جماعت نے تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اس مہلک مرض کا سب سے

بڑا سبب آزادانہ جنسی تعلق ہے۔ اسی بنا پر اس مرض کو رنڈی کا مرض کہا جاتا ہے۔ یہ مرض بہت تیزی سے پھیلتا ہے۔ جدید دنیا جس نے جیومیٹرک انتشار کی صورت اختیار کر لی ہے ایڈز کی ہلاکت خیزی کو دیکھ کر ایک مبتلائے مرض نے کہا:

آہ! اس دنیا کا کیا ہوگا اگر ہمارا حال یہ ہو جائے کہ ہم کو محبت کے لئے مر جانا پڑے۔ ایڈز اس صدی کی آفت ہے۔

آزادانہ جنسی تعلق جس کو مغرب میں خوبصورت طور پر آزادانہ محبت کہا جاتا ہے۔ وہ اب لوگوں کے لئے عذاب بنتا جا رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ **1991**ء تک امریکہ میں **270000** افراد اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں گے۔ جن کا علاج کرنا امریکی ڈاکٹرز کے بس سے باہر ہو جائے گا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے جو مخالفِ ایڈز مہم چلائی جا رہی ہے، اس کا ایک ہی خاص نعرہ ہے...... احتیاط کے ساتھ محبت کیجئے:

''احتیاط کے ساتھ محبت کیجئے'' کی نصیحت کو اگر ہم لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہوگی کہ نکاح کے ساتھ محبت کیجئے۔ بے نکاح محبت کا طریقہ چھوڑ دیجئے۔ ڈی ایچ لارنس کا ناول ''لیڈی شیٹری کا محبوب'' پہلی بار **1928**ء میں چھپا۔ اس میں آزادانہ جنسی تعلق کی حرکات پیش کی گئی تھیں۔ اس وقت اس ناول کو فحش سمجھا گیا اور جلد ہی اس کو بند (**Ban**) کر دیا گیا۔ اس کے بعد حالات بدلے اور **1959**ء میں دوبارہ اس ناول کو چھاپنے اور فروخت کرنے کی قانونی اجازت دے دی گئی۔ اس ناول نے امریکی نوجوانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے اندر آزادانہ جنسی تعلق عام ہو گئے مگر اب دوبارہ آواز اٹھ رہی ہے کہ اس ناول پر پابندی لگائی جائے۔

یہ ایڈز کا کرشمہ ہے۔ آزادانہ جنسی تعلقات نے ایڈز کی پر اسرار مگر حد درجہ مہلک بیماری پیدا کی ہے اور اب مغرب کے لوگ مجبور ہو رہے ہیں کہ آزادانہ جنسی تعلق کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کریں۔

ٹائم کے الفاظ میں، ہر جنسی ترغیب پر دوڑنے والے لوگ، جلد یا بدیر، جنسی احتیاط اور پابندی کے ایک نئے دور کی حقیقت سے دوچار ہوں گے۔

مذکورہ تبصرہ کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ فطرت کے حقائق انسان کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ آزادانہ جنسی تعلق کے طریقہ کو چھوڑ دے اور پابند جنسی تعلق کے طریقہ کو اختیار کرے۔

شریعت خداوندی میں عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلق کو نکاح کی قید کے ساتھ وابستہ کیا گیا تھا۔ مگر موجودہ زمانے کے آزادی پسند لوگوں نے کہا کہ یہ انسان کے اوپر غیر ضروری قسم کی پابندی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار لٹریچر شائع کیا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ممالک میں آزادانہ جنسی تعلق ایک عملی رواج کی صورت اختیار کر گیا۔

لوگ خوش تھے کہ انہوں نے شریعت اور مذہب کی پابندی سے آزاد ہو کر لامحدود عیش کا راز دریافت کر لیا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے ربع آخر میں پہنچ کر آزادانہ جنسی تعلق نے نئے نئے امراض پیدا کر دیئے اور بالآخر ''ایڈز'' کی مہلک بیماری نے لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ شریعت خداوندی کا طریقہ ہی فطری طریقہ ہے۔

اس کے مقابلہ میں جنسی آزادانہ تعلق انسانی صحت کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ٹائم میگزین کے مذکورہ شمارہ (صفحہ 24) میں ایک مرد اور ایک عورت کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ ان کو ایک خوفناک سانپ نے چاروں طرف سے لپیٹ لیا ہے۔

قرآن میں ہدایت کی گئی تھی کہ عورتوں کے ساتھ جنسی تعلق قید نکاح میں لاکر کرو نہ کہ بدکاری کے طور پر کرنے لگو (محصنین غیر مسافحین مائدہ 5) مفسرین قرآن نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ عورتوں کے ساتھ نکاح کے ذریعہ تعلق قائم کرو نہ کہ زانی بن کر (یعنی متزوجین غیر زانین) تجربات نے بتایا کہ یہی طریقہ صحیح فطری طریقہ ہے مناکحت اور مسافحت میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک اگر زندگی ہے تو دوسرا موت۔ ایک طریقہ انسانی سماج کے لئے رحمت ہے تو دوسرا طریقہ انسانی سماج کے لئے عذاب۔

ٹائمز آف انڈیا (19 مارچ 1987ء) نے ایڈز روکو کے عنوان کے تحت ایک امریکی رپورٹ شائع کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی حکومت نے اپنے شہریوں کو بعض تدبیروں کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جس کے ذریعے وہ ایڈز کی مہلک بیماری سے بچ سکتے ہیں۔ ان تدبیروں میں سب سے زیادہ خاص تدبیر جنسی پرہیز ہے:

یہ واقعہ انسانی قانون پر خدائی شریعت کی برتری کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ خدائی شریعت کو ماننے والا ایک شخص اگر خدانخواستہ مسافحت کا طریقہ اختیار کرے اور اس کو ایڈز کی بیماری لگ جائے تو اس کو اصول شریعت سے انحراف کا نتیجہ کہا جائے گا۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب کا ایک انسان مسافحت کر کے ایڈز میں مبتلا ہو تو وہ عین اس کے اصول کی غلطی کا نتیجہ ہے پہلے واقعہ کی صورت میں ایک انسان کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے کی صورت میں خود تہذیب جدید کے اصول کی غلطی۔

غیر فطری مساوات کا نتیجہ

کوئی شخص جو مجھ کو جانتا ہو وہ یقین نہیں کر سکتا کہ میں نے کیا کیا ہے؟ ایک 35 سالہ امریکی نے کہا جو کہ بظاہر ایک سنجیدہ اور معصوم چہرہ والا آدمی ہے۔ اس نے اپنی عورت کو مارنے کی کہانی بیان کی، جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس نے گلا گھونٹ کر اس کو بے ہوش کر دیا۔ پھر اس کو کیچڑ میں دھکیل دیا۔ پھر اس نے چھری سے اس کا گلا کاٹ دینا چاہا، وغیرہ

"میں نے کیسے ایسا کیا۔" اس نے تعجب کے ساتھ کہا: "لوگ مجھے ایک اچھے آدمی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میرا اپنا ایک بزنس ہے، میں شراب نہیں پیتا۔ میں سگریٹ نہیں پیتا، میں دوسری عورتوں کا پیچھا نہیں کرتا۔" اس کے باوجود ایسا ہوا کہ اس شخص نے بار بار اپنی بیوی کو مارا۔

امریکی ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ (مارچ 1987ء) میں اس طرح کے بہت سے امریکیوں کی کہانی بیان

ہوئی ہے۔ ڈائجسٹ کے اس مضمون کا عنوان ہے۔ ''لوگ کیوں ان عورتوں کو مارتے ہیں۔ جن سے وہ محبت کرتے ہیں۔''

پانچ صفحہ کے اس مضمون میں عورتوں کو مارنے کی بہت سی مثالیں نقل کرتے ہوئے حسب ذیل رپورٹ دی گئی ہے:

ایک جائزہ کے مطابق امریکہ میں 18 سیکنڈ میں ایک عورت ماری جاتی ہے۔ کبھی اپنے شوہر کے ہاتھوں اور کبھی اپنے دوست لڑکے کے ہاتھوں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک ملین سے زیادہ عورتوں کو ہر سال طبی امداد کی ضرورت پڑتی ہے ہر ایک دن میں چار عورتیں مرجاتی ہیں۔

امریکہ کے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ میں عورتوں کو مارنے کی یہ برائی کیوں ہے؟ اس پر موجودہ زمانے میں تحقیق کی گئی ہے مسز سوسن شسٹر نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے ''عورتیں اور مردانہ تشدد'' ان کا جواب یہ ہے کہ یہ جابرانہ کنٹرول حاصل کرنے کی ایک صورت ہے۔

ریڈرز ڈائجسٹ کی مذکورہ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے:

''کوئی بھی مارنے والا مرد آپ کو بتائے گا کہ اس نے عورت کو کیوں مارا؟ ڈی اے آئی پی کے ڈاکٹر الن پیس نے کہا:۔ اس نے عورت کے اوپر کنٹرول حاصل کرنا چاہا۔ اس نے چاہا کہ اس کی اپنی مرضی چلے۔ مذکورہ بیان کی روشنی میں غور کیجئے تو یہ صورت حال براہ راست جدید مغربی تہذیب کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے عورت کو مرد کے برابر قرار دیا۔ اس نے عورتوں کے لئے علیحدہ روزگار کا انتظام کر کے انہیں یہ موقع دیا کہ وہ مردوں سے آزاد رہ کر اپنی مستقل معاشی بنیاد حاصل کرسکیں۔ اس بنا پر عورتوں کے اندر برابری کا احساس شدت سے پیدا ہوگیا۔ تاہم یہ احساس مصنوعی تھا۔ کیونکہ مذکورہ معاشی بندوبست کے باوجود مغربی تہذیب کے لئے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ فطرت کی اس تقسیم کو بدل دے کہ مرد پیدائشی طور پر صنف قوی ہے اور عورت پیدائشی طور پر صنف ضعیف۔

اس مصنوعی مساوات کے نتیجے میں۔ ان ملکوں میں گھریلو زندگی ایک تضاد کا شکار ہوگئی۔ ان گھروں میں ایسی عورتیں رہنے لگیں جو اپنی جسمانی بناوٹ کے اعتبار سے تو مرد کے مقابلہ میں تو اسی طرح کمزور تھیں جس طرح ہر دور کی عورتیں کمزور رہی ہیں مگر مزاج کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو مردوں کا ہمعصر سمجھ رہی تھیں۔ مرد صنف قوی ہونے کی وجہ سے عورتوں پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر عورتوں نے اپنے مصنوعی مزاج کی بنا پر کنٹرول قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کشمکش کا نتیجہ یک طرفہ پر عورتوں کے حق میں برا ثابت ہوا۔

عورت اور مرد دونوں اگر واقعتہً حیاتیاتی طور پر یکساں ہوتے تو کبھی مرد عورت کو مارتا اور کبھی عورت مرد کو مارتی۔ مگر چونکہ یہاں معاملہ یکسانیت کا نہ تھا۔ اس لئے وہی صورت پیش آئی جو خربوزے اور چھری کے ٹکراؤ میں پیش آتی ہے۔ مرد ہمیشہ مارنے والا ثابت ہوا اور عورت ہمیشہ مار کھانے والی۔

اس معاملہ میں جدید عورت کی مظلومی اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بھاگ کر بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی۔ رپورٹ کے مطابق ایک عورت نے کہا کہ اگر کوئی عورت بھاگنا چاہے تو اس کا شوہر اس کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تم کو پکڑوں گا اور تمہیں مار ڈالوں گا۔ اکثر سنگین ضربیں اور موتیں اس وقت پیش آتی ہیں جب کہ عورتیں باہر بھاگ جانا چاہتی ہیں۔

فطرت کی تقسیم میں مرد کو عورت کے اوپر قوام بنایا گیا ہے۔ اب اگر اس تقسیم کو مصنوعی طور پر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کا انجام وہی ہوگا جس کی ایک تصویر مذکورہ بالا رپورٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ جدید تہذیب سے پہلے کبھی ایسا نہ تھا کہ عورتیں اس طرح گھروں میں ماری جائیں۔ یہ دور جدید کی خصوصیت ہے اور یہ براہ راست اس مصنوعی نظریہ مساوات کا نتیجہ ہے جو تاریخ میں پہلی بار مغربی تہذیب میں اختیار کیا گیا۔ تاریخ کے پچھلے دور میں بھی عورت کو مارنے کے واقعات ہوتے تھے۔ مگر وہ استثنائی طور پر صرف نچلے طبقات میں پیش آتے تھے۔ لیکن جدید حالات نے ان کو بڑھا کر اعلیٰ طبقات کے دائرہ تک پہنچا دیا۔ اس نے ایسے واقعات کو مہذب انسانوں کے لئے مسئلہ بنا دیا جب کہ اس سے پہلے وہ صرف غیر مہذب انسانوں کے مسئلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

جدید عورت کی مظلومی

ایک سیاح امریکہ گیا۔ ایک بار وہ وہاں کے ایک کلب میں تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر رقص کر رہے تھے۔ سیاح کنارے کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ایک امریکی لڑکی آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی اس نے اداس لہجے میں کہا کہ: مسٹر سیاح! کیا میرے اندر گلیمر نہیں'' ''کیوں نہیں تمہارے اندر تو گلیمر ہے'' سیاح نے جواب دیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی لڑکا مجھے ڈیٹ نہیں دیتا'' لڑکی نے کہا۔

ڈیٹ کے معنی انگریزی زبان میں تاریخ کے ہوتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں یہ لفظ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک رواج کے لئے استعمال ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک صنف کا دوسری صنف کو کسی مقررہ تاریخ کو مدعو کرنا۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ڈیٹ دے کر ایک دوسرے کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ مغربی زندگی میں یہ رواج اتنا زیادہ عام ہو گیا ہے کہ جس لڑکی کو کوئی لڑکا ''ڈیٹ'' نہ دے وہ اپنے آپ کو کم سمجھنے لگتی ہے اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ شادی کے بازار میں اس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

ڈیٹنگ کا یہ طریقہ ابتداً صرف گفتگو اور ملاقات تک محدود تھا۔ اب بڑھتے بڑھتے وہ باقاعدہ جنسی تعلقات تک پہنچ گیا ہے مغربی لڑکوں کے لئے یہ ایک مہذب طریقہ بن گیا ہے کہ وہ ڈیٹ دے کر ایک لڑکی کو ایک تنہا کمرے میں بلائیں اور پھر وہاں اس کے ساتھ جبری طور پر بدکاری کریں۔

اس سلسلہ میں امریکی میگزین ٹائم (23 مارچ 1987ء) نے ایک سبق آموز رپورٹ شائع کی ہے اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے: ''جب ڈیٹ زناکاری میں تبدیل ہو جائے''

سوسن (Susan) 22 سال کی ایک غیر شادی شدہ خاتون ہے اس کی ملاقات ایک مرد سے ہوئی جب وہ

دونوں رخصت ہونے لگے تو مرد نے اس کو ڈیٹ دی اس کے مطابق دونوں ایک کمرے میں جمع ہوئے۔ 45 منٹ تک وہ ٹیلی ویژن دیکھتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اس کے بعد مرد اس کے پاس آ گیا اور آگے کے افعال کرنا شروع کر دیئے۔ عورت ٹھہرو ٹھہرو کہتی رہی۔ مگر مرد نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ تم محض تکلف میں ایسا کہہ رہی ہو، ورنہ حقیقۃً تم مجھ کو روکنا نہیں چاہتی ہو۔

اس کے بعد اس کمرہ میں وہ سب کچھ ہوا جس کو قانونی اصطلاح میں ''زنا بالجبر'' کہتے ہیں۔

اس قسم کی ڈیٹ ریپ موجودہ ترقی یافتہ ممالک میں عام ہو چکی ہے ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنا بعض محققین کے نزدیک، آج کا بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ کالج کے طلبہ کا جائزہ یہی بتاتا ہے جو کہ 6200 عورتوں اور مردوں کے درمیان 32 کیمپس میں تین سال تک کیا گیا۔ ماہر نفسیات میری کاس نے بتایا ہے کہ جن عورتوں کو اس قسم کے تجربات ہوئے جو کہ قانون کے مطابق ''زنا بالجبر'' کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان میں آدھے سے زیادہ تعداد ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنے کی تھی۔ ایک لیکچرر اینڈری پیرٹ نے اندازہ لگایا ہے کہ دو کیمپس جن کا اس نے جائزہ لیا، ان کی 20 فیصد خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا۔ 1985ء میں زنا بالجبر کے واقعات کی تعداد 87340 تھی میری کاس نے کہا: ڈیٹ کے موقع پر بدکاری کا خطرہ اس سے زیادہ ہے کہ اچانک کسی جھاڑی سے نکل کر کوئی اجنبی شخص ایسا کرنے لگے۔ آزادی نسواں کے بعض علمبرداروں کا کہنا ہے کہ امریکہ میں ایک بدکاری کلچر پیدا ہو چکا ہے جس میں مردوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کریں اور عورتیں ان کے آگے سپر ڈال دیں۔

مسٹر سری پرکاش (سابق گورنر مہاراشٹر اور پاکستان میں پہلے ہندوستانی ہائی کمشنر) نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ 1947ء میں انہوں نے ایک انگریز سے پوچھا کہ تم لوگ ہم ہندوستانیوں کو حقیر کیوں سمجھتے ہو۔ انگریز نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا اس میں ایک بات یہ تھی کہ: آپ لوگ شادی کے سلسلے میں بہت سی پابندیاں ملحوظ رکھتے ہیں۔ یورپ کا نظریہ یہ ہے کہ نوجوان لڑکا اور لڑکی خود ایک دوسرے کو پسند کر کے شادی کر لیں۔ آپ کے یہاں ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

آزادی نسواں کی تحریک کے آغاز میں یہ بات بہت اچھی معلوم ہوتی تھی مگر غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان سے ہر قسم کی پابندی کو اٹھانے کا نتیجہ آخر کار قبل از نکاح صنفی تعلقات اور پھر زنا بالجبر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس تجربہ نے بتایا کہ صنفی تعلقات کے معاملہ میں ''پابندی'' کا اصول ہی صحت مند اصول ہے۔ اس معاملہ میں ''آزادی'' کا اصول معاشرہ کو بربادی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

ایک حدیث

''ڈیٹ'' کا مذکورہ مغربی رواج اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ غیر شادی شدہ عورت اور مرد تنہائی میں ایک دوسرے سے ملیں اور جتنی دیر تک چاہیں ایک ساتھ اپنے اوقات گزاریں۔ اس رواج نے مغرب میں جو

اندوہناک صورت حال پیدا کی ہے اس کو نظر میں رکھئے اور پھر مندرجہ ذیل حدیث پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے اس معاملہ میں جو اصول مقرر کئے ہیں وہ کس قدر با معنی ہیں:

ترجمہ: ''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ ہرگز وہ کسی ایسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے جس کے ساتھ کوئی محرم موجود نہ ہو کیونکہ وہاں ان کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ (احمد)

غیر مرد اور عورت اگر تنہائی میں ملیں تو شیطان کو فوراً انہیں ورغلانے کا موقع مل جاتا ہے، لیکن اگر ملاقات کے وقت کوئی محرم رشتہ دار بھی ساتھ موجود ہو تو شیطان کو ان کی نفسیات میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملے گا ایک صورت میں ملاقات کسی حد پر نہیں رکتی اور دوسری صورت میں ملاقات ایک حد پر رہتی ہے وہ اس سے آگے نہیں جانے پاتی۔

پاکبازی کی اہمیت

موجودہ زمانے میں صنفی اباحیت کا طریقہ بہت بڑے پیمانے پر اختیار کیا گیا۔ مغربی دنیا میں نکاح سے پہلے جنسی تعلق قائم کرنا عام ہوگیا، حتیٰ کہ اسے ایک فلسفہ بنا دیا گیا کہا گیا کہ مستقل شریک حیات کے انتخاب کے لئے یہ ضروری زیادہ محفوظ اور بہتر طریقہ ہے کہ پیشگی طور پر اس کا تجربہ کرلیا جائے۔ مرد اور عورت نکاح سے پہلے اسی طرح کھلے طور پر ایک دوسرے سے ملنے لگے جس طرح ایک مرد اور عورت نکاح کے بعد آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

مگر یہ طریقہ فطرت سے ٹکرا گیا۔ تخلیقی نظام کی خلاف ورزی نے ایسے ایسے مسائل پیدا کر دیئے جن کا حل موجودہ ڈھانچہ میں ناممکن نظر آنے لگا ان نتائج نے لوگوں کے اندر نظر ثانی کا ذہن پیدا کیا۔ حتیٰ کہ اب خود ہی لوگ اس طریقہ کے مخالف ہو رہے ہیں۔ جو اس سے پہلے نہایت پرجوش طور پر اس کی حمایت کر رہے تھے۔

اس سلسلہ میں امریکہ کی ایک بڑی سبق آموز رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اے ایف پی (AFP) کے حوالہ سے ٹائمز آف انڈیا (18 مارچ 1987ء) نے اس رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

ایک جائزہ لیا گیا جو 1400 سے زیادہ کالج کے طلباء کے درمیان لیا گیا۔ جن کی عمریں 18-19 سال کی تھیں۔ بتاتا ہے کہ امریکہ کی نوجوان عورتیں ازدواجی تعلقات کے لئے پاکباز مردوں کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ جبکہ دس سال پہلے ایسا نہ تھا، نیویارک کے ماہر نفسیات سے مسٹر سرولی بلاٹنک جن کی کمپنی نے یہ جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ پاکباز مرد بہت اچھا محبت کرنے والا نہ ہو مگر عام طور پر وہ سیکھنے کا شوق رکھتا ہے اور وہ محفوظ ہے۔ وہ ایڈز اور دوسری متعدی جنسی بیماریوں کا خطرہ اپنے ساتھ لئے ہوئے نہیں ہوتا۔ مسٹر بلاٹنک نے کہا کہ یہ دراصل جنس سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کا خطرہ ہے۔ جس نے پاکباز عورتوں کی نظر میں اتنا زیادہ جاذب بنا دیا ہے۔ ان کے اس جائزہ نے بتایا ہے کہ کالج کی عورتوں میں اب 22 فیصد وہ ہیں جو پاکباز مرد

چاہتی ہیں۔ جب کہ دس سال پہلے اس قسم کی عورتوں کی تعداد صرف 9 فیصد تھی۔

ہندوستان ٹائمز (19 مارچ 1987ء) نے امریکی نیوز ایجنسی کی اس خبر کو شائع کرتے ہوئے اس پر یہ سرخی قائم کی ہے:

پاکباز مرد کی مقبولیت

شادی کے لئے پاکبازی کی شرط طرفین کے لئے صنفی آزادی میں رکاوٹ تھی۔ چنانچہ آزادی نسواں کی تحریک کی ابتدائی مدت میں اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اور اس کو محض ایک مذہبی افسانہ قرار دیا گیا۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ یہ مذہبی افسانہ نہیں بلکہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے۔

اگر آپ اپنے لئے درست اور بے ضرر جوڑا چاہتے ہیں تو آپ کو پاکبازی کی شرط کو قبول کرنا پڑے گا پاکبازی اس سے پہلے صرف ایک مذہبی حکم نظر آتی تھی۔ آج وہ صحت مند ازدواجی تعلق کے لئے ایک لازمی اصول کی حیثیت کرگئی ہے۔ خدائی احکام کے مبنی بر حقیقت ہونے کا یہ کیسا عجیب ثبوت ہے جو خود انسانی تجربہ نے موجودہ زمانہ میں فراہم کیا ہے۔ اس کے بعد بھی آدمی اگر خدائی شریعت کی اہمیت کو نہ مانے تو یہ اس کی دھاندلی ہوگی نہ کہ مبنی بر حقیقت رویہ۔

مصنوعی اولاد کا مسئلہ

آزادی نسواں کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے بالکل برابر کا درجہ حاصل کرلیں۔ مگر عملاً ایسا نہ ہوسکا۔ آزادی نسواں کی تحریک اپنے اصل مقصد کو پانے میں پوری طرح ناکام ہے ایک امریکی خاتون ٹی گریس انکٹسن نے کہا کہ یہاں تحریک کا کوئی وجود نہیں۔ تحریک کا مطلب کہیں جانا ہے اور آزادی نسواں کی تحریک کہیں بھی نہیں جارہی ہے۔ اس نے اب تک کچھ حاصل نہیں کیا:

اس تجربہ کی بنا پر مغربی ملکوں میں کچھ ایسی پرجوش خواتین پیدا ہوگئی ہیں جن کا مطالبہ ہے کہ مردوں پر انحصار کو کامل طور پر ختم کردیا جائے حتی کہ ان سے جنسی تعلق بھی نہ رکھا جائے۔ جل جانسٹن کا کہنا ہے کہ آزادی نسواں دراصل اس کا نام ہے کہ عورتیں ہم جنسی کا طریقہ اختیار کرلیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ عورتیں اپنی جنسی ضرورت کیلئے مردوں پر انحصار نہ کریں۔ اس طرح وہ مردانہ کنٹرول سے آزاد ہوسکتی ہیں:

دو عورتوں کا، شوہر اور بیوی کی طرح رہنا سادہ سی بات نہیں اس میں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ جوڑے اگر اپنا بچہ چاہتے ہوں تو وہ اپنے لئے ایک بچہ کیسے حاصل کریں۔ اس کا ذریعہ جدید میڈیکل سائنس نے مصنوعی تخم ریزی کی صورت میں فراہم کردیا ہے۔

ہالینڈ کی دو عورتیں پولا ڈیجز (39) اور جی نین ہاکسمن (38) میاں بیوی کے طور پر رہتی ہیں۔ ان کو اولاد کی خواہش ہوئی تو انہوں نے لیڈن کے انسٹی ٹیوٹ آف برتھ کنٹرول سے رابطہ قائم کیا۔ پہلی کوشش ناکام رہی۔ دوسری کوشش میں پولا ڈیجز حاملہ ہوگئی۔ ایک نامعلوم شخص کے مادہ کے ذریعہ ان کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس

کا نام ٹامس رکھا گیا۔ مگر ٹامس کی پیدائش کے بعد انہیں یہ محسوس ہوا کہ دوبارہ انہیں اس مرد کی ضرورت ہے جس سے توحش کی بنا پر انہوں نے ہم جنسی طریقہ اختیار کیا تھا۔

دونوں عورتیں اس حقیقت کے بارے میں بہت حساس ہیں کہ ان کے لڑکے ٹامس کو مرد درکار ہیں جو اس کے لئے کرداری نمونہ بن سکیں۔ اب وہ دوبارہ اس مقصد کو مصنوعی طور پر حاصل کر رہی ہیں۔ چنانچہ ان خواتین کے چچا ان کے دادا ان کے بھائی اور مرد پڑوسیوں سے درخواستیں کی جارہی ہیں کہ وہ بار بار ان کے گھر آئیں۔ جی نین ہاکسمن نے کہا کہ ہم نے اپنے ایک مرد دوست کو چنا ہے جو ٹامس کے لئے باپ کا کام کرے۔ ہم ٹامس کو اس کے یہاں تمام فنی خدمات کے لئے بھیجتے رہیں گے۔

ٹامس کو ایک ''باپ'' فراہم کرنے کا مذکورہ بالا مصنوعی طریقہ کسی طرح بھی اصل باپ کا بدل نہیں۔ یہ یقینی ہے کہ ان دونوں باپ، اور بیٹے کے درمیان ایک قسم کی اجنبیت حائل رہے گی اور ٹامس جب بڑا ہوگا تو یہ موہوم سی اجنبیت شعوری اجنبیت بن جائے گی۔ ٹامس اپنی ماں کو جانتا ہوگا۔ مگر وہ اپنے باپ سے سراسر ناواقف ہوگا۔ ٹامس کی زندگی کا یہ خلا اس کے اندر طرح طرح کی ذہنی پیچیدگیاں پیدا کرے گا۔ اس کی یہ ذہنی حالت آخر کار اس کو ناممکن بنا دے گی کہ وہ سماج کا ایک مفید حصہ بن سکے۔

گویا عورت اور عورت کے درمیان ہم جنسی کے نظام میں لڑکی پیدا کرنے کی گنجائش تو ہے مگر لڑکا پیدا کرنے کی نہیں۔ اگرچہ لڑکی پیدا کرنے کے لئے بھی دوبارہ اسی مرد پر انحصار کو ختم کرنے کے لئے یہ نظام اختیار کیا گیا تھا۔ فطرت کے نظام سے انحراف کرنا آسان ہے۔ مگر اس کے بعد اسی انحراف کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کو ادا کرنا کسی انسان یا کسی انسانی سماج کے لئے ممکن نہیں۔

غلطی کا اعتراف

امریکہ میں ایک کتاب چھپی جس کا نام باعتبار مفہوم یہ ہے کہ بچے اپنے باپوں کو دوبارہ پا رہے ہیں۔

یہ امریکہ کی خاندانی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ جدید تہذیب میں زندگی کا اعلیٰ معیار یہ بن گیا تھا کہ عورت اور مرد دفتروں میں کام کریں اور بچوں کو گھریلو خادم یا مرکز اطفال کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر کئی نسل کی بربادی کے بعد امریکیوں کی سمجھ میں یہ بات آرہی ہے کہ بچوں کی تربیت اور ارتقاء کے لئے والدین کا کوئی بدل نہیں۔ چنانچہ امریکہ میں ایسے والدین پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے مشاغل میں کمی کر کے اپنے بچوں کے لئے وقت نکال رہے ہیں۔

کیسن شومین کو اونچی تنخواہ کا اعلیٰ عہدہ مل رہا تھا۔ مگر اس نے کم تنخواہ کی ملازمت پر قناعت کیا۔ کیونکہ اعلیٰ عہدہ آدمی کو زیادہ مصروف بنا دیتا ہے کہ اپنے بچوں کی نگہداشت کے لئے وقت نہیں نکال سکتا۔ اس نے کہا کہ موجودہ ملازمت کے ساتھ میں اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں لنچ نہیں کر سکتا۔ نہ ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس میں سفر کر سکتا ہوں مگر میں اپنے فیصلہ پر خوش ہوں، کیونکہ اب میرے پاس کافی وقت ہے جب کہ میں اپنے بچوں کے

تعمیری دور میں ان کی زیادہ مدد کر سکتا ہوں۔ جان فشر بھی اسی قسم کے نئے باپوں میں سے ایک ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس طرز زندگی کو از سرنو اختیار کیا ہے:

یہ معلومات امریکی میگزین اسیان (ستمبر 1987ء) کے ایک مضمون میں دی گئی ہیں۔ 6 صفحات کے اس مضمون کا عنوان یہ ہے:

Putting kids First. the new generation of American fathers is balancing the demands of carcens and childran.

جدید انسان اپنے نظریات کی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر دوبارہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا ہے۔ اگرچہ جدید معاشرہ پر ابھی تک اس کے سابقہ نظریات کا اتنا زیادہ غلبہ ہے کہ جو لوگ اس تبدیلی کے وکیل ہیں۔ وہ اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔ (صفحہ 31)

مغربی شادیوں کا انجام

امریکہ کے ایک میگزین (Better homes and Eardens) نے اپنے قارئین سے سوال کیا کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ امریکہ میں خاندانی زندگی مشکلات (Trouble) سے دوچار ہے۔ 76 فیصد کا جواب تھا کہ ہاں۔ 85 فیصد نے کہا کہ پرمسرت شادی کے بارے میں ان کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ اسی طرح ایک اور امریکی میگزین نیوز ویک نے مئی 1978ء میں اپنے ایک جائزہ کے نتائج شائع کئے تھے۔ اسکے مطابق امریکہ میں تقریباً نصف نکاح طلاق پر ختم ہوتے ہیں۔ طلاق کے بعد دوبارہ نکاح ہوتے ہیں اور پھر دوبارہ طلاق۔

نکاح کے ایک مشیر رونالڈ کیلی نے لکھا ہے کہ:

مشیر نکاح کی حیثیت سے میرے لئے ایک نہایت افسوس ناک بات یہ ہے کہ اکثر عورتیں اور مرد شادی کے بعد بھی اپنے گھروں میں اجنبی کی طرح رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم اشتراک ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک الگ الگ راستے پر چلتا ہے۔ ان میں صرف کبھی کبھی گفتگو ہوتی ہے۔ وہ بھی زیادہ تر پیسہ، بچہ کی پرورش یا جنس کے بارے میں بحث کے طور پر۔ ان کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آخر ابتداء میں وہ دونوں کس طرح اکٹھے ہوئے تھے۔ (پلین ٹروتھ، جون 1987ء)

شادی خواہ کتنی ہی پسندیدگی کے تحت کی گئی ہو۔ اس میں بہر حال ناخوش گواریاں پیش آتی ہیں۔ کبھی زندگی کے مسائل کی بنا پر اور کبھی جنسی کشش زائل ہونے کی بنا پر۔ اب اگر میاں اور بیوی ''شادی برائے مقصد'' کے نظریہ کے تحت یکجا ہوئے ہوں تو پیش نظر مقصد کی خاطر دونوں اس کو نظر انداز کریں گے اور ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے باہم جڑے رہیں گے۔ اس کے برعکس جب ''شادی برائے لذت'' کا تصور ہو تو ہر خلاف مزاج باتیں سنگین صورت حال اختیار کر لے گی۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہ ہوگی جس کی بنا پر عورت اور مرد اس کو

برداشت کرتے ہوئے تعلق کو برقرار رکھنا ضروری سمجھیں۔

مغربی دنیا کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں تہذیب جدید کے اثر سے شادی برائے لذت کا اصول رائج ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں خاندانی زندگی منتشر ہو کر رہ گئی ہے۔ کہیں جنسی کشش کے زوال کی بنا پر اور کہیں گھریلو مسائل کی بنا پر۔

آبادی کا مسئلہ

امریکہ میں ایک کتاب (ٹائم 24 اگست 1987ء) چھپی ہے جس کا نام ہے ''پیدائش کا قحط''

یہ کتاب آج کل مختلف حلقوں میں بحث کا زبردست موضوع بنی ہوئی ہے۔ اس میں مصنف نے اعداد و شمار کی روشنی میں دکھایا ہے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں پیدائش کی شرح خطرناک حد تک کم ہوگئی ہے، دوسری طرف اشتراکی بلاک کی شرح پیدائش بڑھ رہی ہے اور تیسری دنیا کی شرح کا تو یہ حال ہے کہ اگلے پچاس سال میں اس کی آبادی مغربی دنیا سے دس گنا زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے نتیجہ میں اکیسویں صدی میں پہنچ کر امریکہ عالمی طاقت کی حیثیت کھو دے گا۔ اسی طرح پوری مغربی دنیا عالمی سیاست میں دوسرے درجہ کی حیثیت حاصل کرے گی۔ اس کا حل ایک ناقد کے الفاظ میں یہ ہے کہ مغربی عورتیں دوبارہ بچہ پیدا کرنے والی قدیم عورت کا انداز اختیار کرلیں:

جدید تہذیب نے عورت کو جو مقام دیا تھا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے ٹکرا گیا۔ اب مفکرین مغرب کو نظر آ رہا ہے کہ اگر کامیاب زندگی حاصل کرنا ہے تو عورت کے قدیم تصور کو دوبارہ اختیار کرنا ہوگا۔

سرپرستی سے محروم

ہفتہ وار ٹائم (23 مارچ 1987ء) نے امریکہ کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے ''بچوں کی خودکشی'' اس رپورٹ میں دکھایا گیا ہے کہ امریکہ میں 10 سال اور 20 سال کے درمیان کی عمر کے نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ 1950ء کے مقابلہ میں یہ تعداد اب تین گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ 1985ء میں ایک لاکھ آبادی پر ساٹھ نوجوانوں (اور اتنے ہی بڑوں) نے خودکشی کی۔ یہاں ہم تین خواتین کے تاثرات درج کرتے ہیں جو امریکی بچوں کی خودکشی کے سلسلہ میں مذکورہ رپورٹ میں نقل کئے گئے ہیں۔

باربرا وہیلر نے کہا کہ میرا خیال نہیں کہ خودکشی کے وقت یہ بچے سمجھتے ہوں کہ وہ مرنے جا رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ درد کو دور کرنے اور مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایلین لیڈر نے کہا کہ جب اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں اپنے بچوں کے بارہ میں بہت زیادہ سوچنے لگتی ہوں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں ان کی درست طور پر پرورش کرسکوں۔ یہ ان کی زندگی کے خطرناک سال ہیں۔ آپ ہمیشہ یہ جان نہیں سکتے کہ ان کے دماغ میں کس طرح کے خیالات گھوم رہے ہیں۔

ٹائم (23 مارچ 1987ء) کی مذکورہ رپورٹ پڑھنے کے بعد کچھ امریکی باشندوں نے مذکور ہفت روزہ کے نام خطوط لکھے ہیں جو ٹائم (13 اپریل 1987ء) میں چھپے ہیں۔ ایک مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ میرا دل ان

خاندانوں کے لئے خون بہاتا ہے۔ جن کے بچوں نے خودکشی کی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ میرے 16 سال کے پوتے نے اپنے گلے میں پھنداڈال کر خودکشی کی۔ ہمارا خاندان زندگی بھر حیران رہے گا کہ ایسا کیوں ہوا اور ہم کبھی اس کو جان نہ سکیں گے۔

ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان کیوں ہے۔ اس کی واحد وجہ ان کی اپنے سرپرستوں سے محرومی ہے ان ملکوں میں خاندانی انتشار کا مسئلہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا ہے اور یہی چیز ہے جس نے نوجوانوں کے اندر خودکشی کا رجحان پیدا کر دیا ہے وہ خاندان کی شفقت سے محروم ہو کر پرورش پاتے ہیں اور بڑے ہو کر طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ چیز بعض اوقات انہیں خودکشی تک پہنچا دیتی ہے۔

ان ملکوں میں خاندانی انتشار پیدا ہونے کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے ازدواجی زندگی کی بنیاد ذمہ داری کے بجائے لذت پر قائم کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازدواجی تعلق میں مستقل تقدس کی قدر باقی نہ رہی۔ لوگ لذت کی خاطر ایک دوسرے سے ملنے اور لذت ختم ہونے پر ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق عام ہو گئی۔ طلاق کے بعد عورت ایک طرف چلی گئی اور مرد دوسری طرف۔ انہوں نے اس دوران میں جو بچہ پیدا کیا تھا اس کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ وہ والدین کی موجودگی میں یتیم بن کر رہ گیا۔

اس کی دوسری وجہ ان ملکوں میں مشترک زندگی کا خاتمہ ہے انہوں نے زندگی کا جو طرز اختیار کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ بوڑھے ماں باپ دارالضعفاء میں بھیجے جانے لگے۔ مشترک خاندان میں دادا اور دادی، نانا اور نانی بچوں کو سنبھالنے کے لئے موجود ہوتے ہیں مگر مغرب کی معاشرت میں ان لوگوں کا مقام گھر نہیں بلکہ ضعیف خانے ہیں۔ جو خاص طور پر اسی مقصد کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ یہی معاملہ ایک اور صورت میں والدین کے ساتھ ہوا ہے۔ وہاں کے نظام کے مطابق مرد اگر کام کرتا ہے تو عورت بھی کام کرتی ہے نتیجہ یہ کہ دونوں بیشتر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ان کی ملاقات، بمشکل اتوار کے دن ہوتی ہے۔ گویا مغرب کا بچہ اپنے دادا، دادی یا نانا اور نانی سے اس لئے محروم ہے کہ وہ دارالضعفاء میں منتقل ہو گئے ہیں اور اپنے ماں باپ سے اس لئے محروم ہے کہ وہ دونوں کام کرنے کے لئے آفس چلے گئے ہیں۔ ایسے بچوں کا وہی انجام ہو سکتا ہے۔ جو اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔

خاتون سنگر کی موت کے بعد

ٹائمز آف انڈیا (30 مارچ 1987ء) میں ایک رپورٹ جاپان کے متعلق شائع ہوئی ہے اس رپورٹ کا عنوان ہے:

Suicide Easy Escape for Japanese youth

اس رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ 19 سال کے اندر کی عمر کے جاپانی نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ 1985ء میں ایسے نوجوانوں کی تعداد 557 تھی۔ جبکہ 1986ء میں ان کی تعداد

802 تک پہنچ گئی۔

خودکشی کرنے والے اکثر نوجوان وہ تھے جو عمارتوں کی چھتوں سے کود پڑے۔ یہ واقعہ اس کے بعد ہوا جب کہ 18 سالہ خاتون پاپ سنگر یوکیکو اوکادا نے محبت میں ناکامی کے بعد ایک چھت سے کود کر اپریل 1986ء میں اپنی جان دے دی تھی۔ نوجوانوں نے بھی اسی کی نقل کی۔ کچھ لوگوں نے اس طریقہ سے اپنی جان دی۔ وہ مس اوکادا کی موت سے غم زدہ تھے۔ انہوں نے چاہا کہ وہ بھی موجودہ دنیا سے رخصت ہو جائیں گے اور جنت میں پہنچ کر اپنی دل پسند سنگر سے جا ملیں گے۔ کچھ لوگوں نے مرتے وقت ایسی تحریر چھوڑی جس میں مذکورہ پاپ سنگر خاتون کا نام لکھا ہوا تھا۔

یہ ان بے شمار نقصانات میں سے ایک نقصان ہے جو عورتوں کو ''اسکرین'' کی چیز بنانے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ عورت اگر گھر سنبھالے تو وہ نوجوان نسل کو زندگی دینے والی ثابت ہوتی ہے لیکن اگر وہ گھر سے باہر نکل کر لوگوں کی تفریح کا سامان بنے تو وہ نوجوان نسل کو ہلاکت سے دوچار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

فطرت سے دور ہو کر

انسان کا بچہ تمام جانداروں کے بچے میں سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے اس کو جسمانی ورزش اور ذہنی تربیت دونوں مقصد کے لئے لمبے عرصہ تک اپنے ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر اپنے بچے کے لئے خصوصی کشش رکھی ہے۔

قدیم زمانہ میں کسی بچے کے لئے اپنے باپ یا ماں سے محروم ہونا صرف ہنگامی اسباب سے ہوتا تھا۔ جنگ یا کسی اتفاقی حادثے سے قبل از وقت موت، عام حالات میں یقین کیا جا سکتا تھا کہ بچوں کو اپنے والدین کی سرپرستی پختگی کی عمر تک حاصل رہے گی۔

جدید ترقی یافتہ سماج میں یہ استثناء اب عموم بن گیا ہے اور یہ نتیجہ ہے جدید تصور زندگی کا۔ جس نے نکاح کے رشتہ کو غیر مقدس بنا دیا ہے۔ اب یا تو نکاح کے بغیر لڑکے پیدا ہوتے ہیں یا نکاح کے جلد ہی بعد طلاق کی شکل میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے...... بچوں کی اپنے ماں باپ سے جدائی، بچوں کا اپنے والدین کے جیتے جی یتیم ہو جانا۔

اس بڑھتی ہوئی ''یتیمی'' نے جدید معاشرہ کے لئے طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کو محرومی کا بونا پن کا نام دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مغرب کے طبی ماہرین کی ایک تازہ رپورٹ (ایوننگ نیوز 27 جون 1984ء) سامنے آئی ہے۔

اس رپورٹ میں مغربی طرز حیات کے نتائج کے بارہ میں بہت سے انکشافات کئے گئے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ سے محرومی کی بنا پر جن بچوں کو ابتدائی عمر میں محبت نہیں ملتی ان میں مختلف قسم کا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جسمانی نشوونما میں کمی۔ دماغ کا ہلکا پن، حتیٰ کہ یہ چیزیں بعض اوقات ان کی قبل از وقت موت کا باعث

بن جاتی ہیں۔

محرومی کا بونا پن نامی بیماری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ٹھیک طرح سے سونہیں پاتا۔ اس کا نظام ہضم ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہسپتالوں میں جہاں چھوٹے بچے بیڈ پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ پیٹھ کے بل دیر دیر تک پڑے رہنے سے ان کے سر کا پچھلا حصہ گنجا ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں کوئی ماں بار بار کروٹ بدلنے کے لئے موجود نہیں ہوتی۔ ماں باپ سے محروم ہو کر دار الاطفال میں پرورش پانے والے بچے اپنے ذہنی اور جسمانی ارتقاء سے محروم رہتے ہیں۔

ڈاکٹر گارڈنر کا کہنا ہے کہ مطالعہ بتاتا ہے کہ دماغ کی اعلیٰ سطح سے ارتعاش اٹھتے ہیں۔ یہ ارتعاشات جسمانی نظام میں داخل ہو کر مختلف قسم کے ہارمون پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ جو زندگی کی نشوونما کرنے کے لئے ضروری ہے۔ انہی میں سے جو بچے پرورش پاتے ہیں۔ ان میں یہ قدرتی عمل کم ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا جسم حاصل شدہ پروٹین کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتا جوان کی نشوونما کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت کے راستہ سے ہٹنا کس قدر تباہ کن ہے انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی دوسری دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اسی دنیا کے ساتھ مطابقت کرے۔ اگر وہ فطرت کی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے لئے کوئی دوسری شاہراہ بنانا چاہے گا تو وہ صرف ناکامی اور بربادی پر ختم ہوگا اس کے سوا اس کا کوئی انجام نہیں۔

بے قیدی کا تجربہ

امریکی میگزین نیوز ویک (21 جنوری 1985ء) صفحہ 35 پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں امریکی خواتین کا ایک جلوس دکھائی دے رہا ہے۔ جلوس کے آگے ایک نوجوان عورت ایک بینر اٹھائے ہوئے ہے اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔

"اپنے قوانین اور اپنے اخلاق کو میرے جسم سے دور رکھو۔"

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے لوگ اس وقت دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک وہ جو کھلے عام اسقاط کے قائل ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "اسقاط نواز" کے بجائے اپنے آپ کو انتخاب نواز کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو اسقاط کا مخالف ہے وہ اپنے آپ کو زندگی نواز کہتا ہے۔

جدید مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ انہوں نے جو سب سے بڑی چیز دریافت کی ہے وہ آزادی ہے مگر بے قید آزادی کا تجربہ جو جدید مغرب میں ہوا، وہ بتاتا ہے کہ آزادی خیر اعلیٰ نہیں ہو سکتی۔ آزادی اگر خیر اعلیٰ ہو تو وہ اس قبیح انجام تک کیسے پہنچ جاتی ہے۔ جس کا ایک نمونہ اوپر کے اقتباس میں نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی بے حد قیمتی چیز ہے مگر انسان کے لئے خیر اعلیٰ پابند آزادی ہے نہ کہ مطلق آزادی۔ یعنی انسان کے مقابلہ میں آزادی مگر خدا کے مقابلہ میں پابندی۔

انسان خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جہاں تک اپنے جیسے انسانوں کا تعلق ہے، ان کے مقابلہ میں بلاشبہ ہر انسان کو کامل آزادی حاصل ہے مگر اسی کے ساتھ دوسری شدید تر حقیقت یہ ہے کہ خدا کے مقابلہ میں انسان مکمل طور پر پابند ہے۔ خدا کے مقابلہ میں کسی انسان کو کوئی آزادی حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو اپنی آزادی کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ وہ ہر حال میں خدا کے احکام کا پابند رہے۔ یہی پابندی آزادی کے صحیح استعمال کی ضمانت ہے۔

خاتون لیڈر کا اعتراف

امریکی مشہور ناول نگار خاتون اور تحریک نسواں کی لیڈر رہوڈا لرمن اپریل 1987ء میں ہندوستان آئیں۔ یہاں نئی دہلی میں انہوں نے ٹائمز آف انڈیا کے ایک سٹاف رپورٹر کو انٹرویو دیا۔ یہ انٹرویو اخبار مذکور کے شمارہ 30 اپریل 1987ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ پورا انٹرویو علیحدہ صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔

رہوڈا لرمن نے کہا کہ میں بہت بری خبر لے کر آئی ہوں سماج میں عورت کے بدلتے ہوئے؟ انہوں نے انکشاف کیا کہ امریکہ کے غریبوں میں 77 فیصد تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اس کا سبب وہ غیر معمولی فرق ہے، جو مردوں اور عورتوں کی کمائی کے درمیان پایا جاتا ہے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کمائی 62 فی صد ہے صرف اس لئے کہ انہیں ہلکے قسم کے کام دیئے جاتے ہیں یکساں مواقع اور یکساں تنخواہ یکساں کام کے لئے محض ایک فسانہ ہے۔ عورتیں ابھی تک صرف نچلے اور درمیانی انتظامی شعبوں میں داخل ہوسکی ہیں۔

ان کا خیال یہ ہے کہ یہ امتیاز مردانہ تعصب کی بنا پر ہے جو کہ عورتوں کے خلاف کام کررہا ہے۔ مردوں کا کہنا ہے کہ عورتوں پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ زچگی کی چھٹی لیتی ہیں اور بچے پالتی ہیں۔ اگرچہ 96 فیصد کام کرنے والی عورتوں کے یہاں بچے ہیں، ان میں سے صرف 67 فیصد اس اندیشہ کے بغیر زچگی کی چھٹی سے فائدہ اٹھاپاتی ہیں کہ اس سے ان کی ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم سینیرٹی کا نقصان انہیں ہمیشہ اٹھانا پڑتا ہے۔ زچگی اور بچوں کی پرورش تنخواہوں میں زبردست فرق کا سبب ہیں۔ معاشی حقیقت روحانی برابری سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ آزادی نسواں کے علم برداروں نے جنسی برابری اور اسقاط کے حق میں شوروغل کیا اور اس کو حاصل کرلیا۔ وہ اس معاشی تباہی کا اندازہ نہ کرسکے جو اس کے بعد آنے والی تھی۔

انقلابی نسواں تحریک کے تحت عورت اور مرد برابر مان لئے گئے ہیں مگر عورت کو اس کے حیاتیاتی فرق کی کوئی رعایت نہیں ملی۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ہر دو شادیوں میں سے ایک شادی طلاق پر ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد بچہ کی پرورش کی ذمہ داری تنہا عورت پر آجاتی ہے۔ نفقہ و گزارہ محض لفظی قوانین ہیں۔ وہ بہت ہی کم عمل میں آتے ہیں۔ صرف 5 سے 10 فیصد تک ایسے مرد ہیں۔ جو گزارہ ادا کرتے ہیں اور وہ بھی صرف پہلے سال تک بعد کے سالوں میں پورا بوجھ صرف ماں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح زندگی کا معیار ایک مطلقہ عورت کے لئے 73 فیصد تک گھٹ جاتا ہے اور مرد کا اس کے مقابلہ میں 43 فیصد بڑھ جاتا ہے۔ اس قسم کی اکیلے کی زندگی کو مغرب

میں مونو پیرنٹ کہا جانے لگا ہے۔

ایسے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جن میں صرف عورت ذمہ دار ہو اور وہ تنہا ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کرے۔ چنانچہ اگلے دس برس میں 40`50 فیصد بچے وہ ہوں گے جو ایسے گھروں میں پرورش پائیں گے۔ جن کی ذمہ دار صرف عورت ہو۔ یہ ایک غیر صحت مندانہ مظہر ہے۔ جس کے نتیجہ میں بچوں میں خودکشی کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ خاندانی نظام میں انحصار کے فقدان کی وجہ سے خودکشی بچوں کی خصوصیت بن رہی ہے۔

اشتراکی نسوانیت جو کہ مرد اور عورت کے درمیان پائے جانے والے ناگزیر فرق کو ملحوظ رکھتی ہے۔ آج وقت کی پکار ہے۔ امریکی زندگی کے بارہ میں (ابتداء) ہمارا ایک بڑھا ہوا خواب تھا،...... ایک شوہر جو کام کرے، شہر کے کنارے ایک مکان، دولڑکے، دوکاریں اور ماں جو گھر پر رہے اور کیک بنائے (مگر آزادی نسواں کی تحریک نے اس خواب کو منتشر کردیا)

خاندانی نظام ٹوٹنے کے بعد صرف حکومت کی مدد ہی مسئلہ کو حل کرسکتی ہے۔ حکومت کی طرف سے بچوں کی نگہداشت کے لئے مراکز کم ہوں۔ زچگی کی چھٹی کی سہولت ہو اور تنہا عورت کی معاشی کمیوں کی تلافی کے لئے اس کو مدد دی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری فتوحات جھوٹی فتوحات بن کر رہ جائیں گی۔ یا ویسی ہی آزادی جس کا تجربہ چتا کے اوپر ہوتا ہے۔

امریکہ کی خاتون لیڈر نے مذکورہ بیان میں اعتراف کیا ہے کہ تحریک نسواں کی کامیابیاں پرک فتوحات بن کر رہ گئی ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی بادشاہ تھا جس کا نام پرھس تھا۔ اس نے 281 ق م میں اٹلی پر حملہ کیا تھا۔ لمبی جنگ کے بعد اس کو فتح حاصل ہوئی مگر فتح تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنا سب کچھ کھو چکا تھا چنانچہ بعد میں ایک جنگ میں اس کو دوبارہ شکست ہوئی، 272 ق م میں اس کو قتل کردیا گیا۔ پرک وکٹری اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس کا مطلب ہے...... ایسی فتح جو بربادی لے کر آئے۔

یہ صحیح ترین لفظ ہے جو جدید عورت کی فتح کے بارہ میں بولا جاسکتا ہے۔ جدید عورت نے لمبی جدوجہد کے بعد "مساوات" حاصل کی۔ مگر اس خیالی مساوات کو حاصل کرنے تک وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ مذکورہ خاتون کا کہنا ہے کہ مغربی عورت کی محرومی کی تلافی کی اب صرف ایک صورت ہے یہ کہ حکومت اس کی سرپرست بن جائے، وہی حکومت جو آج بھی پوری طرح مردوں کے قبضہ میں ہے۔ گھریلو مرد کی سرپرستی پر عورت راضی نہ تھی۔ اس کی قیمت میں عورت کو حکومتی مرد کی سرپرستی پر راضی ہونا پڑا۔

دو مثالیں

آزادی کے مصنوعی تصور نے مغربی گھروں میں جو مسائل پیدا کئے ہیں۔ ان کا تعلق صرف نچلے یا درمیانی طبقہ کے لوگوں سے نہیں ہے۔ اس کے برے اثرات اونچے خاندانوں اور نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچے ہوئے ہیں اس سلسلہ میں یہاں ہم دو مثالیں نقل کریں گے۔

حال میں آئن سٹائین کے کچھ خطوط ملے ہیں۔ یہ خطوط اس نے ایک عورت (میلیوامیرک) کے نام لکھے تھے۔ جو بعد میں اس کی پہلی بیوی بنی۔ یہ خطوط ان کے تعلقات کی خوشی اور غم کی کہانی بیان کرتے ہیں یہ خطوط آئین سٹائین کی تحریروں کے مجموعہ کے لئے مواد کی تلاش کے دوران حاصل ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے:

The Collected Papersof Albert Einstien;

میلیوامیرک کی عمر آئن سٹائن سے چار سال زیادہ تھی۔ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً آئن سٹائن کی ماں اس رشتہ پر راضی نہ تھی۔ جس کی بنا پر انہیں مایوسی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ بعد میں آئن سٹائن اور میلیوا کا نکاح ہوا۔ تاہم نکاح سے پہلے ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ لڑکی کے ساتھ کیا پیش آیا۔ بظاہر وہ آئن سٹین کے ساتھ کبھی نہیں رہی۔ آئن سٹائین اور مس میرک کی ملاقات 1896ء میں فیڈرل ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ (زیورک) میں ہوئی تھی۔ ان کا نکاح جنوری 1903ء میں ہوا۔ یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی۔ اور 1919ء میں ان کے درمیان طلاق ہوگئی (دی ٹائمز آف انڈیا 5 مئی 1987ء)

دوسری مثال موجودہ برطانوی ولی عہد چارلس کی ہے۔ مسز پینی جونز نے حال میں پرنس چارلس کی سوانح عمری شائع کی ہے اس میں وہ کہتی ہے کہ پرنس چارلس نے ایک غلط عورت سے شادی کی۔ اس سلسلہ میں بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پرنس چارلس ایک غم زدہ انسان ہیں۔ وہ زمین پر بالکل تنہا ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک بیوی سے جو مدد ملنی چاہئے تھی وہ انہیں حاصل نہیں۔ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈیانا ایک دوسرے سے، زیادہ سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مسز جونز نے کہا کہ انہوں نے یہ نتیجہ ان لوگوں سے بات کر کے حاصل کیا ہے جو شہزادہ سے بہت قریب ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اور جو نتیجہ نکالا ہے اس کو شاہی محل دیکھ چکا ہے۔ محل کے کسی آدمی نے نہیں کہا کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔

(ٹائم (نیویارک) 11 مئی 1987ء، ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز 29 اپریل 1987ء)

ناقابل اعتماد کردار

ٹائم (نیویارک) نے اپنے شمارہ 25 مئی 1987ء میں پنٹاگان سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ جس کا عنوان ہے:

"جنس کا تعلق رازداری سے"

اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ امریکی ادارہ پنٹاگون 2،7 ملین لوگوں کے جنسی اعمال کی بابت محکمہ دفاع کے سیکورٹی کلیرنس کے معاملہ میں پریشان ہے۔ جنوری 1987ء میں پنٹاگون نے اپنے ضوابط کی توسیع کرتے ہوئے فوج کے لوگوں، شہری کارکنوں اور ٹھیکہ کے ملازموں پر یہ شرط عائد کر دی ہے کہ وہ کلیرنس کے تحت یہ بتائیں کہ کیا وہ جنسی اعمال مثلاً زنا، اغلام اور محرمات کے ساتھ مباشرت میں مبتلا رہے ہیں۔ ان قوانین کا مقصد یہ اطمینان حاصل کرنا ہے کہ وہ لوگ جن کی پہنچ حکومت کے رازداروں تک ہے ان میں یہ کمزوری نہیں ہے کہ ان

کو بلیک میل کیا جا سکے۔

اباحیت پسند لوگوں کا دعویٰ تھا کہ نکاح سے باہر جنسی تعلقات محض ''گناہ'' ہیں۔ یعنی وہ خدا کے نزدیک برے ہو سکتے ہیں۔ مگر انسانی معاملات میں ان سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ مگر تجربات نے بتایا کہ جو شخص جنسی تعلق کے معاملہ میں نکاح کی حدود کا پابند نہ ہو وہ ایک ناقابل اعتماد شخص بن جاتا ہے، اس کے اندر ایک ایسا اخلاقی رخنہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے داخل ہو کر دشمن ہی ہمارے نازک ترین رازوں تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک مثال

مسٹر گاری ہارٹ امریکہ کے صدارتی الیکشن 1987ء کے لئے ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار تھے۔ اندازوں کے مطابق ان کی کامیابی یقینی تھی۔ مگر اس درمیان میں ایک واقعہ ہوا۔ اس کے بعد امریکہ میں اتنا طوفان اٹھا کر مسٹر ہارٹ کو صدارت کے مقابلہ سے استعفاد ینا پڑا۔

50 سالہ مسٹر ہارٹ الیکشن کی مہم میں مصروف تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک ملین ڈالر سے زیادہ قرض لیا تھا۔ اس درمیان میں ہفتہ کا آخری دن گزارنے کے لئے یکم مئی کو وہ خاموشی کے ساتھ میامی پہنچے۔ یہاں انہوں نے ایک 29 سالہ ایکٹرس مس ڈونا رائس کے ساتھ ایک دن اور ایک رات گزاری۔ اس کی خبر ایک امریکی اخبار میامی ہیرالڈ کو ہوگئی۔ اس نے اپنی 3 مئی 1987ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر یہ کہانی حسب ذیل سنسنی خیز سرخی کے ساتھ چھاپ دی:

Miami woman is linked to Hart

اس کے فوراً بعد ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔ مسٹر ہارٹ کی تصویریں مس ڈونا رائس کے ساتھ چھپنے لگیں۔ مسٹر ہارٹ جہاں جاتے وہاں ان سے پوچھا جاتا کہ کیا وہ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں؟ مسٹر ہارٹ عوامی عدالت میں زناکاری کے ملزم کی حیثیت سے کھڑے کر دیئے گئے۔

میامی ہیرالڈ میں اگر یہ خبر چھپتی کہ مسٹر ہارٹ فلاں مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رات بھر رہے تو کوئی اس پر دھیان نہ دیتا۔ مگر اخبار نے جب یہ خبر چھاپی کہ مسٹر ہارٹ نے میامی کے فلاں مکان میں ایک عورت کے ساتھ رات گزاری، تو ہر طرف ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔ یہ واقعہ اس بات کا تجرباتی ثبوت ہے کہ غیر عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ اگر یہ فعل انسانی فطرت کے خلاف نہ ہوتا تو ہنگامہ کرنے والے کبھی اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

مسٹر ہارٹ نے اس مصیبت سے بچنے کے لئے اپنی ساری ذہانت صرف کر دی۔ پہلے انہوں نے انکار کیا، پھر ٹالنے والے جوابات دیتے رہے۔ انہوں نے اپنی بیوی لی ہارٹ کو راضی کیا کہ وہ 1300 میل کا سفر کر کے ہیم شائرے ڈنور پہنچیں اور اخبار نویسوں کے سامنے یہ بیان دیں کہ یہ بات اگر مجھے پریشان نہیں کرتی تو میں نہیں سمجھتی کہ کسی اور کو اس سے پریشان ہونا چاہئے''۔

مسٹر ہارٹ نے جب دیکھا کہ معاملہ کو چھپانے کے بارہ میں ان کی ساری تدبیروں کے باوجود راز کھل گیا ہے تو آخر کار انہوں نے اعتراف کرلیا۔ اب انہوں نے کہا کہ زنا کوئی قانونی جرم نہیں ہے وہ صرف ایک گناہ ہے اور وہ میرے اور میری بیوی اور خدا کے درمیان ہے:

تاہم مسٹر ہارٹ کی یہ باتیں امریکی عوام کو مطمئن نہ کرسکیں۔ اوپنین پول میں اس سے پہلے امکانی صدر کی حیثیت سے ان کا نام سرفہرست رہتا تھا۔ اب پول کے ذریعے عوام کی پیشگی رائے معلوم کی گئی تو اچانک ان کا نام بالکل نیچے آگیا۔ اس کے بعد مسٹر ہارٹ نے اپنے آپ کو ملک میں تنہا پایا:

ٹائم (18 مئی 1987ء) کے الفاظ میں ایکٹرس سے جنسی تعلقات ان کے لئے ان کی سیاسی موت کے ہم معنی بن گیا۔ 3 مئی کو اس معاملہ کا انکشاف ہوا اور صرف پانچ دن بعد 8 مئی کو انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ صدارتی مقابلہ سے علیحدگی کا اعلان کردیا:

I was withdrawing from the race and then quietly disappear from the stage (p.6)

ٹائم نے اس سلسلہ میں اپنی طویل رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ امریکی اب اپنے لیڈروں کے بارے میں وہی گہری معلومات جاننا چاہتے ہیں جو کسی وقت کلارک گیبل (ایکٹر) اور ایلزبتھ ٹیلر (ناول نگار) کی رومانیت کے لئے مخصوص تھیں۔ ہتھیاروں کے کنٹرول کے مسائل سے نبرد آزما ہونے اور معاشی مسائل سے نمٹنے سے زیادہ امریکی عوام ایسے افراد چاہتے ہیں جن پر وہ بھروسہ کرسکیں جن کا فیصلہ اور جن کی دیانت داری ان کے لئے اطمینان بخش ہو:

یہی بات سابق صدر امریکہ لینڈن جانسن کے پریس سکیرٹری جارج ریڈی نے اس طرح کہی کہ صدارت کے امیدوار کے لئے جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس کا کیرکٹر ہے اور یہ سب سے زیادہ عورتوں کے ساتھ اس کے تعلق کے معاملہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس عہدہ پر ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو آپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے بنک اکاؤنٹ کے معاملہ میں بھی چار سال تک اس پر اعتماد کریں۔ اگر خود اس کی اپنی بیوی اس پر اعتماد نہ کرسکے تو یہ بات کس چیز کا پتہ دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرے کہ وہ نکاح کے دائرہ سے باہر جنسی تعلق قائم کرے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے اندر ذہنی ڈسپلن نہیں ہے وہ اپنے جذباتی محرکات پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایسا ایک شخص اپنے کردار کے اعتبار سے ہرگز اعتبار کے قابل نہیں۔ اس کے اندر ایسی نفسیاتی کمزوری ہے جس کی بنا پر شدید اندیشہ ہے وہ اپنی کسی ذاتی خواہش کے لئے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو قربان کردے۔ ایسا شخص عام زندگی میں بھی بھروسہ کے قابل نہیں کجا کہ ریاست کے اعلیٰ منصب کے لئے اس پر بھروسہ کیا جائے۔

تجربات بتاتے ہیں کہ جنسی تعلقات کے معاملہ میں خدائی حد کو توڑنا سادہ معنوں میں صرف ایک مذہبی برائی

نہیں ہے بلکہ ایک مہلک قسم کی سماجی برائی بھی ہے۔ وہ صرف ایک گناہ نہیں بلکہ ایک جرم بھی ہے بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے سب سے بڑا جرم۔

اجرتی ولادت

جدید دور نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو نیابت مادری کہا جاتا ہے۔ اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ میں 1976ء سے 1986ء تک مصنوعی حمل کے ذریعہ 500 لڑکے پیدا کئے جا چکے ہیں، امریکہ میں اس وقت تقریباً ایک درجن اس کے مراکز کام کر رہے ہیں ان مراکز میں مزید اضافے کا امکان ہے کیونکہ امریکہ میں تقریباً 15 فیصد شادی شدہ افراد طبی طور پر غیر زرخیز ہیں۔ (ٹائم جنوری 1987ء)

مسٹر ولیم اسٹرن اور ایلزبتھ اسٹرن کے یہاں اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ کسی خاتون کو معاوضہ دے کر اس کے رحم کو استعمال کریں گے اور اپنے لئے ایک بچہ حاصل کریں گے۔ 1985ء میں 20 ہزار ڈالر ادا کر کے انہوں نے میری بیتھ وہائٹ ہیڈ سے معاہدہ کیا۔ اس کے رحم میں مسٹر اسٹرن کا مادہ بذریعہ انجکشن داخل کر دیا گیا۔ اس عمل کے ذریعہ ایک بچی پیدا ہوئی۔ اب مسز وہائٹ کی مامتا جاگ اٹھی۔ اس نے بچی مسٹر اسٹرن اور مسز اسٹرن کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ عدالت نے اس کو معاہدہ کا معاملہ قرار دے کر بچی کو مسٹر اسٹرن کے حوالے کئے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ پانچ پولیس کے آدمیوں کو لے کر مسز وہائٹ ہیڈ کے گھر آئے تو خاتون بچی کو لے کر پچھلے دروازے سے بھاگ گئی تاہم وہ دوسرے شہر میں پکڑی گئی اور آخر کار بچی اسٹرن اور مسز اسٹرن کے حوالے کر دی گئی۔

اب امریکہ میں اس پر اخلاقی بحثیں شروع ہو گئی ہیں۔ نیو جرسی کے بشپ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مادری نیابت کا طریقہ بچہ کو محض ایک سودا بنا دیتا ہے اور عورت کو محض ایک بچہ ساز: دوسری طرف جو عورت دوسرے شخص کے لئے بچہ پیدا کرتی ہے وہ خود سخت قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو جاتی ہے اس قسم کی ایک عورت ایلزبتھ کین نے کہا کہ مجھے اپنے بچہ کی یاد ستاتی ہے۔ ان احساسات کو دبانے کے لئے مجھے برسوں کی مدت درکار ہوگی۔

ترقی کے بجائے تنزل

امریکی میگزین ٹائم کی اشاعت 29 دسمبر 1986ء ایک سپیشل نمبر تھی جس کو اس نے "2086 کے نام ایک خط" کا عنوان دیا تھا۔ اس شمارے میں مختلف پہلوؤں سے امریکہ کا حال آنے والی صدی کو بتایا گیا تھا۔ اس کا ایک جزء خاندان کے احوال کے بارے میں بھی تھا۔ اس میں جو احوال لکھے ہوئے تھے۔ ایک کا ایک حصہ یہ تھا۔

پچاس سال پہلے امریکی خاندان ایک چٹان تھا جس پر ملک نے اپنا معبد تعمیر کیا تھا، اب وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ امریکی عورت نے مادری ذمہ داری اور گھر سنبھالنے کی ذمہ داری کو پندرہ سال پہلے چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ روزگار کے بازار میں اپنی جگہ بنا سکے۔ اب وہ ان تینوں ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

امریکی مرد اپنے آپ کو ایک نئی سخت دنیا میں پا رہا ہے اور بمشکل ہم آہنگی کی کوشش کر رہا ہے۔ جب امریکی مرد اور عورت ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں جیسا کہ شادی شدہ جوڑوں کی نصف تعداد آج کل ہوا کرتی ہے تو امریکی بچہ اپنے سرپرستوں سے محروم ہو کر ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی سہارے کے بغیر پروان چڑھ رہا ہے۔

بیسوی صدی کے آخر میں پہنچ کر امریکہ کا دانش ور طبقہ اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ نے جس چیز کو ترقی کا زینہ سمجھ لیا تھا۔ وہ اس کے لئے صرف بربادی کا زینہ ثابت ہوا ہے۔ عورت کو گھر سے باہر نکالنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی خاندانی نظام بالکل منتشر ہو کر رہ گیا۔ مزید یہ کہ عورت کو ''آزاد'' کرنے کا خوش نما منصوبہ عملاً ازدواجی زندگی کو غیر مستحکم بنانے کا ذریعہ ثابت ہوا اور اس کے نتیجہ میں بے شمار معاشرتی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

اب امریکہ میں اس سابقہ فکر پر نظر ثانی کا ذہن پیدا ہو رہا ہے مگر جدید عورت چونکہ دوبارہ گھریلو عورت بننے کے لئے تیار نہیں ہے اس لئے جو عورت نئی زندگی کو اختیار کرتی ہے۔ اس کے حصہ میں صرف یہ آ رہا ہے کہ وہ باہر کی ذمہ داریوں کے ساتھ گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھائے۔ کیسی عجیب ہے وہ ترقی، جس کا نتیجہ بربادی کی صورت میں ظاہر ہو۔ کیسی عجیب ہے وہ آزادی جو عملاً غیر آزادی بن جائے۔

(بحوالہ خاتون اسلام۔ مولانا وحید الدین خاں)

مغرب اور خاندان

پہلی تصویر: بیٹی باپ کے در پہ بیٹھی رو رہی تھی

دوسری تصویر: بیٹی نے باپ کو ڈنڈے مار مار کر گھر سے نکال دیا

امریکہ اور یورپ کے اکثر ملکوں میں خاندانی زندگی تباہ و برباد ہو چکی ہے اور خصوصاً برطانوی معاشرے کا حلیہ تیزی سے بگڑ رہا ہے برطانیہ میں 20 ہزار افراد سے بات چیت کر کے BBC نے جو جائزہ مرتب کیا اس کے مطابق وہاں ایک چوتھائی گھرانوں میں روایتی کنبے رہتے ہیں باقی دو تہائی بغیر شادی کے اکٹھے رہتے ہیں یا تنہا زندگی گزارتے ہیں۔" (جنگ لاہور 28 ستمبر 91ء)

خاندانی زندگی کی تباہی کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی عصری محفل میں سنایا تھا انہوں نے فرمایا کہ پیرس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص سے ملنے اس کے گھر گیا۔ اس نے دیکھا کہ مکان کی سیڑھیوں پر ایک جوان لڑکی بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے اس شخص نے رک کر لڑکی سے رونے کی وجہ معلوم کی تو اس نے جواب دیا کہ جس شخص سے آپ مل کر آ رہے ہیں وہ میرا باپ ہے۔ میں اس کے پاس اس مکان کا ایک کمرہ کرائے پر لینے آئی تھی۔ لیکن اس نے مجھے یہ کہہ کر کمرہ کرائے پر دینے سے انکار کر دیا ہے کہ ایک دوسری جگہ سے اسے زیادہ کرایہ مل رہا ہے اس لئے وہ مجھے کمرہ کرایہ پر نہیں دے گا۔ لڑکی ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی اب میں کیا کروں اور کہاں جاؤں؟" (ماہنامہ "قافلہ حق" لاہور نومبر 91 ص 35)

تنظیم اساتذہ کے ایک رفیق پروفیسر سید بہادر شاہ پولینڈ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے ہوئے ہیں اور وہاں کے مشاہدات تنظیم اساتذہ کے ماہنامہ مجلّہ "افکار معلم" میں لکھتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے لکھا کہ ایک بوڑھا اپنی بیٹی کے گھر آیا اور وہاں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر بیٹی نے انکار کیا اور بوڑھے کے اصرار پر اسے ڈنڈے مار مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ شور سن کر لوگ جمع ہوئے تو بیٹی نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے رقم کی ضرورت پڑی تو میرے باپ نے باقاعدہ شرح سود طے کر کے رقم دی اور اصل زر کے ساتھ سود بھی وصول کیا پھر میں اسے اپنے گھر میں کیوں ٹھہراؤں۔ ("افکار معلم" فروری 92ء ص 64)

برطانیہ اور بچوں میں جنسی رجحانات

برطانیہ میں انتہائی کم عمر کے بچے اور بچیوں میں جنسی رجحانات فروغ پا رہے ہیں۔ بی بی سی کے مطابق بچوں کے تحفظ کی قومی کونسل کی سالانہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 1986ء میں کم عمر بچوں کے مابین جنسی تعلقات کے تقریباً بارہ سو واقعات رونما ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر تعداد ایسے بچوں کی تھی جن کی عمریں پانچ سال سے بھی کم ہیں رپورٹ میں اس خطرناک رجحان کی ذمہ داری مخلوط تعلیم اور جنسی مناظر پر مبنی فلموں پر عائد کی گئی ہے۔" ("جنگ" لاہور 28 اپریل 1987ء)

فطرت، مغرب اور جدید سائنس

مغربی تہذیب کے مخصوص نظریات میں سے ایک نظریہ مرد اور عورت کی مساوات تھا۔ مغربی دنیا میں پچھلے سو سال سے اس نظریہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ کسی بھی شعبہ میں یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا جائے۔ قانون کے اعتبار سے برابری کا درجہ پانے کے باوجود عملی طور پر دونوں سماج کے اندر برابری کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

اس فرق کے بارے میں ابتداء یہ کہا گیا کہ یہ فرق ماحول (Environment) کا پیدا کردہ ہے مگر جدید تحقیقات اس مفروضہ کو سراسر بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مختلف شعبوں میں تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ فرق حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام تر پیدائشی ہے نہ کہ تاریخی۔

نیویارک کے نیوز ویک (18 مئی 1981ء) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ جس میں مختلف امریکی محققین کے نتائج تحقیق درج ہیں ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عورت اور مرد کی بناوٹ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مرد کا مسائل کو حل کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہونا، عورتوں کا جذباتی طور پر سوچنا، لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ بہادرانہ انداز سے کھیلنا، ریاضیات میں مردوں کا زیادہ برتر ہونا، یہ سب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے نہ کہ محض ماحول کا۔

محققین کا خیال ہے کہ قائدانہ خصوصیتیں (Leadership capacities) مردوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید تحقیقات لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لے جا رہی ہیں کہ سابقہ خیال کے برعکس پرورش (Nurture) نہیں بلکہ فطرت (Nature) وہ اصل عامل ہے۔ جس نے مرد اور عورت کے عمل میں فرق پیدا کیا ہے۔ عمومی طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ لڑنے بھڑنے کی صلاحیت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر زیادہ ہوتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ دونوں کے ہارمون (Harmone) جدا جدا ہوتے ہیں اور وہی دونوں کے درمیان فرق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ محققین نے نر کے ہارمون (Harmone testosterone) کو مادہ کے جسم کے اندر داخل کیا تو مادہ کے اندر نر کی خصوصیات محسوس کی جانے لگیں۔ کچھ لڑکیوں میں پیدائش سے پہلے ہی مردانہ ہارمون داخل کر دیئے گئے۔ چنانچہ پایا گیا کہ پیدائش کے بعد ان میں گڑیوں کے ساتھ کھیلنے کا شوق بہت کم تھا۔ ان میں لڑکوں کی طرح جارحیت کا مزاج زیادہ پایا گیا۔

محققین نے پایا ہے کہ ہارمون خود دماغ کے ڈھانچہ کو بدل دیتے ہیں۔ نر اور مادہ کے دماغ میں فرق پایا گیا ہے اور اس کا سبب دونوں کے ہارمون کا فرق ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ دونوں صنفوں کے درمیان ناقابل انکار فرق موجود ہے۔

یہ تحقیقات واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ عورت اور مرد کی تخلیق میں فرق ہے اور جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہونا چاہئے۔ مگر جو لوگ لمبی مدت تک پچھلے خیال کے ساتھ وابستہ رہے وہ ابھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ایک مغربی عالم نے کہا:

''کیا یہ عضویاتی فرق مردوں اور عورتوں کے سماج کے اندر الگ الگ کردار مقرر کرتے ہیں؟ یہ ایک علیحدہ اور زیادہ پیچیدہ سوال ہے۔'' (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر 1981ء)

اس سے پہلے امریکہ کے ایک اور ہفتہ وار میگزین ٹائم (20 مارچ 1972ء) نے اس موضوع پر تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ میگزین کے وسیع ادارتی اسٹاف میں سے 20 تعلیم یافتہ خواتین کو مقرر کیا گیا کہ وہ ''جدید امریکہ میں عورتوں کی حالت'' کا جائزہ لیں۔ انہوں نے ہر میدان میں اس کا جائزہ لیا اور ہر شعبہ کے ماہرین سے مدد لی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی جو خصوصی نمبر کے طور پر مذکورہ میگزین میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ سائنس کے تمام متعلقہ شعبوں کی تحقیق کے مطابق مرد جنس غالب ہے۔

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سو سالہ جدوجہد کے باوجود امریکی عورت ابھی تک اسی مقام پر ہے جہاں وہ سو سال پہلے تھی۔ مرد اب بھی عملاً امریکہ میں جنس برتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ قدیم نظریہ کے مطابق سماجی نہیں ہے بلکہ تمام تر حیاتیاتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب میں آزادی نسواں کی تحریک سو سالہ تجربہ کے بعد اب اس رائے پر پہنچی ہے کہ حیاتیاتی حقائق عورت کو مرد کے برابر مقام دینے میں رکاوٹ ہیں۔ یہ قدرت کا ظلم ہے نہ کہ سماج کا ظلم۔ اس لئے اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس آف ایوجینکس کے ذریعہ رحم مادر میں جینیک کوڈ کو بدل دیا جائے اور اس طرح نیا حیاتیاتی نظام وجود میں لایا جائے جس میں نئے قسم کی عورتیں پیدا ہوں اور مردوں کی برتری ختم ہو کر یکساں صنفی صلاحیت کا سماج بن سکے...... یہ تجویز ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص بطور خود یہ نظریہ قائم کرے کہ مچھلی اور بکری دونوں ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے مچھلی کو بھی دودھ دینا چاہئے جس طرح بکری دودھ دیتی ہے اور جب کوشش کے باوجود مچھلی دودھ نہ دے تو وہ کہے کہ ہم میڈیکل سائنس کے ذریعہ نئی قسم کی مچھلیاں پیدا کریں گے جو بکری کی مانند دودھ دینے لگیں۔

فطرت کی جنگ

کسی ڈاکٹر کو ایک روز خیال آ جائے کہ منہ کا مقام چہرہ پر نہیں بلکہ پیٹ پر ہونا چاہئے اور اس کے بعد وہ آپریشن کے ذریعے منہ کو چہرہ سے ہٹا کر پیٹ پر منتقل کرنا شروع کر دے، تو دنیا اس کی بیوقوفی پر ہنسے گی کیونکہ فطرت نے ہر چیز کو اس کے مقام پر متعین کیا ہے وہاں سے اس کو ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ہماری کامیابی یہ ہے کہ ہر چیز اس کے مقام پر رکھ کر معاملہ کریں نہ کہ خود ساختہ نظریہ کے تحت اشیاء کی ترتیب بدل کر ایک نیا نقشہ بنانے کی مہم شروع کر دیں۔ اسی تخلیل پسندی کی ایک مثال عورت کا مسئلہ ہے جدید تہذیب نے زندگی کا نیا نقشہ بنانا شروع کیا تو اس میں اس کا ایک نعرہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات ہونی چاہئے۔ اس خوش نما تخیل کو وجود

میں لانے کے لئے خاندان اور معاشرت کا سارا ڈھانچہ الٹ پلٹ دیا گیا۔ مگر آخر میں جو چیز حاصل ہوئی وہ یہ کہ عورت گھر سے باہر تو آ گئی مگر عملی زندگی میں وہ مرد کی ہم سر نہ ہو سکی۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یہاں فطرت نے انسانی تخیل کا ساتھ نہیں دیا۔

"ایک روسی سائنس دان انٹون نملوف جو خواہش کی حد تک خود بھی عورت اور مرد میں کامل مساوات دیکھنا چاہتا ہے۔ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ حیاتیات میں ہماری اس خواہش کے لئے بنیاد موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملاً یہ چیز اب تک حاصل نہ ہو سکی۔

وہ سائنس کے تجربات اور مشاہدات پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظامِ تمدن میں محدود حقوق دیئے جائیں تو کم سے کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہئے کہ مساوات مرد وزن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویت روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین بنائے گئے۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے۔ (صفحہ 76)

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویت طبقوں میں بھی جما ہوا ہے اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھیں گی۔ بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنس دان، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر اور کسی صد فیصد کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عورت کو وہ اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانہ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو۔ یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ضرور ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائیں گی۔ (194-95)

عورت کو مساوات کا درجہ نہ ملنا کوئی وقتی اور عملی خرابی بلکہ اس کی وجہ سے حیاتیات تک جاتی ہے۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے:

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکراتا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Bioilogy) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے۔ اور دونوں پر یکساں بار نہیں ڈالا گیا ہے۔" (77)

Anton Nenilov The Biological Tragedy of Women Landon 1932

فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہی نہیں ہوتا کہ وہ چیز عملاً حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یقینی طور پر اس کی نسبت نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فطرت نے کسی چیز کو جہاں رکھا ہے وہی اس کی اصل جگہ ہے اور جب کسی چیز کو اس کے واقعی مقام سے ہٹایا جائے تو اس کے نتیجہ میں خرابی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

یہی چیز عورت کے معاملہ میں ہوئی۔ عورت کو مرد کے مساوی بنانے کے لئے گھر سے باہر نکالا گیا۔ اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ عورت فی الواقع مرد کے مساوی ہو جاتی۔ البتہ اس کو زندگی کے ہر موڑ پر مردوں کے ساتھ کھڑا کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ فواحش کا سیلاب امنڈ آیا۔

مذکورہ بالا مصنف لکھتا ہے:

''سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمال (Workers) میں صنفی انتشار کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت پر خطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ ہزار ہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقہ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔ (3-102) روسی مصنف نے یہ بات پچاس سال پہلے کہی تھی مگر بعد کے سالوں نے اس کی مزید تصدیق کی ہے اس کے الفاظ آج مزید اضافہ کے ساتھ جدید معاشرہ کے لئے صحیح ہیں وہ کسی اعتبار سے غلط ثابت نہیں ہوئے۔

جدید انسان نے عورت اور مرد کے قدیم تصور کو دقیانوسی قرار دیا اور عورت و مرد کے درمیان صنفی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ فطرت سے جنگ کرنا تھا۔ یہ حقیقت واقعہ سے ٹکرانا تھا۔ اس کا نتیجہ الٹا ہوا، اس کے نتیجہ میں دونوں صنفوں کے درمیان مساوات کا مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ اس مصنوعی کوشش سے یہ نقصان ہوا کہ معاشرہ کے اندر نئی نئی برائیاں پیدا ہو گئیں۔

چند مثالیں

مغربی تہذیب نے عورت کے معاملہ میں فطرت سے جو انحراف کیا، اس کے بڑے عجیب اور مہلک نتائج پیدا ہوئے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ جن سے اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑے گی۔

شادی نہ کرنا غلطی

گریٹا گاربو کسی زمانہ میں ہالی وڈ کی مشہور ترین ایکٹریس تھی۔ مگر اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد فلمی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے پرانے دوست بھی سب کے سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں 18 ستمبر 1980ء کو اس نے اپنی 75 ویں سالگرہ تنہا منائی۔ گریٹا گاربو کے سوانح نگار نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ کو اس بات پر افسوس ہے کہ آپ نے شادی نہیں کی جس کی وجہ سے آج آپ کی تنہائیوں کا کوئی ساتھی نہیں۔ گریٹا گاربو نے غمگین لہجہ میں جواب دیا۔ میرا خیال ہے کہ میرا شادی نہ کرنا ایک غلطی تھی۔'' (ہندوستان ٹائمز 21 ستمبر 1980ء)

خدا نے انسان کو جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ پھر زندگی کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ اس ملاپ کا مستقل ہونا بھی ضروری ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے خدا نے نکاح کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ نکاح ایک مرد اور ایک عورت کو مستقل خاندانی نظام یا تعلق میں جوڑتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر خود اپنے تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور سماج کے تقاضوں کی بھی۔

مغربی زندگی میں آزادی کے غلط تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ شادی کو بندھن خیال کیا جانے لگا۔ اس کے نتیجہ میں جو آزادانہ زندگی پیدا ہوئی، اس نے بے شمار خاندانی اور سماجی مسائل پیدا کر دیئے۔ انہی میں سے ایک وہ ہے جس سے گریٹا گاربو جیسی عورتیں دوچار ہوتی ہیں۔ جوانی کی عمر میں، جب ان کے اندر مردوں کے لئے کشش پیدا ہوتی ہے، وہ ہر جگہ رونق محفل بنی رہتی ہیں۔ ان کو روزانہ ایسے تفریحی پروگرام ملتے رہتے ہیں جن میں مصروف رہ کر وہ اپنے صبح وشام گزارتی رہیں۔ مگر جب عمر زیادہ ہوتی ہے اور وہ جنس مخالف کی عام سرگرمیاں محض مصنوعی سرگرمیاں ثابت ہوتی ہیں تو پھر دوستیاں اور تعلقات اس طرح چھوٹ جاتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کے پتے۔ اس وقت انہیں معلوم ہوتا ہے کہ مستقل وفاداری کو بندھن سمجھنا ان کی کتنی بڑی غلطی تھی۔

ان پر یہ کھلتا ہے کہ اب تک وہ خوابوں کی دنیا میں جی رہی تھیں۔ ان کی رونقوں سے بھری زندگی اچانک ایک سوتے گھر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جہاں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہوتی کہ کتے اور بلی پال کر دل بہلاتی رہیں۔ ان کا کوئی رفیق حیات نہیں ہوتا۔ جو خوشی اور غم میں ان کا شریک ہو ان کے سامنے اپنے بچوں کا وہ ''باغ'' نہیں ہوتا۔ جن کی صورت میں ایک آدمی اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کے تسلسل کو دیکھ کر مطمئن ہوتا ہے، ان کے آس پاس کوئی ''اپنا'' نہیں ہوتا جس کو اپنی زندگی اثاثہ سونپ کر وہ سمجھیں کہ انہوں نے دنیا میں بے کار محنت نہیں کی۔ ان کو گوشت پوست کی کوئی ایسی دنیا نظر آتی نہیں جس کو وہ اپنا سمجھیں اور جو انہیں اپنا سمجھے۔ ایسے لوگ بھری کائنات میں بالکل تنہا ہو کر رہ جاتے ہیں اور یقیناً کسی آدمی کے لئے تنہائی سے بڑی کوئی سزا نہیں۔

اچھی بیوی بنو

فرینک بورمن ایک امریکی خلا باز ہیں انہوں نے ایک ایسی خلائی کشتی میں پرواز کیا تھا۔ جس میں ان کے علاوہ ایک خاتون خلا باز بھی سوار کرائی گئی تھی۔ مسٹر بورمن نے ایک بیان میں کہا:

''خلائی کشتی میں عورت کو بٹھانا اچھا ہے البتہ ایک عورت اور ایک مرد کو دیر تک اتنا زیادہ قریب رکھنا ابتری کا باعث ہوگا۔''

مسٹر بورمن کے اس بیان نے مساوات مرد وزن کے بہت سے علمبرداروں کو بوکھلا دیا ہے۔ ایک امریکی خاتون نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا:

''مسٹر فرینک بورمن کا وجود کہاں ہوتا اگر ان کے ماں باپ اکٹھا نہ ہوئے ہوتے۔''

سائنسی تحقیقات نیز عملی زندگی کے حقائق نے مساوات مرد وزن کے قدیم تصور کو سخت جھٹکا پہنچایا ہے۔ایک امریکی خاتون مسز ہیلن گن دو بچوں کی ماں ہیں ا ن نے حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ''مکمل عورت'' ہے۔(Total Women)۔اس کتاب میں ا ن نے اپنی امریکی بہنوں کو ''خوش گوار ازدواجی زندگی'' کے لئے سادہ گر بتائے۔

''اچھے شوہر کی اچھی رفیق بنو،اس کو ملامت کرنا چھوڑ دو،اس کی ضرورتوں کو سمجھو۔

یہ کتاب ایک سال سے بھی کم عرصہ میں تین ملین کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے،موصوفہ کے نزدیک مرد کی رفیق بننا عورت کی تکمیل ہے نہ کہ آزادانہ زندگی کا مالک بننا۔(ٹائمز آف انڈیا 8 فروری 1978ء) حقیقت یہ ہے کہ مکمل عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کی مکمل رفیق بن سکے۔

ناکامی کا اعتراف

امریکہ کی ایک ایکٹریس جین سیبرگ نے اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔امریکہ کے علاوہ یورپ میں بھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔اس نے قدیم انداز میں ایک ''گھر'' بسانے کے بجائے لاکھوں گھروں کے لئے سامان تفریح بننے کو ترجیح دیا۔مگر اس کی موت کے بعد جب اس کی ڈائری پڑھی گئی تو اپنی ڈائری کی آخری سطروں میں اس نے لکھا تھا: ''کاش میں اپنے گھر میں رہی ہوتی''(ٹائمز آف انڈیا 8 نومبر 1981ء)

کیسا عجیب تھا یہ کامیاب سفر جو بالاخر ناکامی پر ختم ہوا

خدا نے جس طرح اس دنیا کی مادی چیزوں کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی فطرت پر قائم رہ کر کوئی چیز اپنا صحیح وظیفہ انجام دے پاتی ہے۔یہی حال انسان کا بھی ہے خدا نے مرد کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی طرح عورت کو بھی خاص فطرت پر پیدا کیا ہے۔دونوں اسی وقت اپنی صحیح زندگی گزار سکتے ہیں جبکہ وہ خدا کی فطرت پر قائم رہیں۔فطرت سے ہٹتے ہی وہ زندگی کے نقشہ میں اپنا مقام کھو دیں گے۔

عورت کی صلاحیتیں واضح طور پر مرد سے مختلف ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کا دائرہ کار اور مرد کا دائرہ کار عمومی اعتبار سے یکساں نہیں۔مرد کا دائرہ کار اگر باہر ہے تو عورت کا دائرہ کار ''اندر'' مرد اپنے دائرہ کار میں زیادہ مفید بن سکتا ہے اور عورت اپنے دائرہ کار میں۔اگر دونوں اپنے دائرہ کار کو بدلیں تو دونوں اپنی معنویت کھو دیں گے دونوں اپنے کو بے جگہ بنالیں گے۔

صرف مسائل پیدا ہوئے

امریکہ میں ایک ناول چھپا ہے،جس کا نام ہے ''اکیلی خاتون''

Havrold Robbins. The Lonely Lady. New Einglish Library

London 1976.pp.448

اس ناول میں امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرہ کی ایک کمزوری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کی غیر شادی شدہ زندگی بالآخر ایک نا قابل برداشت تنہائی پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی کے مطابق ایک خوبصورت اور نوجوان امریکی خاتون فلمی دنیا کی چمک دمک سے متاثر ہوتی ہے وہ شادی شدہ زندگی کو چھوڑ کر فلم ایکٹرس بن جاتی ہے۔ اس کی باکمال نسوانیت اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ بہت جلد ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی ہے یہاں تک کہ وہ ترقی کے آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ دولت، شہرت، عزت اور چاہنے والوں کی بھیڑ، ہر چیز بافراط اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے مگر ترقی کی آخری انتہا پر پہنچنا اس کو سکون نہیں دیتا۔ اب وہ ایک تلخ حقیقت کو دریافت کرتی ہے:

''یہ کہ شہرت بالآخر ختم ہو جاتی ہے اور دوست بالآخر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جب کہ ایک عورت کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ امریکی خاتون نہایت حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے:

حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت ہی اس بات کو جانتی ہے کہ اکیلا پن کیا ہے۔ ناول کا خلاصہ یہ کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ فلمی دنیا کے ذریعے بڑی بڑی کمائی کرنا اور اپنے لئے ایک خود مختار زندگی حاصل کرنا بطور بڑا پر سکون اور پر کشش معلوم ہوتا ہے، مگر جب عورت کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھیوں میں اس کے لئے کشش باقی نہیں رہتی تو وہ ایک نا قابل برداشت حادثہ سے دوچار ہوتی ہے۔

اس کے پاس دولت اور مادی ساز و سامان کا انبار ہوتا ہے۔ مگر وہی چیز نہیں ہوتی جس کی ایک عورت کو سب سے زیادہ ضرورت ہے یعنی زندگی کا چین۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا جو اس کے صبح و شام میں اس کا ساتھی بن سکے۔ وہ ایک ایسے آباد گھر کی مالک نہیں ہوتی جس کو وہ اپنا گھر سمجھے:

یہ ایک تنہائی ہے جو خود مختار زندگی سے برآمد ہوتی ہے ایک دیانت دارانہ فردیت، ایک ایسے سماج میں جہاں بددیانتی ہی سب سے بڑا نفع بخش سرمایہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بے حد نازک ترکیب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ تبدیلی بھی صرف بربادی پر ختم ہوتی ہے۔ جمادات اور نباتات کی دنیا کے لئے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامیابی کا راز یہ ہے کہ فطرت کے بنائے ہوئے نظام سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہاں مطلوب نتیجہ تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے، جب کہ فطرت کے مقررہ ڈھانچوں کو قبول کیا جائے مگر وہی انسان جو جمادات اور نباتات کے معاملہ میں اس حقیقت کی مکمل پابندی کرتا ہے۔ وہ خود اپنی زندگی کے معاملہ میں اس ابدی حقیقت کو بھول جاتا ہے۔

عورت اور مرد کے لئے فطرت کا بنایا ہوا نظام یہ ہے کہ وہ شادی شدہ زندگی گزاریں ان کی جسمانی ساخت، ان کے نفسیاتی اور خاندانی مسائل ان کے اجتماعی رشتے سب اپنی درستگی کے لئے شادی شدہ زندگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ عورت کا آزاد اور خوشحال ہونا۔ الفاظ کے اعتبار سے بظاہر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا عملی تجربہ اتنا ہی زیادہ بھیانک ہے۔

عورت اپنی جوانی کی عمر میں بڑی آسانی سے اس قسم کے خوش کن اور دل فریب نظریات کا شکار ہو جاتی ہے مگر جب اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا راستہ غلط تھا۔ مگر یہ علم اس کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ تلافی کا وقت نہیں ہوتا۔ اب اس کے لئے موجودہ دنیا میں جو چیز رہ جاتی ہے وہ صرف یہ کہ کتوں اور خرگوشوں کو پال کر مصنوعی طور پر ان سے دل بہلائے اور بالاخر مسرت اور مایوسی کے قبرستان میں جا کر سو رہے۔

لذتیت کا انجام

جان کینڈی (1917ء تا 1963ء) امریکہ کا 35 واں صدر تھا اس نے جیکولین کینڈی سے شادی کی۔ اس کے بعد جیکولین کینڈی امریکہ کی خاتون اول کی حیثیت سے کافی مشہور ہوئی۔

امریکہ کی ایک خاتون مصنف کٹی کیلی نے جیکولین کینڈی کے بارے میں ایک کتاب شائع کی ہے اس کتاب کا نام۔ آہ جیکی تھا۔ یہ کتاب جیکولین کینڈی کے نجی حالات کے بارے میں ہے جو کسی وقت امریکہ کی خاتون اول (First Lady) تھی۔

جیکولین قدرت سے ایک پر کشش نسوانی شخصیت لے کر پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائشی خصوصیت نے جان کینڈی کو متاثر کیا جو امریکہ کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی شادی جان کینڈی سے ہوگئی۔ بعد میں جان کینڈی امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس طرح جیکولین کینڈی کو امریکہ میں وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل ہو گیا۔ جس کے آگے مزید برتری کا کوئی مقام نہیں۔

جان کینڈی 1960ء میں امریکہ کے 35 ویں صدر منتخب ہوئے تھے مگر اس کے صرف تیسرے سال 23 نومبر 1963ء کو صدر کینڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جیکولین کینڈی جو اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مشہور اور معزز خاتون بن چکی تھی اچانک بے حیثیت ہو کر رہ گئی۔ تاہم اس کی نسوانی کشش نے یونانی ارب پتی ارسٹائل روناسس (1975ء...... 1906ء) کو متاثر کیا۔ اس کی دوسری شادی روناسس سے ہوگئی اس وقت جیکولین کی عمر تقریباً 40 سال اور روناسس کی عمر تقریباً 60 سال تھی، یہ شادی دونوں کے لئے خوش گوار ثابت نہ ہو سکی۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہی دونوں الگ الگ رہنے لگے۔ یہاں تک کہ 1975ء میں طویل بیماری کے بعد روناسس کا انتقال ہو گیا۔ جب کہ جیکولین اس کے پاس موجود بھی نہ تھی۔ جیکولین کو ہر چیز ملی مگر اس کو خوشی نہ مل سکی۔ اس کی سوانح نگار کٹی کیلی کے الفاظ میں جیکولین کینڈی نے خوشی حاصل کرنے کی بابت اپنی نا قابل علاج خواہش کو خرید کر حاصل کرنا چاہا۔ خواہ اس کی قیمت 3 ہزار ڈالر فی گھنٹہ دینی پڑے۔ اس کے باوجود خوشی حاصل نہ کر سکی۔

خود کشی کر لی

مارلن مزو (میریلین مونرو) امریکہ کی ایک مشہور خاتون ہے اس نے اولاً فوٹو گرافر کے ماڈل کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اس کے بعد وہ غیر معمولی نسوانی کشش کی بنا پر فلم کی دنیا کی ہیروئن بن گئی۔ اس کو جنسی دیوی

کہا جانے لگا۔ اس کی فلموں کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں کہیں اس کا کوئی شو ہوتا تو بے شمار تماشائی اس کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے۔

مارلن منرو کی آخری فلم بے جوڑ (The Misfits) تھا۔ فلم کا یہ عنوان گویا خود اس کی اپنی زندگی کا بھی عنوان تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے جگہ پا رہی تھی۔ انسانی سمندر کے درمیان وہ نفسیاتی طور پر تنہا ہو کر رہ گئی تھی۔ بظاہر اس کی ہنستی ہوئی تصویریں اخباروں اور رسالوں میں چھپتی تھیں مگر اندر سے وہ اپنے آپ کو مستقل طور پر افسردگی میں محسوس کرتی تھی۔ آخر کار وہ اس نفسیاتی عذاب کو برداشت نہ کر سکی۔ 5 اگست 1962ء کو اس نے بیک وقت بہت سی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف 36 سال تھی۔

اس قسم کی عورتوں کا عام حال یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر خوش دکھائی دیتی ہیں۔ مگر ان کا دل مستقل طور پر روتا ہے ان کی زندگی بڑی مظلومی کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ سب کی ہوتی ہیں مگر کوئی ان کا نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو خوش کرتی ہیں۔ مگر ان کو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ کوئی نہیں جس کے ساتھ وہ اپنی خوشی کے لمحات گزار سکیں۔ مجلسی تقریبات میں بظاہر، ان کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت دکھائی دیتی ہے مگر اپنی حقیقی دنیا میں وہ اپنے آپ کو بالکل خالی محسوس کرتی ہیں۔ ابتدائی شاندار زندگی آخر کار ایک غیر شاندار زندگی پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تنہائی کی زندگی عورت کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ عورت تنہائی برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر مغربی تہذیب کا راستہ عورت کو آخر کار جہاں پہنچاتا ہے۔ وہ یہی تنہائی کی زندگی ہے اس کے برعکس اسلام عورت کو ایک ایسی زندگی کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ تنہا نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک پورے خاندان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام کا طریقہ فطری طریقہ ہے اور مغربی تہذیب کا طریقہ غیر فطری طریقہ۔

مجھ سے دور رہو

انڈین ایکسپریس (14 مئی 1986ء) میں صفحہ نمبر 14 پر ایک مغربی عورت کی تصویر ہے وہ ایک میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہے اور ایسی پریشان حال دکھائی دے رہی ہے جیسے کہ اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ مگر یہ کوئی عام عورت نہیں یہ دور جدید کی مشہور ترین ایکٹریس ایلزبتھ ٹیلر ہے۔ تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

''ایڈز'' کے لئے رقم۔ امریکی سینٹ کی ایک سب کمیٹی کے سامنے واشنگٹن میں ایکٹرس الزبتھ ٹیلر اپنا مسئلہ پیش کرتے ہوئے مزید رقم کا مطالبہ کر رہی ہے تاکہ وہ ایڈز کے مہلک مرض سے نجات حاصل کر سکے۔ ''ایڈز'' موجودہ زمانہ کا ایک ناقابل علاج مرض ہے۔ جو بے قید جنسی اختلاط کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا شخص نہ صرف خود عجیب وغریب قسم کی تکلیفوں کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ وہ متعدی بھی ہے دوسرے لوگ ایسے شخص سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اعلان کیا ہے کہ ایڈز کے مریض سے جو شخص چھو جائے گا۔ اس کو بھی ایڈز کا مرض لاحق ہو جائے گا۔ چنانچہ ٹیلر جیسی خواتین جن سے قریب ہو کر لوگ فخر محسوس کرتے تھے۔ اب وہ ایسی عورتوں سے دور بھاگ رہے ہیں کہ کہیں ان کو بھی یہ مہلک مرض لاحق نہ ہو جائے۔

کیسا عجیب ہے مغربی عورت کا انجام! وہ مساوی درجہ حاصل کرنے کی کوشش میں غیر مساوی درجہ تک پہنچ گئی۔آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ انسانی قافلہ سے پیچھے چلی گئی۔

شہرت بوجھ بن گئی

فرانس کی سینما کی تاریخ میں جس خاتون نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ ''بی بی'' (Brigitte Bardot) ہے جو 1934ء میں پیدا ہوئی۔ فلمی دنیا میں بعض اعتبار سے اس نے میریلین منرو اور مارلین ڈٹرچ سے بھی زیادہ بڑا مقام حاصل کیا۔ جون آف آرک کے بعد وہ فرانس کی سب سے زیادہ شہرت یافتہ خاتون شمار ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''بی بی'' کے ذریعہ باہر کی جو دولت فرانس میں آئی وہ اس سے بھی زیادہ ہے جو مشہور رینالٹ (Renault) موٹر کمپنی کے ذریعہ فرانس میں آئی۔ ٹونی کرای نے 1958ء کے آخر میں اندازہ لگایا تھا کہ اس کی تصویریں یورپ اور امریکہ کے جرائد کے صفحہ اول پر 29345 بار چھپ چکی ہیں۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مئی 1986ء)

''بی بی'' کی فلم پر فلم بنتی رہی۔ اس کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ بعض اوقات وہ اپنے گھر سے نکلنے میں صرف اس لئے کامیاب نہ ہوسکی کہ اس گھر کے باہر فوٹو گرافروں کی ناقابل عبور فوج کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے نام روزانہ اتنے زیادہ خطوط آتے تھے کہ ان کی منتخب تعداد کو پڑھنا بھی اس کے لئے ناممکن تھا۔

ان تمام ظاہری رونقوں کے باوجود اندر سے وہ سخت غیر مطمئن تھی حتیٰ کہ اس کی شہرت اس کے لئے ایک بوجھ بن گئی۔ اس نے خودکشی کے ارادہ سے ایک رات بہت زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالیں۔

تاہم وہ مر نہ سکی۔ اس وقت بھی جب کہ وہ نازک حالت میں پیرس کے ایک ہسپتال میں لے جائی جارہی تھی، فوٹو گرافروں نے ایمبولینس کار کو زبردستی راستہ میں روکا تاکہ وہ اس کا فوٹو لے سکیں۔ ''بی بی'' کے بارہ میں ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ کیمرہ کے سامنے اس نے کبھی سکون محسوس نہیں کیا۔

39 سال کی عمر میں جب کہ وہ تقریباً پچاس کامیاب فلمیں بنا چکی تھی اس نے اچانک اپنا کیریئر ختم کردیا۔ وہ فلمی دنیا سے بالکل بے تعلق ہوگئی۔ اس نے اپنی شاندار رولس رائس کار فروخت کردی اور اپنے مکان میں تنہا رہنے لگی جہاں وہ ایک معمولی انسان کی طرح زندگی گزار سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ گھر کے باہر کی دنیا میں ہیرو بننا اور ہر طرف شہرت حاصل کرنا عورت کی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ عورت فطری طور پر خانہ پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنوعی میدانوں میں شہرت پانے والی عورتیں اپنے کیریئر کے درمیان میں یا اس کے آخر میں خانہ نشین ہوجاتی ہیں۔ وقتی چمک دمک کے بعد بالآخر ان کو جہاں سکون ملتا ہے وہ ان کا گھر ہے نہ کہ ان کا باہر۔

عورت کے بارہ میں اسلام کا قانون عورت کی اسی فطرت کی رعایت ہے نہ کہ عورت کے اوپر ظلم۔ وہ مقام جہاں ایک عورت ناکام تجربہ کے بعد پہنچتی ہے، اسلام چاہتا ہے کہ وہ اپنے آزاد ارادہ کے تحت خود اپنے انتخاب

کے ذریعہ وہاں پہنچے۔

میدانِ عمل سے محرومی

مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے قیمت پاتا ہے عورت کو مرد کے مساوی قرار دے کر جب گھر سے باہر لایا گیا۔ تو اس کی قیمت اس میں تھی کہ وہ ان تمام شعبوں کو سنبھال لے جن کو مرد روایتی طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ یعنی وہ پائلٹ، ڈرائیور، انجینئر، پروفیسر، ایڈمنسٹریٹر، پولیس آفیسر، فوجی کمانڈر وغیرہ وغیرہ تمام حیثیتوں میں بالکل مرد کی طرح کام کرنے لگے۔ مگر حیاتیاتی اعتبار سے عورت کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ وہ ان شعبوں کو اس طرح نہیں سنبھال سکتی جس طرح مرد ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔

عورت جب مردانہ شعبوں کو سنبھال نہ سکی تو اب یہ سوال تھا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ وہ ان شعبوں میں جمع ہونے لگی جن میں وہ اپنی نسوانیت کے اعتبار سے قیمت پا سکتی تھیں، نہ کہ تمدنی کارکردگی کے اعتبار سے۔ مثلاً فلم، ٹیلی وژن، تفریحی مجلس، وہ اشتہاری صنعتیں جو عورت کی نسوانیت کو استعمال کرتی ہیں۔ مگر یہاں عورت کی دوسری کمزوری اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ان شعبوں میں جوان عورت کی ضرورت تھی اور عورت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہمیشہ جوان رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت باہر نکل کر ایک قسم کی ادھوری شخصیت بن گئی۔ وہ صرف جوانی کے چند سالوں تک اپنے آپ کو باقیمت ثابت کر سکی۔ جوانی کی مدت ختم ہونے کے بعد باہر کی زندگی میں اس کی کوئی قیمت نہیں رہی۔

مغربی ملکوں میں آزادی نسواں کی تحریک نے پردہ کو ختم کر دیا ہے عورت اور مرد کے درمیان کوئی حد بندی باقی نہ رہی۔ تمام عورتیں سڑکوں اور بازاروں میں نکل آئیں اب جن عورتوں میں نسوانی کشش نسبتاً زیادہ ہو وہ فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آ جاتی ہیں وہ تیزی سے لوگوں کے درمیان مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں مگر یہ مقبولیت اس قیمت پر حاصل ہوتی ہے کہ وہ خاندانی زندگی سے دور ہو جاتی ہیں۔ وہ شادی کو بندھن سمجھ کر اس سے بے رغبت ہو جاتی ہیں۔ وہ گھر بنا کر اس میں رہنے کے بجائے محفل کی رونق بننا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

مگر یہ پر رونق لمحات بے حد وقتی ہوتے ہیں۔ جوانی کی خاص عمر تک ان عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں نارنگی کے چھلکے کی طرح پھینک دیا جاتا ہے مقبول شخصیت بالآخر خود اپنے ماحول میں غیر مقبول شخصیت بن کر رہ جاتی ہے۔

مغربی تہذیب میں صرف ''جوان عورت'' کے لئے جگہ ہے۔ ''بوڑھی عورت'' کے لئے مغربی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں، مغربی تہذیب میں ایک عورت اپنی نسوانی کشش کی بنیاد پر جگہ حاصل کرتی ہے بڑھاپے میں یہ نسوانی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے مغربی عورت بوڑھی ہونے کے بعد اپنا مقام بھی کھو دیتی ہے۔ ''جو شخص ذمہ داری قبول نہ کرے اس کو حقوق میں بھی حصہ نہیں ملتا۔'' یہ مقولہ اپنی بدترین شکل میں مغرب عورت کے حق میں صادق آیا ہے۔

خاندان سے وابستہ ہو کر جو زندگی بنتی ہے اس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے خاندان میں ایک عورت ''بیوی'' کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کرتی ہے۔ یہاں اس کو اپنے عمل کا بھرپور میدان مل جاتا ہے اس کا گھر ایک پوری مملکت ہوتا ہے، جس کو وہ سنبھالتی ہے۔ اور جس کی وہ تنہا انچارج ہوتی ہے۔ یہاں اس کی کارکردگی سے اس کی تاریخ بنتی ہے۔ جو آخر وقت تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہر اگلا دن یہاں اس کے عزت و احترام میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے وہ ''ماں'' بنتی ہے، پھر وہ نانی اور دادی بنتی ہے حتیٰ کہ خود اپنے شوہر کی نظر میں اس کی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ عورت جوانی میں بیوی ہوتی ہے اور بڑھاپے میں ماں کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

عورت کی یہ حیثیت بالکل فطری ہے۔ چنانچہ خود مغربی دنیا میں جو افراد ازدواجی زندگی کے دائرہ میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی فطرت کے زور پر عورت یہی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک سبق آموز مثال امریکہ کے صدر رونالڈ ریگن کی ہے۔ چنانچہ ایک امریکی رپورٹ (ہندوستان ٹائمز 18 اکتوبر 1987ء) میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر ریگن اپنی بیوی سے بہت زیادہ وابستہ ہیں، وہ ان کو ''ماں'' کہتے ہیں جب کہ وہ عوام سے دور ہوتے ہیں، یہ بات ان کے قریبی رفیقوں نے بتائی۔

اس طرح عمر بڑھنے کے ساتھ گھر کے اندر عورت کا وقار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھر کی مالکہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ خاندان کسی عورت کی وہ دنیا ہے جو اول سے آخر تک اس کا ساتھ دیتی ہے جب کہ مغربی تہذیب کا حال یہ ہے کہ وہ زندگی کے چند سالوں میں عورت کی ساتھی ہے، وہ اس کی عمر کے طویل تر حصہ میں عورت کی ساتھی نہیں۔ مغربی زندگی میں عورت اپنی جوانی کے چند سال کے بقدر قیمت پاتی ہے۔ اور خاندانی زندگی میں اپنی پوری عمر تک۔

جاپان کی مثال

جاپان کی عورتوں کے بارہ میں ایک رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان میں اگرچہ 15 ملین کارکن خواتین موجود ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر معمولی کاموں میں مصروف ہیں وہ اپنے مرد افسروں (Male Superiores) کی مددگار کے طور پر کام کرتی ہیں۔

36 سال کے بعد دو خواتین جاپانی کابینہ میں لی گئی ہیں وہ بھی زیادہ تر اقوام متحدہ کے موسم خواتین کی رعایت سے جو 1985ء میں ختم ہو رہا ہے۔ جاپان میں اس وقت 608 ڈپلومیٹ ہیں ان میں خواتین کی تعداد صرف 12 ہے۔ جاپان آج بھی بنیادی طور پر مردوں کا سماج ہے۔

رپورٹ میں جاپان کی موجودہ خاتون وزیر کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔ ''عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کرنے والا ایک بل جاپانی پارلیمنٹ میں ہے مگر وہ اب تک پاس نہ ہو سکا۔ اکثر مرد ناقدین اس بل کو برعکس امتیاز پیدا کرنے والا اقدام سمجھتے ہیں۔ (انڈین ایکسپریس 24 نومبر 1984ء)

جو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کی مساوی شرکت کے بغیر قومی ترقی نہیں ہو سکتی انہیں اس واقعہ سے نصیحت لینی چاہئے۔ جاپان دور جدید کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے، یہ ترقی اس کو اس کے بغیر حاصل ہوئی ہے کہ اس نے اپنی خارجی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں عورتوں کو برابر کے شریک کی حیثیت سے داخل کر دیا ہو۔

قدیم زمانہ میں عورت اور مرد کے کام کا دائرہ الگ الگ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اس حد بندی کو ختم کر دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اس سے ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ تقسیم عمل کے قدم کو توڑنے کا کوئی فائدہ تمدنی اعتبار سے نہیں ہوا۔ جن ملکوں میں عورت اور مرد دونوں کو زندگی کے ہر میدان میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے وہاں بھی عملاً زندگی کے تمام ترقیاتی کام مردوں ہی کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ عورتوں کے ہاتھ میں۔

جاپان کی مذکورہ مثال بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ جاپان پورے معنوں میں دور جدید کا ایک ترقی یافتہ ملک ہے مگر وہاں کا سماج ابھی تک قدیم انداز کے مطابق مردوں کے غلبہ کا سماج ہے۔ جاپان کی مثال ثابت کرتی ہے کہ ترقی کے لئے عورتوں کی مفروضہ مساوی شرکت ضروری نہیں۔ ایک امریکی خاتون شرمن بیبیئر (Shurmon Babior) نے اس معاملہ میں جاپان اور امریکہ کے فرق کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں نہیں سمجھتی کہ امریکی عورت اس جاپانی نقطہ نظر کو برداشت کر سکتی ہے کہ شوہر اپنے گھر کا حاکم ہے: (دی ٹائمز آف انڈیا (نیو دہلی) یکم دسمبر 1987ء)

(بحوالہ: خاتون اسلام مولانا وحید الدین خاں)

اخلاقی گراوٹ کی گھناؤنی مثالیں

★...... ماں بیٹے کی شادی

★...... ماں اور بیٹیاں، ایک خاوند

اخلاقی جرائم کی یلغار، طالب علموں اور نوجوانوں کے علاوہ بڑوں میں بھی روز افزوں ہے۔ بلکہ ایسے ایسے اخلاقی جرائم منظر عام پر آ رہے ہیں جن کی انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی مثال ملے، اندازہ کیجئے کہ نیویارک میں 43 سالہ ماں نے بیٹے سے شادی کر لی۔ ہوا یوں کہ ایک خاتون ''میری'' نے سترہ سال کی عمر میں ایک بچے کو جنم دیا۔ وہ سات سال کا تھا۔ جب وہ اس سے لاتعلق ہو گئی۔ ڈینی خیراتی اداروں میں پل کر جوان ہوا۔ اور 26 سال کا ہوا تو اس کا تعارف میری سے ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کا بیٹا ہے اس کے باوجود اس نے ڈینی کو ورغلایا اور اس سے شادی کر لی۔ بیٹے کو اصلیت کا پتہ چلا تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو گیا۔'' (جنگ یکم مئی 84ء)

اسی طرح کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ماں بیٹیوں کا ایک ہی خاوند ہو لیکن امریکہ میں یہ بھی ممکن ہو گیا۔ تفصیل یوں ہے کہ ٹام گرین نے پہلے دو عورتوں سے شادی کی اور بعد میں ان کی تین بیٹیوں سے بھی شادی رچا لی۔ یعنی پہلے اس نے تمیہ نامی ایک بیوہ سے شادی کی جس کی ایک بیٹی لنڈا بھی اس کے ساتھ آ گئی پھر اس نے ایک اور بیوہ سے شادی کی جس کی دو بیٹیاں بھی ماں کے ساتھ آ گئیں۔ دونوں بیویوں نے اپنے شوہر کے ''حسن سلوک'' سے متاثر ہو کر اور بیٹیوں سے اس کا عشق دیکھ کر یکے بعد دیگرے اپنی بیٹیوں کی شادیاں بھی ٹام سے کر دیں اس طرح ماں بیٹیوں کے ایک خاوند کی حیثیت سے ٹام گرین نے نئی مثال قائم کی۔ (جنگ جمعہ میگزین 27 دسمبر 91ء)

(از محترم ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، بحوالہ اردو ڈائجسٹ، ستمبر 93ء)

یورپ میں خاندانی نظام کی تباہی و بربادی، زنا، جنسی جرائم کی صورت حال اب اس قدر دگرگوں ہو چکی ہے کہ خود اب وہاں کے دانش ور بھی چیخ اٹھے ہیں کہ ایسے جرائم کے مرتکب افراد کو سنگین نوعیت کی سزائیں دی جائیں۔ تا کہ معاشرے کو مکمل تباہی سے بچایا جا سکے۔ یہی بات اسلام کہتا ہے تو نہ صرف ان کی بلکہ بعض ''اپنوں'' کی جبینیں بھی شکن آلود ہو جایا کرتی ہیں وہ لوگ کہ مسلمان ہو کر بھی جن کا ''قبلہ'' یورپ ہے وہ ذرا اپنے آقاؤں کے ارشادات پہ ہی غور فرما لیں اور اسلامی سزاؤں کو ''وحشیانہ'' کہنے سے توبہ کر لیں۔ ورنہ تو عذاب الیم ان کا منتظر ہے ہی۔

غیر شادی شدہ زانی کے لئے اسلام کوڑے اور شادی شدہ کے لئے رجم کی سزا تجویز کرتا ہے اور ذرا غور کیا جائے تو یہ سزا کہیں زیادہ نرم، ہلکی اور آسان ہے بہ نسبت اس سزا کے، جو یورپی دانش ور تجویز کر رہے ہیں ان

کے مطابق عصمت دری کے مرتکب کو مردانہ صفات سے محروم کر دینا چاہئے۔ رجم سے تو انسان گناہ سے پاک ہو کر ایک ہی دفعہ دنیائے فانی سے کوچ کرکے ابدی نعمتیں حاصل کرے گا۔ لیکن مردانہ صفات سے محروم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کا ایک ایک پل اذیت ناک بنا دیا جائے اور ہر قدم قدم پر موت کا مزہ چکھتا رہے۔

دین فطرت سے بغاوت اور دوری سے عقل انسانی ایسی ہی ''دانش وری'' کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کاش کہ ہم کہیں صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرکے انہیں مثال دکھا سکتے۔ یہاں ان مغرب زدہ مسلمانوں کے لئے بھی درس عبرت ہے جو یہ کہا کرتے ہیں کہ معاشرے کو جنسی قدغن سے آزاد کر دیا جائے تو جنسی جذبہ سرد پڑ جائے گا صنف مخالف کی رغبت بھی کم ہو جائے گی اور جنسی جرائم بھی عنقا ہو جائیں گے۔

کیا انہیں معلوم نہیں کہ یورپ یہ تجربہ اپنی مکمل شکل میں کرکے اب واپس لوٹنے کی صدائیں دے رہا ہے؟ وہاں مکمل آزادی کے باوجود صنف نازک کی طلب میں کتنی کمی واقع ہوئی؟ جنسی جرائم پر کتنا قابو پایا گیا۔ اور حضرت انسان کی فطرت میں کتنی تبدیلی واقع ہوئی؟

جنسی آزادی کے علمبردار یقیناً اتنے بے وقوف نہیں وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جنسی بھوک بھی پیٹ کی بھوک کی طرح ایک بنیادی ضرورت ہے۔ جس طرح ایک دفعہ کھانا کھانے سے اشتہا ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک وقفے کے بعد پھر اسی شدت کے ساتھ دوبارہ لوٹ آتی ہے اسی طرح ایک دفعہ کا بے قید جنسی عمل بعد میں سینکڑوں جنسی اعمال اور پھر ہزاروں جنسی جرائم کا نکتہ آغاز ثابت ہوتا ہے۔ مگر مسلم معاشرے میں جنسی آزادی پھیلانے کی ان کی یہ ساری کوشش ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے۔ جس کا منتہائے مقصود مسلم معاشرے اور مسلم خاندان کو بھی اسی تباہی سے دوچار کرنا ہے جس سے آج کا یورپ دوچار ہے اس تناظر میں درج ذیل تین خبریں ملاحظہ فرمائیے:

1۔ عصمت دری کے مرتکب افراد کو مردانہ صفات سے محروم کرنے کا مطالبہ......ڈیوڈ ایونز

2۔ غیر انسانی جرائم کرنے والوں کو ایسی سزائیں دی جائیں کہ وہ جرم کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

3۔ اسلامی سزاؤں پہ واویلا مچانے والی انسانی حقوق کی تنظیمیں اب کیوں خاموش ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ حقوق انسانی کے پردے میں ان کا مقصد اسلام دشمنی ہے؟

لندن (پی اے) ہاؤس آف کامنز میں گزشتہ روز لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال پر ہونے والی بحث کے دوران ویلوین اور ہیٹ فیلڈ کے ایم پی ڈیوڈ ایونز نے ہوم سیکرٹری مائیکل ہاورڈ سے مطالبہ کیا ہے کہ زنا بالجبر کے مرتکب افراد کو زبردستی نامرد بنا دینا چاہئے تاکہ خواتین رات کے وقت گلیوں میں آتے جاتے خوف و ہراس کی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ سزائے موت کی غیر موجودگی میں چوری اور قتل کی وارداتوں میں تفریق کرنا ناممکن ہو چکا ہے انہوں نے حال ہی میں پیش آنے والے ایک واقعہ کا حوالہ دیا جس میں بس سٹاپ پر کھڑی ہوئی ایک خاتون کو تین افراد نے اغوا کرنے کے بعد قبرستان میں لے جا کر تشدد کا نشانہ

بنایا اور عصمت دری کی۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح غیر انسانی جرائم کے مرتکب افراد کو ایسی سزائیں دی جائیں کہ وہ جرم کرنے سے پہلے سوچیں کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ان حیوان صفت مجرموں کو نہ صرف مردانہ صفات سے محروم کیا جائے بلکہ کوڑے لگائے جائیں نہیں تو یہ جانور چند سال جیل میں رہ کر پھر سے معاشرے میں گند پھیلانا شروع کر دیں گے۔ ہوم منسٹری کے وزیر ڈیوڈ میکلین نے جواب میں کہا کہ 1990ء میں ہاؤس آف کامنز نے سزائے موت کا بل مسترد کر دیا تھا۔ اور اب میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ ہاؤس آف کامنز بھی اس حق میں نہیں کہ سزائے موت بحال کی جائے۔ ڈیوڈ جونز نے ہوم آف کے وزیر سے سوال کیا کہ آپ مجھے سیدھا جواب دیں کہ حکومت ان حیوانوں کو روکنے کے لئے کوئی ایکشن لے رہی ہے یا نہیں۔ ڈیوڈ میکلین نے کہا: کہ حکومت نے 1990ء سے لے کر اب تک 16,500 اضافی پولیس فورس بھرتی کی ہے نئی جیلیں تعمیر کی ہیں۔ جوا کے رائیڈنگ کے خلاف اقدامات کئے اور گلیوں میں پولیس کا گشت بھی بڑھا دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں عام آدمی کے ذہن میں پائے جانے والے خدشات سے واقف ہوں اور ذاتی طور پر سزائے موت اور دیگر سزاؤں کے حق میں ہوں لیکن پارلیمنٹ واضح طور پر اس قسم کی سزاؤں کے خلاف فیصلہ دے چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جسمانی سزائیں یورپین کنونشن آف ہیومن رائٹس سے بھی متصادم ہیں۔ جس نے ان پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ (روزنامہ جنگ لندن 9 جون 1993ء)

نوجوان لڑکیوں کو "NO" کہنے کا ڈھنگ سکھائیں

لڑکیوں کو لڑکوں کی ہوس سے بچانے کے لئے تربیتی کورس شروع کرنے کی تجویز۔

"لندن (کلچر رپورٹر) برطانوی سکولوں کے نوجوان لڑکے یہ غلط بیانی کر کے بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں کہ لڑکی "پہلی محبت میں حاملہ نہیں ہوسکتی۔ یہ بات برطانوی سکولوں کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ایک سروے رپورٹ سے سامنے آئی ہے اس سروے کے لئے انٹرویو دینے والے 16 سال تک کی عمر کے تقریباً آدھے لڑکے لڑکیوں کا کہنا ہے کہ وہ اس عمر تک پہنچنے تک جنسی تجربہ حاصل کر چکے ہیں جبکہ 25 فیصد کا کہنا ہے کہ انہوں نے محض "مخصوص دوستی" کا آغاز ہونے کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر جنسی گناہ بھی کر لیا۔ برطانیہ کے ایک ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر راجر انگھم نے اس رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ نوجوان لڑکیوں کو "NO" (نہ) کہنے کا ڈھنگ سکھانے پر توجہ دیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لئے کسی مخصوص کورس کا آغاز کیا جانا چاہئے اور تمام نوجوان لڑکیوں کو اس میں حصہ لینا چاہئے ڈاکٹر انگھم کا دعویٰ ہے کہ اکثر نوجوان بھولی بھالی لڑکیاں لڑکوں کی ہوس کا نشانہ صرف اس لئے بن جاتی ہیں کہ انہیں انکار کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا اور وہ "نو" نہیں کہہ سکتیں۔ انہوں نے کہا کہ برطانیہ میں ناجائز طور پر حاملہ ہونے والی نوجوان لڑکیوں کی تعداد کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سکولوں میں جنسی تعلیم کو باقاعدہ لازمی مضمون کے طور پر رائج کیا جائے۔

(روزنامہ "جنگ" لندن، 25`24 اکتوبر 1992ء)

یہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی باتیں ہیں۔ صرف No سکھانے سے بات نہ بنے گی۔ جب تک کوئی ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کی جائے گی اور ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کرنے کی صلاحیت صرف اسلام کے پاس ہے۔ جس کا اللہ ہر وقت، ہر جگہ، ہر ایک کو برابر دیکھتا ہے۔ ہر ایک کی سنتا ہے حتیٰ کہ لوگ جو سوچتے ہیں وہ بھی جانتا ہے اور ایسے اللہ کے حضور جوابدہی کا تصور ہی اخلاق کو اس حد تک سدھارنے کے لئے کافی ہے۔ اگر کبھی لڑکی خود بھی مجبور کرے تو لڑکا اس جرم عظیم سے بچنے کے لئے اپنے جسم پر انسانی گندگی ملنا گوارا کرے مگر اس اخلاقی اور روحانی گندگی میں ملوث ہونے سے خود کو بچالے۔

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو دار العلوم دیو بند کے ایک طالب علم کو پیش آیا تھا۔ جب اس نے انسانی فضلہ اپنے جسم پہ مل لیا تو لڑکی کو مجبوراً اسے چھوڑنا پڑا

یورپ کی واپسی؟ کیا ہم سبق حاصل کریں گے

لندن: بوتھ سنٹروں سے کال گرلز کے فون نمبرز صاف کر دیئے گئے

لندن (خصوصی رپورٹ) برٹش ٹیلی کوم کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ لندن شہر کے ان تمام بوتھ سنٹروں سے جہاں دعوت گناہ دینے والی لڑکیوں کے فون کارڈ چسپاں تھے تیزی کے ساتھ صاف کئے جا رہے ہیں مزید کہا ہے کہ اب تک 44 ہزار ایسے ٹیلیفون فوری طور پر بند کرائے گئے ہیں۔ (روزنامہ "خبریں" لاہور، 27 اکتوبر 96ء)

یورپ حقوق نسواں کے نام پر جنسی آزادی کے جس سفر پر آج سے ایک صدی قبل بڑے طمطراق سے گامزن ہوا تھا۔ آج اس کا تلخ انجام اس کے لئے سوہان روح بن چکا ہے اور اب وہ واپسی کی راہوں کا متلاشی ہے۔ لڑکیوں کو No سکھانے کا ڈھنگ .... اور کال گرلز کے فون نمبرز صاف کرنے کا عمل اسی رجوع کی غمازی کرتا ہے۔ کیا ہمارے "دانش ور" "ترقی پسند" "لبرل اسلام" اور "آزادی نسواں" کے علمبردار اس سے سبق حاصل کریں گے؟ مگر شاید نہیں کیونکہ یہ سب تو اس زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیتے ہیں جس کا مقصد مسلم خاندان اور معاشرے کو باندھ کر سیکس کے اندھے قید خانے میں ایسا قید کرنا ہے کہ جہاں سے واپسی کی راہ بھی کوئی نہ ہو۔ مگر ہم بتائے دیتے ہیں کہ در کھلا ہے ابھی، اور وقت بھی کچھ باقی ہے، وگرنہ

ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لادوا

ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

1 امن وامان کی تشویش ناک صورت حال:

2 اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سربراہ نے اپنی اہلیہ کو اکیلے گھر سے باہر جانے سے روک دیا۔

3 عوام تو درکنار اپنی بیوی کی حفاظت کرنے سے قاصر ہوں، قانون کی کمزوریوں کے باعث جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سر پیٹر ایمرٹ:

لندن (نمائندہ جنگ) سکاٹ لینڈ یارڈ کے سربراہ سر پیٹر ایمرٹ نے کہا ہے کہ وہ برطانیہ میں تشدد کے

جرائم سے اس قدر پریشان ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو اکیلے جانے کی اجازت نہیں دیں گے انہوں نے کہا کہ اس سال 15 جولائی کو دمبلڈن کامن میں جہاں ایک نوجوان خاتون ریچل قتل ہوئی عین اسی جگہ ان کی اہلیہ لیڈی ایمرٹ روزانہ اپنے کتے کو لے جایا کرتی تھی اور اس واقعہ سے چند منٹ کی قبل وہاں سے گزری تھیں اور ریچل کے قاتل نے اتفاقیہ اس کا انتخاب کیا تھا۔ سر پیٹر کا کہنا تھا کہ عوام تو در کنار وہ اپنی اہلیہ کی حفاظت کرنے سے بھی بے بس ہیں سر پیٹر جنوری میں ریٹائر ہو رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ دس سالوں میں جرائم میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ قانون کی کمزوریاں ہیں اور انصاف کے حصول اور مجرموں کو سزا دینے کے لئے قانون میں ایسی تبدیلیاں بھی لائیں جن کے تحت ضمانت پر رہا افراد جو جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں تو بھی سخت سزائیں دی جا سکیں۔ (جنگ لندن 20 دسمبر 1992ء)

امن و امان کے ضمن میں یورپ کو آئیڈیل قرار دینے والے مندرجہ بالا خبر پر غور فرمائیں۔

جہاں پولیس کا سربراہ اس حد تک مجبور ہو وہاں کے نظام کو مثالی کہنا مبالغہ آرائی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج تک مسلمانوں کے کسی بھی ملک میں اسی کا اتنا اثر ہے کہ وہاں امن و امان کی صورت حال پوری دنیا کے لئے قابل رشک ہے۔ جرائم کی شرح سب سے کم ہے اور اکیلی خاتون رات کی تنہائیوں میں بھی بلا خوف و خطر سفر کر سکتی ہے۔

برطانیہ کی طرح امریکہ کا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ 8 جنوری 1996ء کو نیوز ویک میں مضمون گریٹ ایکس پیکٹشنز یعنی ''بڑی توقعات'' ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں عام یہودی پراپیگنڈہ کی طرح کہا گیا ہے کہ امریکہ میں بہت ترقی ہوئی ہے لوگوں کی حالت بہتر ہے افسوس کہ امریکی عوام اس ترقی پر یقین نہیں رکھتے اور شدید تکلیف اور بدحالی کا احساس رکھتے ہیں جو ان کی غلطی ہے۔

اس مضمون میں صفحہ 15 پر مندرجہ ذیل اعداد و شمار دیئے گئے ہیں بیسویں صدی کے شروع میں قتل کے جرم کی افتاد ایک فی لاکھ آبادی تھی جو صدی کی آخری دہائی میں بڑھ کر دس قتل فی لاکھ آبادی بسالانہ ہو گئی جو اکثر اسلامی ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے یعنی اسلامی ممالک میں اگر آپ ایسا علاقہ یا قصبہ میں جس کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے تو اس میں ہر ماہ ایک قتل کی واردات ملے گی قتل کی مثال ایک علامت کے طور پر لی گئی ہے منشیات، چوری نقب زنی، دھوکہ دہی، شدید ضربات لگانے وغیرہ کی مدوں میں مغربی سوسائٹی خصوصاً یو ایس اے کے حالات ایسے ہیں۔ کہ گویا اسی دنیا میں لوگوں کو جہنم کی سزائیں مل رہی ہیں اور ان کی روحیں انتہائی رنج و ملال، درد و کرب کی کیفیت میں تڑپ رہی ہیں یہ کہنا کہ ان آبادیوں کو ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر وغیرہ جیسے آلات وسیع پیمانے پر مل رہے ہیں۔ انسانی ترقی کی دلیل نہیں ہے۔ (بحوالہ ''نوائے وقت'' لاہور 19 فروری 96ء مقالہ پروفیسر اشفاق علی خان صاحب)

یورپین معاشرے بچے پیدا کرنے کے لئے حیوانوں کے راستے پر

شفاخانہ حیوانات میں بھینسوں، گائیوں اور گھوڑیوں کی بار آوری کے لئے اعلیٰ نسل کے نر جانوروں کے سپرم بذریعہ انجکشن استعمال کئے جاتے تھے۔ یورپ کا حیوان معاشرہ جو اس سے بچا ہوا تھا۔ اب اس میدان میں بھی کود پڑا ہے تاکہ حیوانیت کی کسی شکل سے محروم نہ رہے۔ اس سلسلے کی تازہ خبر برطانیہ سے تعلق رکھتی ہے دی ٹائمز آف انڈیا کے مطابق ایک مرد جو 1995ء میں فوت ہوا۔ اس کی اجازت کے بغیر اس کے سپرم (Sperm) لے لئے گئے اور فریز کر کے محفوظ کر لئے گئے۔ برطانیہ نے 1991ء میں جو قانون بنایا وہ یہ ہے کہ کسی مرد کے سپرم اس کی اجازت سے ہی لئے جاسکتے ہیں، اب یہاں صرف اتنی بات تھی کہ اس کی اجازت نہیں لی گئی مگر مذکور مرد جس کا نام سٹیفن ہے۔ اس کی بیوہ ''ڈیانے بلڈ'' نے عدالت میں مقدمہ درج کرادیا کہ وہ اپنے خاوند کے سپرم کی وارث ہے چنانچہ لوگوں کی ہمدردیاں اسے حاصل ہو گئیں اور عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا اور 30 جون کے خلیج ٹائمز کے مطابق اس عورت نے حاملہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

قارئین کرام! اب مسئلہ تو یہ ہے کہ سپرم کسی اور کا اور عورت کوئی اور...... پھر مرد کو فوت ہوئے کئی سال گزر گئے اور اس کی اولاد پیدا ہو رہی ہے۔ وراثت کے مسائل، ہمدردیاں، خاندان۔ غرض یہ سارے رہے سہے بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔ اور پھر کیا ہوگا۔ لامحالہ جس طرح مویشی زندہ رہ رہے ہیں۔ یہی حال انسانی معاشروں کا یورپ میں ہو جائے گا کہ جو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔ آہ! انسانوں کے معاشرے کو حیوانی معاشرے کی طرف سرپٹ دوڑایا جارہا ہے۔ ہے کوئی جو اس رفتار کے آگے بند باندھے؟'' (مجلہ الدعوة اگست 1998ء)

اسقاط حمل...... لیبارٹری آپریٹر اور جنین کے ڈھانچے...... منجمد جنین اور بیوٹی کریم

امریکہ کی اخلاقیات کا اندازہ اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں روزانہ چار ہزار حمل ساقط ہوتے ہیں اور ان میں 65 فیصد غیر شادی شدہ عورتیں ملوث ہیں۔ اس طرح 1973ء میں سپریم کورٹ کی طرف سے اسقاط حمل کو غیر قانونی قرار دیئے جانے کے بعد سالانہ پندرہ لاکھ حمل اسقاط ہو رہے ہیں۔ گزشتہ بیس سال میں تین کروڑ بچوں کی نسل کشی کی گئی ہے اس طرح امریکہ میں ہر بیس سیکنڈ کے بعد اسقاط حمل کی ایک واردات ہوتی ہے۔ اس حوالے سے لندن کے ایک رسالے نے انکشاف کیا کہ 1985ء میں کیلی فورنیا کے ایک لیبارٹری آپریٹر کے گھر سے سترہ ہزار جنین کے ڈھانچے بھی ملے۔ اسی جریدہ نے لکھا ہے کہ اپریل 1985ء میں کسٹم حکام نے فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد کے قریب چھاپا مار کر منجمد جنین سے بھرا ہوا ٹرک پکڑ لیا ان سے بیوٹی کریم بنائی جاتی تھی۔ (جنگ لاہور 7 مئی 1985ء)

مکافات عمل

خاندانی زندگی کی تباہی، اخلاقی جرائم کی کثرت، بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں پر ہمہ گیر ظلم وستم اور سب سے بڑھ کر خدا بیزاری اور مادیت پرستی نے امریکہ اور یورپ کے معاشروں کا سکون چھین لیا ہے حالانکہ وہاں دولت کی ریل پیل ہے اور دنیا جہاں کی سہولتیں وافر ہیں۔ مگر سچی مسرت اور حقیقی راحت عنقا ہو چکی ہے یہ معاشرے بے شمار رقم کے نفسیاتی اور عملی مسائل کا اس طرح شکار ہوتے جا رہے ہیں کہ ان سے نکلنے کی کوئی راہ انہیں سجھائی نہیں دے رہی۔ عالم اسلام اور خصوصاً اسلامی تحریکوں کے خلاف ان ملکوں کی لامتناہی سازشوں کے نتیجے میں اللہ نے ان کی دولت سے برکت چھین لی ہے اس سلسلے میں ذیل کی خبریں ملاحظہ ہوں:

ہر پانچ میں سے ایک امریکی پاگل ہے

امریکہ کے تمام بالغ مردوں اور عورتوں میں ہر پانچ افراد میں سے ایک پاگل ہے۔ ایک امریکی اخبار کے مطابق امریکی وفاقی حکومت کے ایک سروے میں یہ بات کہی گئی کہ ہر پانچ امریکیوں میں سے ایک کا دماغ خراب ہونے کے سائنسی ثبوت موجود ہیں۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈیرل اے ریگر نے کہا ہے کہ عمومی طور پر تو ذہنی مریضوں میں عورتوں اور مردوں کی تعداد برابر ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ ڈپریشن، فوبیا اور رنجیدگی جیسی بیماریوں میں مبتلا زیادہ تعداد عورتوں کی ہے جب مردوں میں سماج دشمن ادویہ اور نشہ خوری جیسے امراض عام ہیں۔

ان سروے میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں مرد و عورت فکر مند اور پریشان رہتے ہیں۔ امریکیوں کے ذہن پر زیادہ اشیاء، دولت اور تحفظات حاصل کرنے کا جنون سوار رہتا ہے اور اس جنون میں ہر شخص مقابلے میں جتا ہوا اندھا دھند دوڑتا جا رہا ہے۔ کسی کو کسی پر اعتبار نہیں، کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا اور نفسا نفسی کے عالم میں جتنی زیادہ رفتار اس لالچ کی دوڑ میں اختیار کی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ بداعتمادی پیدا ہوتی ہے ہر کوئی دوسرے سے خوف زدہ ہے اور "محبت" کا مطلب وہاں سودے بازی یا پھر "برابر کا سودا" ہے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے جدید ماہرین نفسیات نے لکھا ہے کہ پرانی نفسیات یہ سمجھتی تھی کہ ایسے ذہن ان لوگوں کے ہوتے ہیں۔ جن کے گھریلو ماحول نے ان پر غلط اثر ڈالے ہوں لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ گھریلو ماحول بھی سماجی حالات سے متاثر ہو کر ہی بنتا ہے۔ لہٰذا امریکیوں کے پاگل پن کی اور پریشانیوں کی وجہ امریکہ کا دولت پرست معاشرہ اور "پریگماٹزم" کا فلسفہ ہے جس پر ہر شخص عمل کرتا ہے اور عملی مفادات کو ہی سب سے بڑی سچائی سمجھتا ہے۔ (جنگ لاہور 12 اکتوبر 1984ء)

ایک دوسری خبر کے مطابق ساڑھے چار کروڑ امریکی دماغ امراض میں مبتلا ہیں۔ (خبریں 93-5-5) اور یو ایس نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق امریکی ہسپتالوں کے ایک چوتھائی بستر شیزوفرینیا کے مریضوں کے لئے مختص ہیں جن پر امریکی حکومت 129 بلین ڈالر کی رقم خرچ کرتی ہے۔ ان

مریضوں کی وجہ سے پولیس جن مسائل سے دوچار ہوتی ہے۔ اس پر مزید 29 بلین ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔(''پاکستان'' جمعہ ایڈیشن 10 جولائی 1992ء)

مغرب اور خودکشی

انہی ذہنی امراض، غیر معمولی ڈپریشن اور مایوسی وقنوطیت کا نتیجہ ہے کہ امریکہ کی خاصی بڑی آبادی زندگی سے بیزار ہوگئی ہے اور آخری چارہ کار کے طور پر خودکشی ہی کو سارے دکھوں کا علاج سمجھتی ہے۔ چنانچہ 1985ء کے اعداد وشمار کے مطابق ہر دومنٹ کے بعد ایک امریکی خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ اور ہر گھنٹے کے بعد ایک کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس طرح تیرہ سے لے کر تیس سال کی عمر میں ہر سال پانچ ہزار امریکی نوجوان اپنے ہاتھوں زندگی جیسی قیمتی متاع کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

1950ء کے مقابلے میں امریکہ میں خودکشی کی شرح تین گنا ہو چکی ہے اور ماہرین کے لئے یہ مسئلہ انتہائی پریشان کن ہے کہ دنیا کے امیر ترین ملک میں پیدا ہونے والے نوجوان اس قدر مایوس اور پریشان کیوں ہیں کہ وہ موت ہی میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔(''جنگ'' 29 مارچ 1985ء)

برطانیہ میں بھی صورت حال کم وبیش ایسی ہی ہے جہاں روزانہ کم از کم 83 افراد خودکشی کر لیتے ہیں اور ہر اڑھائی منٹ بعد ایک آدمی خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔(جنگ 16 مارچ 1985ء)

امریکہ میں خودکشی کا چلن اس قدر عام ہے کہ وہاں ایک شخص ڈیرک ہمفری نے ''خودکشی کے آسان طریقے'' کے عنوان سے کتاب لکھی جو وہاں ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور چند ہی دنوں میں اس کی 41 ہزار جلدیں فروخت ہوگئیں۔(روزنامہ ''پاکستان'' 8 اگست 91ء)

روس سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق وہاں بھی خودکشی کا تناسب روز افزوں ہے اور صرف قفقاز کے روسی علاقے میں سالانہ دس لاکھ افراد خودکشی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں ساٹھ ہزار افراد کامیاب ہو جاتے ہیں جب کہ شمالی قفقاز کے علاقے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خودکشی کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔(دعوت، دہلی 10 نومبر 1992ء)

جاپان ایشیاء کا خوشحال ترین ملک ہے اس کی صنعتی ترقی اور مادی خوشحالی پر مشرق ومغرب کی ساری دنیا رشک کرتی ہے مگر قارئین کے لئے یہ حقیقت حیران کن ہوگی کہ اس انتہائی ترقی یافتہ ملک میں جہاں خواندگی کا تناسب سو فیصد ہے وہاں خودکشی کی شرح بے پناہ ہے ایک سعودی اخبار کے مطابق 1983ء میں 25204 جاپانیوں نے خودکشی کی جن میں 17118 مرد اور 8086 عورتیں تھیں۔(''جنگ''، 20 اگست 1984ء)

اور خودکشی کا ایک بڑا سبب وہ جسمانی بیماریاں بھی ہیں جو شراب نوشی، بدکاری اور خصوصاً ہم جنس پرستی کے نتیجے میں ایک وبا کی طرح مغربی معاشرے کا مقدر بنتی جا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ایڈز شمالی امریکہ میں خدائی عذاب کی طرح جاری وساری ہے امریکہ اس کے علاج پر ہر سال چار ارب 30 کروڑ ڈالر خرچ کر رہا ہے۔

(جنگ 14 دسمبر 1992ء)

برازیل میں یہ وبا اس قدر عام ہے کہ روزانہ چار افراد ایڈز کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ (''نوائے وقت'' 14 دسمبر 1992ء)

برطانیہ میں بھی یہ بیماری تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے اور وہاں کا معاشرہ اس سے لرزاں و ترساں ہے'' (جنگ 24 فروری 85ء)

کینیڈا کے ایک گورے نے اپنی بیوی کو قتل کیا۔ اسے پکایا اور مزے لے لے کر اس کا گوشت کھاتا رہا۔

مسقط سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے ''ٹائمز آف عمان'' 31 مئی 1998ء، نے بتایا کہ کینیڈا کے ایک شخص نے اپنی بیوی کو قتل کیا پھر اس کو پکانے کے بعد اس کے جسم کے مختلف حصے کھاتا رہا۔ اس کا مقدمہ جب عدالت میں پیش ہوا تو جسٹس بنجمن ہیواک نے حکم دیا کہ 32 سالہ مجرم ایرک رائیڈ کا نفسیاتی علاج کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے قتل کا ارتکاب کیا لیکن اس کو سزا نہیں دے سکتے کیونکہ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ عدالت نے یہ بات بھی تسلیم کر لی کہ مجرم نے اپنی بیوی کو گلے سے زور زور سے بار بار دبا کر قتل کیا پھر اس نے اس کی لاش کو تین دن تک پانی کے ٹب میں رکھا۔ پھر اس کے ٹکڑے کئے انہیں پکایا باقیماندہ کو فریج میں محفوظ کر دیا۔

ظلم تو یہ ہے کہ ظالم نفسیاتی مریض بن جاتا ہے چنانچہ اس وقت امریکہ اور یورپ ایسے نفسیاتی مریضوں کی زد میں ہے لیکن اگر ایسے مریضوں کو سزا ملنا شروع ہو جائے تو دیکھنا یہ نام نہاد نفسیاتی مریض کیسے ختم ہوتے ہیں۔ بہر حال اس رخ سے بھی دیکھیں مغربی تہذیب درندوں سے بھی بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ (الدعوۃ اگست 98ء)

امریکہ کو کس تہذیب و تمدن پہ ناز ہے؟

امریکہ کو آخر کس چیز پر ناز ہے؟ موجودہ حیوانی مغربی تہذیب پر جو قدیم یونانی اور رومی وحشیانہ تہذیبوں کا امتزاج ہے۔ اس تہذیب کا راوج کمال کیا ہے۔ ایٹم بم، نیوٹران بم اور جراثیمی ہتھیار، کیا امریکہ پاکستان کو بھی عراق کی طرح جراثیمی ہتھیاروں کے استعمال سے ڈرا کر خائف کرنا چاہتا ہے؟ انکل سام کر لے یہ پورا شوق بھی...... آخر امریکہ کس بات پر اتراتا، اینٹھتا، براتا، بوراتا اور بولاتا پھر رہا ہے؟ اس کو کس شے پر فخر ہے؟ کس برتے پر یہ پتا پانی...... 20 لاکھ سالانہ حرامی بچوں پر، سالانہ 25 لاکھ بن بیاہی ماؤں پر، سالانہ پندرہ لاکھ مطلقہ عورتوں پر، ہائی اسکولوں کی 86 فیصد ٹین ایجر حاملہ طالبات پر، ہیروشیما کے ویرانوں پر، ناگاساکی کے کھنڈرات پر، ویٹو کے امتیازی حق پر، عراق میں سویلین آبادی کو بطور جنگ فاقوں میں مبتلا کرنے پر، ویت ناموں کے اجتماعی قتل عام پر، کمزور ملکوں کی بحری اور معاشی ناکہ بندی کرنے پر، لاکھوں شیر خوار بچوں کے منہ سے فیڈر چھین لینے پر، ماؤں کے پیٹوں میں پلنے والے معصوم بے گناہ بچوں کے خلاف بیالوجیکل وار شروع کرنے پر...... چلی میں رات کے سناٹے میں بندوقوں کی چھاؤں تلے جمہوریت کی دیوی کی پرورش پر...... کوریا اور ویت نام کی

جنگوں میں اپنے چھ لاکھ فوجیوں کو ہلاک کروانے پر اور 2 لاکھ کو لنگڑا لولا کروانے پر...... لاس اینجلس میں 75 ہزار اور کیلے فورنیا میں 5 لاکھ شہریوں کی اجتماعی خودکشی پر...... اگر یہی تمدن ہے، یہی تہذیب ہے اور یہی جمہوریت ہے...... اگر یہ سائنسی ترقی ہے، یہی ثقافتی عروج ہے، یہی تکنیکی مہارت ہے اور یہی جمہوریت ہے...... اگر یہ تمدن ہے تو ہم اس تمدن پر تھوکتے ہیں اگر یہ تہذیب ہے تو اس انسانیت کش اور بے غیرت تہذیب کو ہم جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ اگر یہ ثقافت ہے تو ہم اس ننگی ثقافت پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اگر یہ ترقی ہے تو ہم پسماندہ ہی بھلے، اگر یہ جمہوریت ہے تو تف ہے اس جمہوریت پر، اگر یہ روشن خیالی ہے تو ہماری تاریک خیالی پر ایسی کروڑوں روشن خیالیاں نثار، اگر یہی تکنیکی مہارت ہے تو نہیں چاہئے ہمیں یہ تکنیکی مہارت...... نہیں چاہئے ہمیں یہ علم، یہ سائنسی ترقی، یہ آمریت پرور جمہوریت، یہ گندی تہذیب، یہ ننگی ثقافت، یہ اندھی روشن خیالی، یہ بے لگام تمدن، اٹھا کر لے جاؤ اپنے گندے انڈوں کو۔

(از حافظ شفیق الرحمٰن صاحب بحوالہ روزنامہ دن، لاہور 14 اگست 1998ء)

(بحوالہ: رواداری اور مغرب) (محمد صدیق شاہ بخاری)

صنف لطیف

مبصرین کی آراء:

اگر شباب راس الحیات بلکہ روح رواں زندگی ہے تو اس کے لیے لذائذ بھی گونا گوں فطرت نے وضع کیے ہیں۔عورتوں اور اولاد کی محبت سے انسان کی زینت ہے۔ یہ بات بالکل فطرت کے موافق اور احکام الٰہی کے مطابق ہے۔قدرت کا انتظام ہے کہ اس نے عورت کے ہر جز میں نزاکت اور دلکشی پیدا کی ہے۔صنف نازک اور مردوں میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔عورتوں کے دست و بازو بھرے بھرے مقابلتاً نازک ہاتھ پاؤں، دل شکن نگاہیں، برق پاش تبسم، اعضاء کا تناسب خوبصورت خدوخال، خوش لحن آواز، نزاکت رفتار، دلفریب گفتار، تمام باتیں، محبوبیت کی شان لیے ہوئے نظر آتی ہیں۔اس بیش بہا ہدیہ کو اگر فطرت کی فیاضی نہ کہیں یا بہار فطرت سے اس کو موسوم نہ کریں تو یہ کفران نعمت اور بڑی ناشکر گزاری ہے۔

عورت دنیا میں کیوں آئی؟ اس مسئلہ کے حل پر شائستہ دماغ مدت سے متوجہ ہیں۔اس کا جواب یہ ہے۔کہ عورت محبت کی چیز ہے، وہ دنیا میں صرف محبت کے لیے آئی ہے، عورت محبت پر جان دیتی ہے، عورت بہترین عطیہ فطرت ہے اور اس میں کالی گوری کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔عورت زندگی کے صحیفہ کی تفسیر ہے۔وہ دنیا میں اس لیے آئی ہے کہ بقائے نسل انسانی کو قائم رکھ کر ویرانہ دنیا کو چمنستان خوش بہار بنائے رکھے۔

عورت ایک سرور محبت، ایک آبگینہ الفت، ایک پیکر سعادت، ایک سرتاسر معصومیت ہے۔عورت کیا ہے۔ دنیا کے بنی نوع انسان کی ماں ہے۔

زندگی کی رزم اور بزم میں اور مکانوں کے تاریک کمروں کی ایک رونق ہے۔عورت رحم دلی اور نرم مزاجی کا ایک مجسمہ اور صبر و شکر کی زندہ تصویر ہے۔ حسن سیرت اور حسن صورت کا لہریں مارتا ایسا دریا ہے جس کی روانی میں کبھی کمی نہیں آتی۔مختصر یہ کہ عورت دیباچہ کائنات ہے۔

عورت گھر کی ملکہ ہے، نیک دل حاکم ہے، اطاعت شعار محکوم ہے، غم گسار شریک زندگی ہے، عورت بچوں کی ماں ہے۔جس کی آغوش شفقت اپنے بچوں کے لیے ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ یہ صرف عورت ہی ہے جو جوانی کی راحت اور بڑھاپے کی وفادار رفیق ہوتی ہے صرف عورت ہی بیماری کے دوران میں شریف ترین تیماردار اور مصیبت میں سچی وفادار اور غم گسار اور چارہ ساز ثابت ہوتی ہے۔

عورت کی شان

عورت نے کائنات کے سب سے پہلے انسان کو اپنے وجود سے تسکین دی۔اس کی تنہائی کی وحشت دور کر

دی۔اس کی اولاد کی حاملہ بن کر رونقِ دنیا کا باعث بنی۔عورت نے اپنے بطن سے ایسے نامور فاتح دیوتا، اوتار، پیغمبر، نبی، ولی، غوث وقطب، ابدال، عالم وفاضل پیدا کیے جن پر کائنات اور اقوام عالم کو ناز ہے۔سچ تو یہ ہے کہ عورت نے اپنے وجود اور اپنے حیرت انگیز کارناموں سے اس کارزارِ ہستی کو چار چاند لگائے۔

سب سے بڑی نعمت

انگلستان کے مشہور فلاسفر لوتھر نے عورت کی یہ تعریف کی کہ "سب سے بڑی نعمت جو انسان کو اس دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو نیک اور پارسا بیوی ملے جس کے ساتھ مرد امن وچین کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔"

عورت حسن قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس کا تعلق نسل انسانی کے کسی مخصوص طبقہ سے نہیں۔عورت اپنے خاوند کی رفیق، بہترین شریک زندگی ہے۔اپنے بچوں کی شفیق ترین ماں ہے۔اپنے پڑوسیوں کی ہمدرد اور سچ تو یہ ہے کہ عورت کی تربیت سے قوموں کا انقلاب وابستہ ہے۔

تربیت

عورت کی تربیت کا کام بڑا مشکل ہے۔عورت کی تربیت پر نظام عالم کا اگر انحصار نہیں ہے تو اس کی تربیت پر اقوام عالم کی ترقی کا دارومدار ضرور ہے۔اگر اسکی تربیت عمدہ پیمانہ پر کی گئی تو ملک وملت کے لیے کارآمد ثابت ہو گی۔ورنہ عورت کی تربیت کا نقص اقوام اور ملکوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔کیونکہ بچپن میں عورت کی تربیت اگر اچھی نہ ہوگی اور وہ فرماں بردار اولاد اطاعت شعار بیوی، شفیق ماں، اور شریف شہری کیونکر بن سکے گی۔اس کی آغوش سے ایسی تربیت یافتہ اولاد پیدا ہوگی جس کا اثر آئندہ نسلوں کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔اس لیے عورتوں کی تربیت پر بہت زیادہ زور دیا جائے کیونکہ جو آج لڑکیاں ہیں وہ کل مائیں ہوں گی اور ان کی آغوش میں قوم کے نونہال پروان چڑھیں گے۔

علم نوعی

ایک ایسا علم ہے جس میں انسان کی پیدائش اس کی وجہ پیدائش اور اس کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما اور شادی اور اولاد وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے۔اس کے تمام بیان میں نسل انسانی کا علم سب سے زیادہ قیمتی اور اہم معلومات کا خزانہ ہے جس کا تعلق انسانی نسل کی بقا سے ہے۔یورپ اور امریکہ میں اس مفید ترین علم پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں کیونکہ مغربی ممالک کے باشندے اس علم سے واقفیت رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔مگر ہندوستان میں اس علم پر کوئی توجہ نہیں دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے نوجوانوں میں قسم قسم کے امراض پیدا ہو گئے ہیں۔کمزور بچے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی شرح اموات خطرناک طریقے سے بڑھ رہی ہے۔جوانی کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کا پیغام آجاتا ہے۔شباب کے زمانہ میں نوجوانوں کی آنکھیں اتری ہوئی، رخسار پچکے ہوئے، چہرہ رنگ زرد اور جسمانی کمزوری دور کرنے کے لیے رات دن ڈاکٹر اور اطباء کی خوشامدوں میں سرگرداں پھرتے ہیں۔اگر کچھ

لکھنا پڑھنا آتا ہے تو اخباری اشتہارات کی ''تیر بہدف اور سنیاسی مجربات'' ادویات کا شکار بن کر رہی سہی کسر پوری کر لیتے ہیں۔ علم نوعی اور علم الازدواج پر ہندوستان میں اگر کچھ شائع ہوا بھی ہے تو بقول جناب سید عزیز حسن بھائی ''مدیر پیشوا لذت النساء اور پرانا کوک شاستر جیسی مخرب اخلاق اور ناممکن العمل سراپا لغو اور پرفریب کتابیں جن کا وجود ہی سراسر مشتبہ ہے اور جن کی بجائے فائدہ ہونے کے الٹی بیحد مضر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اس خیال سے بالکل متفق ہیں اور جناب بقائی صاحب کی رائے کی تائید کرتے ہیں۔

تناسب اعضاء

نظام قدرت ہی کی طرف سے صنف نازک کے حسن و جمال اور ان کے متناسب اعضاء میں مردوں کے واسطے ایک جذبہ بے اختیار کی کشش موجود ہے جو صرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے ایک خواہش دل میں پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ مرد کے تمام حواس ظاہری و باطنی ملکہ حسن کی مصاحبت سے لذت اندوز ہونا چاہتے ہیں جو عورت ہمہ صفت موصوف ہوگی اس میں تمام خوبیاں علیٰ درجہ بکمال پائی جائینگی۔ اگر عورت میں کسی قسم کا نقص ہوگا تو اس کے حسن اور جمال بھی ناقص ہوگا۔

چار

ماہرین علم نسواں اور تمام صاحبان علم اس بات پر متفق ہیں کہ صنف نازک کے چہرہ اور تمام بدن میں چار چیزیں قابل تحسین ہیں۔ یہی صاحب رجوع الشیخ کا خیال ہے۔ سیاہ بال، سیاہ پلکیں، سیاہ ابرو اور سیاہ مردم چشم۔

چار طرح کی سفیدی

رنگ سفید، آنکھوں کے ڈھیلوں کا سفید ہونا، سفید دانت، پنڈلیوں کی نکھری ہوئی سفید رنگت۔

چار دراز چیزیں

لانبی صراحی دار گردن، دراز قامت، لانبے گیسو، کھنچے ہوئے ابرو۔

چار چیزیں کشادہ

مستحسن ہیں کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، وسیع سینہ، گول چوڑا چہرہ۔

چار چیزیں چھوٹی

چار چھوٹی چیزیں اچھی ہوتی ہیں۔ غنچہ سا دہن، چھوٹے نتھنے، چھوٹے پاؤں اور چھوٹے چھوٹے نمود شباب کے آثار پر بہار۔

اہلِ عرب کا مذاق حسن

عرب میں عصام نام کی ایک عورت عورتوں کے حسن و جمال کے جانچنے میں بڑی ماہر، کامل اور پختہ اور صاحب اسرائے عورت تھی۔ وہ عرب کی ایک حسین ترین لڑکی کے حسن و جمال کا بیان ان الفاظ میں کرتی ہے:۔

''اس حسینہ کے سر کے بال گھوڑے کے لچھے دار دم کی مثل ہیں۔ وہ ان کو کھولتی ہے تو وہ انگور کے خوشے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی چمکدار پیشانی آئینہ کی طرح صاف شفاف اور سورج کی مانند چمکدار ہے۔ اس کے دونوں ابرو ایسے کمان کی طرح ہیں جیسے قدرت نے اپنے ہاتھ سے سیاہ خط کھینچ دیا ہو۔ اس کی سیاہ آنکھیں وحشی ہرنی کے مثل ہیں جن کو شکاری کا خوف نہ ہو۔ آنکھوں کی سفید موتی کے مانند اور آنکھوں کی سیاہی اندھیری رات کو مات کرتی ہے۔ ناک کیا ہے کہ گویا صیقل کی ہوئی تلوار ہے نہ کوتاہی نے اس کو بھدا کیا ہے نہ اس کے طول نے عیب دار بنایا ہے۔ دونوں رخسار بابونہ کے دو پھول ہیں اور ان کی صباحت موتی کو شرماتی ہے۔ دہن کو غنچہ نا شگفتہ کھویا انگشتری اس کا برق پاش تبسم دل کو کھینچ لیتا ہے اور اس کے دانت موتی کی طرح چمکتے ہیں۔ اس کا جسم اتنا خوشبودار ہے کہ جیسے صبح کے وقت باغ کے پھولوں کی نکہت سے مہکتا ہے۔ شیریں زبان، فصیح البیان، کامل العقل، حاضر جواب، تازہ مکھن کی طرح دونوں ہونٹ ہیں۔ اس کی بلند گردن چاندی کی صراحی کی گردن ہے۔

۔اس کے دونوں بازو صاف اور سڈول ہیں۔

اسکی دونوں کلائیاں چاندی کے دستے ہیں، وہ نرم انگلیوں میں سونے اور عقیق کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہیں سینہ پر نمود و شباب نے وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو انار کے پھل دار درخت میں نظر نہیں آ سکتی۔ ہاتھی دانت کے دو قمقمے ہیں۔ جن سے شب تاریک منور ہو سکتی ہے۔ اس کے پیٹ کی نرم شکن ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے قبطی ریشمی کپڑے کی ملائم تہہ، کمر کا کیا کہنا، اس کے وزنی اور پر گوشت

.رانیں گویا موتیوں کی جمی ہوئی تہیں ہیں سفید اور بھری ہوئی پنڈلیاں سبحان اللہ، اس نزاکت اور صغرسنی کے باوجود تمام جسم کا بوجھ دو نازک اور پتلے قدم اٹھائے ہوئے ہیں۔

خوش مزاجی اور شیریں زبانی

خوش مزاجی اور شیریں زبانی ایک خاص جوہر لطیف ہے۔ جو دشمنوں کو بھی رام کر کے دوست بنا دیتا ہے۔ اس کے برخلاف بدمزاج اور کلہ کار زبان دراز عورت کے نہایت قریبی اقرباء اور دوست بھی اس کی بدخوئی اور زبان درازی سے اس کے دشمن بن جاتے ہیں اور اس سے سخت نفرت کرنے لگتے ہیں۔

ایثار و قربانی

عورت کی ایک امتیازی صفت ایثار و قربانی ہے۔ عورت ایثار و قربانی کا مجسمہ ہے اور اسکی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ وہ شوہر کے لیے فنا ہو جائے۔ قدرت نے اس کے رگ و ریشہ میں یہ جذبہ پیوست کر دیا ہے کہ اگر والدین کی غلطی سے عورت کا یہ قدرتی وصف نمایاں نہ ہو سکے تو وہ عورت حقیقی معنوں میں شان انسانیت کی حامل نہیں بن سکتی۔ اگر خداوند کریم نے تمہیں ایک لڑکی کی زمام تربیت تفویض کر دی ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کو شروع ہی سے ایثار و قربانی کا سبق دو۔ اور اس کو بتاؤ کہ اگر دوسروں کے آرام دینے میں اسے تھوڑی سی تکلیف گوارہ کرنا

پڑے تو وہ کبیدہ خاطر نہ ہو۔ جو لڑکی اپنے والدین کی خدمت کرے گی اور اپنے بھائی بہنوں کو آرام پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہے گی وہی اپنے شوہر اور اس کے دوسرے عزیزوں کا حق رفاقت بھی ادا کرے گی کیونکہ اس خوش نصیب لڑکی میں یہ جذبہ پہلے ہی سے پوشیدہ ہو گا کہ جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچائے۔ اس لیے زندگی کے اس نئے دور میں اسے ہر طرح کی مسرتیں نصیب ہوں گی۔ اور شوہر کا گھر اس کے لیے حقیقی معنوں میں راحت کدہ بن جائے گا۔ ہر شخص اس کو آنکھوں پر بٹھائے گا۔

کفایت شعاری

عورت میں کفایت شعاری کی عادت بھی شروع سے پیدا کرنی چاہئے۔ ممکن ہے کہ ایک شفیق باپ کی نگاہ میں اس کی بیٹی کا اسراف یا چٹورپن کی عادت چنداں مذموم نہ ہو لیکن اسے سمجھ لینا چاہئے کہ ایک دن لڑکی نے بیاہ کر غیروں میں جانا ہے اور وہاں اس کی ایک ایک بات پر گہری نگاہیں پڑیں گی۔ صرف یہی نہیں کہ اس بری عادت پر سسرال والے انگلیاں اٹھائیں گے بلکہ اس کا اثر براہ راست خود عورت کی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ عورت کا یہ فرض ہے کہ اپنے شوہر کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کے پیسہ کو نہایت احتیاط کے ساتھ خرچ کرے۔ بیوی کو اپنے خاوند کی آمدنی کے لحاظ سے خرچ کرنا چاہئے کیونکہ خانہ داری کا بار مرد کے سر پر نہیں بلکہ عورت کے سر پر ہے۔ عقلمندی اور دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ عورت گھر کے مصارف اس طرح رکھے کہ خرچ کبھی بھی آمدنی سے نہ بڑھنے پائے جو اس کی آمدنی پر چور اسی کا خرچ کرتی ہے وہ کبھی اطمینان اور خوشی کی صورت نہیں دیکھ سکتی۔ اس لیے کہ اس کو افکار و پریشانیوں سے ہی فرصت نہ ملے گی اور اتفاقیہ ضروریات کے لیے ایک پیسہ بھی اس کے پاس پس انداز نہ ہو وہ جبھی خوش رہ سکتی ہے کہ اس کی آمد پر مہ خرچ کر کے دس بچائے۔

بحوالہ: رموز ازدواج

عورت جب اقتدار کے تاج تک پہنچی

اندرا گاندھی کے مشاہدات

بیوی، ماں اور سیاست دان

فیروز پارسی تھا اس سے شادی کر کے میں نے صدیوں پرانی رسم توڑی تھی۔ شادی دو مختلف قوموں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان ہوئی تھی۔ چنانچہ ہندوستان بھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر چہ اس طرح کی شادی اس طرح کا کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا اور مجھے بہت سے ایسے لوگوں کے خطوط ملے جنہوں نے ایسی مخلوط شادیاں کر رکھیں تھیں لیکن میں شاید عوامی شخصیت تھی۔ اس لیے لوگوں کی نظر میں یہ پہلا بڑا واقعہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگ جن میں میرے خاندان کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس واقعہ سے مضطرب ہوئے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شخصیت، جس کے بارے میں خود میرا اپنا اندازہ تھا کہ بہت سیخ پا ہوگی، یعنی میری نانی...... اس نے میری شادی کو کھلے دل سے قبول کر لیا۔

میری شادی کے فوراً بعد الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ میرے شوہر کے ذمہ اس پنڈال کی تعمیر تھی جہاں اجلاس منعقد ہونا تھا۔ میں کام کرنے والے رضا کاروں میں شامل تھی۔ چنانچہ ہمیں صبح سویرے گھر سے نکلنا پڑتا اور رات گئے واپس آتے۔ چونکہ ہمارے کام مختلف تھے۔ اس لئے سارا دن ہم ایک دوسرے کو مل نہ سکتے تھے۔

ہم نے ایک چھوٹا سا گھر لے لیا۔ چونکہ یہ کانگریس کے اجلاس کی جگہ کے قریب تھا۔ اس لیے آدھا مکان پارٹی کے دفتر کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ ہمارے استعمال میں صرف دو کمرے تھے۔ ان دنوں موسم گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے والد کولو وادی جا رہے تھے لیکن فیروز پارٹی کاؤنسل اور دیگر معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ اس لیے نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں والد کے ساتھ چلی گئی۔ کولو سے واپسی پر میں اور فیروز کشمیر روانہ ہو گئے۔ ہم شیخ عبداللہ کے مہمان تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم کشمیر کے مختلف مقامات کی سیر کریں۔ چنانچہ انتظامات مکمل ہونے پر ہم سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔

مئی 1942ء میں مہاتما گاندھی نے ''ہندوستان چھوڑو'' کا نعرہ لگایا جس کی گونج پورے ملک میں سنائی دینے لگی۔ 19 اگست کو گاندھی جی، میرے والد اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان کو گرفتار کر لیا گیا۔

اسی سال ستمبر میں مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ میں لال بہادر شاستری کے ماتحت کام کر رہی تھی۔ مسٹر شاستری فیروز اور بہت سے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں زیر زمین چلا جانا چاہئے۔ لیکن میں منظر عام پر رہی۔ میں لٹریچر اور فنڈز کے معاملات چلا رہی تھی۔ ایک ... اطلاع ملی کہ مجھے بھی گرفتار کیا جا رہا ہے۔ میں نے فیروز کو پیغام بھجوایا۔

وہ الہ آباد میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح آسانی سے گرفتاری دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم ایک جلسہ منعقدہ کرائے کیونکہ اس وقت صورتحال بالکل واضح ہے۔ ہمارے جلسے پر پابندی عائد کی گئی۔ ہم نے صرف جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ابھی مقام کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ ہم نے صرف یہ کہا تھا کہ فلاں شہر میں فلاں وقت جلسہ ہوگا۔ مقام کے بارے میں لوگوں میں زبانی تشہیر کا اہتمام کیا گیا۔ البتہ باقی امور کی اشاعت کردی گئی۔ میں خاموشی سے مذکورہ شہر پہنچی اور رات بسر کی جلسہ کے مقررہ وقت پر میں سامنے آئی۔ تو لوگوں کو پتہ چل گیا۔ لوگ دکانوں، سینما اور دیگر جگہوں پر منتشر حالت میں تھے۔ ٹھیک وقت پر سب جلسہ کے مقام پر جمع ہو گئے۔ برطانوی سپاہی شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گشت کر رہے تھے لیکن انہیں معلوم نہین تھا کہ اجتماع کس جگہ پر ہے۔ یہ جگہ ایک سینما کے ساتھ کھلا میدان تھا۔ میں اجتماع میں پہنچی اور تقریر شروع کی۔ جلد ہی فوج بندوقوں کا رخ ہماری طرف کیے وہاں پہنچ گئی۔ ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ ایک فوجی کی سنگین مجھے چبھ رہی تھی۔ فیروز سیڑھیوں پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ جذباتی ہوگیا۔ وہ بھول گیا کہ اس نے روپوشی اختیار کر رکھی ہے وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور سپاہیوں کو مخاطب ہو کر بولا ''گولی چلاؤ یا پھر یہاں سے دفع ہو جاؤ......''

ہم سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار ہونیوالوں میں فیروز اور میں دونوں شامل تھے۔ ایک سارجنٹ سے غلطی ہو گئی۔ جیل کی گاڑی میں بٹھانے کے لیے اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ اس کی یہ حرکت لوگوں کو ناگوار گزری، ہجوم بپھر گیا۔ میرا دوسرا بازو کانگریس کی ایک عورت نے پکڑ لیا اور مجھے گاڑی میں جانے سے روکنے کے لیے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ ایک طرف سارجنٹ کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف سے خواتین۔ مجھے لگا کہ میں کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاؤں گی۔ بہر حال میں محفوظ رہی۔ اگرچہ فائرنگ نہیں کی گئی تھی۔ لیکن رائفلوں کے بٹ مار مار کر لوگوں کو زخمی کر دیا گیا۔ گاڑی میں سوار جیل جاتے ہوئے راستے میں مجھے مختلف تجربہ ہوا۔ وین میں موجود پولیس والے میری گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور معافیاں مانگنے لگے۔ انہوں نے اپنی پگڑیاں میرے پاؤں میں رکھ دیں اور رونے لگے۔ ان کا استدلال تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی کے ہاتھوں میری گرفتاری پر مجبور تھے۔

میں نہیں سمجھتی کہ کسی ایک واقعہ سے کوئی فرد سیاستدان بن جاتے ہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ جس میں نت نئے تجربات ہر وقت آپ کی تربیت کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ جیل میں گزرے ہوئے دن میری زندگی کا اہم ترین حصہ ہیں۔

گرفتاری سے پہلے ایک اور واقعہ پیش آیا۔ 19 اگست کو کانگریس کے اس وقت کے صدر نے جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کرنا تھی۔ سبھی لوگ وہاں جا رہے تھے۔ کم از کم کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سبھی ارکان وہاں گئے۔ غالباً یہ کانگریس کا جھنڈا لہرانے کی باقاعدہ تقریب تھی۔ چنانچہ ہم سب لوگ وہاں پہنچے۔ وہاں آنسو گیس کا اندھادھند استعمال کیا گیا۔ مجھے پہلی بار آنسو گیس سے واسطہ پڑا تھا۔

قید میرے لیے ایک خاص قسم کا تجربہ رہی۔ ویسے تو بچپن ہی سے اپنے عزیزوں کے مقدمات اور والد سے

ملنے کے لیے جیل جاتی رہی تھی۔ لوگوں نے یہ تو سن رکھا ہے کہ میرے والدین جیل میں رہے ہیں لیکن یہ کسی کو اندازہ نہیں کہ میرے والد اور میری والدہ کے کتنے عزیز جیلوں میں رہے ہیں۔ دو درجن کے قریب افراد کے نام تو مجھے یاد ہیں لیکن بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے طویل عرصہ جیل میں گذارا لیکن میں ان کے نام نہیں جانتی۔ مجھے کسی اور خاندان کا علم نہیں جن کے اس قدر زیادہ افراد آزادی کی جدوجہد میں جیلوں میں رہے یا مشکلات کا سامنا کرتے رہے ہوں۔

جیل میں کسی قیدی سے ملنے جانا اور خود قیدی ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ جس نے جیل نہ کاٹی ہو اسے قید کی اذیت اور گھٹن کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آسکر وائلڈ نے لکھا "ہر دن ایک سال جس کے دن بہت طویل ہوتے ہیں۔" ہر آنے والا دن یکسانیت، تضحیک اور بغض میں پہاڑ ہوتا ہے۔ پیتھک لارنس کے لفظوں میں "قیدی کی زندگی کی اذیت ناک حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اسے ایک کمتر انسان سمجھا جاتا ہے۔"

ہمیں مویشیوں کی طرح رکھا اور ہانکا جاتا تھا۔ پرائیویسی سے محروم تر کر دیا گیا۔ باہر کی خبروں اور وابستگیوں سے ہی نہیں۔ ہر طرح کی خوب صورتی اور رنگینی سے بھی خارج کر دیا گیا۔ زمین، دیواریں اور ہر وہ چیز جو ہمارے اردگرد تھی خاکستری رنگ کی تھی۔ یہی حال ہمارے جیل میں دھوئے گئے کپڑوں کا تھا۔ ہمار کھانا بہت بدذائقہ ہوتا تھا۔ اس میں کنکر اور ریزے ہوتے تھے۔ سلاخوں والے روزنوں سے ہم براہ راست لُو (گرم ہوا) کی زد پر ہوتے تھے۔ گرد آلود طوفان، آندھیاں اور پھر مون سون کی بوچھاڑیں ہمارا مزاج پوچھتی رہتی تھیں۔ اس کے بعد سردیاں آئیں تو ٹھنڈی یخ بستہ ہوائیں ہمارا مقدر تھیں۔ دوسرے قیدیوں کے لیے ہر ماہ دو ملاقاتیں اور ایک خط کی اجازت مل گئی لیکن ہم اس سے محروم تھیں۔ میں اپنے آپ کو مطالعے اور تدریس میں مصروف رکھ کر خوش رہی۔ میں نے ایک بچے کی دیکھ بھال کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لیں جس کی ماں بہت جلد رہائی پانے والی تھی۔ میری کوشش تھی کہ وہ رہا ہونے سے پہلے اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکے۔ اس لیے میں اسے ہنر سکھا رہی تھی۔

جیل سے باہر کی دنیا میں میرے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ کیونکہ باہر کوئی ایسی شخصیت یا عزیز نہ تھا جس کے لیے رہائی کی تڑپ شدید ہو سکے۔ اس کے برعکس ہم ذہنی طور پر خود کو سات برس کی قید کے لیے تیار کر چکے تھے۔ میں ہر مشکل، مصیبت اور بے عزتی برداشت کرنے کے لیے پرعزم تھی۔ ایک دفعہ عوام کے اصرار پر یوپی کے گورنر نے سول سرجن کو جیل میں میرے علاج کے لیے بھیجا۔ اس نے میری بیماری کے پیش نظر میرے لیے ایک ٹانک اور خصوصی غذا تجویز کی جس میں اوولٹین شامل تھی۔ لیکن سول سرجن کے جاتے ہی بلکہ وہ ابھی واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ نے تشخیص والا کاغذ پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اسے فرش پر پھینک کر بولا اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ چیزیں مہیا کی جائیں گی تو یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔

میرے لئے یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ نہ تو میں نے کسی چیز کی خواہش کی تھی اور نہ سول سرجن کا دورہ

میری توقع یا خواہش کے مطابق تھا۔

ایک رات ہم ایک خوف ناک چیخ سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ہماری سب سے بدتمیز اور ظالم وارڈن خوف اور دہشت سے لرز رہی تھی۔ ہماری کوٹھڑی کی سلاخوں والے دروازے سے ایک گز کے فاصلہ پر بہت بڑا کوبرا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ زہرہ کی تمام تر خباثتوں کے باوجود اس وقت ہمیں اس پر بہت رحم آیا۔ زہرہ کو خود اپنے ڈسے جانے کے علاوہ یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر سانپ نے کسی قیدی کو ڈس لیا تو اس کی نوکری جاتی رہے گی۔ سانپ اسی کلاک کے نیچے مزے سے بیٹھا تھا جسے وارڈن ہر راؤنڈ کے بعد نیچے کرتی تھی۔ زہرہ کی خوف زدہ چیخیں منت سماجت، دھونس، اشتعال، دیوار کے باہر ڈیوٹی پر موجود بے نیاز سنتری کو کسی کاروائی پر آمادہ نہیں کر رہے تھے۔ سنتری بڑے اطمینان سے کبھی سانپ کی لمبائی، کبھی چوڑائی، کبھی پوچھتا کس جگہ ہے۔ اس طرح کے سوالات پر زہرہ جھلا گئی۔ وہ چیخ کر بولی "ارے کم بخت کیا میرے پاس درزی کا گز پڑا ہے آخر خدا خدا کر کے کہ اس کی سر سے دم تک لمبائی ماپ کر بتاؤں......؟

سنتری میٹرن کے گھر گیا جو تین فرلانگ دور تھا۔ میٹرن سپرنٹنڈنٹ کے گھر گیا۔ اسے جگا کر دفتر میں لایا گیا تا کہ وہ عورتوں کی بیرک سے چابیاں نکال سکے۔ جب تک یہ جلوس ہماری بیرک کے برآمدہ تک پہنچا ناگ دیوتا رینگتے ہوئے نہ جانے کہاں جا چکے تھے۔ اور ہم سب دوبارہ سو گئے۔

ایک دن ہم بڑی مشکل سے جل کر مرنے سے بچے۔ جنگ کے دن تھے اور کنٹونمنٹ برطانویوں کے علاوہ امریکیوں اور کینیڈین سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کینیڈین ہماری جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی خوبصورت بیٹی پر فریفتہ تھا۔ ایک روز وہ اپنے معمول کے مطابق محبوبہ کے گھر کے اوپر نیچی پرواز میں مصروف تھا کہ جہاز کا ایک پر ٹیلی گراف تار سے ٹکرا گیا اور پھٹ کر شعلوں میں تبدیل ہو گیا۔ ہم نے تیزی سے جیل کے اوپر گرتے ہوئے دیکھا لیکن خوش قسمتی سے وہ جیل کی عمارت کو چھوڑتا ہوا ساتھ ہی واقع ایک زیر تعمیر بنگلہ پر جا گرا۔

وقت جیسا بھی ہو گزر جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا میری غیر متوقع رہائی تاریک راستے میں سے اچانک روشن مقام پر آ نکلنے کے مترادف تھی۔ باہر آ کر میں زندگی کی بھیڑ بھاڑ سے گھبرا گئی۔ میرے اردگرد مسائل اور الجھنیں تھیں۔ مجھے پھر سے زندگی کی رفتار کے ساتھ چلنے میں تھوڑا سا وقت ضرور لگا۔

1944ء میں میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ میرے والد اس کا کوئی اچھا سا نام رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں ناموں کی ایک فہرست بھیجی۔ اسی طرح انہوں نے بھی ایک فہرست بھیجی۔ میری ایک سہیلی نے بھی کچھ نام تجویز کیے جن میں راجیو بھی شامل تھا۔ تب تک میں نے کسی کا نام راجیو نہیں سنا تھا۔ راجیو کے معنی ہیں کنول کا پھول۔ میری والدہ کے نام کا مطلب بھی کنول ہے۔ میرے بیٹے کا پورا نام راجیو رتنا ہے۔ رتن کا مطلب بھی وہی ہوتا ہے جو جواہر کا ہے۔ یوں یہ نام میرے والد اور والدہ کے ناموں کا امتزاج ہے۔

میری شادی کی ایک وجہ میری بچوں کی خواہش بھی تھی، لیکن اس ضمن میں کچھ عرصہ میرے لیے پریشانی بھی

رہی۔ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ ایام حمل کے دوران میں زندگی سے ہاتھ دھو سکتی ہوں۔بد قسمتی سے اس نے یہ بات لکھ کر دے دی تھی۔چنانچہ میں جب امید سے ہوئی تو بہت سے خدشات نے ہمیں گھیر لیا۔الہ آباد میں ڈاکٹر نے میرا کیس لینے سے انکار کر دیا۔کیونکہ وہ بھی ہماری ملنے والی تھی۔یہی وجہ ہے کہ میں بمبئی چلی گئی۔اور وہاں اپنی پھوپھی کے پاس رہی۔وہاں میرے ہاں راجیو پیدا ہوا۔ایک مکمل اور صحت مند بچہ۔خود میں بھی صحت مند اور ہر طرح ٹھیک رہی۔نہ تو زچگی کی کوئی تکلیف ہوئی اور نہ کوئی دوسرا مسئلہ کھڑا ہوا۔

یہ لمحات میری لیے زندگی کے خوبصورت اور پرمسرت تھے۔تاہم ایک بات ہے کہ اس وقت راجیو زیادہ خوبصورت نہیں تھا۔ٹیگور نے لکھا ہے کہ "ہر آنے والا بچہ اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی بنی نوع انسانی سے مایوس نہیں ہوا۔"

ایک عورت کے لیے ماں بننا اس کی عظیم ترین تکمیل ہوتی ہے۔ایک نئی ہستی کو دنیا میں لانا اس کے ننھے منھے ہاتھ پاؤں کو دیکھ کر اس کے اعلیٰ مستقبل کے خواب دیکھنا زندگی کے تمام تجربات سے بڑا اور کیف آور تجربہ ہے۔ اس سے انسان حیرت اور سرفرازی سے لبریز ہو جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک روز پولیس میرے والد اور گوبند ولبھ پنت کو احمد نگر سے المورہ یا بریلی جیل کے لیے لائی۔ وہ نینی جیل الہ آباد میں رکے۔انہیں ایک رات وہیں رہنا تھا۔مجھے پیغام ملا۔ہمیں صحیح طور پر علم نہیں تھا کہ وہ یہاں ٹھہریں گے یا نہیں۔لیکن ہمیں امید تھی کہ رکیں گے۔توقع یہی تھی کہ انہیں کسی مضافاتی اسٹیشن پر اتار لیا جائے گا۔اس بات کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میرے والد کو واقعی نینی جیل میں لایا جائے گا یا صرف گارڈ تبدیل کی جائے گی۔بہر حال میں اور فیروز انہیں بچہ دکھانے کے لیے ساتھ لے گئے۔

ہم جیل میں پہنچے اور باہر انتظار کرنے لگے۔وہ رات گئے وہاں پہنچے۔کیونکہ برطانوی تاریکی میں کام کرنے کے عادی ہیں۔میں نے بچے کو اوپر اٹھایا تاکہ میرے والد اسے سڑک پر آویزاں مدھم روشنی میں دیکھ سکیں۔ میرے والد نے اسے بڑی محبت اور احترام سے دیکھا۔

نواسے نواسیاں یا پوتے پوتیاں...... شاید کسی بھی فرد کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔چونکہ آپ اس مرحلہ سے گذر چکے ہوتے ہیں اس لیے بچوں کے بچوں کے لیے آپ کی محبت دوگنا ہو جاتی ہے۔میرا خیال ہے کہ میں اپنے بچوں کے بچوں کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتی۔حالانکہ مجھے ان کے ساتھ کھیلنا،سکول کے کام میں ان کی مدد کرنا اور اسی طرح کے معمولات پسند ہیں۔یوں ایک دادی کا کردار جو میں اپنے حالات کی وجہ سے پوری طرح ادا نہیں کر پا رہی،میرے نزدیک تسکین بخش ہوتا ہے۔

1945ء میں میرے والد رہا کر دیئے گئے۔برطانیہ سے کیبنٹ مشن،ہندوستان آ چکا تھا۔مسٹر جناح ایک خود مختار پاکستان کے لیے پرعزم تھے۔اور کانگریس برصغیر کو متحد رکھنے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ان دنوں میں صرف ایک بیوی اور ایک ماں تھی۔سیاسی معاملات میں میرا عمل دخل کچھ زیادہ نہیں تھا۔جب میرے والد رہا ہو

گئے تو فیروز الہ آباد میں اور میں سرینگر میں تھی۔ وہاں میں اپنے چچا (بی کے نہرو کے والد) کے پاس مقیم تھی۔ وہ مہاراجہ کشمیر کے مالی مشیر تھے۔

سارے گھر والے مہاراجہ کی سالانہ ضیافت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے ریڈیو پر سنا کہ میرے والد اور دیگر رہنماؤں کو رہا کیا جا رہا ہے۔ میں جلدی سے ٹرین یا بس کے ذریعے الہ آباد کی بکنگ چاہتی تھی۔ اس لمحے بچے کو بھول گئی۔ جب گھر کے لوگ ضیافت سے واپس آئے تو میرے ارادے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ پریشان تھے کہ وہ کس طرح اچانک میرے سفر کے لیے کچھ کریں۔ میں نے کہا...... مجھے کچھ معلوم نہیں میں ابھی جاؤں گی۔

میں بچے کو چھوڑ کر روانہ ہو گئی۔ گھر میں بہت سے عزیز اور ایک چچا تھے جو ڈاکٹر تھے۔ راجیو کو ان سب کے سپرد کر کے میں الہ آباد چلی گئی۔

میرے والد بمبئی جا رہے تھے جہاں ایک میٹنگ تھی۔ میں بھی ان کے ہمراہ ہو گئی۔ مون سون کی شدید بارشوں کے باوجود وہاں جانا کسی وجہ سے بہت ضروری تھا۔ خراب موسم میں مجھے فلو ہو گیا۔ بخار اترنے تک میں واپس نہیں جا سکتی تھی۔ تندرست ہونے پر کشمیر لوٹ آئی۔ جلد ہی والد بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ وہاں ایک ماہ تک رہے۔ اس دوران مولانا ابوالکلام آزاد بھی وہاں آئے۔ (مولانا آزاد کانگریس میں ممتاز مسلمان رہنما تھے)

دھلی میں میرے والد کسی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اور مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں دہلی میں ان کے پاس آ جاؤں۔ حکومت کے ساتھ مذاکرات جاری تھے۔ یہ دور انتہائی دباؤ اور سیاسی خلفشار کا تھا۔ 1946ء میں میرے والد نے عبوری حکومت کی قیادت سنبھالی۔

دسمبر 1946ء میں میرے ہاں دوسرے بچے یعنی سنجے کی پیدائش ہوئی۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ لیڈی کرپس اور کئی دیگر شخصیات بھی موجود تھیں۔ میری خواہش تھی کہ بیٹی پیدا ہو۔ ہم نے لڑکیوں کے کئی نام بھی سوچ رکھے تھے۔ دوسرے بیٹے کا نام عجلت میں رکھا گیا۔

سیاسی جدوجہد کی وجہ سے میرا بچپن غیر معمولی رہا تھا جس میں تنہائی اور عدم تحفظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے بچوں کو پورا وقت دینا چاہتی تھی۔ ایک بچے کے لیے ماں کی محبت اور توجہ اتنی ہی بنیادی اور ضروری ہے جتنی کسی پودے کے لیے دھوپ اور پانی۔ کسی بھی ماں کے لیے سب سے پہلی ترجیح اس کے بچے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک مخصوص انداز میں ماں پر انحصار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری زندگی کا اصل مسئلہ یہی تھا کہ میں عوام کے لیے اپنی ذمہ داریوں اور گھر اور بچوں کے فرائض کے درمیان ہم آہنگی کیسے پیدا کروں۔

جب راجیو اور سنجے ابھی کم سن تھے۔ تو ان کی ضروریات کے لیے کسی آیا وغیرہ کا تصور میرے لیے ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ مجھ سے جو ہو سکتا تھا کرتی رہی۔ بعد میں جب وہ سکول جانے لگے تو میں نے اپنی مصروفیات ان کے سکول سے واپس آنے تک محدود کر لیں تاکہ بچوں کو واپسی پر میں فارغ ملوں۔ ایک دفعہ سنجے ابھی بہت چھوٹا

تھا تو اس کے ایک کلاس فیلو کی والدہ ہمارے گھر آئی۔ بچے کی ماں ایک سماجی خاتون تھی۔ وہ میرے عوامی کاموں پر تنقید کرنے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گذار رہی۔ سنجے کو یہ بات بری لگی اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی وہ دوڑتا ہوا میری مدد کے لیے آیا اور بولا...... میری ماں کو بہت سے اہم کام کرنا ہوتے ہیں اس کے باوجود وہ میرے ساتھ کھیلتی ہے۔ اور اس سے زیادہ وقت ہمیں دیتی ہے جتنا تم اپنے بیٹے کو دیتی ہو۔ اس کا اشارہ برج کھیلنے کی طرف تھا جس پر سنجے کا دوست ماں کی شکایت کیا کرتا تھا۔

بچے کے ساتھ گذارے جانے والے وقت کا عرصہ اتنا اہم نہیں جتنا وقت کا مناسب مصرف اور انداز ہے جس کسی کے پاس بچوں کے لیے کم وقت ہو تو اسے میسر وقت کا بہترین استعمال کرنا چاہیے تاکہ بچے مطمئن ہو سکیں۔ میں چاہے کتنی ہی دیر مصروف ہوتی، کتنی ہی تھکی ہوئی ہوتی یا چاہے بیماری ہوتی میں نے کبھی بھی بچوں کے ساتھ کھیلنے اور پڑھنے سے گریز نہیں کیا۔

بچوں کی تربیت مثال کے ساتھ ہونا چاہئے۔ بچے غیر معمولی طور پر معمولی چیزوں کو سمجھتے اور آپ کا احترام کرتے ہیں۔ تو وہ چھوٹی سی عمر میں بھی آپ سے تعاون کریں گے۔ میرا بڑا بیٹا راجیو بہت ہنس مکھ اور خوش باش قسم کا بچہ تھا۔ لیکن تین سال کی عمر میں جب اس کا چھوٹا بھائی سنجے پیدا ہوا تو ہمیں الٰہ آباد چھوڑنا پڑا۔ چھوٹے بچے کی موجودگی اور مانوس ماحول سے محرومی جیسی تبدیلیوں نے اسے الجھا دیا۔ خود میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ راجیو کی جھلاہٹ مجھے برہم کر دیتی۔ اسے جھڑکنا مزید خراب کر دیتا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اسے ذہنی طور پر مطمئن کیا جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مجھے اتنے عزیز ہو کہ تمہارا چیخنا اور رونا پریشان کر دیتا ہے۔

وہ بولا...... ''میں کیا کروں میں رونا نہیں چاہتا لیکن یہ خود بخود ہی ہو جاتا ہے''۔

میں نے کہا...... ''ہمارے باغ میں ایک خوبصورت چشمہ ہے۔ جب تم رونا چاہو تو وہاں چلے جایا کرو۔''

اس کے بعد جب بھی اس کے رونے کے آثار نمودار ہوتے میں سرگوشی کرتی...... چشمہ...... اور وہ فوراً وہاں چلا جاتا۔ باغ میں بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو بچے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ اس طرح راجیو بھی وہاں جا کر اپنی تکلیف بھول جاتا۔

جب بچے اتنے بڑے ہو گئے کہ وہ اسکول کے بورڈنگ میں رہنے لگے تو میں نے پارٹی کے کام کے لیے دوسرے شہروں میں جانا شروع کر دیا۔ جب وہ گھر نہ ہوتے تو میں دور دراز کے سفر بھی کر لیا کرتی۔ لیکن چھٹیوں کے دنوں میں میں انہیں خوب وقت دیتی۔ جب میں بچوں سے دور ہوتی تو انہیں ہفتہ میں ایک یا دو خط ضرور لکھتی تاکہ وہ مطمئن رہیں کہ ماں انہیں بھلائے ہوئے نہیں۔

زندگی غموں اور خوشیوں کا مجموعہ ہے۔ تعلیم کا وسیع ترین مفہوم یہ ہے کہ جسم اور ذہن دونوں کی تربیت ہو اور ایسی متوازن شخصیت تشکیل پائے جو ہر طرح کے حالات میں خود کو سنبھال سکے۔ اور زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کے ساتھ آسانی سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو۔ یہ محض سکول کی پڑھائی اور

کتابوں کے علم سے ممکن نہیں۔اس کا انحصار زیادہ تر ماں کے رویے اور تربیت پر ہے۔ماں کا فرض ہے کہ وہ بچے میں خود نظمی اور کردار کی مضبوطی پیدا کرنے میں مدد کرے۔حقیقی محبت یہ نہیں کہ بچے کی ہر جائز نا جائز خواہش پوری کی جاتی رہے بلکہ یہ ہے کہ اسے منظم ہونا اور ضرورت کے مطابق حالات کو سمجھنا سکھایا جائے۔

بارہ سال کی عمر میں راجیو کو ایک آپریشن کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔سرجن اسے بہلانے کے لیے کہنے لگا کہ اس اقدام سے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔لیکن میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ اس طرح بچے کی ذہانت کی توہین ہوتی ہے۔چنانچہ میں نے سرجن کی بات کاٹتے ہوئے کہا دیکھو راجیو یہ آپریشن ہے بعد کے چند روز تمہیں اچھی خاصی تکلیف اور درد ہوگا۔اس لیے تمہیں خود کو تیار رکھنا ہوگا۔اگر میرے لیے ممکن ہوتا کہ اس کی تکلیف میں برداشت کر سکتی تو ایسا کر لیتی لیکن چونکہ یہ ممکن نہ تھا اس لیے اسے ہی یہ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے تھا۔رونے دھونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ سر درد میں اضافہ ہو جاتا۔اور نتیجہ یہ نکلا کہ راجیو نے خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کیا اور ڈاکٹر کو کہنا پڑا کہ اس نے بڑی عمر کے لوگوں میں بھی ایسا حوصلے والا مریض نہیں دیکھا۔

عوامی کام بعض اوقات مجھے بچوں سے دور لے جاتے۔لیکن وہ اسے محسوس نہ کرتے۔انہیں اچھی طرح علم تھا کہ اس طرح میں ہندوستان کے بھی بچوں کا مستقبل بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔بہت زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی بچوں کی شخصیت کو تسلیم کرنا اور ان کے خصوصی حقوق کا تحفظ نسبتاً ایک نئی بات ہے۔تجربات، غلطیوں کے عمل نے دنیا سے منوالیا ہے کہ بچے کی شخصیت کو تسلیم نہ کرنا اور اس بات کی اعانت کے لیے ضروری اقدامات نہ کرنا معاشرے کو گھمبیر مسائل سے دوچار کر دیتا ہے۔صنعتی انقلاب کے بعد ہماری زندگیوں میں سنگدلی کے ساتھ ایک تیزی پیدا ہوگئی ہے۔بقا کی جدوجہد، تلاش معاش اور آسمان تلے اپنی جگہ کا حصول ذہنی دباؤ پیدا کر رہا ہے۔

حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی بھی فرد کو ہر وقت تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال سے مطابقت پیدا کرنا پڑتی ہے۔جوں جوں آدمی بڑا ہوتا ہے قدرتی طور پر یہ عمل مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں ہر نسل اور آنے والی نسل کے درمیان سوچوں (انداز فکر) کی خلیج وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔

مشہور فلاسفر اور شاعر خلیل جبران نے بچوں کے بارے میں لکھا ہے:

تم انہیں اپنی محبت دے سکتے ہو خیالات نہیں
کیوں کہ ان کے اپنے تصورات اور خیالات ہوتے ہیں
تم ان کے جسموں کی نشوونما کر سکتے روحوں کی نہیں
کیونکہ ان کی روح میں آنے والے کل کے مکانوں میں رہتی ہیں
جن میں تم کبھی نہیں جا سکتے
یہاں تک کہ اپنے خوابوں میں بھی نہیں

کتنے والدین فاصلوں کی گہرائی سے آگاہ ہوتے ہیں۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کو محض اپنے وجود کی توسیع سمجھتے ہیں اور انہیں اپنی ناکام خواہش پورا کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اپنے والدین کی محبت اور احترام میں بچے جوان ہو کر اپنی خواہشات اور رجحانات کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ انہیں اپنے پسندیدہ شعبے سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ چاہے اس شعبے میں ان کا میلان اور رغبت فطری ہو لیکن وہ اپنے والدین یا سرپرست کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔

والدین کی خواہشات کا احترام عملی زندگی میں آنے والے نئے فرد کا جوش و جذبہ مردہ کر دیتا ہے۔ یوں معاشرہ اپنی مشین میں ایک نئے پرزے کا اضافہ کر دیتا ہے۔ حالانکہ اسے ایک ایسے فرد کی ضرورت ہوتی ہے جو پورے جوش وخروش، توانائی اور لگن سے انسانی برادری کی خدمت کر سکتے۔ نہ کہ نیم دلی سے میکانکی انداز میں ایک پرزہ بن کر رہ جائے۔

اگر ماں کے بس میں ہو تو وہ اپنے بچے کی تمام مصیبتوں کو خوشی کے ساتھ خود جھیل لے لیکن افسوس...... بہت جلد ہمیں علم ہو جاتا ہے کہ انجام کار ہم نہ تو باپ ہیں اور نہ ماں۔ نہ شوہر اور نہ بیوی اور نہ بچہ...... ہم سب الگ الگ ایک ذاتی اور اکیلی کائنات ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے قانون اور اپنی نوعیت کے بیچ میں رہنا پڑتا ہے تو کیا پھر والدین کو چاہیے کہ محض تماشائی بن کر رہ جائیں اور بچے کو اپنی پسند کے راستے پر جانے دیں۔ کسی طرح کی نگرانی یا نگہبانی نہ کریں؟ نہیں زندگی اتنی بھی آسان نہیں۔ ہم والدین کے سامنے ایک پیچیدہ اور نازک فریضہ ہوتا ہے کہ ہم بچوں کی تربیت مداخلت کے بغیر اس طرح کریں کہ نہ تو بچوں کی شخصیت پر ہماری چھاپ پڑے اور نہ ان پر ہماری خواہشات نافذ ہوں۔

ہمیں بچے کو جرات، خود اعتمادی اور پختہ کار ہونے میں مدد دینا ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے آکسفورڈ کے مسٹر سمتھ نے انگلینڈ کے وزیر اعظم کو 1919ء میں لکھا تھا "کھلا ذہن، واضح نظر اور سچائی سے محبت ثبوت ہے کہ غلط استدلال، دقیانوسی باتوں اور بازاری زبان کے خلاف ایک بچے کی مناسب تربیت ہوئی ہے۔

اگر ہمارے پیش نظر یہی مقصد ہو تو ہم بچوں کو ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کریں، جوان کے لئے کامیاب زندگی اور گہرا تحفظ یقینی بنائے اور وہ محض آسان کام تلاش کرنے پر اکتفا نہ کریں۔ 15 اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا اور میرے والد اس کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ میں نے کہیں لکھا ہے...... "یہ لمحہ میری زندگی کا سب سے جذباتی اور قابل فخر تھا۔ یہ لمحہ جدوجہد کا نکتہ عروج تھا۔ جس کے لئے بہت سے لوگ خود وقف کئے ہوئے تھے لیکن جب یہ موقع آیا تو میں جیسے مبہوت ہو کر رہ گئی۔ میرا خیال ہے کہ جب آپ کوئی بات شدت سے محسوس کرتے ہیں تو یہ جیسے محسوس نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اپنے آپ کو یقین نہیں آتا کہ واقعی ایسا ہو گیا ہے۔

ستمبر 1947ء میں دہلی فسادات بھڑک اٹھے۔ میں میسوری میں تھی۔ وہاں بچوں کی وجہ سے کچھ دن رکنا پڑا۔ دہلی سے فون آیا کہ ابھی دہلی مت آؤ۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اس لئے روکا گیا تھا کہ صورت حال خاصی خراب تھی۔ اس کے بعد کوئی رابطہ اور خبر نہ ہوئی۔ مجھے گھر میں چین نہیں آ رہا تھا۔ ہر وقت میری کوشش تھی کہ کسی طرح کوئی پیغام بھجوا سکوں۔ لیکن جواب ایک ہی تھا۔ ابھی مت آؤ۔

میں وسوسوں میں پڑی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے بالآخر میرا رابطہ فیروز سے ہو گیا۔ وہ دہلی میں میرے والد کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا باقی باتیں تو چھوڑو ہمارے پاس کھانے کے لئے بھی مناسب انتظام نہیں اس لئے تم بچوں کو یہاں نہیں لا سکتی۔

میں نے کہا...... میں بہت سے آلو لے کر آ جاتی ہوں ہم سب آلو کھا کر گزارہ کریں گے...... فیروز بولا...... صورت حال بہت خطرناک ہے۔ اگر صورت حال خطرناک ہے تو مجھے یہاں بیٹھنے کی بجائے تم لوگوں کے پاس ہونا چاہئے۔

چنانچہ میں نے سامان سمیٹا اور اسی شام آلو کی دو بوریاں لے کر دہلی روانہ ہو گئی۔ جب ہم ڈیڑھ دن پہنچے تو پتہ چلا تھوڑی دیر پہلے یہاں فساد ہو چکا ہے۔ پھر شاہدرہ یا دہلی سے باہر کسی اور اسٹیشن پر ہماری ٹرین رکی۔ معمول کے مطابق ٹرین کو اسی جگہ رکنا نہیں تھا۔ انڈین ریلوے کوئلہ استعمال کرنے کی وجہ سے بہت گندی ہوتی تھی چونکہ اب ہم دہلی میں داخل ہونے والے تھے۔ میں منہ ہاتھ دھونے کے لئے باتھ روم میں تھی۔ میں نے باہر نکل کر کھڑکی میں سے جھانکا...... چھ لوگ کسی کا پیچھا کر رہے تھے۔ صورتحال سنبھالنے کے لئے میں گاڑی سے باہر نکلی۔ میں ایک آدمی کو بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ جبکہ دوسرا آدمی دور تھا اور اس کے پیچھے بہت زیادہ لوگ تھے۔

میرے پاس صرف ایک تولیہ تھا۔ اس لئے میں اور زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی میں گھر پہنچی اور بیمار ہو گئی۔ مجھے والد نے مشورہ دیا کہ مہاجروں کے کیمپ کی دیکھ بھال کروں میں نے جانفشانی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک دن ایک مہاجر کیمپ سے واپس گھر آتے ہوئے، میں انتہائی خوفناک منظر دیکھے۔ ایک آدمی کے پیچھے تقریباً دو سو افراد کا ہجوم تعاقب میں تھا۔ تنہا آدمی سینکڑوں افراد سے جان بچانے کے لئے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ رکو...... لیکن ہمارا ڈرائیور مسلمان تھا۔ اسے گاڑی روکنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کہا تمہیں گاڑی روکنا ہو گی ورنہ میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔ اس نے گاڑی روکی تو نہیں، لیکن رفتار آہستہ کر دی۔ میں نے چپل اتارے ہوئے تھے۔ کیونکہ گرمی سے میرے پاؤں سوج جاتے ہیں۔ مجھے گرمی اچھی نہیں لگتی اور ان دنوں ابھی گرمی سے مانوس نہیں ہوئی تھی بہر حال میں ننگے پاؤں تھی۔ میں گاڑی سے اتری اور ہجوم کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ جس آدمی کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ اسے میں نے اپنے پیچھے کر لیا۔

یہ تم کیا کر رہی ہو وہ لوگ بولے۔

''میں اس آدمی کی جان بچا رہی ہوں تم اسے صرف اس صورت میں مار سکتے ہو کہ پہلے مجھے مار دو......''

وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے کہا... کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم تمہیں قتل نہیں کر سکتے'' میں نے کہا'' کوئی بھی مجھے قتل کر سکتا ہے لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم میں اتنی ہمت نہیں اور تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے اس مصیبت زدہ آدمی سے کہا کہ بھاگ کر ہماری کار میں گھس جاؤ لیکن وہ بہت خوف زدہ تھا۔ میری ساڑھی کو پکڑا کھڑا رہا۔ چنانچہ ہم قدم قدم پیچھے ہٹنے لگے۔ میرا چہرہ ہجوم کی طرف تھا۔ وہ سب خاموش کھڑے رہے۔ اگرچہ وہ مشتعل لگتے تھے لیکن انہوں نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں اس آدمی کو کار میں لائی اور پھر ہم سیدھے ہسپتال گئے اسے سر پر شدید زخم تھا۔ لیکن بروقت علاج سے وہ بچ گیا۔

کسی طرح گاندھی جی کو اس واقعے کی خبر ہوگئی۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ والد صاحب کو بھی نہیں لیکن گاندھی جی نے کسی سے سن لیا۔ ہم روزانہ شام کو عبادت سے پہلے انہیں ملنے جاتے تھے۔ ایک روز ہمیں ان کا فون ملا کہ آج ہم آ رہے ہیں یا نہیں...... ہم پہنچ گئے۔ گاندھی جی نے پوچھا'' میں نے شاہدرہ کے واقعہ کے بارے میں سنا ہے...... کیا یہ درست ہے؟''

''جی، ہاں درست ہے؟''

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا...... انہوں نے کہا۔

میں نے جواب دیا...... ''میرا خیال ہے یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی کہ آپ کو بتائی جاتی میں نے یہ سب کچھ اضطراری کیفیت میں کیا۔ بعض اوقات کوئی آدمی کچھ سوچے سمجھے بغیر قدم اٹھا لیتا ہے ممکن ہے اگر کوئی خطرے کا احساس کرے تو شاید ہچکچا جائے لیکن یہ خیال کہ کچھ کیا جانا چاہئے بہت طاقتور محرک ہوتا ہے۔''

گاندھی جی نے پوچھا:'' آج کل کیا کر رہی ہو؟''

میں نے کہا... ''میں مہاجر کیمپوں میں جا رہی ہوں لیکن یہ کام زیادہ قیمتی نہیں۔ بہت سے لوگ یہ کام کر رہے ہیں اور یہ کار خیر کوئی بھی کر سکتا ہے۔''

گاندھی جی نے کہا کہ'' کوئی آدمی مسلمانوں کے علاقے میں جائے اور وہاں کی صورت حال سے مجھے آگاہ کرے۔

''میرے ساتھ کون جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

اگر کوئی آدمی جا سکتا تو میں تمہیں نہ کہتا کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔

میں نے جواب دیا کہ'' مجھے دہلی کے گلی کوچوں سے زیادہ واقفیت نہیں اور مجھے یہ بھی علم نہیں کہ مسلمانوں کے علاقے کون سے ہیں؟

''معلوم کرو''...... گاندھی جی کے یہ آخر لفظ تھے۔

مجھے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو یہ جانتا ہو کیونکہ ہمارے گھر میں تمام افراد دہلی میں اجنبی تھے کسی نے بتایا کہ ٹاؤن ہال وہ جگہ ہے۔ میں ٹاؤن ہال پہنچی۔ وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور

مجھے علم نہیں تھا کہ یہ کون ہے۔ اس نے کھادی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ میں اس کے پاس گئی اور پوچھا...... ''کیا تم دہلی میں رہتی ہو؟''

''ہاں'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تم یہاں سماجی یا۔یا ی کام کرتی ہو؟''

''ہاں میں مزدوروں میں کام کرتی ہوں۔ ہم لوگ کلاتھ مل میں ملازم ہیں۔'' میں نے پوچھا۔'' کیا تم دہلی سے اچھی طرح واقف ہو اور تمہیں علم ہے کہ مسلمانوں کے علاقے کون کون سے ہیں؟

اس نے جواب دیا...... ''ہاں میں جانتی ہوں۔''

میں نے اسے بتایا کہ گاندھی جی کیا چاہتے ہیں اور مجھے اس سلسلے میں کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔ سواری کا انتظام میں کروں گی۔ وہ میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کا نام نہ پوچھا۔ ہم نے دوبارہ ملنے کا وقت اور مقام طے کرلیا۔

پھر ہم کام میں مصروف ہو گئے۔ مسلمان بڑی پریشان کن صورتحال سے دوچار تھے۔ ان کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اور علاقے سے باہر کوئی نہ جاسکتا تھا۔ ایک مہینے سے کوئی صفائی نہ ہوئی تھی چونکہ یہ برسات کا مہینہ تھا اس لئے کئی گلیوں میں پانی کھڑا تھا۔ جس پر گندگی تیر رہی تھی۔ بعض اوقات چلتے ہوئے ہمارا پاؤں بجلی کے تار پر آ جاتا اور ہمیں جھٹکا لگتا۔ واقعتاً ہمیں بعض اوقات خود ہی جگہ صاف کرنا پڑتی۔ یہاں تک کہ جب ہم نے ایک خاکروب کو ساتھ لیا تو وہ مارے جانے کے خوف سے علاقے کے اندر جانے سے ہچکچاتا رہا۔ ہم نے اس ... انتظام کیا کہ جب وہ کام کرتا تو دو آدمی اس کی حفاظت کے لئے ساتھ ساتھ رہتے۔ ان علاقوں میں راشن کی دکانیں تو تھیں لیکن خالی پڑی تھیں۔ ہمیں خود ہی راشن لانے کا انتظام کرنا پڑتا۔

سرکاری عملے کا رویہ بھی ''فرقہ وارانہ'' تھا۔ پہلے تو انہوں نے کہا کہ ''وہاں کسی کو نہیں بخشا جارہا اس لئے اب مسلمانوں کے لئے ہمارے پاس کوئی اور ترجیح نہیں۔'' ہمارا کہنا یہ تھا کہ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے پھر مسلمانوں کے لئے کسی ترجیح کا کیا سوال ہے وہ اس ملک کے شہری ہیں۔ آپ انہیں بھوک اور بیماری سے مرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ ہم تقسیم کو قبول کر چکے ہیں تب انہوں نے تسلیم کیا کہ ہاں کچھ غلہ موجود ہے۔ لیکن پھر ان کے پاس غلہ لے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ نہ ہونے کا عذر موجود تھا۔ ہم نے ایک ٹرک کا انتظام کر دیا اور مسلم علاقوں میں غلہ پہنچانا شروع کر دیا۔ ان علاقوں میں ہمارے ساتھ بہت سے لڑکے اور بڑی عمر کے لوگ کام کر رہے تھے۔ ہم وہاں اناج پہنچاتے۔ ڈاکٹروں کو لے کر جاتے کیونکہ ان علاقوں میں ہیضہ پھوٹ پڑا تھا اس حوالے سے بھی ایک دلچسپ واقعہ ہوا مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں انسداد ہیضہ کا انجکشن لگوالوں۔ ان دنوں راجکماری امرت کور محکمہ صحت کی سربراہ تھی۔ میں نے اس سے بات کی امرت کور کا جواب تھا کہ ویکسین ضائع نہیں کی جاسکتی۔ دراصل اسے علم نہیں تھا کہ میں ان علاقوں میں کام کر رہی ہوں۔

ہم نے بہت سے لوگوں کو قتل ہونے سے بچایا۔ اور کئی ایسے افراد گرفتار کروائے، جو گڑ بڑ پھیلا رہے تھے۔ انہی دنوں آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) سے میرے اختلافات شروع ہوئے۔ بظاہر کچھ لوگ لاٹھیاں لے کر گھوما کرتے تھے ان لاٹھیوں میں تلواریں چھپی ہوئی تھیں یا ٹھوس دھات کے راڈ جن کی ضرب سے آدمی کا سر ٹکڑے ہو سکتا تھا۔

ایک دن میں نے شیو بھادر جوشی سے کہا۔ ''ہم ایسے تمام لوگوں کو گرفتار کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال ہمیں کہاں لے جائے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنا سارا وقت برے لوگوں کے ساتھ گزار رہے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ جرائم کون کر رہا ہے۔ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے سوچا اس معاملے کو کسی اور طرح سے نمٹایا جائے۔ یہ دیکھیں کہ کون لوگ قتل و غارت اور نفرت پھیلانے میں ملوث ہیں۔ کوشش کی جائے کہ ایسے لوگ اکٹھے ہو سکیں۔

چنانچہ اب ہم مسلمانوں کے علاقوں میں جاتے اور انہیں کہتے یہاں بہت سے لوگ ہم سے بہتر ہیں۔ ہمیں ایسے ہندوؤں کے نام بتاؤ جو اشتعال انگیزیوں کے باوجود انسانیت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ ہمیں بتاتے کہ ہاں اس طرح کے لوگ یہاں ہیں اور ان کے نام یہ ہیں۔ ان سے کہا جاتا کہ فکر نہ کرو ہم ان لوگوں کو یہاں لاتے ہیں۔ کیا اس طرح صورت حال بہتر نہ ہوگی۔ بعض اوقات وہ کہتے نہیں۔ دوسرے لوگ کیا کہیں گے۔ مسلمان برادری ہمارا بائیکاٹ کر دے گی پھر یہ بات بہت خطرناک ہوگی وہ تو ہمیں قتل کر دیں گے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ ہم صرف دو آدمیوں (ہندوؤں) کو لاتے ہیں کیا وہ دو تم سب کو قتل کر سکتے ہیں......''

اسی طرح ہم ہندوؤں کے علاقے میں جاتے اور پوچھتے کہ کیا یہاں ایسے مسلمان مقیم ہیں جنہوں نے کسی قیمت پر بھی غلط رویہ نہیں اپنایا؟ وہ ہمیں بتاتے کہ ہاں فلاں فلاں مسلمان ایسا ہے۔ میرے والد کو بہت سے دھمکی آمیز خطوط ملے جن میں لکھا تھا۔ تمہاری بیٹی کیا کرتی پھر رہی ہے۔ وہاں (پاکستان میں) ہماری عورتوں کی عصمت دری ہو رہی ہے۔ اگر یہ باز نہ آئی تو ہم اس کی عزت لوٹ لیں گے۔ ہم اسے مزید یہ سب کچھ نہیں کرنے دیں گے اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ہر طرح کے خط اور دھمکیاں مل رہی تھیں۔ میرے والد کے سیکرٹری نے سوچا کہ مجھے تحفظ فراہم کیا جانا چاہئے۔ ہم ایک عام کار استعمال کیا کرتے تھے۔ اس کی بجائے ہمیں پولیس نے ڈرائیور کے علاوہ صرف یہی ایک مرد ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ جب ہم مسلمانوں کے علاقے میں گئے۔ اس نے میری ساڑھی پکڑ لی اور میرے پیچھے چھپ کر بولا۔ ''بستی کے اندر جانا تمہارا کام نہیں ہے یہ کام بہت خطرناک ہے۔''

ایک روز ہم بری طرح تھک گئے۔ ہم صبح پانچ بجے سے گھر سے نکلے تھے۔ شام کو ایک جگہ ہماری واپسی کے لئے گاڑی آنا تھی۔ لیکن جس جگہ کا تعین کیا گیا تھا۔ وہاں گاڑی نہیں تھی۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سو بھادرا (میرے ساتھ کام کرنے والی لڑکی) بولی...... ہو سکتا ہے انہوں نے غلط سمجھا ہو اور اگلے چوک پر انتظار کر رہے ہوں۔ آپ یہاں بیٹھیں، میں دیکھ کر آتی ہوں۔ میں نے کہا چلو میں بھی چلتی ہوں۔ ہم نے گن مین کو کہا کہ تم

یہاں بیٹھو ہم اگلے چوک سے ہو کر آتے ہیں۔ گن مین بولا...... میں یہاں اکیلا نہیں بیٹھوں گا۔ اس کے پاس بندوق تھی لیکن بہت ڈرپوک تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ ہم میں سے کوئی اس کے پاس رہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں وہاں رہی یا سوبھا اور اکیونکہ کسی ایک کو موجود ہونا چاہئے تھا۔ کہ اگر اس اثناء میں گاڑی ہمیں لینے آ جائے تو نئی الجھن نہ بنے۔ پھر ہمیں گاڑی نظر آ گئی جو کسی اور جگہ کھڑی تھی۔

جب کچھ علاقہ صاف کروانے کے بعد ہم نے راشن کا انتظام کیا اور ڈاکٹروں کو وہاں لے گئے۔ تو میں ایک روز گاندھی جی سے ملنے گئی۔ ہماری سرگرمیوں کے بارے میں انہیں کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ میں نے ان کے کہنے کے باوجود کوئی کام نہیں کیا اور اب ان سے ملنے سے کترا رہی ہوں۔ جب میں وہاں پہنچی تو انہوں نے درشتی سے میری طرف دیکھا اور بولے: کیا میں نے تمہارے ذمہ کوئی کام نہیں لگایا تھا؟

میں نے جواب دیا...... ''میں آج کل وہی کام کر رہی ہوں۔'' پھر میں نے انہیں اب تک کیے کاموں کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ گاندھی جی بولے تم نے پہلے آ کر مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے کہا: مجھے یہ کام کرنا لوگوں سے ملنے سے زیادہ اہم محسوس ہوا۔

اب ہم نے ''امن کا کام'' کرنا شروع کیا۔ جگہ جگہ جانے کے بعد بالآخر ہمیں پانچ مسلمان اور پانچ ہندو ایسے مل گئے جو ملاقات پر تیار تھے۔ ممکن ہے ان کی تعداد چھ یا سات ہو۔ بہر حال وہ بڑے خوف زدہ تھے اور جب ملے تو کانپ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ لوگ ایک دوسرے سے ملے ہیں لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تم سب دوست ہو۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہم نے پانچ سو افراد کو چائے پر جمع کر لیا۔ ہندو مسلمان سبھی تھے۔ میں نے ایک دفعہ اس بارے میں لکھا تھا لیکن زیادہ تفصیل سے نہیں۔

29 جنوری **1948**ء کو میں آخری مرتبہ مہاتما گاندھی سے ملی اور یہ ان کی موت کا موقع تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے اسی روز ہمیں بلا بھیجا۔ انہوں نے پیغام بھیجا کہ ہم لوگ کافی دنوں سے انہیں نہیں ملے۔ حالانکہ یہ کافی دن محض چار پانچ دن تھے۔

پیغام پوجا کے اجتماع سے پہلے ملا۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ اگر ہم نے دیر کی تو پھر وہ پوجا کے لئے چلے جائیں گے اور اس کے بعد انہیں اور بہت سی مصروفیات ہے مس نائیڈو (سروجنی نائیڈو کی بیٹی) ہمارے ساتھ تھی۔ میں اپنے ساتھ راجیو کو بھی لے گئی۔

میرے بال زیادہ لمبے نہیں تھے۔ لیکن میں انہیں باندھ کر رکھتی تھی۔ مالی تھوڑی دیر پہلے بالوں میں لگانے کے لئے مجھے کچھ پھول دے گیا تھا۔ پھول بہت خوشبودار تھے میں نے سوچا کہ انہیں بالوں میں لگانے کی بجائے گاندھی جی کو پیش کر دوں۔ میں جاتے ہوئے انہیں ساتھ لے گئی اور گاندھی جی کو پیش کر دیئے۔ ان کے ساتھ ملاقات بڑی خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ پوجا میں ابھی بہت وقت تھا اور وہ رنگدار چشمہ اور چھوٹا سا ہیٹ پہنے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ راجیو ان کے قریب بیٹھا کھیلتا رہا۔ اور ہم مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ ان میں

فلمیں اور اسی طرح کے اور موضوعات شامل تھے۔

ایک شام پہلے ہمارے ہاں فلم شو کا اہتمام کیا گیا تھا میرے والد نے آشرم سے کچھ لڑکیوں کو آنے کی دعوت دی لیکن گاندھی جی نے انہیں اجازت نہ دی۔ میرے والد کا کہنا تھا کہ یہ لڑکیاں اب بڑی ہو چکی ہیں ان پر اس طرح کی سختی مناسب نہیں۔ ملاقات کے دوران میں نے گاندھی جی کو فلم کے بارے میں اپنے تاثرات بتائے انہوں نے کہا میں نے لڑکیوں کو نہ بھیج کر ٹھیک کیا۔ اگرچہ آج کل کے معیار سے فلم میں کوئی نازیبا بات نہیں تھی۔ لیکن اس دور کے اعتبار سے میرے خیال میں یہ تھوڑی سی غیر اخلاقی بات تھی۔ اگرچہ اس میں سیکس، تشدد یا کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک اچھی فلم نہیں۔ چنانچہ گاندھی نے ہنستے ہوئے کہا کہ اپنے باپ کو بتا دینا کہ لڑکیوں کو نہ بھیجنے کا میرا فیصلہ بالکل درست تھا۔

اگلے روز ہم ابھی چائے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ ہمیں گاندھی جی کی خبر ملی۔ گاندھی جی کی موت صرف ایک قومی نقصان ہی نہیں۔ میرے لئے ذاتی طور پر گہرے دکھ کی بات تھی وہ اس طرح ہمارے خاندان اور ہندوستان کا اہم حصہ تھے کہ ان کے بغیر ہم ہندوستان کے بارے میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ ایک ایسا مرکزی نکتہ تھے جس کے گرد پورے ملک کا آدمی اور کانگریس گھومتی تھی۔ بعض اوقات ان کی عدم موجودگی میں کانگریس کے اجلاس ہوتے لیکن یہ اطمینان ہوتا تھا کہ وہ ملک ہی میں ہیں اور ان سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ والد انہیں کیا سمجھتے تھے اور ان کے بعد زندگی میں کیسا خلا محسوس کریں گے۔

گاندھی جی کے بارے میں ہر آدمی کا نکتہ نظر اس کی اپنی ذہنی نشوونما اور تبدیلیوں کا پیمانہ تھا۔ جب وہ زندہ تھے تو میری عمر کے بہت سے لوگ انہیں سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ ہم میں سے کچھ ان کے اصولوں کے بارے میں مضطرب ہوتے تھے اور ان کے کچھ اصولوں کو غیر واضح اور مبہم سمجھتے تھے۔ ہمیں ان کی عظمت کا اعتراف تھا لیکن سیاست میں صوفی ازم کو لانے پر ان سے اختلاف کرتے تھے۔ یہ بات صرف میری نسل تک محدود نہیں تھی۔ خود میرے والد نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ اور ان کے ہم عصر دوسرے لوگ گاندھی جی کے خیالات کو اپنی سوچوں کے ڈھانچے میں ڈھالنا مشکل محسوس کرتے تھے لیکن بتدریج میرے والد قوم تحریک کے دوران ہونے والے تجربات کی وجہ سے گاندھی جی کو بھرپور طریقے سے سمجھنے لگے۔ وہ گاندھی جی کو ایک ''جادوگر'' کہتے تھے۔ اور ان کے تصورات کو رائج اصطلاحات میں سمونے لگے۔ تاکہ یہ زیادہ جامع ہو جائیں اور نئی نسل کے لئے انہیں اپنانا آسان ہو جائے۔

گاندھی جی غیر مشروط اطاعت کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے نکتہ نظر اور حکمت عملی کو آزمائش کے بغیر قبول کروانے کے خواہش مند بھی نہیں تھے وہ کسی بحث ومباحثہ کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اپنی نوعمری میں بھی ان سے بحث پر اتر آتی تھی وہ کسی بھی خلوص رائے کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ایسے لوگوں کو وقت دیتے جو ان سے اختلاف کرتے۔ یہ خوبی ہمارے ملک میں کسی استاد یا مہمان آدمی میں نہیں تھی۔ وہ ایک غیر روایتی قسم کے

''پیغمبر'' تھے کیونکہ انہوں نے کبھی وحی یا الہام کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ انہیں کبھی بھی نہ تو صلے کی تمنا ہوتی تھی اور نہ سزا کا خوف۔ وہ کبھی اپنے مشن کی مشکلات سے نہیں گھبرائے وہ ایک ایسے صوفی تھے جو بذلہ سنجی سے کام لیتے اور قہقہہ لگانا جانتے تھے۔

میرے نزدیک گاندھی جی ایک زندہ شخصیت ہیں جنہوں نے ایسا اعلیٰ معیار پیش کیا جس پر کوئی بھی انسان خود کو بہتر بنا کر پیش کر سکتا ہے ماضی کی بہتریوں سے مالا مال ہو کر وہ حال میں رہتے تھے اور مستقبل کے لئے رواں دواں تھے۔ دونوں ان کے خیالات وقت کی قید سے آزاد تھے انہوں نے فوری مسائل کے حل کے لئے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا۔ ان کی بہت سی باتیں فرد کی داخلی رہنمائی کے لئے تھیں ان کی دانش ادھر ادھر کی معلومات کی مرہون منت نہ تھی انہوں نے اپنے خیالات کو اپنی زندگی کی تجربہ گاہ میں آلات کے طور پر استعمال کیا۔

(بحوالہ: میرا سچ آپ بیتی اندرا گاندھی) (مترجم: طاہر منصور فاروقی)

عورت پردے سے طوائف تک

ایک سرد آہ

آہ...... میرے پاس طاقت ہوتی تو اس کتاب کو نہ لکھتا اس معاشرہ کے درودیوار ہلا ڈالتا جس میں عورت کسبی ہے میرے پاس تلوار ہوتی تو سیاسی کھوپڑیوں کی فصل کاٹتا کہ پک چکی ہے۔ میرے پاس صرف قلم ہے اور میں نے اس عورت کے زخم پیش کیے ہیں جس کا روپ عیاش انسانوں کے قہقہوں کی دستبرد میں ہے۔

کاش...... مجھے اختیار ہوتا کہ میں بڑے بڑے عماموں کے پیچ کھولتا، ان کی دستار فضیلت کے پھریرے بنا کر بالاخانوں پر لہراتا عالمگیری مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو کر فقیہہ شہر کو للکارتا۔ اس دراز قبا پھاڑ ڈالتا اور اس کے ٹکڑے دریدہ عفتوں کے حوالے کر دیتا کہ اپنی برہنگی ڈھانپ لیں۔

قبا نہیں، اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کا کفن ہے۔

(بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

میری استدعا

کوئی شخص اس کے مطالعہ سے گمراہ ہوتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ اس نے میری کتاب کا مقصد کھو دیا ہے کوئی راہ پر آتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی کہ اس کے نفس کی نیکی جاگ اٹھی ہے اس کے علاوہ نہ مجھے داد تحسین کی ضرورت ہے کہ اس جنس کاسد سے میرا جی بھر چکا ہے۔ نہ فقیہوں کی ملامت، مصلحوں کے قہر اور راہنماؤں کی خشونت سے ڈرتا ہوں کہ اس کرہ ارضی پر ان سے زیادہ بے مایہ چیز کوئی نہیں ہے۔ (بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

فحاشی اور میرے تجربات

میں نے ان چار ساڑھے چار برس میں کوئی چھ سو لڑکیوں سے فحاشی کے اسباب کی چھان پھٹک کی ہے جو نتیجہ برآمد کیا وہ حسب ذیل ہے:

سبب	تعداد	سبب	تعداد
انتہائی افلاس	80	خاوندوں کی ترغیب	28
خواہشات نفسانی کی شدت	32	صحبت بد کا اثر	45
والدین کی ترغیب	52	عاشقوں کی بے وفائی	48
سیاسی اغوا	22	والدین سے ناراضی	19
سرپرستوں سے الجھاؤ	13	گھریلو جھگڑے	8

شوہروں کی دغا	13	ادبی معاشقے	9
تن آسانی	9	مخلوط تعلیم	28
ملازمت	11	خاندانی پیشہ	112
شوقیہ	17	جوشِ انتقام	1
اور دوسرے اسباب	34	کل میزان	600

(بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

اس بازار میں

بکھرے بکھرے تاش کے پتے چند جواری کھیل رہے ہیں
فکر میں ہر اک ڈوب رہا ہے باری باری کھیل رہے ہیں
حکم کی دگی، اینٹ کا دہلا، چشم زدن میں جیت گئی ہے
سکوں کی جھنکار کے بل پر رات اندھیری بیت گئی ہے
خواجہ کی دستار کا سلمہ ایرے غیرے لوٹ رہے ہیں
کلیوں کے منہ زرد پڑے ہیں سرو کے پرچم ٹوٹ رہے ہیں
داؤں یہ ہے ہر ایک کھلاڑی ترساں ترساں، لرزاں لرزاں
جیتنے والے خنداں خنداں، ہارنے والے حیراں حیراں
یہ مارا وہ پانسا پلٹا، یہ جیتے وہ ہار رہے ہیں
حکم اور اینٹ کی ترپ نہیں ہے پھول کے پتے مار رہے ہیں
جیتو ہارو، ہارو جیتو، اس ڈیرے کی ریت یہی ہے
اس سے چھینو، اس پر جھپٹو، میت کے بھوکو میت یہی ہے
دھوپ چڑھی آتی ہے سروں پر کھیلنے والے نوٹ چکے ہیں
سرخ ہیں اب سونے کی چٹانیں خون کے چشمے پھوٹ چکے ہیں

(بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

ردعمل

یہ کون ناچ رہی ہے بلند کوٹھے پر
فضا میں تیر رہا ہے سرود چنگ و رباب
ہوا کے دوش پہ ہے گھنگھروؤں کی موسیقی
غزل کی لے میں کُھلے جا رہے ہیں شیب وشباب
اڑاؤ کاگ کہ ہے محتسب بھی رند خراب
اٹھاؤ جام مداوائے روزگار ہے یہ
قبائیں کھول دو زلفوں کو منتشر کر دو
بڑھاؤ ہاتھ، تقاضائے نو بہار ہے یہ
مغنیہ کی دھنیں ہیں کہ کہکشاں کے دو خطوط
یہ پھول وہ ہیں کہ شرمندۂ بہار نہیں
ہر ایک بول ہے دامن کش شکیب و قرار
شراب لاؤ کہ ہستی کا اعتبار نہیں
بنا رہی ہے کئی زاویے فضاؤں میں
نرت کے روپ میں تبدیل ہوتی جاتی ہے
گداز جسم کی ہر قوس ایک نغمہ ہے
ہوا سرود میں تحلیل ہوتی جاتی ہے
صدائے منبرو محراب؟ اے خدا کی پناہ
کہ اس سے نغمہ چنگ و رباب بہتر ہے
حرم فروش فقیہوں کے حوض کوثر سے
مغنیہ کے لبوں کی شراب بہتر ہے

(بحوالہ: اس بازار میں.. شورش کاشمیری)

طاؤس ورباب آخر

''کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ زندگی کے سبق ہمیں اس وقت ملتے ہیں۔ جب وہ ہمارے لئے بیکار ہو جاتے ہیں''...... آسکر وائلڈ

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلا چکلہ محمد تغلق نے اپنی راجدھانی دولت آباد کے نزدیک طرب آباد کے نام سے قائم کیا۔ ہر روز عصر کے وقت چکلہ کا چودھری وسطی برج میں آ بیٹھتا۔ تمام رنڈیاں اور گویے باری باری مجرا بجالاتے پھر جب سورج ڈوب جاتا تو بازار سجتا، خریدار آتے اسی رامش ورنگ میں صبح ہو جاتی۔ امیر شمس الدین تبریزی سب سے بڑا درباری گویا تھا۔ جس کے ماتحت دربار کی بیسیوں رنڈیاں اور گویے تھے۔ اس دور کے چکلوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی عمارتوں اور رنڈیوں کے کوٹھوں میں اکثر و بیشتر مکانی قرب رہا۔ تمام چکلے ملک یا صوبے کی راجدھانی کے اس حصے سے ملحق ہوتے جہاں قلعہ ہوتا یا امراء سلطنت کے محل شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں فتح پورسیکری کے پاس رنڈیوں کے لئے شیطان پور آباد کیا تھا۔ دہلی میں چوک چاندنی اور قلعہ معلی سے ملحق چاوڑی بازار تھا، لکھنو قلعہ واجد علی شاہ کی عمارتوں کے نزدیکی راستہ پر ہے خود لاہور ہی کو دیکھئے کہ شاہی قلعہ اور لاہور کے چکلے میں صرف چند ہی قدم کا فاصلہ ہے۔ اب امتداد زمانہ سے لاہور کی ہیت گزائی کافی زیر وزبر ہو چکی ہے لیکن شہر کی جغرافیائی بناوٹ سے اس کے آثار اب بھی مل جاتے ہیں۔ قلعہ کی پیٹھ پر بارود خانہ تھا اس کے آگے موتی بازار نشیبی سمت پر شاہ عالمی دروازہ اور دائیں کو مڑ کر چکلہ جو آج بھی بازار چوک چکلہ کہلاتا ہے' چوک چکلہ سے لوہاری دروازہ کو نکل آیئے تو انارکلی بازار ہے اسی فرضی طوائف ہی سے جہانگیر کی داستان عشق منسوب کی جاتی ہے۔

قریب نصف صدی پہلے انارکلی میں طوائفیں بیٹھا کرتی تھیں لاہور مونسپلٹی کی تجویز پر ان کو اٹھا دیا گیا اس وقت سے ہیرا منڈی کا علاقہ ان کے لئے مخصوص ہے۔

چکلہ کا لفظ کیونکر وضع ہوا؟ اس کے بارے میں سانیات کے ماہر ہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لغت میں چکلہ کے معنی قحبہ خانہ کے ہیں اس کا مادہ چکلیدن ہوا جس کے معنی جانور کے اڈے پر بیٹھنے کے ہیں دو مصدر اور ہیں۔ چکاندن اور چکانیدن جو ٹپکانے کے معنی میں آتے ہیں چکلہ کا لفظ بھی ان ہی سے ماخوذ ہو سکتا ہے۔ خود چک کا لفظ مختلف المعنی ہے زمین کے معنی میں بھی آتا ہے اور مردانہ عضو کے لئے بھی اسی طرح چکلہ کی املا غور طلب ہے۔ صحیح املا چکلہ ہے یا چکلا، پہلی صورت میں ''لہ'' کے معنی پردہ کے ہیں اور دوسری صورت میں ''لا'' انگوری شراب کو بولتے ہیں۔ ان مختلف المعنی اشکال پر غور کرنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ چکلہ کی معنوی خصوصیت انہی الفاظ میں نہ کہیں ضرور ہے۔

آہستہ آہستہ رنڈیوں کے صفاتی ناموں میں ان کی پیشہ وارانہ بوقلمونی سے اضافہ ہوتا گیا۔ بالخصوص اس دور

میں جب سلطنت اودھ پر شجاع الدولہ اور پھر واجد علی شاہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور دہلی میں محمد شاہی امراء، عورتوں کو چو سر کی نردیں سمجھتے تھے۔ اشرف صبوحی کے الفاظ میں۔

شہزادے پانی میں مارے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک زانوں پر پیچوان لگا ہے دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے، دھواں اڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں۔

یہ زمانہ سلطنت کی ویرانی کا تھا۔ صرف ظاہری رسموں اور مغوی راجوں کا طنطنہ باقی تھا جس نسبت سے بازو کی طاقت گھٹتی گئی۔ اسی نسبت زبان کی نزاکت بڑھتی گئی۔ جن کا پیشہ ناچنا اور گانا تھا ان کو طوائف کہا گیا۔ جن کا کاروبار بدن کی فروخت ٹھہرا وہ کسبیاں کہلائیں یا کنچنیاں اور جو محض ''بازاری مال'' تھیں۔

یعنی روپے اور میں تبادلہ کرنے والی ٹکیائیاں ٹھہریں۔ ان کے لئے بیسوا رنڈی، پاتر اور دیشیا کے لفظ بھی مستعمل ہیں جن میں ایک باریک سا معنوی فرق ہے اور اب تو بعض کمین ذاتیں بھی ان میں محسوب ہوتی ہیں مثلاً مراثنیں، ڈومنیاں اور پیرنیاں وغیرہ...... کنچن کوئی ذات نہیں صرف پیشے کی رعایت سے ایک ذات بن گئی ہے اور اب ہر اس جمعیت انسانی کو کنچن کہتے ہیں جن کا تعلق طوائفوں اور کسبیوں کے خاندان سے ہوتا ہے۔

شجاع الدولہ اور واجد علی شاہ کے لکھنو نے طوائفیت کی مختلف شاخوں کو پروان چڑھایا۔ شاہی عیش طبیوں نے چکلے کی نوعی تہذیب اور ارباب ونشاط کے مخصوص تمدن کو زندگی کے بال و پر بخشے۔ جس سے دیکھتی آنکھوں ایک ایسا معاشرہ پیدا ہو گیا کہ مسلمان بادشاہوں کی پوری تاریخ میں طوائف کے عروج کی اتنی بڑی مثال نہیں ملتی۔

شجاع الدولہ نواب صفدر یار جنگ کا بیٹا تھا۔ جب اس کی انگریزوں سے صلح ہو گئی۔ تو اس نے فیض آباد کا سفر اختیار کیا۔ احمد خان بنگش نے اس کو قصد سفر سے پہلے تین نصیحتیں کیں۔ اولاً مغلوں پر اعتبار نہ کرنا ثانیاً فیض آباد کو دار الحکومت بنانا، ثالثاً خواجہ سراؤں سے کام لینا۔ شجاع الدولہ نے ان تینوں باتوں کو آویزہ گوش بنالیا۔ پہلا کام یہ کیا کہ فوج کی کمان خواجہ سراؤں کو سونپ دی سب سے بڑے ڈویژن میں چودہ ہزار سپاہی تھے۔ جن کی وردی کا رنگ سرخ تھا۔ خواجہ سر بسنت علی خاں کو ان کا کمانڈر بنایا۔ اسی نام کے ایک دوسرے خواجہ سر، کی ماتحتی میں ایک ہزار سیہ پوش گھڑ سوار تھے۔ خواجہ سر عنبر علی کی زیر ہدایت پانچ گھڑ سواروں کا دستہ اور خواجہ سرا محبوب علی کی ماتحتی میں پانچ سو شہسواروں کی چار پلٹنیں، ایک اور خوش چہرہ خواجہ سرالطاف علی کے ماتحت فوج کے اتنے ہی دستے تھے۔

علاوہ ازیں شجاع الدولہ کے دربار میں بہت سے زنانہ اور مردانہ طائفے تھے۔ شرر مرحوم نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کا دل ہمیشہ خوبصورت عورتوں اور دلفریب رقاصاؤں کے بانکپن کا شکار رہا۔ تمام شہر اور اس کے کوچہ و بازار طوائفوں سے پر تھے۔ یہاں تک کہ سلطنت کا چپہ چپہ الناس علی دین ملو کھم کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔ کئی نامور ڈیرہ دار نچاں تھیں جن کے ہمراہ عالیشان خیمے رہتے تھے۔ جب شجاع الدولہ سلطنت کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتا تو بادشاہ کے ہمراہ خیمے بھی ہوتے جہاں جی چاہتا خیمے لگا دیئے جاتے محفل جمتی اور آناً فاناً رقص ونغمہ کا چمن آراستہ ہو جاتا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں شجاع الدولہ کا لگایا ہوا پودا ایک تناور درخت بن گیا۔ حتیٰ کہ واجد علی

شاہ اور لہو ولعب ہم معنی الفاظ ہو گئے ۔ واجد علی شاہ بچپن ہی سے حسن ونغمہ کی گود میں پلا تھا اور ابھی سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا کہ اس کی عمر کے بہت سے اجلے ورق طوائفوں سے ہم آغوشی سے داغدار ہو چکے تھے جب تخت پر بیٹھا تو عورتوں سے اس کی رغبت کا یہ عالم تھا۔ تو اس نے فوج کی کایا پلٹ دی۔ رسالوں کا نام بانکا، ترچھا اور گھنگھور رکھا۔ پلٹنوں کے نام آختری اور نادری، جو دو مشہور طوائفوں کے نام پر تھے اور جنہیں وہ ممتوعہ کہتا تھا۔ واجد علی شاہ متعہ کو مذہباً جائز سمجھتا تھا۔ ہر وہ عورت جو اس کی ہوس کا شکار ہوتی اس کو ممتوعہ کے خطاب سے نوازتا۔ ایک دفعہ بھنگن پر جی آ گیا تو نہ صرف اسے فیض یاب کر ڈالا بلکہ نواب مصفا بیگم کے لقب سے ملقب کیا۔ اسی طرح بہشتن پر دل للچایا تو اس کو نواب آب رساں بیگم بنا ڈالا۔ ان چہلوں اور چونچلوں میں اس کا جواب نہیں تھا۔ واجد علی شاہ مسلمان فرمانرواؤں میں پہلا بادشاہ تھا۔ جس نے خوب صورت عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج بنائی۔

آج فوجوں میں جو زنانہ دستے نظر آتے ہیں۔ وہ غالباً اسی نظیر پر قائم ہیں خود بادشاہ کا وزیر علی نقی خاں ارباب نشاط میں سے تھا۔ اس کی بیٹی نواب اختر محل شاہ کی ملکہ تھیں۔ اکثر نابالغ اور کم سن لڑکیاں بادشاہ کی نظر کا شکار ہو جاتیں۔ تو انہیں غیر ممتوعہ بنا کر رکھ لیا جاتا اور جوان ہوتے ہی ممتوعہ بنا لیا جاتا۔ پھر مختلف حالات میں ان کے سپرد گانے اور ناچنے کا کام ہوتا تھا۔ یہ اتنا زیادہ ہوتی تھیں کہ ان کے طائفے بنا دیئے گئے۔ ہر طائفہ کا نام اس کی خصوصیت پر رکھا گیا۔ مثلاً

رادھا منزل والیاں، جھومر والیاں، لٹکن والیاں، سار دھا منزل والیاں، نتھ والیاں، گھونگھٹ والیاں، رہس والیاں، نقل والیاں اور اچھوتیاں۔ ان میں اکثر بادشاہ کے قریب سلطان خانہ میں رہتیں بعض کو کوٹھیوں میں محل سرائیں ملی ہوئی تھیں جس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا۔ اسے محل کا خطاب دیا جاتا جو صاحب اولاد نہ ہوتی۔ اس کو بیگم کہتے بیگموں کی تنخواہ روٹی کپڑے کے علاوہ چھ سے بیس روپے ماہانہ ہوتی۔ البتہ محلات کے زمرے میں آتے ہی دو سو روپے ماہوار ہو جاتے اور رہنے کو محل سرا اور ڈاوڑھی میں دربان وغیرہ دیئے جاتے تھے۔ ہر ممتوعہ کا نام چن کر رکھا جاتا۔ پری جمال بیگم، مور شمائل بیگم، گل رخ بیگم اور نازک اندام بیگم۔

اسی طرح محلات کے نام ہوتے تھے۔ نواب خاص محل صاحبہ، نواب معشوق محل صاحبہ، نواب دلدار محل صاحبہ، نواب عاشق سلطان محل صاحبہ، نواب ممتاز محل صاحبہ، نواب اختر محل صاحبہ، نواب قیصر محل صاحبہ اور یہ کوئی ستر کے قریب ممتوعات ومحلات تھیں انہی عیاشیوں کی بدولت واجد علی شاہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بدبختی کا آخری مرقع تھا۔ اس نے ناچ اور گانے میں وہ ایجادیں کیں کہ اب تک بڑے بڑے استادان فن اس کا لوہا مانتے ہیں وہ کئی راگنیوں اور نرتوں کا موجد اور معلم تھا۔ کوئی رقاصہ کہیں چوکتی تو پلنگ پر لیٹے لیٹے بھاؤ بتا کر اصلاح کر دیتا۔ کسی گویے کی آواز میں کوئی عیب ہوتا تو فوراً ٹوک دیتا۔ خود تال اور سر کی ایک ایک ادا کا مزاج دان تھا۔ اس کا وجود عیش وعشرت کا پیکر تھا۔ کبھی اپنے اوپر زچگی کی کیفیت طاری کر لیتا اور بچہ جنتا اس پر دربار میں مبارک بادیں چلتیں، نیازیں بٹتیں، حجرے ہوتے۔ جب انگریزوں نے قید کر کے کلکتہ پہنچا دیا تو وہاں بھی عیش وعشرت ہی کو

اوڑھنا بچھونا بنائے رکھتا۔ جن ممنوعات کا عشق سر پر سوار تھا۔ انہیں قید خانہ سے عشقیہ خطوط لکھتا، ان سے کچھ نہ کچھ مانگ بھیجتا، مثلاً دلدار محل سے مسی مانگی۔ اختر محل سے زلفوں کے بال، انہیں سرہانے رکھ کر سوتا اور بار بار سونگھتا، جعفری بیگم سے دولائی دوپٹہ منگوایا جس سے لپٹ کر بار بار روتا۔ غرضیکہ واجد علی شاہ نے ایک ایسے لکھنو کو جنم دیا۔ جو عیش ونشاط کے سانچے میں ڈھل کر خود ایک کسبی ہو گیا تھا۔

لکھنو میں رنڈیوں کے تین طائفے تھے:

کنچنیاں

یہ نیچ ہندو ذات کی پیشہ ورعورتیں تھیں۔ جنہوں نے پنجاب سے نقل مکانی کر کے فیض آباد میں ڈیرے ڈالے تھے، انہیں کے دم قدم سے لکھنو کا چکلہ آباد تھا۔

چونہ والیاں

یہ تعداد میں دوسرے درجے پر تھیں ان کا کام ناچنا اور گانا تھا ان میں حیدر بائی چونے والی مشہور طوائف گزری ہے جس نے نور کا گلا پایا تھا۔

ناگرنیاں

یہ پنجھیل مشائی تھیں جن میں ہر قوم کی فاحشہ عورتیں ضم ہوئی تھیں ان کی برادری کا اثر بہت پھیلا ہوا تھا لیکن ڈیرہ دار نیاں فصیح محاورہ تھیں جنہیں یہ مخصوص استعمال کرسکتا تھا۔ فی الجملہ ان کا وجود مزمہ تھا۔ حیدر بائی کی آواز میں جادو تھا۔ گوہر بائی کا رقص اس بلا کا تھا کہ انگریز بھی نمائش میں یورپین خو نیرت رہ گئے۔ چنانچہ زہرہ و مشتری کا طوطی بولنے لگا۔ زہرہ تو خوش شاہد تھی۔ قدرت نے آواز میں سحر بھر دیا تھا۔ یہ شعر ان کا ہے:

رات کا خواب الٰہی توبہ
آپ سنئے گا تو شرمایئے گا

مشہور فلم سٹار نرگس کی ماں جدن بائی اس محفل کی آخری شمع تھی مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک مضمون لکھا ہے کہ اس کو مور پنکھی ناچ میں وہ کمال حاصل تھا کہ نرت پر وقت ٹھہر کر اس کی اداؤں سے چشم سیر ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں طوائفوں نے بعض پیشہ وارانہ اصول وضع کئے اور معاشرت میں بعض ایسے الفاظ شریک کئے جن سے ان کی معصیت ڈھک گئی۔ مثلاً وہ کسی مرد سے مقررہ مشاہرہ پر زنا سوئی کے تعلقات قائم کرتی تو پیشہ کی اصطلاح میں اس کو ملازمت کہتے تھے۔ یہ رواج اب بھی ہے ایک طوائف جس مرد سے مشاہرہ پر تعلقات قائم کرتی ہے اس کا بدن اسی کے تصرف میں رہتا ہے لیکن رقص ونغمہ کے لئے اس کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوتا ہے۔

یہ تھا نستعلیق لکھنو ...... مگر محمد شاہ رنگیلے کی دہلی کا اخلاقی انحطاط اس سے بھی افزوں تر تھا۔ نواب درگاہ قلی خاں نے اس عہد کا تذکرہ لکھا اور خواجہ حسن نظامی نے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے ایک اقتباس ادنیٰ ملاحظہ کیجئے:

''جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھئے دہلی کے خوش باش لوگ زندگی کی بہار لوٹنے میں مشغول ہیں۔ ہر کوچہ و بازار میں

حسن وعشق کے معرکے ہیں، ہر درخت کی چھانوں میں، ہر عاشق ومعشوق رنگ رلیوں میں مصروف ہیں ہر میدان میں محبوبوں کی ٹولیاں سیریں کرتی اور جھومتی نظر آتی ہیں، ہر باغ میں الھڑ حسینوں اور خوش چہرہ لڑکوں ان کے شیدائیوں اور دل فگاروں کے راز ونیاز کی محفلیں جمتی ہیں۔ یہ رات کے ابتدائی حصے کے منظر ہیں۔ جب رات زیادہ آجاتی ہے تو بس دہلی والوں میں بھی شباب کی امنگیں زور مارنے لگتی ہیں اور وہ راہ گیروں سے بے نیاز ہوکر بے اندیشہ اور بے خطر ہوس رانی میں لگ جاتے ہیں:.....

محمد شاہ کے ہزاریوں میں کسل سنگھ ایک سردار تھا۔ اس کے نام پر کسل پورہ آباد تھا۔ جہاں کسبیاں پیشہ کماتی تھیں۔

ارباب نشاط میں نعمت خاں اور اس کا بھائی موسیقی میں نازک سے نازک خیال ادا کرنے پر قادر تھے۔ غلام رسول اور جانی قوالی میں یکتائے روزگار تھے۔ باقر تنبورہ بجانے میں یگانہ تھا۔ خود بادشاہ اس پر جی جان سے فدا تھا۔ حسن خان رباب بجانے میں بے مثال تھا۔ غلام محمد سارنگی بجانے میں منفرد تھا۔

یہ تو مردوں کی خصوصیات تھیں۔ عورتوں کے احوال اس سے بھی رسوا تھے۔ معشوقہ ابوالحسن، محمد شاہ کی محبوب رقاصہ تھی۔ آواز میں تمکنت، لہجہ میں ملوچ اور ادا میں رنگینی جو دیکھتا اسی کا ہوکر رہ جاتا۔ نور بائی ڈومین تھی۔ لیکن فصیح گفتگو میں اس کا جواب نہ تھا۔ اس کا مکان ایک مرصع دربار تھا۔ ہمیشہ ہاتھی پر سوار ہوکر سیر کو نکلتی چوب دار اور ملازم محافظ دستہ کی حیثیت میں ہمراہ ہوتے۔ جب امراء بلا بھیجتے تو قیمتی ہدیئے بھیجتے۔ ایک دو نہیں بیسیوں رئیس اس کے ہاں لٹ گئے۔ اچھے اچھوں کی حویلیاں کھد گئیں۔ اس کی معیت میں بہت سی عورتیں ہوتی تھیں۔ جنہیں بیگم اور خانم کہا جاتا تھا۔ ان سب کا فن روپیہ کھینچنا تھا۔ اکثر قارونی جیبیں ان کی بدولت خالی ہو چکی تھیں۔ امیر بیگم ایک عجیب الخلقت طوائف تھی اس کا کمال یہ تھا کہ مجلسوں میں برہنہ آتی ہر حصہ عریاں ہوتا۔ لیکن اس انداز میں پاجامے کی نقاشی کرواتی جسے کم خواب کا بیلدار پاجامہ پہن رکھا ہو۔ اس عریانی کو کوئی نہیں پہنچان سکتا تھا۔ تمام لوگ ملبس ہی سمجھتے تھے۔ اعتمادالدولہ کی داشتہ کا نام رام رجنی تھا۔ زینت اور گلاب بڑے پاپا کی ڈیرہ دارنیاں تھیں۔ ان کے دروازے پر دستک دینا ہر کسی کے بس سے باہر تھا۔ رحمان بائی محض رقاصہ تھی۔ لیکن پیکر بدن ایسا تھا جیسے شام کشمیر مجسم ہوگئی ہو۔ پنا بائی کی آواز میں وہ سحر تھا۔ کہ زندے تڑپ اٹھتے اور مردے جی جاتے تھے۔ اس نے بہت سی راگنیاں بھی تخلیق کی تھیں۔ پانی پر یکسر کھینچنا اور ہوا میں گرہ لگانا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ کمال بائی درباری مغنیہ تھی۔ کنوار بائی کی بیٹی کا نام روما بائی تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں اس کی ماں کا حسن ختم ہوتا، وہاں سے اس کا حسن شروع ہوتا تھا۔ پنا اور تنو محمد شاہ کی منہ چڑھی طوائفیں تھیں۔ جب محمد شاہ نے نادر شاہ کی لوٹ سے دل برداشتہ ہوکر ارباب نشاط کو چھٹی دے دی تو یہ دونوں بالاخانوں پر آبیٹھیں۔ جہاں ہر شب مغل شہزادے اپنی صبح انجام کو قریب لاتے تھے۔

ادھر 1857ء میں دہلی پر جو قیامت ٹوٹی اس سے پرانی ثقافت کے درودیوار تک ہل گئے۔ تمام ملک بارہ

باٹ ہوگیا۔ وہ لوگ جن کے ہاں بادشاہوں کے دستر خوان بچھتے تھے۔ اب روزی کی تلاش میں مر رہے تھے جنھوں نے کبھی کسی کا ہاتھ نہ تکا تھا۔ ان کے دامن کشکول ہو گئے اور اب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پیٹ کی دہائی دے رہے تھے۔ ادھر خاندانی شرافت فقیر کی گدڑی ہو گئی ادھر ہر کوئی بے نوا کا سونا بنا پھرتا تھا۔ جن کے چہروں پر دہلی و لکھنؤ کی شرافت کا انحصار تھا۔ وہ تیتر بتر ہو گئے۔ ہر نشے پر جھوٹا جھول چڑھنے لگا۔ شرفا کی لاج لچوں کا قہقہہ بن گئی اور دیکھتی آنکھوں ایسا انقلاب برپا ہو گیا کہ تیمور و بابر کی بیٹیاں تن ڈھانپنے کے لئے چیتھڑے ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ تاریخ فحاشی شاہد ہے کہ کسبیوں کا وجود جنگ یا انقلاب کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور بڑھتا ہے یونان اور روما کی تاریخ الفحشا میں بھی اس کا اعتراف موجود ہے خود برصغیر ہندوستان کی تقسیم اس کی تازہ شہادت ہے پچھلی دو بڑی جنگوں میں جو کچھ ہوتا رہا، وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ اس مادی تباہی سے قطع نظر جو یورپ میں اپنے خطرناک نتائج چھوڑ گئی۔ سب سے بڑا سانحہ ہے وہ اخلاقی تباہی ہے جس سے عورت ایک جنس بن گئی ہے۔ پچھلی جنگ میں آسام کی سرحد پر ایک غیور قوم موگ نے قحط کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور جب بھوک کا تقاضا شدید ہوتا گیا تو موگ کی عورتوں نے اتحادی سپاہیوں کے ہاتھوں اپنا جوہر عصمت بیچ ڈالا۔ جو بہر حال روٹی کا بدل تھا...... روٹی...... اور...... عصمت...... !

1857ء کا سانحہ اپنے ساتھ یہی نتائج لایا تھا۔ جب تاج و تخت چھن گئے تو ان کی وابستگیاں بھی جاتی رہیں۔ معاشرہ کا معاشرہ تہس نہس ہو گیا۔ وہ رنڈیاں جن سے شرفاء کے بچے آداب مجلس سیکھتے تھے شمع راہگذر بن گئیں جن کی زبان میں کوئی لچک نہ تھی۔ اس طرح اٹھتی گئیں کہ معیاری طوائف کا تصور بتاشہ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کے برعکس بازاروں میں حیرت ناک اضافہ ہونے لگا اور وہ خرابیں جو اس پیشہ کے آداب سے ناواقف تھیں۔ یہاں تک اتارو ہو گئیں کہ وہ جسم کو گوشت کے بھاؤ بیچنے لگیں۔ وضع داری کے تمام سانچے ٹوٹ گئے۔ مولانا شبلی کے ایک طنزیہ سوال پر سر سید نے کہا تھا۔ اس زمانے کے لوگ واقعی اپنے دوست کی داشتہ کو بھاوج کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خود طوائف کا یہ حال ہوتا تھا کہ جس سے ایک دفعہ تعلق ہو جاتا اس سے عمر بھر ناطہ نہ ٹوٹتا۔

تھوڑے ہی دنوں میں غدر کا ہنگامہ فرو ہو گیا اور استعمار انگریزی کی مصلحتوں نے ریاستوں کے وجود کو برقرار رکھا تو ریاستیں طوائفیت کی پشتیبان ہو گئیں۔ چنانچہ غدر کے بعد طوائفوں کے ادارہ کو فروغ دینے میں سب سے نمایاں ہاتھ نوابوں، مہاراجوں، خانوں، تعلقداروں اور زمین داروں کا ہے اس برعظیم میں طوائف کا موجودہ نظام براہ راست جاگیرداروں کی پیداوار ہے جو تکلف، تصنع، استحصال اور تلون، جاگیرداری نظام کی خلقی خصوصیت ہے وہی خصوصیت ایک طوائف کی سیرت کا پرتو ہے۔

ہندوستان میں تقسیم سے پہلے...... 562 ریاستیں تھیں۔ سب سے بڑی ریاست حیدرآباد دکن جہاں پونے دو کروڑ لوگ بستے تھے۔ سب سے چھوٹی بلباری کس کی آبادی صرف 72 نفوس پر مشتمل تھی، ان سب ریاستوں کے رگ و ریشہ میں (الا ماشاء اللہ) طوائف کا خون دوڑتا رہا۔ ان میں سے بیشتر کے فرماں روا اپنے رب وجد کی

دعا و برکت سے طوائفوں ہی کی اولاد ہیں اور ان کا خمیر اور ضمیر طوائف ہی کی مٹی میں گندھا ہوا ہے یہ بات پایہ تحقیق ہو چکی ہے کہ طوائف کا ادارہ جاگیر داروں ہی کی وجہ سے پروان چڑھا ہے بڑی بڑی ریاستوں میں کسبیاں پلتی اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بکتی ہیں ان ریاستوں کے گھناؤنے نظام کے باعث بردہ فروشی کو خاصا فروغ ہوا۔ مرحوم پنجاب میں چمبہ کا علاقہ خوبصورت لڑکیوں کی فروخت کے لئے بے حد مشہور تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اپنے والد کی تین سو سے زائد بیویوں کو 35 روپے فی نفر کے حساب سے فروخت کیا تھا۔ ہندوستان میں بہت سے راجے اور نواب ایسے تھے جو بیک وقت بیٹی اور ماں سے مستفید ہوتے رہے۔ خود مجھے ایک طوائف نے عندالملاقات بتایا کہ ریاستوں میں گورا رنگ اور سرمئی آنکھیں ہمیشہ راجواڑوں کی ملکیت سمجھی گئیں مشہور کہاوت ہے کہ:

ریاستوں میں خوبصورت لڑکیاں ترقی حاصل کرنے کے لئے جنی جاتی ہیں۔ ایک انگریز افسر نے جو ریاستی محکمہ میں کام کر چکا تھا۔ اپنے ایک مراسلہ میں برطانوی حکومت کو لکھا تھا کہ ریاستی افسروں کا صرف ایک ہی کام ہے کہ وہ حکمرانوں کے لئے عورتیں اغوا کرتے ہیں۔

ایک مہارانی نے ''بمبئی کرانیکل'' میں انواس کا کچا چٹھا لکھتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ:

ہم محض بستروں کے کھلونے ہیں ہماری زندگی یا موت کا انحصار مالکوں کی مرضی پر ہے۔ ہماری زندگی بھیانک خوابوں سے ابتر ہے ہمارے حرم مرصع پنجرے ہیں جہاں ہمیں قید رکھا جاتا ہے۔

• چنانچہ راجپوتانہ کے ایک مہاراجہ اپنے پیچھے چار ہزار عورتیں چھوڑ کر مرے تھے اور ان میں بے شمار نابالغہ تھیں اس شہوانی جذبے کی تسکین کے لئے ان حکمرانوں کے محلوں میں باقاعدہ عشرت کدے تعمیر ہوتے تھے۔ جن میں اس قسم کے آئینے آویزاں ہوتے تھے کہ ان سے اختلاط کے مختلف زاویوں کا لطف اٹھایا جاتا تھا۔ مہاراجہ اندور کو محض اس جرم کی پاداش میں گدی چھوڑنی پڑی کہ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی داشتہ موراں کی پڑپوتی ممتاز سے تعلق قائم کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ممتاز کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ بھاگ گئی۔ مہاراجہ کے ملازموں نے پیچھا کیا لیکن ممتاز نے بمبئی کے ایک کروڑ پتی سیٹھ باؤلے سے نکاح پڑھوالیا۔ مہاراجہ کے ملازموں نے موقع پا کر سیٹھ کو قتل کر ڈالا اور کوشش کی کہ ممتاز کو اٹھالیں مگر سب کے سب موقع پر گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا اور بالآخر مہاراج ادھیراج کا سنگھاسن ڈول گیا۔

ان اللے تللوں کی بنیاد ہی پر ایک مصنف نے کہا تھا:

''ہر انسان مختلف طریقوں سے دن کا آغاز کرتا ہے۔ انگریز انڈے اور سور کے گوشت سے جرمن ساسیج سے اور قیمہ سے، امریکن انگور سے، مگر ''ہز ہائی نس'' دوشیزہ کو ترجیح دیتے ہیں!''

(بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

ایک ہی تنور کی سوختہ

کمہار نے ایک خوبصورت آبخورہ بنایا، لوگوں نے اس کو جام صہبا بنالیا...... کمہار نے ایک جام صہبا بنایا اور لوگوں نے اس کو آبخورہ سمجھ کر مسجد کی دیوار پر رکھ دیا تو پھر کیا اس سے مٹی کی حقیقت بدل گئی؟ پیالہ میں چاہے شراب بھر دو چاہے زم زم...... عورت کو بیوا بنا دو یا گھر کی ملکہ، جو چاہے بنا دو، لیکن ہر حال میں وہ عورت ہی ہے۔
(قاضی عبدالغفار)

ایشیاء میں طوائف کا معاشرتی نظام یورپ کے معاشرتی نظام سے مختلف لیکن جنسی اعتبار سے دونوں میں ہم رنگی ہے۔ دونوں بازاری شراب ہیں جو فرق ہے اس کی بڑی وجہ ایک تو مشرق و مغرب کے جداگانہ اخلاقی نظریئے ہیں۔ دوسرے عورت کے متعلق دونوں کے عقائد کا اختلاف ہے۔ ویسے یورپی عورت ایشیائی عورت سے سماجی آزادی میں کجروی کی حد تک آگے نکل چکی ہے اور شرم و حیا کے وہ معیار جو مشرق کی جان تصور ہوتے ہیں اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ایشیائی ملکوں میں ایک طوائف بھی کسی حد تک اخلاق کے ظواہر کی پابندی کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایشیا بڑے مذاہب کا مولد و مسکن رہا ہے۔ ان مذاہب نے ایشیائی قوموں کو ایک اخلاق مہیا کیا جس سے ذہنوں میں اوامر نواہی کا ایک تصور جاگزیں ہو گیا۔ یہاں کسی فلسفی و مصنف کو یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ فحاشی کا جواز پیدا کریں اور یہ کہیں کہ طوائف ایک ناگزیر ادارہ ہے۔

لیکن اس اخلاقی کروفر کے باوجود ایشیائی ملکوں میں فحاشی محو نہ ہوئی اس کی مختلف صورتیں ہر حال میں اور ہمیشہ قائم رہی ہیں چنانچہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی تصنیف کام شاستر میں ہندوستان کی دھارمک فحاشی کا سراغ ملتا ہے۔ جنوبی ہند کے لوگ اپنی بیٹیوں کو مندروں کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ جنہیں دیوداسیاں کہا جاتا، یہ کنیائیں سنگیت اور ناچ کی تعلیم حاصل کرتیں۔ جب تک جوانی کا روپ جھلمل جھلمل کرتا، ان کے قدردان بھی موجود رہتے جب جوانی ڈھل جاتی تو انہیں مندروں سے نکال دیا جاتا اور دربدر بھیک مانگ کر گزارہ کرتیں۔ ان سے کسی ذات کا کوئی ہندو شادی نہ کر سکتا تھا۔ ان سے مندر کے مہنت خوش وقت ہوتے یا تعلقداروں اور زمینداروں کو ترغیب دے کر انہیں داشتہ رکھنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔

ہندوستان میں دھارمک، فحاشی کا ایک بڑا ثبوت لنگم ہے، یہ ٹھیک ہے کہ آریائی تہذیب نے عورت کو ازدواجی سکون مہیا کیا۔ وہ جس مرد کی شریک زندگی ہوتی اس کی موت پر اس کے ساتھ ستی ہوتی۔ لیکن عورت کے جسم کو ہمیشہ ہی خطرہ رہا۔ اور اس وقت سے رہا جب لکشمن نے سروپ نکھا کی ناک کاٹی، راون نے سیتا پر ہاتھ اٹھایا اور پانڈو دروپدی کو ہار گئے۔

منوسمرتی میں بیاہ کی آٹھ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ آٹھویں قسم ''پشاچ بواہ'' ہے۔ جس کے معنی ہی حرام کاری کے ہیں۔ بائبل میں عبرانیوں کی حرام کاری کا ذکر ہے۔ عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر بیت اللہ کے دروازے پر زنا کے قصیدے معلق تھے۔ مکہ میں جو فاحشہ عورتیں تھیں وہ باندیوں میں سے تھیں۔ عبیداللہ کا باپ زیاد اسی ٹہنی کا پتا تھا۔ مورخوں کا خیال ہے۔ زیاد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان کے سلب سے تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی تعلق پدری کا واسطہ دے کر زیاد کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے الگ کیا تھا۔ لیکن اس دور قبل از اسلام میں بھی کوئی آزاد فاحشہ عورت نہ تھی۔ حالانکہ عورتوں کا عشق عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ شوہر خوش ہوتا تھا کہ اس کی دلہن کا عاشق پہلے سے موجود ہے اکثر خاوند بیوی کو اپنے پہلے عاشق سے ملنے اور اس کا چرچا کرنے سے بھی نہ روکتے تھے۔ وہ اس کو فخر سمجھتے تھے کہ ان کی بیوی فلاں شاعر کی محبوبہ ہے اور اس کے حسن و جمال اور عفت و طہارت کا تمام عرب میں ڈنکا بج رہا ہے۔

ایک عرب شاعر کا قول ہے:

''محبوبہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سراسر محبت کے لئے، دوسرا شوہر کا جس پر کبھی آنچ نہیں آتی۔''

حضرت زرتشت نے بدکار عورتوں کے لئے تباہی کی دعا کی ہے۔ ترکستان میں کسبیوں کے بڑے بڑے بازار تھے اور ان کے مکانوں میں جانا خلاف اخلاق نہ تھا۔ مشرقی چین میں فحاشی تجارتی بنیادوں پر قائم رہی۔ وہاں کسبیوں کا وہی درجہ تھا جو یونان میں تہائرہ کا تھا۔ عام چینی انہیں پھول والیاں کہہ کر پکارتے تھے۔ اب ماؤ کی حکومت نے قحبہ خانوں کو سرے ہی سے کالعدم کر دیا ہے جاپان کی رنڈیوں، کے سکونتی بازار کا نام یوشی واڑہ ہے۔ اور انہیں بعض قانونی مراعات حاصل ہیں۔ کوریا میں طوائف کو گیسا تنگ یعنی ورق النور کہتے ہیں۔ روس، چین اور حجاز ان تین ملکوں میں عورت کے لئے جسم فروشی ممنوع ہے۔ موخر الذکر تو اسلام کا مولد ہے۔ لہذا وہاں کسی فرد یا حکومت کو اس قسم کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی اول الذکر دو ملکوں میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے اور اشتراکیت اس قسم کے ادارہ کو سرمایہ کاری کی ظالمانہ پیداوار سمجھتی ہے۔ علامہ حلبی کا قول ہے کہ اسلام نے فحش اور قحبگی کا قلع قمع کر دیا تھا۔ حضور سرور کونین ﷺ فداہ امی وابی کے وصال مبارک کے بعد پہلی صدی تک دنیائے اسلام کے اندر عصمت فروشی بالکل مفقود رہی لیکن جب اسلامیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور مسلمان بادشاہتیں قیصر و کسریٰ کے نقش قدم پر چل نکلیں تو جگہ جگہ لہو و لعب کا بازار گرم ہو گیا اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ بیشتر عباسی خلفا نے عورت کو کھلونا بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (الا ماشاء اللہ) اب جواری کھلونے تھے اور کھلونے جواری۔ جو عروج یا کمال عباسی خلفا کے عہد میں انہیں حاصل ہوا۔ اس کی نظیر کسی دور میں نہیں ملتی ایک طرف ان کو فنی تربیت دی گئی اور دوسری طرف ان کے اقتدار کو تسلیم کیا گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی بڑی سلطنتیں ان کے حسن و جمال سے ہل گئیں۔ کئی خلفاء نے ان کے اشارہ ابرو سے تاج و تخت قربان کر دیئے کئی بادشاہ ان کی جنبش لب پر نثار ہو گئے۔

ادھر رنڈیوں کے طائفے بھی نکھرتے گئے۔ ان میں بھی خاندانی وغیر خاندانی کا فرق قائم ہو گیا جو محض گانے والی تھیں وہ مغنیہ کہلائیں، مصر میں انہیں عالمہ کہتے ہیں۔ جو ناچنے والی تھیں انہیں رقاصہ کہا گیا اور جو صرف جسم بیچتی تھیں انہیں طوائف کہا گیا۔ ادھر ہندوستان میں مغلوں نے اور بھی گل کھلائے۔ ظاہر ہے کہ طوائف عشرت کی چیز ہے اور مرد نے اسی لئے اس کو تخلیق کیا ہے جب مقصد عشرت ہو اور وہ بھی نفس تو پھر وہ تمام لوازم یکے بعد دیگرے جمع ہوتے جاتے ہیں جن سے نفس کو تسکین ہو چنانچہ طوائف کے ساتھ وہ تمام سامان عشرت جمع کر دیا گیا ہے۔ جن سے عیاشی فن ہو گئی اور طوائف...... فن کار

ادھر جواری (کنیزیں) نتیجہ تھیں جنگ کا، جب فتوحات کا سیلاب ٹھہر گیا تو ان کی فراہمی بھی رک گئی جس سے ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ادھر مسلمان خلفاء اسلامیت کی روح کھو چکے تھے اور صرف ظواہر کے پابند تھے۔ انہیں رجھانے کے لئے کنیزوں کو درآمد کیا گیا جس سے بردہ فروشوں کا گروہ پیدا ہو گیا، جو ترکیہ، صقلیہ، ہندوستان آرمینیا، روم اور افریقہ سے نوجوان لڑکیاں لاتا اور بغداد میں فروخت کرتا تھا۔ ان کی سب سے بڑی مارکیٹ کا نام سوق الرقیق تھا۔ جہاں بیشتر مکان اکثر دوکانیں اور متعدد احاطے واقع تھے تمام ملکوں کی کنیزیں حسن وخوبی کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی تھیں۔ سب سے قیمتی کنیزیں۔ مدینہ طائف، بصرہ، کوفہ اور مصر کی ہوتیں ایک تو ان کا لہجہ مصفا ہوتا۔ دوسرے حاضر جواب ہوتیں۔ خود بادشاہوں کی پیشانیاں ان کے کمال سے بھیگ جاتی تھیں۔ اسی بازار کا ایک حصہ نو آمد کنیزوں کے لئے مخصوص ہوتا انہیں عریاں حالت میں لایا جاتا، بال کھلے ہوتے، کوئی سنگار نہ ہوتا۔ مقصود یہ تھا کہ خریدار طبعی حسن کا جائزہ لے سکیں مختلف تاجر، حسن ورعنائی کے معیار پر ان کی قیمت لگاتے اور دام چکا کر خرید لیتے۔ تاجر اس خام مال کو تعلیم وتربیت کی کٹھالی میں ڈال دیتے جب وہ پختہ ہو جاتیں تو انہیں بہت گراں قیمت پر فروخت کیا جاتا۔ چنانچہ اکثر موسیقار، عالمہ، فاضلہ اور مدبر عورتیں ان کنیزوں ہی میں سے ہوئی ہیں ان کے بطن سے بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی پیدا ہوئے ہیں۔

تمام بازار مختلف الاصل لونڈیوں سے پُر ہوتا۔ بڑے بڑے تجار اور امراء جمع ہوتے۔ فروختار آواز لگاتا:

''اے تاجرو! اے دولت مندو! نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے اور نہ ہر مستطیل چیز کیلا، ہر وہ چیز جو سرخ ہے گوشت نہیں اور نہ ہر سفید چیز چربی ہے۔ اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور، اے تاجرو یہ ایک بیش بہا موتی ہے۔ زر خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت لگاتے ہو؟''

ایک ایک کنیز کئی کئی ہزار میں نیلام ہوتی گاہکوں کا حق ہوتا کہ وہ انہیں عریاں حالت میں بھی دیکھ سکیں چنانچہ اہل عرب نے مختلف ملکوں کی کنیزوں کے احوال واوصاف پر کئی کتابیں لکھی ہیں مثلاً: نجابت کے لئے فارس، خدمت کے لئے روما، کھانے پکانے کے لئے حبشہ اور بچوں کی تربیت ورضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں معیاری سمجھی جاتی تھیں۔

حسن ظاہر کے لحاظ سے چہرہ ترکی، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی اور کمر یمن کی پسند کرتے تھے۔ اس بردہ فروشی

کے ماہر اتنے زیرک تھے کہ وہ کسی لونڈی کو اس کی ذہانت کے قیافہ پر خرید لیتے تھے۔ متوکل کے پاس چار سو کنیزیں تھیں۔ ہارون الرشید کے پاس دو ہزار جن میں سے تین سو ارباب نشاط تھیں۔ ام جعفر برمکی کے پاس کئی ہزار لونڈیاں تھیں۔ ہارون الرشید نے ایک کنیز کو ایک لاکھ دینار میں خرید کیا تھا۔ سلیمان بن عبدالمالک کے بھائی سعید نے اپنی لونڈی زلفا کے ستر ہزار دینار ادا کئے تھے۔

جعفر برمکی نے ایک کنیز کو چالیس ہزار دینار میں حاصل کیا، کبھی کبھار عباس خلفاء خرید کے سوال پر برہم ہو جاتے کتاب لانمانی اور عقد العزیز میں اس قسم کے کئی واقعات درج ہیں۔ ہارون الرشید تخت پر بیٹھا تو حکم دیا کہ فلاں لونڈی ایک لاکھ دینار دے کر خرید لی جائے۔ یحیٰی بن خالد (وزیر سلطنت) نے عذر کیا۔ رشید برہم ہو گیا۔ یحیٰی نے تمام روپیہ اس کے کمرے میں بکھیر دیا۔ رشید سمجھ گیا کہ یحیٰی نے اس کے اسراف پر چوٹ کی ہے۔ امین نے جعفر بن ہادی سے کہا: بذل نام کی کنیز خرید لو، جعفر نے انکار کیا امین کو غصہ آ گیا اور حکم دیا کہ بذل کو سونے میں تلوا کر خرید لو، تعمیل کی گئی۔ اس سونے کی قیمت دو کروڑ درہم تھے۔ پھر ان لونڈیوں کو امور سلطنت میں جو دخل رہا وہ مخفی نہیں۔ ان کے کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید بن عبدالملک کا عشق ذات الخال کے ساتھ تاریخی شہرت لکھتا ہے ہارون الرشید کی ماں خیزران خود کنیز تھی۔ مقتدر کی ماں بھی کنیز تھی اور ملکی سیاسیات پر ان کا جو اثر تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جہاں کہیں بھی مسلمان بادشاہتوں کے ''ڈیرے'' گئے ان کے ساتھ لونڈیوں کا ادارہ بھی گیا۔ جب خلافت ملکی حدوں میں بٹتی گئی تو یہ بھی ان کے ساتھ تقسیم ہوتی گئیں۔ خلیفہ عبدالرحمٰن اندلسی کی کنیزیں خاصی شہرت رکھتی تھیں بالخصوص قصر لبنا کی کنیزیں جو بڑی ہی نامور تھیں۔

فاطمہ خلیفہ کی خفیہ تحریریں لکھتی اس کو شعر و انشاء میں اتنی دستگاہ تھی کہ کوئی مرد بھی اس کے رتبہ کو نہ پہنچ سکا۔ خدیجہ نے شعر و غنا میں نام پیدا کیا۔ مریم نے خاندان اشبیلیہ کی لڑکیوں کو شعر و انشاء کی اعلیٰ تعلیم دی۔ رقیہ نے شعر و حکایت میں وہ کمال پیدا کیا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس کو آزاد کر دیا۔ جب عبدالرحمٰن انتقال کر گیا تو اس نے مشرق کا سفر کیا۔ ہر جگہ کے حکماء نے اس کی آؤ بھگت کی۔

ان لونڈیوں نے شعر و غنا میں ایجادیں کیں، انہی کی بدولت امرائے سلطنت قتل کئے گئے، مامون الرشید نے علی ابن ہشام سے اس کی ایک خوش جمال کنیز کو طلب کیا۔ علی نے انکار کیا، مامون الرشید نے برہم ہو کر ابن ہشام کو قتل کروا ڈالا۔

ہارون الرشید نے رات کی تنہائی میں کسی کنیز سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہی اس نے صبح پر ٹال دیا۔ صبح ہوئی تو ہارون نے بلوالیا اور وہ حاضر ہو گئی ہارون نے وعدہ شب یاد دلایا، کنیز نے ارتجالاً کہا

کلام اللیل یمحوہ النہار

چراغ حسن حسرت نے اردو ترجمہ کیا ہے

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

ہارون مسکرا کر نکل گیا تمام ملکی شعراء سے کہا کہ وہ اس مصرع پر گرہ لگائیں ابونواس سب میں بازی لے گیا۔ اس نے تضمین کے مصرعوں میں ہارون الرشید کی دراز دستی کا پورا واقعہ بیان کر دیا۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلمان فرمانرواؤں نے (الا ماشاء اللہ) جواری کے جواز سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے ان کے محلوں میں سکیڑوں عورتیں اس طرح رہ رہی ہیں۔ جیسے سونے کے قید خانے میں ہوں ان کی ازدواجی زندگی اصلاً یا معناً اسارتی زندگی سے مختلف نہ تھی ہر شاہی دور اور ہر شاہی محل میں قریب قریب یہی ہوتا رہا ہے۔

میڈم کلی برزی نے جو ایک ترک وزیر کی اہلیہ تھی ایک کتاب لکھی ہے ''حرم کے تین سال'' اس میں سلطان عبدالمجید کے حرم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی بیگمیں راستہ چلنے والوں کو جھروکوں سے بلایا کرتی تھیں۔ جب ان سے متمتع ہو چکتیں تو افشائے راز کے ڈر سے مروا دیتیں۔

ایک دفعہ خدیو مصر محمد علی کی بیٹی نازلی خانم کے شوہر نے کسی کنیز سے ہاتھ دھلوانے کے لئے کہا۔ ہاتھ دھو چکا تو کنیز سے کہا، بس بس پیاری! یہ سننا تھا کہ نازلی خانم کو تاؤ آ گیا لونڈی کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس کی کھوپڑی میں چاول بھر کر تنور میں پکوائے۔ جب خاوند خاصہ پر بیٹھا تو اس کے سامنے رکابی رکھ کر کہا اپنی پیاری کا بھی ایک لقمہ کھا کر دیکھو۔ شوہر نے سنا تو بھڑک اٹھا اور محل سے نکل گیا۔

مغلوں کا ہندوستان میں درود...... ایک مورخ کے الفاظ میں اسلام کے دور انحطاط کی یادگار ہے ان کا اسلام کی بنیادوں سے کچھ گہرا تعلق نہ تھا۔ جب انہیں ہندوستان میں سلطنت کا سکون ملا تو ان کا جسمانی عیش اپنے پیش رووٴں سے منزلوں آگے نکل گیا۔ ان کے عشرت کدوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کے گرد و پیش عجمی اور ہندی حسن جمع ہو گیا۔ وہ ذہانت جس سے عربی لونڈیوں کا شہرہ تھا۔ عجمیوں میں بھی سرایت کر گئی۔ ہمایوں شکست کھا کر ایران پہنچا تو اس کا غم غلط کرنے کے لئے دارائے ایران نے ایک مجلس نشاط منعقد کی تمام گویے مدعو کئے گئے۔ ایک مغنیہ نے غزل چھیڑی:

ہمایوں منزے کاں خانہ راما ہے چنیں باشد
مبارک کشورے کاں عرصہ راشا ہے چنیں باشد

زرنج و راحت گیتی مشو خنداں، مرنجاں دل
کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

ہمایوں کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاہ نے دیکھا تو مغنیہ کو مجلس سے اٹھوا دیا لیکن اس برجستہ ذہانت کی تحسین کئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب ہمایوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کیا تو اس مغنیہ کو بلا بھیجا۔ پتہ چلا کہ

وہ انتقال کر چکی ہے۔ شہنشاہ اکبر کی داستان ہائے نشاط سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے مینا بازار لگوایا۔ مینا بازار کا تصور ترکستان سے مستعار تھا۔ ہر مہینے کی تیسری تاریخ کو قلعہ معلیٰ میں بازار لگتا۔ اس کو خوش روز بھی کہتے تھے۔ تمام اہتمام امرائے سلطنت کی عورتوں کے سپرد ہوتا۔ خواجہ سرا قلماقنیاں اور اردبیگنیاں ادھر ادھر گھوڑے دوڑائے پھرتیں۔ مالنیں چمن آرائی کرتیں۔ جہانگیر نے بزمانہ شہزادگی مینا بازار ہی میں نواب زین خان بہادر کی بیٹی صاحب جمال کو دل دیا تھا۔ مینا بازار ہی کے انگوری پارک سے گزر رہا تھا ایک خادمہ نے عرض کیا۔ صاحب عالم! آپ کو بادشاہ سلامت یاد فرماتے ہیں شہزادہ کے ہاتھ میں کبوتروں کا جوڑا تھا۔ صاحب جمال سامنے سے آرہی تھیں۔ اس سے کہا: لو ذرا ہمارے کبوتر تھامنا ہم ابھی آتے ہیں۔ واپس آئے تو صاحب جمال کے ہاتھ میں ایک ہی کبوتر تھا، پوچھا:

''دوسرا کبوتر کیا ہوا؟''

''صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔''

''کیسے؟''

صاحب جمال نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا اور کہا۔

''صاحب عالم...... ''یوں''

اس ''یوں'' پر جہانگیر لٹو ہو گیا بالآخر صاحب جمال اس کے عقد میں آ گئی۔ لاہور کے سیکرٹریٹ میں انارکلی کا جو مقبرہ ہے وہ دراصل اسی صاحب جمال کا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے کبوتر کے واقع کو نور جہاں سے منسوب کیا ہے جو غلط ہے اسی طرح انارکلی کا تمام واقعہ بھی فرضی ہے۔

ایک روز جہانگیر کسی ایرانی شہزادے سے اس شرط پر شطرنج کھیل رہا تھا کہ جو ہار دے کنیز دے۔ اتفاق سے جہانگیر ہار گیا تمام کنیزیں اکٹھی کی گئیں۔ سب حسن و جمال میں ایک دوسرے پر فائق تھیں جہان نام کی ایک کنیز کو بڑے تردد کے بعد چن لیا گیا۔ جہان کو ہم جولیوں سے بچھڑنا گوارا نہ تھا۔ عرض کیا۔

تو بادشاہ جہانی جہاں زردست مدہ
کہ بادشاہ جہاں راجہاں بکار آید

بادشاہ رک گیا۔ حیات نام کی ایک دوسری لونڈی کو منتخب کیا تو اس نے ارتجالاً عرض کیا:

جہاں خوش است و لیکن حیات می باید
اگر حیات نہ باشد جہاں چہ کار آید

جہانگیر نے ایک تیسری کنیز دلآرام کو تجویز کیا وہ خود شطرنج کی ماہرہ تھی عرض کی صاحب عالم مجھے ایک بار بساط دکھا دیجئے پھر کوئی فیصلہ فرمایئے گا۔ درخواست منظور کر لی گئی۔ دلارام نے غور کیا اور شاہ سے کہا۔

شاہا دو رخ بدہ و دل آرام راندہ

پیل و پیادہ پیش کن واسپ کشت مات

جہانگیر بازی جیت گیا دل آرام کو اعزاز وانعام سے نوازا۔ آج تک یہ شعر شائستہ کھلاڑیوں کی زبان کی نوک پر ہے۔

جہانگیر کی ایک بیوی راجہ اودے سنگھ کی بیٹی بان متی تھی۔ شاجہان اسی کے پیٹ سے تھا۔ تمام محل میں بان متی کے گانے کا شہرہ تھا۔ جہانگیر خود موسیقی کی نوک پلک سے واقف تھا اور اس نے اپنی بہت سے خواصوں کو موسیقی کی تعلیم وتربیت کے لئے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ اسی زمانے میں بزرگی کشمیری نام کی ایک طوائف کا بڑا نام تھا۔ ایک دن اس کی صحبت میں بہت سے اہل عجم بیٹھے تھے کہ ایک عرب بھی جا پہنچا عجمیوں کو شرارت سوجھی اور یہ رباعی لکھ کر اس کے پاس بھیج دی ؎

اے شیوهٔ کفر و دیں بہم ساختہ
غم را بوجود و عجم ساختہ
آثار بزرگی ست از حیثیت پیدا
گہ باعرب و گر با عجم ساختہ

بزرگی میں بھی شعر کا ملکہ تھا جواب میں لکھا

روزے کے نہادیم دریں دہر قدم را
گفتیم صلائیست عرب را و عجم را

''گفتیم صلائیست عرب را وعجم را'' پر غور کیجئے، ایک طوائف کی کاروباری سیرت بہ تمام وکمال نظر آئے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''غبار خاطر'' میں صاحب ماثر الامراء کے حوالے سے اورنگ زیب کی ازخود رفتگی کا ایک واقعہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:

''برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آبادی کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی۔ جو زین العابدین کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے نغمہ وحسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانہ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحب ماثر الامراء نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر کہا ہے۔

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق ربائی ہا
نگاہ آشنائے یار پیش آز آشنائی ہا

اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا۔ لیکن ایک زمانہ میں گوشت پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا۔ اور کہہ سکتا تھا کہ

گز.جگی ہے یہ فن بہار ہم پر بھی

ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سامنے میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا زین آبادی نے نہ تو شہزادہ کی موجودگی کا پاس لحاظ کیا نہ اس کی خالہ کا۔ بے باکانہ اچھلی اور ایک شاخ بلند سے پھل توڑ لیا۔ خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادہ پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا

بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من
کوتاہ کرد قصہ زہد دراز من

صاحب ماثر الامراء نے لکھا ہے کہ بکمال ابرام و سماجت زین آبادی زار خالہ محترمہ خود گرفتہ، با آن ہمہ زہد خشک و تفقہ نجت، شیفتہ و دلدادہ اوشد، قدح شراب بدست خود پر کردہ می داد گویند، روزے زین آبادی زاہم قدح بادہ پر کردہ بہ دست شہزادہ داد و تکلیف شرب نمود" یعنی بڑی منت والی الحاح کرنے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہد خشک اور خالص تفقہ کے جس کے لئے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کے پیش کرتا اور عالم نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگائے۔ دیکھئے عرفی کا ایک شعر کیا موقع سے یاد آ گیا اور کیا چسپاں ہوا ہے۔

ساقی توئی و سادہ دلی بیں کہ شیخ شہر
باور نمے کند کہ ملک مے گسار شد

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو۔

درد چشم تو تا خمار باقیست — مے حاجت نیست مستیم را

لیکن اس عیار کو رحم نہ آیا۔

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی بیآموز آں دو چشم نا مسلماں را

ناچار شہزادے نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگائے گویا۔ ولقد همت به وهم بها کی پوری روئداد پیش آ گئی۔

عشقش خبرز عالم مد ہوش آورد
اہل صلاح رابقدرح نوش آورد

لیکن جونہی اس خسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہوکر پینے کے لئے آمادہ ہوگیا ہے۔فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا

غرض امتحان عشق بود نہ کہ تلخ کامئی شمار

ایں جو دیگر است کہ آزاد عاشقاں
چنداں نے کند کہ بہ آزاد خوکنند

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہ جہاں تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ داراشکوہ نے اس حکایت کو اپنی شکایت وغمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا ''بینید ایں مزورریائی چہ صلاح وتقویٰ ساختہ است؟''

فیضی نے خوب کہا ہے۔

چہ دست می بری اے تیغ عشق گر داد است
ببر زباں ملامت گر زلیخا را

نہیں معلوم اس قضیہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا لیکن قضا وقدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ یعنی عین عروج شباب میں زین آبادی کا انتقال ہوگیا! اورنگ آباد کے بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

اورنگ زیب کے بعد سلطنت آفتاب گہن میں آ گیا تمام ملک میں عالم سے میری پینٹ اکھڑ گیا۔ شمشیر وسنان طاق نسیان میں چلے گئے۔ اوران کی جگہ طاؤس ورباب نے لے لی، ہر کوئی عیاشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر کہیں طوائف الملو کی کا دور دورہ تھا۔ ہر کسی کی آنکھ کا پانی مر چکا تھا۔ ہر گھر میں وضع داری نے دانت نکوس دیئے القصہ مختصر ملک لہو ولعب کا ایک عبرت ناک مرقع تھا۔ غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی بیٹیوں اور بہوؤں کو ننگے بدن ناچنے پر مجبور کیا۔ وہ ناچنے لگیں اور خود خنجر کھول کر بظاہر غافل ہوگیا۔ وہ ناچ چکیں تو خنجر اٹھایا اور کہا، غیرت تیمور کے گھر سے واقعی رخصت ہو چکی ہے۔

محمد شاہ نے نادر شاہ درانی کی مدارت کے لئے نوربائی ڈومنی کو گوایا۔ نادر شاہ اس کے نورانی گلے سے بڑا ہی خوش ہوا، انعام دیا لیکن ساتھ ہی کہا:

نوربائی روئے ہند سیاہ کن بیا کہ بہ ایرا نیت بریم

نوربائی کا رنگ فق ہوگیا لیکن پھر سنبھل گئی اور یہ غزل گائی

من شمع جانگدازم تو صبح دلربائی
سوزم گرت نہ بنیم میرا پورخ غائی

نزدیکت ایں چلیم دو آنچاں کہ گفتم
نے تاب و صل دارم نے طاقت جدائی

نادر شاہ اس برجستہ و برمحل غزل سے بہت محفوظ ہوا اور اپنے ارادہ سے باز رہا۔ الغرض ان خوش جمالوں سے بادشاہوں کی تاریخ بھری پڑی ہے اور جن عورتوں کو ہم فاحشہ کہتے ہیں وہ اصلاً ان بادشاہتوں ہی کے تنور کی سوختہ ہیں۔

(بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

رہزنی کا پہلا شکار

عورت میں مجرمیت کی قائم مقام فحاشی ہے ایک پیدائشی فاحشہ اخلاقی پاگل ہے۔ایک مجرم اور ایک فاحشہ میں یکساں خصوصیتیں ہیں...... اخلاق کا فقدان، سنگدلی کا وجود، بدکاری کا میلان، تلون مزاجی، تن آسانی عارضی اور سطحی مسرتوں کا شوق اور خورد بینی وخودنمائی کا جذبہ۔

طوائف کا مستعمل مفہوم بازاری عورت ہے ہر اس عورت کو جو اپنے جسم یا آواز کی بیوپاری ہے...... طوائف کہتے ہیں ویسے لغت میں طائفہ کی جمع طوائف ہے اور طائفہ جوق (منڈلی) کو کہتے ہیں۔ چونکہ مصر میں رقاصاؤں کی ٹولی کو جوق کہتے تھے۔اس لئے طائفہ بھی جوق کے ہی معنی میں مستعمل ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ طوائف نے جمع سے مفرد کے معنی پیدا کر لئے۔اور اب اس کا اطلاق ہر اس عورت پر ہوتا ہے جو پیشہ کماتی ہے۔ان فاحشات کو ٹھیٹھ اردو میں بیوا یا رنڈی بھی کہتے ہیں۔

یہ کہنا محال ہے کہ سب سے پہلی طوائف کون ہوئی ہے اور اس کا تعلق کس ملک اور قوم سے تھا۔اس کے باپ یا بھائی کون تھے اور کس شقی القلب نے پہلے پہل اس کو طوائف بننے پر مجبور کیا۔ بہ ظاہر چند معلومات جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں یا بعض آثار و مظاہر میں جن سے ایک اندازہ استوار ہوتا ہے اور کچھ قیاس ہیں جن پر ایک عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ان سب کے مطالعہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں رہزنی کا پہلا شکار عورت کی عصمت ہوئی ہے اور غالباً انفرادی ملکیت کا تصور بھی اسی سے ماخذ ہے...... یعنی محنت کے استحصال سے مدتوں پہلے عصمت کا استحصال شروع ہو چکا تھا۔

جیسے جیسے معاشرہ بدلتا گیا۔عورت سے تعلقات کی نوعیت اور خصوصیت بھی بدلتی گئیں ہر زمانہ میں ایک نیا روپ رہا۔ معلوم نہیں دھات اور پتھر کے زمانوں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا صحیح نقشہ کیا تھا۔لیکن سائنسی دور کی ایک خاص مدت تک ہر مرد عورت کو شہوانی غذا سمجھتا رہا۔اور اس کے حصول کا طریقہ شکمی غذا کے حصول سے مختلف نہ تھا۔ایک طاقت ور قبیلہ کمزور قبیلہ کی آبادیوں پر چڑھائی کر دیتا۔ سردار گھوڑے پر سوار ہوتا۔ چند لوگ نقادوں پر چوٹ لگاتے اور باقی نبرد آزما ہوتے حملہ آور مفتوح مردوں کو قتل کر دیتے جو عورتیں مردوں کے تخلیہ میں آچکی ہوں ان کو ہلاک کر ڈالتے کنواریوں کو لشکر یوں میں بانٹ دیتے اور اس طرح فاتح بن کر لوٹتے۔(صحیفہ قاضیون باب 21 آیت 2310)

بظاہر عجیب سی بات ہے لیکن ایشیائی اقوام میں برات کا جو طریقہ رائج ہے۔اس پر غور کرنے سے پتہ چلا ہے کہ شادی دراصل اس عسکریت ہی کے ثقافتی ارتقاء کی ایک معاشرتی صورت ہے اور وہ زیور جو دلہنیں پہنتی ہیں ان

عسکری فتحمندیوں ہی کی علامت ہیں مثلاً ہتھکڑیوں کا بدل چوڑیاں یا کڑے، بیڑیوں کی جگہ پاؤں کی جھانجنیں ہیں۔طوق کی جگہ ہنسلی مالا اور کنٹھا۔اور نکیل کی جگہ نتھ اور بالیاں ہیں۔اس طرح دلہن کے ماتھے پر جو سونے کا ٹیکا ہوتا ہے۔اس کی صورت عورت کے اندام پر ہے۔اب بھی قیدی عورتوں کی جو صدیوں پرانی تصویریں دیکھنے میں آتی ہیں ان سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔

یہ دور گیا تو اشتراک فی النسواں کی بنیاد پڑی یعنی ایک عورت کو اس مرد کی ملکیت قرار دے دیا گیا جو اس کی دسترس رکھتا تھا۔بعض محققین کا خیال ہے کہ فحش کے غیر شعوری مرض کا ابتدائی علاج نظام امہانی اور نظام بطریقی کا قیام تھا۔جو ہزار ہا تاریخی کروٹوں کے بعد مرد اور عورت کے موجود رشتے تک پہنچا ہے چنانچہ عورتوں کے فحش پر بیوائی کی جو مہر لگی ہے اس کی عمر چند ہزار سال سے زیادہ نہیں۔البتہ اس سوال پر خاصا اختلاف ہے کہ فحاشی عہد وحشت کی یادگار ہے یا نہیں؟

بعض کا خیال ہے کہ فحش کاری عہد وحشت سے بہت بعد کی چیز ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس عہد کا انسان اس تصور ہی سے خالی تھا۔عورت اور مرد شروع ہی سے ازدواجی زندگی میں رہے صرف ماحولی صورتیں بدلتی رہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شروع شروع میں ازدواجی کی تین صورتیں تھیں اولاً مرد کئی بیویوں کا شوہر ہوتا۔ ثانیاً عورت کے کئی شوہر ہوتے۔ ثالثاً عورت اور مرد ایک محدود زمانہ کے لئے ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہو جاتے تھے۔ چنانچہ عورت کے اس فحش ہی کا نتیجہ دختر کشی کا رواج تھا۔

ایک اور عجیب بات جو ہمیں نظر آتی ہے وہ انسان کے ابتدائی مذاہب سے فحش کا گٹھ بندھن ہے تمام مذاہب انسان کی دکھتی ہوئی پیٹھ کو سہارا دینے کے لئے آئے تھے۔لیکن مرور زمانہ سے ان کی اصلی روح تو ختم کر دی گئی۔ ایک جسم باقی رہ گیا اور وہ لوگ ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ جو فحش کے مختلف محرکات کو بھی منجملہ عبادت سمجھتے تھے یہ تو انسان کے ابتدائی مذاہب کا حال تھا، خود عالمی مذہب اشتداد کے زمانہ کے باعث اپنے پیروؤں کی نفسی خواہشوں کا شکار ہو گئے اور رفتہ رفتہ انسانی فطرت کی کجروی نے ان میں بھی فحش کے لئے کوئی نہ کوئی گوشہ تلاش کر لیا۔ چنانچہ آج عالمی معاشرہ میں جتنی بھی فاحشت میں تمام پر ''مذہبی'' ہیں اور ''مذہبی'' اس مفہوم میں کہ وہ ''خدا اور آخرت'' کے تصور پر ہماری طرح یقین رکھتی ہیں۔

یونان کے ایک مشہور سیاح، ہیروڈوٹس (5000 قبل مسیح) نے لیڈیا کے سفرنامہ شاہ اسیانیس کے مقبرہ کا جو حال لکھا ہے کہ اس کی تیاری میں جو رقم صرف ہوئی اس کا بڑا حصہ پیشہ ور عورتوں کا دیا ہوا تھا۔اسی مورخ کا کہنا ہے کہ عام لوگوں کی لڑکیاں پیشہ کماتی اور اپنے جہیز کے لئے روپیہ جمع کرتی تھیں۔ بابل کے لوگ اپنی عورتوں کو افرادتیہ دیوی کے مندر میں مردوں سے اختلاط کے لئے بھیج دیتے تھے۔ان عورتوں کی چوٹی میں پھول گندھے ہوتے تھے یہ غیر مردوں کی راہ تکتیں جب کوئی عورت کسی مرد کو پسند آجاتی تو وہ اس کی جھولی میں چاندی کا سکہ پھینک دیتا وہ چار و ناچار اس سکہ کو قبول کر لیتی اور ساتھ ہو جاتی گھر لوٹتی تو اسے فخر کی چیز سمجھا جاتا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ سب مادیت کی فکر گستاخ کے کرشمے ہیں۔ لیکن یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ایک زمانہ میں فحش کو انسانی مذاہب کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور یہ مذہبی فحاشی ہی کے برگ و بار ہیں جو مرورِ ایام سے طوائف کے وجود میں منتقل ہو گئے ہیں۔

آج کی قحبہ عورتیں دراصل قدیم الایام کی ''مذہبی فاحشات'' کا ردعمل ہیں جن عورتوں کو یونان میں تہائرہ، روم میں کنواری، بابل میں کاوشستو، ہندوستان میں دیوداسی اور بغداد میں جواری کہا گیا ان ہی عورتوں کی تحریف کا نام طوائف ہے اس بازاری فحش کے محرکات میں سے بعض یہ ہیں:

اولاً...... معاشرے کے اخلاقی ارتقاء جس سے متمدن ملکوں میں ازدواجی زندگی باضابطہ اور مہذب ہو گئی اور اس زندگی کو شہوانی انتشار سے بچانے کے لئے پیشہ وروں کو ایک ادارہ بنا دیا گیا۔

ثانیاً...... مردوں اور عورتوں کے تناسب کا فرق جس سے خرابی کے برگ و بار پیدا ہوتے چنانچہ جن ملکوں میں یہ فرق بڑا نمایاں ہے وہاں فحاشی بھی اسی نسبت سے نمایاں ہے۔

ثالثاً...... وہ افراد جن کی بے ڈھب عیاشیاں خاندانی عزتوں کے درپے ہوتی ہیں۔

رابعاً...... طبقاتی سماج میں اقتصادی تفاوت اور انفرادی ملکیت کی مضرتیں۔

یورپ میں کئی مسیحی فرمانرواؤں نے قحباؤں کی سرپرستی کی وہ ان کی آمدنی سے اپنا خزانہ بڑھاتے رہے۔ لیکن بعض نے ان کا قلع قمع کرنا چاہا ایک ہزار برس تک نسلاً بعد نسل اصلاحِ احوال کی کوششیں کی گئیں۔ یہاں تک کہ فاحشہ عورت کے لئے سزا مقرر ہو گئی۔ لیکن فحاشی کہیں بھی نہ رک سکی۔ بالآخر ان کے ادارہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ کوریات نے وینس کے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ سترھویں صدی کے آغاز میں بیس ہزار کے قریب کسبیاں ایسی تھیں جن سے حکومت کو اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ اس سے ایک درجن جنگی جہازوں کے مصارف پورے رہتے تھے۔

یونان ڈھلا تو روما بڑھا، وہاں عورت کا درجہ نسبتاً وقیع تھا۔ لیکن روما کا آفتاب بھی ڈھل گیا اور فحاشی کا ایسا زور بندھا کہ سسرو جیسا معلم اخلاق اور سحر بیان مقرر جس نے خطابت کے اصول مدون کئے ہیں۔ نوجوانوں کے کسبیوں سے اٹھانے کی تائید کرتا ہے۔ ہر چند کہ مسیحیت نے قحبگی کی روک تھام کی لیکن بعض انفرادی مساعی کے علی الرغم مسیحی ممالک وہ کھل کھیلے ہیں کہ اب گناہ بھی آرٹ ہو گیا۔

عالمگیر مذاہب میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورت کو نصف کائنات سے تعبیر کیا اس کے حقوق تسلیم کئے۔ فحش کی مخالفت کی، زنا کو حرام قرار دیا اور چکلہ کے تصور ہی کو محو کر دیا لیکن جب مسلمان بادشاہوں کے دل و دماغ اسلامیت کے تصور سے خالی ہو گئے۔ تو سبھی بند ٹوٹ گئے۔ یہ ایک عجیب سی حقیقت ہے کہ ایشیاء کے اسلامی ملکوں میں قحبگی کو مسلمان بادشاہتوں نے پروان ہی نہیں چڑھایا بلکہ اس کی کاروباری قبا میں بعض دلچسپ پیوند بھی لگائے اور یہ صورت حالات ظاہر کرتی ہے کہ عورت بازارِ فحش کی جس منزل سے بھی گزری ہے اس کے

ذمہ دار مرد ہیں اور صرف مرد۔ مرد نے عورت کو کھلونا سمجھا۔ چنانچہ مرد کی نفسی خواہشوں کے غلبہ کا نام ہی فحاشی ہے۔ کوئی عورت فاحشہ ہونا پسند نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ ایک طوائف بھی نسوانی حیات تہی نہیں ہوتی۔ ماسوا ان عورتوں کے جن کی عادت پختہ ہو کر فطرت بن جاتی ہے کبھی کوئی عورت برضا ورغبت مختلف مردوں کا کھلونا بننا گوارا نہیں کرتی۔ آپ کسی بھی کسبی کے دل کو ٹٹولئے اور اس کی روح کے زخم سے کھرنڈ اتار کر دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ محض اس لئے مونڈھے پر بیٹھتی ہے کہ اس کی ''عورت'' مر چکی ہے اور جو باقی ہے وہ عورت نہیں بستر ہے۔

دراصل جسمانی فحاشی ایک طاعون ہے اس کا مریض بھی دق کے مریض کی طرح چار و ناچار زندگی بسر کرتا ہے۔

جن حکماء نے قحبگی کے انسداد کی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے ان کا خیال ہے کہ قحبگی ناگزیر معصیت ہونے کے باوجود ایک مفید ادارہ ہے جو معزز گھرانوں کی عفت وعصمت کا پشتیبان ہے ایک فلسفی شاعر کا قول ہے۔

کسبی اخلاق عامہ کی بداخلاق نگراں کار ہے

بلزاک لکھتا ہے طوائف خود کو جمہوریت پر قربان کر دیتی اور اپنے جسم کو معزز خاندانوں کا پشتیبان بنا دیتی ہے۔ شوپنہار کہتا ہے کسبیاں وحدت ازدواج کی قربان گاہ پر انسانی قربانیاں ہیں۔

لیکی نے تاریخ اخلاق یورپ میں کسبیوں کو بے شمار خاندانوں کی پارسائی کا نگہبان قرار دیا ہے۔ ایک عجمی مصنف نے لکھا ہے کہ اس معاشرہ میں استلذ اذ بالمثل کا بہت بڑا بوجھ طوائف کے کاندھوں پر ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم ان رایوں سے اتفاق کریں ان کے مصنف غالباً سماج کے معاشی تعلقات پر غور نہیں کرتے حالانکہ جتنی خرابی ہے طبقاتی ہے اور طبقاتی ملکوں ہی کے فکر و عمل نے طوائف کو ناگزیر معصیت قرار دیا ہے۔

طوائف کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ اس نے اپنے ''حسن و قبح'' کے باوجود بڑے بڑے دماغوں پر حکومت کی ہے۔ کئی شہنشاؤں کو زیر نگیں کیا۔ کئی مملکتوں کو اجاڑا کئی فرمانرواؤں کو جھکایا، عیاشیوں کے خزانے لٹا دیئے۔ سلطنتوں کی بنیادیں ہلا ڈالیں، حرمات شاہی کو خون کے آنسو رلوایا۔ نسل انسانی کو جنگوں میں جھونکا اور جن کی گردنوں میں پگھلا ہوا سیسہ تھا انہیں مجبور کیا کہ موم بتی کی طرح پگھلیں۔ چنانچہ یورپ اور ایشیا کے اوراق تاریخ کا ایک بڑا حصہ ان کے اذکار و اشغال سے پر ہے، مثلاً:

طوطسیہ وی آرگونا کی شعریات ہسپانوی ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ درونیکا فرانکو یونانی علم الاصنام کی ماہرہ ہوئی ہے۔ فرانس کا شہنشاہ ہنری سوئم اس کی ملاقات کو حاضر ہوا تھا اور چلتے وقت اس کی تصویر لے گیا۔ نینوں وی لنکلوس کے حسن و جمال کا اتنا شہرہ تھا کہ خاندان سیوزنہ کی تین پشتیں اس کے چاہنے والوں میں گزریں۔ اس کا مکان بڑے بڑے درباؤں کو مات کرتا تھا۔ رہوڈوپی ایک مشہور کسبی گزری ہے جس نے مصری اہرام میں سے ایک ہرم بنوایا تھا۔ پریکلز کے متعلق پلوٹارک نے لکھا ہے کہ اس نے رسیاسا کی نام کی ایک کسبی کو خوش کرنے کے لئے ایتھنز کو جنگ میں جھونک دیا۔ خود سقراط اس کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔

انقلاب فرانس نے قحبگی کے ایک کو جنم دیا۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے کہ اس انقلاب کی حیثیت جمہوری

اور سیاسی ہے۔ اخلاقی اور روحانی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شراب خانے محلسرا بن گئے۔ بازاری بیگمیں ہو گئیں اور بدچلن پناہ گزینوں نے ہم سب کو نستعلیق کر دیا۔ آج عیاشوں کے گروہ ہمارے بازاروں میں چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔

صنعتی یورپ نے مقدس فحاشی کو تو قریب قریب ختم کر دیا ہے لیکن اس جگہ مہذب فحاشی آ گئی ہے فحش و گناہ کی نئی نئی تعبیریں کی گئیں۔ اخلاق کو اضافی سے کہا گیا۔ اعلانیہ بحثیں ہونے لگیں کہ عفت کس بلا کا نام ہے۔ تقویٰ کس کو کہتے ہیں؟ جو چیز مناکحت سے جائز ہوتی ہے۔ وہ بغیر مناکحت کیوں جائز نہیں؟ جب ہاتھ ملانا کوئی جرم نہیں تو جسم ملانا کیوں جرم ہے؟ اچھایا برائی کا اپنا کوئی وجود نہیں دونوں ہمارے اپنے ہی فکر کا پرتو ہیں۔

فرانسیسی افسانہ نگاروں کی نوجوان پود نے ان نظریوں کی اشاعت کے لئے اپنا سارا زور بیان صرف کر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ژورژ ساں ایک مشہور فرانسیسی ادیبہ ہوئی ہے۔ جس نے جنسی تعلقات کی رنگارنگی پر زور دے دیا ہے الغرض پہلی جنگ عظیم **(1914-1918)** میں یورپ نے اخلاقی قدروں کا اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تمام یورپی ملکوں میں فرانس بازی لے گیا۔ فرانسیسی اکابر کا ایک ہی نعرہ تھا۔ ''بچے جنو اور جناؤ'' مناکحت کی ضرورت نہیں، کنواری یا بیوہ جو عورت بھی وطن کے لئے رحم کو رضا کارانہ طور پر پیش کرتی ہے وہ عزت کی مستحق ہے۔ ان عورتوں کو ام الوطن کا خطاب دیا گیا۔ ایک فرانسیسی قائد لکھتا ہے:

''پچھلے پچیس سال میں ہم کو اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ ''حرامی بچہ'' حلال بچے کا ہم رتبہ ہو گیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے بچے پیدا ہوا کریں تا کہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے۔''

ایک معلمہ ناجائز بچے جننے کے جرم میں معطل کر دی گئی تھی، اس کو فرانس کی وزارت تعلیم نے اس بنا پر بحال کیا کہ نکاح کے بغیر ماں بننا زیادہ جمہوری طریقہ ہے فرانس کے **127** ویں ڈویژن کے کمانڈر نے دوران جنگ میں ایک حکم نامہ جاری کیا تھا۔ جس کے الفاظ یہ تھے۔

> ''معلوم ہوا ہے کہ فوجی قحبہ خانوں پر بند وقچیوں کے ہجوم اور اجارہ کی وجہ سے سوار اور پیادہ سپاہیوں کو شکایت ہے ہائی کمانڈ عورتوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا بند وقچیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ دیر اندر نہ رہا کریں اور اپنی خواہشات کی تسکین میں عجلت سے کام لیں۔''

جنگ عظیم نے تجارتی قحبہ خانوں ہی کو نہیں بڑھایا بلکہ خیراتی قحبہ خانے بھی قائم کئے۔ ان خیراتی قحبہ خانوں کا مقصد فوجیوں کی دل جوئی تھا، فرانس کی وزارت جنگ نے ان خیراتی قحبہ خانوں کو **(War-Good-Mother)** کا لقب دیا، اردو اس کے ترجمے ہی سے معذور ہے۔ اب کئی برس سے فرانس میں قحبگی کا پیشہ انفرادی نہیں رہا۔ بلکہ اجتماعی تجارت اور اجتماعی صنعت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کئی لمیٹڈ کمپنیاں قائم ہیں ان کے کارندے بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ اخبارات میں اشتہارات چھپتے ہیں۔ جن ملازموں کے

سپرد ملک کے مختلف حصوں سے ان ''عروسان یک شب'' کی فراہمی کا کام ہوتا ہے وہ اس پیشہ کی باقاعدہ فنی تربیت حاصل کرتے اور دفتری معیار پر کام چلاتے ہیں۔

جرمنی میں ڈاکٹر ماگنوش نے لواطت کے حق میں چھ سال تک جدوجہد کی اور حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ احتساب اٹھائے۔ ڈاکٹر ماگنوش کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جانبین رضامند ہوں تو حکومت کے لئے کون سا عذر رہ جاتا ہے؟ کیا اس سے مملکت کو نقصان پہنچ جاتا ہے کیا یہ زیادہ فطری طریقہ نہیں؟ جو لوگ اس کو وہ غیر فطری کہتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ وہ محض ایک فرسودہ قول دہرائے چلے جاتے ہیں اس کے برعکس عورت کو مرد سے اختلاط کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے یا تو وہ ماں بن جاتی ہے یا بچے ضائع کرتی ہے لیکن لواطت میں اس کا قسم کا کوئی خطرہ نہیں بلکہ اس ہم جنسی سے قحباؤں کی افزونی بھی رک سکتی ہے۔

انگلستان بھی اس تہذیب میں ڈوبا ہوا ہے اور اب وہاں تو مرد پرستی قانوناً آزاد ہوگئی ہے امریکہ میں قحبہ خانے آرٹ کے درجے پر ہیں۔ اس کی بدولت امریکہ میں ہر سال کم سے کم 15 لاکھ حمل ساقط ہوتے ہیں اور ہزار ہا حرامی بچے اس پر مستزاد ہیں جو موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ کئی سال ہوئے ہیں مجلس اقوام نے مختلف ممالک سافحاشات کے جواعداد و شمار حاصل کئے تھے۔ وہ برائے نام ہیں جتنی فاحشات تمام عالمی ملکوں میں بیان کی گئی ہیں اتنی فاحشات ان میں سے کسی ایک ملک میں ہیں اس بورژوا سماج نے (جو استحصال کے نقطہ آخر تک پہنچ چکا ہے) دو چیزیں ہوا فر کر دی ہیں (۱) محنت کی لوٹ کھسوٹ (۲) عصمت کی خرید و فروخت۔ سائنسی نظام کے ڈھیلا پڑ جانے کی وجہ سے پیشہ ور فاحشات تو ختم ہو رہی ہیں مگر ان کی جگہ غیر پیشہ ور نے لے لی ہے۔ ہر متمول انسان کو ذہنی و جسمانی عیاشی کے لئے پورے سماج پر دسترس ہے تمام معاشرہ ایک طوائف ہے اور پورا آرٹ ایک چکلہ، رس کو اندیشہ تھا کہ آئندہ نصف دنیا کے باپ وزراء ہوں گے یا پادری؟

(بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

گوشت ہی گوشت

''اے پشتیماز رتشتر! یہ گاہی (کسبی) ہے جو اپنے اندر مومنین و منکرین یعنی برے اور بھلے دونوں قسم کے آدمیوں کا بیج ملاتی ہے اس کی نگاہ اس عظیم سیلاب کے پانی کو جو پہاڑوں سے آتا ہے ایک ثلث خشک کر دیتی اور ایک ثلث طلائی پودوں کو مرجھا دیتی ہے اس کے لمس سے مومن کے نیک خیالات، پسندیدہ اقوال، حسنہ اعمال، جسمانی قوت، قوائے فتح مندی اور روحانی تقدس کا ایک تہائی خاک میں مل جاتا ہے۔ (زرتشت)

لاہور کا موجودہ چکلہ بوڑھے راوی کا ہم عمر ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ انحطاط سے اس کا آغاز ہوتا ہے اس سے پیشتر چوک بازار چکلہ سے رسالہ بازار تک جس میں نئی اور پرانی انار کلی کا علاقہ شامل ہے۔ کسبیاں بیٹھا کرتی تھیں۔ اردگرد مغلوں کی سرکاری عمارتیں یا ان کے کھنڈر تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں شہر لاہور کا نصف چکلہ تھا۔ ممکن ہے رنڈیوں کی اس بہتات کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ لاہور ہمیشہ ہی فوجوں کی گزرگاہ رہا ہو۔ جب غیر ملکی حملہ آور خیبر پار سے ہندوستان میں داخل ہوتے تو ان کا پہلا پڑاؤ لاہور ہوتا اس کے علاوہ سندھ، سرحد اور دہلی کے فوجیوں نے بھی لاہور کو جولا نگاہ بنائے رکھا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شہر فوج کی زد میں ہو تو اس کی دولت ہی نہیں عصمت بھی لٹتی ہے فاتحین چکلے بناتے ہیں اور مفتوحین کسبیاں جنتے ہیں۔

برعظیم پاک و ہند کے چار بڑے چکلوں میں لاہور کا چکلہ چوتھے درجہ پر تھا۔ بیس سال پہلے اقوام متحدہ کی ثقافتی کمیٹی نے مختلف ملکوں کی کسبیوں کے جو اعداد و شمار فراہم کئے تھے۔ اس کے مطابق اول کلکتہ تھا۔ دوم بنگلور سوم بمبئی اور چہارم لاہور۔

تب کلکتہ میں ایک لاکھ سے زائد رنڈیاں تھیں اور ان میں لگ بھگ پچانوے فیصد نکیائیاں تھیں جس ادارہ کا نام طوائف ہے وہ یا تو لکھنؤ میں رہا یا آگرہ میں یا دہلی میں یا پھر لاہور میں۔

لاہور کا بازار عام بازاروں کے طرز پر نہیں کئی بازاروں اور کئی محلوں کے وصل سے ایک بڑے قصبے کے برابر ہے تمام علاقہ کو اجتماعاً ہیرا منڈی کہتے ہیں اس کی سطح لاہور کے ہر حصہ سے بلند ہے اگر راوی کا پانی مارکرتا ہوا اس سطح تک آجائے تو نہ صرف لاہور غرق ہو جاتا بلکہ ملتان تک کا سارا علاقہ ڈوب جاتا ہے۔

ہیرا منڈی ایک تکون کی طرح ہے عالمگیری مسجد اور اکبر قلعہ کے بائیں سمت بالا خانوں کی دور تک پھیلی ہوئی ایک قطار ہے۔ جس میں ٹیڑھی ترچھی کئی قطاریں ضم ہوتی ہیں۔ ٹیکسالی دروازہ سے داخل ہوں تو سب سے پہلے نکڑ پر شاہی وقتوں کی ایک منزلہ مسجد ہے جس کے چہرے پر برص کے داغ ہیں...... سیاہ دیواروں پر سفید دھبے...... اس کی تعمیر مغلئی طرز پر ہے۔ اس مسجد سے چند ہی قدم آگے رنڈیوں کے کوٹھے شروع ہو جاتے ہیں۔ بازار

شیخو پوریاں کے وسط سے محلہ سمیاں کو جو راستہ جاتا ہے اس کی دو یا چار دکانیں چھوڑ کر ایک گلی مڑتی ہے جس کو ٹبی کہتے ہیں یہ ایک بازاری کوچہ ہے جس کا دوسرا سرا بازار حکیماں کے آغاز پر ختم ہوتا ہے ایک پہلو میں بازار عبداللطیف ہے دوسرا موڑ ٹبی تھانے کے سانھ سے ہو کر گزرتا ہے۔ ٹھیک وسط میں گیٹی تھیٹر کا چوک ہے۔ جہاں بازار شیخو پوریاں، چیت رام روڈ، شاہی محلّہ، ہیرا منڈی، بارود خانہ کا عقبی حصہ اور اڈہ شہباز خاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔

اس زہرہ گداز فضا کے صحیح تماشائی اورنگ زیب کی مسجد...... یا کعبہ کی بیٹی کے وہ بلند قامت مینار ہیں جو سالہا سال سے انسان کی بیٹی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔

ٹبی ایک دندانہ دار کوچہ ہے اس کے اوپر نیچے دکانیں اور مکان ہیں جہاں ہر رنگ اور ہر عمر کی عورتیں بھری پڑی ہیں۔ (ملک امیر محمد خاں کی گورنری کے زمانہ میں عصمت فروشی قانوناً ممنوع ہوگئی تو یہ کوچہ بند ہو گیا نہ جانے اب صورت حال کیا ہے؟)

یہ بازار نہیں، ایک سنگین بستر ہے جہاں عورت کی عفت تھک کر ہمیشہ کی نیند سو گئی ہے۔ اس بوچڑ خانہ میں عورت قتل ہوتی ہے۔ اس کا گوشت بکتا ہے۔ برہ کا گوشت...... باکرہ کا گوشت...... آہو کا گوشت مینا کا گوشت...... گائے کا گوشت...... ہیر کا گوشت...... سوہنی کا گوشت جو سہاگ رات ہی میں بیوہ ہو جاتی ہیں کسی بھی گاہک کے لئے کوئی قید نہیں ہر بوٹی کی قیمت مقرر ہے آٹھ آنے سے تین روپے تک...... آپ نے دام پوچھا اور پھر جیسا گوشت چاہا خرید لیا تازہ، باسی، جوان، بوڑھا، سرخ، سفید، گوشت ہی گوشت۔ جسم ہی جسم؟

آپ کی چاندی اور عورت کی چمڑی۔ اس منڈی کا اصل الاصول ہے ہمیشہ دساور سے تازہ مال آتا ہے کچھ دنوں دکانوں پر نکلتا ہے اور پھر باسی ہو جاتا ہے۔

اس پیچ دار مارکیٹ میں کہیں اور کوئی سیدھا نہیں تمام بازار میں جوڑ ہی جوڑ ہیں وسط میں ایک چھوٹا سا چوک ہے۔ غربی حصہ میں ایک۔ کٹڑی ہے اور کٹڑی سے ایک تکون موڑ ہے اس موڑ پر حضرت سید قاسم شاہ مشہدی کا مزار ہے اس مزار کے پہلو میں مسجد ہے مسجد کے دروازے پر عموماً تالا پڑا رہتا ہے متولی کا کہنا ہے کہ جو لوگ چوری چھپے آتے ہیں وہ حضرت سید قاسم شاہ کے مزار کی دیوار کے سہارا لے کر مسجد کے عقب سے نکل جاتے ہیں لیکن بعض کھلنڈرے مسجد کی اہانت کو محسوس نہیں کرتے اور اسی کو چور دروازہ بنا لیتے ہیں۔

حضرت سید قاسم شاہ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں مشہد سے لاہور تشریف لائے تھے اور اس جگہ قیام فرمایا۔ جہاں دفن ہیں۔ مزار کے پڑوس میں ایک کھلے صحن کا مکان ہے جس کا چوبی دروازہ اندر سے بند رہتا ہے سید اولاد شاہ گیلانی ایم اے جو آپ کی پوتی کے بیٹے ہیں اس مکان میں رہتے ہیں۔ شاہ صاحب مدرس رہ چکے ہیں تقریباً بیس سال تک ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان میں سیکرٹری رہے کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں ان کا بیان ہے کہ ٹبی اسم تصغیر ہے ابتدا میں اس جگہ ٹبہ (ٹیلا) ہوتا تھا۔ حضرت قاسم شاہ نے اس کو اقامت وعبادت کے لئے

چن لیا مسجد کی بنیاد رکھی، حجرہ بنوایا اور یاد اللہ میں مشغول ہو گئے تھوڑے ہی دنوں میں ان کے فقر و استغنا کا چرچا ہو گیا۔

انہی دنوں چیچو کی ملیاں (شیخوپورہ) کے بعض خانہ بدوشوں نے ٹبی کے نشیب میں قیام کیا یہ لوگ اپنے آپ کو پنجاب کی مختلف ذاتوں سے منسوب کرتے تھے ان کا کام چٹائیاں بننا اور چقیں بنانا تھا۔ لیکن پیٹ کی مار صورتوں کے ساتھ سیرتیں بھی بگاڑ دیتی ہے۔ ان کی عورتیں خوبصورت تھیں ان سے چوری چھپے پیشہ کمانا شروع کیا۔ حضرت قاسم شاہ کے فرزند حضرت میرن شاہ جو اس وقت دس گیارہ برس کی عمر کے تھے۔ ان کی جھونپڑیوں میں شب کو گھس جاتے، دیئے گل کرتے اور چلاتے:

سئور آ گئے سئور، سئور آ گئے سئور

اس پر چند لوگ حضرت قاسم شاہ کی خدمت میں پہنچے اور مرشد زادے کی شکایت کی شاہ صاحب نے فرمایا:

''میرن! ان کے لئے دعا کرو بد دعا نہ دو سئور بھی تو خدا کی مخلوق ہیں''

ان خانہ بدوشوں ہی کی اولاد ہیرا منڈی کے پشتینی کنچوں کی صورت ہے اور ان کی بڑی بڑی حویلیاں ہیں۔

جب حضرت میرن شاہ کا **1878**ء میں وصال ہو گیا تو ٹبی کا نام کوچہ میرن شاہ رکھا گیا۔ لیکن **1920**ء یا **1921**ء میں پولیس کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ علی گوہر نے اپنے نام سے منسوب کر لیا وہ انتقال کر گیا تو کوچہ گاڈیاں کہلایا اب ٹبی یا چکلہ کہتے ہیں۔

ہر سال عرس کے موقع پر پشتینی رنڈیاں حضرت قاسم شاہ کے مزار پر حاضر ہوتی اور مجرا کرتی ہیں۔ انہی حضرت قاسم شاہ کے برادر زادے حضرت علامہ میر حسن سیالکوٹی علامہ اقبالؒ کے استاد تھے۔ علامہ میر حسن کے دو بیٹے تھے نقی شاہ اور تقی شاہ۔ نقی شاہ کے علامہ اقبالؒ سے دوستانہ مراسم تھے۔ ''امروز'' کے ''اقبال نمبر'' میں نقی شاہ کے نام علامہ اقبالؒ کے جس خط کا عکس چھپا تھا۔ اس میں امیر کا ذکر تھا۔ امیر ایک نامور طوائف ہوئی ہے!

ٹبی میں کوئی دو سو کے لگ بھگ دوکانیں، مکان یا ڈربے ہیں جہاں کوئی ساڑھے چار سو کے قریب عورتیں بیٹھتی تھیں ان کا کام صرف جسم فروشی تھا کیونکہ عصمت نام کی کوئی چیز بھی وہاں نہ تھی ان کی دکانیں صبح بارہ بجے کھلتیں اور رات بارہ بجے بند ہو جاتیں چونکہ یہ عورتیں بکاؤ مال تھیں اس لئے ان کے ٹھیکیدار یا ان ٹھیکیداروں کے گماشتے سر پر کھڑے رہتے۔ نرخ اور ہوس باقی سب موقوف۔

عورتیں کیا؟ تاش کے پتے، چوسر کی نردیں، آم کی گٹھلیاں، کیلے کا چھلکا، خربوزے کی پھانک، گنے کی پوریں، سگریٹ کا دھواں، عورت نہیں شارع عام۔ ان کا وجود خوفناک قہقہہ تھا، ایک عریاں گالی، ایک سنگین احتجاج ایک اوپن ایئر تھیٹر، ایک سرکاری کمیونک علماء سے معذرت کے ساتھ ایک عوامی شاہکار۔

عورتیں نہیں قبریں، عورتیں نہیں چتائیں

عورتیں نہیں ہچکیاں عورتیں نہیں آنسو

فطرت کے آنسو، انسان کے آنسو، خون کے آنسو، آنسو ہی آنسو

ع آدمی محسوس کرتا ہے خدا خاموش ہے

ٹبی سے باہر بازار شیخوپوریاں ہے۔ ہیرامنڈی کے چوک تک رنڈیوں کے مکان یاد کانیں ہیں اس علاقہ کا سب سے بڑا چودھری سیالکوٹ کا ہے، کوئی درجن ڈیڑھ درجن لڑکیاں اس کے تصرف میں ہیں اس کی روزانہ آمدنی چار پانچ سو روپے ہوگی اس کے پاس رائفل ہے۔ گولیاں ہیں کار ہے، تانگہ ہے، گھوڑیاں ہیں، دولت ہے، اثر ہے، رسوخ ہے غرض سبھی کچھ ہے اس لئے کہ لڑکیاں ہیں۔

شاہی محلہ کی مختلف نکڑیوں میں یہ خانے ہی یہ خانے ہی یہ خانے ہیں۔ ایک طرف ڈینٹل ہسپتال کے نکڑ پر دوسری طرف شاہی مسجد کو نکلتے ہوئے چوک میں بہت سے نوجوان کھڑے رہتے ہیں ان کا کام دلالی ہے کاریں آتیں، کھسر پھسر ہوتی، سودا چکتا اور پھولے کرنکل جاتی ہیں۔

ہیرامنڈی کے چوک سے کوچہ شہباز خان سے آخری سرے تک پشتین کنچیوں کے مکانات ہیں۔ کچھ خاندانی رنڈیاں مدرسہ نعمانیہ کے آس پاس رہتی ہیں۔ اکثر مرکھپ چکی ہیں بعض کی اولاد بڑے بڑوں کے گھر اٹھ گئی ہیں اور بعض ابھی تک پرانے ڈگر پر چل رہی ہیں۔

ہیرامنڈی اور ٹبی بازار میں بڑا فرق ہے ٹبی محض قصاب خانہ ہے ہیرامنڈی تصویر خانہ، ایک آرٹ گیلری جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ اس علاقہ کے بالاخانوں میں دن ڈھلے قحبہ انگڑائیاں لے کر اٹھ بیٹھتی ہیں رات کی پہلی کروٹ کے ساتھ ہی بازار جگمگانے لگتے ہیں۔ کوئی نو بجے شب دروازے کھل جاتے ہیں۔ ہر بیٹھک کی تیاری مکمل ہو چکتی ہے ہر کوئی آ جا سکتا ہے۔ لیکن ان بالاخانوں میں جانے کے لئے روپیہ اور ہمت کی ضرورت ہے۔ کئی حویلیاں نسلی کنچیوں کی ہیں۔ یہ لوگ مالدار ہیں ہرا ایرا غیرا ان کے ہاں نہیں آ جا سکتا۔ ان کے ٹھاٹھ شاہانہ ہیں ان کے جسم شاہی کھلونا ہیں ان کی محلسرائیں جدید وقدیم امتزاج کا نمونہ ہیں۔ ڈرائینگ روم ہیں خاصا خانے اور خلوت خانے ہیں قالین ہیں ڈوریوں سے کسے ہوئے پلنگ ہیں۔ فرش پر بچھی ہوئی ستھری چاندنی ہے چاندی کے نقشی پائدان ہیں۔ پھولدار اگالدان ہیں مغلئی حقے ہیں۔ دیواروں پر جلی آئینے ہیں اور چھت گیریاں ہیں وسط میں جھاڑ ہیں!

ایک طرف میراثی ساز لئے بیٹھے رہتے اور جب تک گاہک نہ آئیں تانا، ری ری کرتے پھبتیاں کستے، لطیفے جھاڑتے اور حقے پیتے ہیں۔ ان کی شکلیں عجیب سی ہوتی ہیں ہر کوئی گھن لگا ایندھن ہے۔ اکثر جواری ڈھنڈاری ہیں جو کچھ رات میں کماتے دن کو ہار دیتے ہیں خرانٹ صورت ہیں۔ چرکٹے ہیں۔ نٹ کھٹ ہیں۔ چیر غٹو ہیں۔ اول جلول ہیں۔ لیکن ہیں آٹھوں گانٹھ کمید، انہیں رنڈیوں کے لاحقے اور سابقے کا نام دینا زیادہ بہتر ہے عام گنوار نیں انہیں استاد جی کہتی ہیں فطرت نے رنڈی کے چہرے سے حیا اور میراثی کے چہرے سے رونق دونوں چھین رکھی ہیں۔

جب شوقین مزاج آتے ہیں۔ تو یہ ایک نظر میں ان کا جائزہ لیتے ہیں ان کا قیافہ عموماً درست ہوتا ہے کوئی مالدار ہو تو ان کی آنکھیں شکرانہ پڑھتی نظر آتی ہیں ان کے چہروں کا اتار چڑھاؤ گاہک کی جیب پر ہوتا ہے۔ وزنی جیب مرمریں جسم، طبلہ کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھن چھن، سارنگی کا لہرا، باجے کی کمک آواز کا شعلہ، غرض کہ ہر شے سروں میں گھٹی ہوتی ہے۔ گاہک آتے اور جاتے ہیں جب کوئی آتا ہے تو کواڑ بند ہو جاتے ہیں۔ نہیں تو کھلے رہتے ہیں کواڑ کھلے ہوں تو کسبیاں بھی کھلی ہوتی ہیں۔ نہیں تو کھلے رہتے ہیں۔ کچھ فلمی رسالے یا جنسی ناول پڑھتی ہیں۔ کچھ گاہکوں کی راہ تکتی ہیں۔ کچھ سگرٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولوں میں ان اجنبی مردوں کا تصور باندھتی ہیں جو انہیں کھلونا سمجھتے اور جنہیں یہ کھلونا سمجھتی ہیں لیکن کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی یاد کی ٹیسیں چھوڑ جاتے ہیں ان کسبیوں کے والدین ان کے ساتھ رہتے اور کمائی کھاتے ہیں فی الجملہ ان سے پورا خاندان پلتا ہے۔

جب رات ذرا گہری ہو جاتی ہے تو شاہی محلہ کی اندھیری گپھاؤں اور قلعہ کی سیڑھیوں کے نشیبی دوراہہ پر طرح طرح کی کاریں آ کر رک جاتی ہیں اور اس وقت تک کھڑی رہتی ہیں جب تک عشق کے ساز ٹوٹ نہیں جاتے اور حسن کی موتیا کملا نہیں جاتی یا جب تک سوہنی کا جسم تھک نہیں جاتا۔ اور مہینوال کی ہمت ٹھٹھر کر یخ بستہ نہیں ہو جاتی۔ بعض محض دیوار کے سہارے کھڑے رہتے ہیں اور کبھی کبھار سایہ دیوار ہی میں ان کی رات بسر ہو جاتی ہے۔

اور جب ہر طرف بکھری ہوئی مسجدوں کے میناروں سے الصلوٰۃ خیر من النوم کی آواز گونجتی ہے تو خانزادوں کی رنگارنگ کاریں بگٹٹ ہو جاتی ہیں اور ان کے تعاقب میں کتوں کے مدھر گیت دور تک چلے جاتے ہیں۔

سورج جاگتا ہے قحبہ سو جاتی ہے اور اگر کچھ رہ جاتا ہے تو حکایت شبینہ کے غیر مرئی حروف جن سے چہروں پر ایک تھکن سی ہوتی ہے۔ بازار کیا ہے لالہ زار ہے۔ ہر شاخچہ کی کونپلیں شبنم سے نہیں سیم سے کھلتی ہیں انہیں دن کی چمک سلا دیتی ہے اور رات کی کھنک جگا دیتی ہے ان میں سے بعض عورتیں اناروں کے کنج ہیں دانہ دانہ پر مہر لگی ہے۔ بعض انگوروں کا گچھا ہیں کہ رندوں کا حلقہ نچوڑتا ہے۔ بعض گوؤں کا چونہ ہیں کہ گوالے دودھ دوہتے ہیں۔ بعض گلیوں کی گہل ہیں کہ شوقین مزاج گودا کھا جاتے اور چھلکا پھینک دیتے ہیں۔ بعض روٹیوں کی تھئی ہیں۔ کہ نفس بھوکے ٹوٹے پڑتے ہیں اور بعض پانوں کی ڈھولی ہیں کہ بانکے پتیاں چباتے اور چباتے ہی چلے جاتے ہیں۔

عورتیں نہیں، ساز کی دھن، طبلہ کی تھاپ، رقص کا زاویہ اور بستر کی تنہائی۔

(بحوالہ: اس بازار میں۔ شورش کاشمیری)

ایک عبرت انگیز ملاقات اور قدرت اللہ شہاب

ایک روز میری ملاقات بشیراں طوائف تھی۔ وہ بڑے ٹھسے سے دفتر میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے رنگین لباس سے عطر کی باسی باسی خوشبو آ رہی ہے اور اس کی آنکھیں رت جگے اور رونے کی آمیزش سے سوجی ہوئی ہیں میں اس کی اس تراش خراش کا سرسری سا جائزہ لے کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں اور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی جانب ٹکٹکی لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔

بشیراں طوائف کھنکار کر گلا صاف کرتی ہے ''سرکار میری بات سنو'' اس کی آواز میں ایک بلغمی سا بوجھ اور کھردرا پن ہے۔

''کیا بات ہے؟''

''میری بات سنو سرکار'' وہ دوبارہ تھکن آلود آواز سے کہتی ہے۔

''سن تو رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟''

لیکن بشیراں مطمئن نہیں ہوتی۔ غالباً اس کا مدعا یہ ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کروں۔ لیکن میں بدستور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھا رہتا ہوں اس پر بشیراں طوائف ایک ہچکی لے کر رونے لگتی ہے۔ میں گھبرا کر اس کی طرف نظر اٹھاتا ہوں اور کسی انجانے خوف سے لرز اٹھتا ہوں۔ اس کی بڑی بڑی سوجی ہوئی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہیں۔ مجھے رہ رہ کر ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کی جگہ خون کے قطرے یا کچے گوشت کے لوتھڑے گرنے لگیں گے۔

مجھے اپنی طرف متوجہ کر کے بشیراں طوائف دوپٹہ کے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہے اور اس کے ہونٹوں پر اس کی پیشہ وارانہ مسکراہٹ از سر نو نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ مسکراہٹ ایک میکانکی عمل ہے اس میں ہونٹوں کے پھیلاؤ کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں۔

''سرکار، میرے گھر پر کل رات مونسپلٹی والوں نے چھاپہ مارا ہے'' وہ اپنی شکایت کرتی ہے۔

''کوئی وجہ ہوگی؟''

''کوئی وجہ ہوتی تو میں کبھی شکایت نہ کرتی'' وہ خود اعتمادی سے کہتی ہے۔

''مجھے ناحق دق کیا جاتا ہے۔ میں بارہ برس سے اسی جگہ بیٹھی ہوں اپنی محنت سے روٹی کماتی ہوں۔ منڈی کا داروغہ، کمیٹی کا انسپکٹر اور شہر والے لوکل سب مجھ سے خوش ہیں۔ لیکن پانی پت کے پناہ گیر جواب میرے محلے میں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ ہر روز وہ میرے خلاف عرضیاں دیتے رہتے ہیں کہ مجھے اس مکان سے نکال دیا جائے

تا کہ ان کی بہو بیٹیوں پر خراب اثر نہ پڑے اور......؟

''مکان کس کا ہے؟'' میں بات کاٹ کر پوچھتا ہوں۔

''میرا ہے سرکار۔ لالہ شنکر داس نے میری نتھ اتروائی پر میرے نام کروایا تھا۔'' بشیراں نے اپنی پٹاری سے لالہ شنکر داس کے کاغذات نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

''بحالیات کے محکمہ سے بھی اجازت لی ہے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ کنفرم ہے'' اس نے محکمہ بحالیات کے کاغذات میز پر دے مارے۔

''سرکار میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر حج کے لئے رقم جمع کی ہے کراچی سے حج کا قرعہ بھی میرے نام آ گیا ہے۔ اب اگر میں حج پر چلی گئی تو پانی پت والے کمیٹی سے مل کر میرے مکان پر قبضہ کر لیں گے۔ حاضری کا بلاوا تو آ گیا ہے۔ اگر نہ گئی تو اس کا عذاب کون بھگتے گا؟ آخر میں نے بھی تو قوم کی بہت خدمت کی ہے''

''کیا خدمت کی ہے؟'' میں نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

وہ اپنے تھیلے سے آزاد کشمیر فنڈ، قائداعظم فنڈ، قائداعظم میموریل فنڈ، بیوہ گھر اور یتیم خانوں میں دیئے گئے۔ چندوں کی رسیدیں نکال کر میز پر ڈھیر لگا دیتی ہے۔

یہ دیکھ کر میں ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔ یہ پیشہ ور بدنام عورت ماہی بے آب کی طرح حج پر جانے کے لئے تڑپ رہی ہے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قانون اسے اس عظیم سعادت کی نعمت سے محروم نہیں کرتا۔ لیکن جھنگ مگھیانہ مونسپلٹی کا قانون اس کا مکان چھین سکتا ہے۔ اگر اس کا مکان چھن گیا تو وہ حج پر جانے سے رہ جائے گی...... اگر دس نمازی اور متقی حج پر نہ جا سکیں تو شاید جنت کی آبادی میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔ لیکن اگر یہ طوائف حج پر جا کر توبہ کرنے سے رہ گئی تو دوزخ کے شعلے کس کے لئے سرد پڑیں گے؟ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتا ہوں اور آغا شجاعت علی صاحب ایس پی کو ٹیلی فون پر یہ صورت حال سناتا ہوں آغا صاحب بڑے بااخلاق شائستہ اور نیک خو پولیس افسر ہیں۔ وہ اپنی نرم آواز میں بڑے جذبے سے کہتے ہیں ''میں اس قضیے سے واقف ہوں آپ اسے ضرور حج پر جانے دیں۔ اس کا مکان کوئی نہیں چھین سکتا اس کی غیر حاضری میں پولیس اس کے مکان کی حفاظت کرے گی۔''

واپس آ کر میں بشیراں سے کہتا ہوں۔ ''تم ضرور حج پر روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے مکان کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تمہاری واپسی تک پولیس اس کی حفاظت کرے گی۔''

خدا سرکار کو سلامت رکھے۔ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے اور جلدی جلدی آزاد کشمیر فنڈ، قائداعظم ریلیف فنڈ، قائداعظم میموریل فنڈ، بیوہ گھر اور یتیم خانوں کے چندوں کی رسیدیں سمیٹ کر اپنی جھولی میں ڈال لیتی ہے۔

اندر ہی اندر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس سے کہوں کہ جب تم حرمین شریفین کی زیارت کرو تو میرے لئے بھی

دعا کے دو الفاظ بول دینا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر کا شدید احساس کمتری مجھے یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ بشیراں محض ایک طوائف ہے۔ یوں بھی محمد صدیق اردلی دیر سے دفتر کے دروازے پر منڈلا رہا ہے اور میرا اس قدر وقت ''ضائع'' کرنے پر بشیراں کو بڑی سنگدلی سے گھور رہا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ میرے دفتر سے باہر نکلے تو محمد صدیق اپنی خالص گڑگانوی زبان میں اسے دو چار گالیاں بھی سنا دے۔

(بحوالہ: قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ)

بہن جی کہنے کا اثر

1947ء کے فسادات جاری تھے۔ مغربی پنجاب سے ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے صوبجات میں چلے آ رہے تھے۔ اور ان کی بہت بڑی تعداد دہلی پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ دہلی کے تجارتی مرکز ہونے کے باعث مغربی پنجاب کے تاجروں کے لئے دہلی میں کافی کشش تھی۔ جہاں یہ اپنے لئے کوئی ذریعہ معاش تلاش کر سکتے تھے۔

اس زمانہ میں ''ریاست'' کا دفتر محلہ چرخے والان میں تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ کہ پشاور کی ایک خاتون تشریف لائیں۔ اس خاتون کی عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ اس کا شباب ختم ہو چکا تھا اور بڑھاپے کی آمد تھی۔ مگر اس کے ہونٹوں پر سرخی، ریشمی لباس، بالوں کو خوبصورت بنانے کی کوشش اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کا جبر ظاہر کرتا تھا کہ یہ اپنے آپ کو نوجوان لڑکیوں کی صف میں شمار کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کو دیکھنے والوں کے دلوں میں طلاطم پیدا ہو اس خاتون کے ساتھ ایک سکھ تھا۔ جس کے لباس اور چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوفر کلاس میں سے ہے یہ خاتون بغیر اطلاع اور بغیر کسی سے دریافت کئے میرے کمرے میں تشریف لائیں۔

اگر کوئی شخص میرے کمرہ میں بغیر اطلاع چلا آئے تو مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے اصحاب سے میں ملنا پسند نہیں کرتا اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں اس کا نام معلوم کئے بغیر ہی اسے واپس چلے جانے کا حکم دے دیتا ہوں مگر یہ عورت تھیں میں نے ان سے واپس چلے جانے کے لئے تو نہ کہا۔ کچھ بے اعتنائی کا سا اظہار کرتے اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ بیٹھئے، فرمائیے کیا حکم ہے؟ جس کا مطلب یہ تھا کہ کام کی بات کیجئے اور تشریف لے جائیے۔ اس خاتون نے بتایا کہ یہ پشاور کی رہنے والی ہیں وہاں لاکھوں ان کی روپیہ کی جائیداد تھی۔ باغ تھے۔ کوٹھیاں تھیں اور امیر گھرانہ سے تعلق رکھتی ہیں اور فسادات کے باعث یہ بغیر ایک پیسہ ساتھ لئے تین کپڑوں کے ساتھ (شرنارتھی اس زمانہ میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ یہ تین کپڑوں یعنی قمیض پاجامہ اور صافہ کے ساتھ اپنے گھروں سے خالی ہاتھ چلے آئے ہیں چاہے ان کی جیب میں ہزار روپے کے نوٹ ہوتے) چلی آئی ہیں۔ ان کے پاس رہائش کے لئے کوئی جگہ نہیں اور یہ چاہتی ہیں کہ ان کو اس دفتر یعنی ''ریاست'' کی بلڈنگ میں ایک کمرہ رہائش کے لئے دیا جائے۔

چونکہ فسادات کے متعلق ہر شخص کو دلچسپی تھی۔ میں نے کمرہ کے متعلق تو کہہ دیا کہ اس بلڈنگ میں کوئی کمرہ خالی نہیں مگر فسادات اور شرنارتھیوں کے متعلق میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں اور میرے اور اس خاتون کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ لوگ پشاور میں کیا کام کرتے تھے؟

ہمارے باغ تھے، کوٹھیاں تھیں، جائیداد تھی۔ زمین تھی، پھلوں کا کاروبار کرتے تھے اور لاکھوں روپیہ کے مالک تھے۔

آپ وہاں سے کتنا روپیہ ساتھ لائے ہیں؟

ہم صرف ان تین کپڑوں میں جان بچا کر آئے ہیں۔

راستہ میں تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟

نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی، سپیشل ٹرین میں آئے ہیں فوج کا پہرہ تھا۔

آپ کے گھر کے کتنے ممبر ہیں؟

میرا باپ اور بھائی تھا۔ وہ قتل ہو گئے، میں، میری ماں اور میری چھوٹی بہن یہاں پہنچ گئے ہیں۔

یہ آپ کے ساتھ جو سکھ ہے یہ کون ہے؟

یہ میرا بھائی ہے۔

کیا حقیقی بھائی ہے؟

ہاں، میرا یہ حقیقی بھائی ہے۔

وہاں کیا کام کرتا تھا۔

یہ پشاور میں ٹانگہ چلاتا تھا۔

آپ لوگ لاکھوں روپیہ کے مالک تھے مگر آپ کا بھائی ٹانگہ چلاتا تھا؟

ہاں پہلے اس نے پھلوں کی دکان جاری کی تھی۔ نالائق ہے۔ دوکان بند کر دی تو ٹانگہ چلانے لگا۔

آپ یہاں دہلی میں کیا کاروبار کریں گے؟

جو کام مل جائے گا کریں گے آخر زندگی کے دن تو پورے کرنے ہی ہیں۔ یہ کہنے کے بعد اس نے مسکراہٹ کے ساتھ انگڑائی لی اور کہا کہ سردار جی ہمیں ایک کمرہ تو ضرور دے دیجئے۔''

اس کی مسکراہٹ اور انگڑائی کا مطلب یہ تھا کہ میں مجبور ہو جاؤں اور ان کو اپنے ہاں مہمان رکھ لوں۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ عورت آوارہ کلاس کی ہے۔ ساتھ والا شخص اس کا دلال ہے اور شاید یہ مغربی پنجاب یا پشاور وغیرہ میں پیشہ کرتی ہوگی۔ کیونکہ اس عورت میں حیا نہ تھی، اور ہندی زبان کی کہاوت کے مطابق اس کا انگ انگ پھڑکتا تھا۔ یعنی اس کے جسم کے حصے عشق کی دعوت دیتے تھے۔

باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا کہ ''آپ نے بہت مہربانی کی، درشن دیئے اب میں کام کر رہا ہوں میرے پاس کمرہ ہوتا تو شاید دے دیتا مگر یہاں کوئی کمرہ خالی نہیں۔ میں خود تکلیف میں ہوں میرے اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ تشریف لے جائیے۔''

میرے اس کہنے پر بھی یہ خاتون مایوس نہیں ہوئی اور اس نے اظہار تموج (یعنی نمائش حسن کی ناکام کوشش) کرتے ہوئے پھر انگڑائی لی اور کہا کہ "ہم تو کمرہ لئے بغیر یہاں سے نہ جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو" میں حیران کہ اس عورت سے کیا کہوں اول تو میرے پاس کوئی کمرہ نہیں اور اگر ہو بھی تو میں اس کلاس کے لوگوں کو کمرہ یا جگہ نہیں دے سکتا۔ میں نے اس عورت کی سائیکالوجی کو بدلنے کے لئے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بہن جی! میرے پاس نہ تو کوئی کمرہ ہے اور نہ دے سکتا ہوں مجھے اب ضروری کام ہے، اب آپ تشریف لے جائیے ست سری اکال" یہ کہہ کر میں دوسرے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب تو آپ ضرور ہی تشریف لے جائیں۔

میرے بہن جی کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کیجئے۔ کوئی اور گھر تلاش کیجئے۔ جہاں آپ "مہمان" رہ سکیں۔

اس کے بعد یہ خاتون کبھی میرے ہاں نہ آئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے بازار سیتارام میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا جہاں یہ پیشہ کرتی رہی اور اس کے ساتھ جو سکھ آیا تھا وہ اس کا دلال تھا۔ جو آسامیاں لایا کرتا۔

میری رائے میں جو عورتیں اظہار عشق کرنے والے مردوں کی حوصلہ شکنی کرنا چاہیں۔ ان کو بات چیت کرتے وقت "بھائی صاحب" کہنا چاہئے اور مردوں کو عورتوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے "بہن جی" کہنا کافی ہے اور یہ نسخہ ننانوے فیصد کامیاب ہوتا ہے۔

(بحوالہ: ناقابل فراموش۔ دیوان سنگھ مفتون)

عورت کا نازک احساس

دہلی ریڈیو سٹیشن پر ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر مسٹر روپ لال ملک تھے۔ یہ آج کل لندن میں اپنا کاروبار کرتے ہیں اور پچھلے چند برس میں پچاس ساٹھ ہزار روپیہ پیدا کرنے کے علاوہ بطور بزنس مین مزے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مسٹر روپ لال جب ریڈیو کے محکمہ میں ملازم تھے۔ تو ان کا ذہن غریبوں کی مصیبت سے فوراً متاثر ہو جاتا تھا۔ کسی شخص کے ساتھ محکمہ میں زیادتی ہوتی تو یہ اپنا فرض سمجھ کر اس کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے چنانچہ جہاں اس محکمے کے ملازم اور سازندے وغیرہ ان کا احترام کرتے اور ان کے لئے اپنے دل میں محبت کے جذبات رکھتے آپ اپنے افسروں کی نظر میں کھٹکتے اور آپ کو ایک طرح کا لیبر لیڈر سمجھا جاتا۔

انگریزی کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ وہ لوگ ہمدردی کے مستحق ہیں جو بے نقاب ہو گئے۔ اس مصنف نے لکھا ہے کہ وہ لوگ ہمدردی کے مستحق ہیں جو بے نقاب ہو گئے۔ اس مقولہ کا مطلب یہ کہ ہر شخص گناہ گار ہے اور گناہ گار ہوتے ہوئے ہر شخص بے گناہ ہے کیونکہ وہ بے نقاب نہیں ہوتا اور وہ شخص پبلک کی نگاہوں میں اس وقت گناہ گار قرار دیا جاتا ہے جبکہ وہ بے نقاب ہو جائے چنانچہ سرکاری دفتروں میں دن رات رشوت ہے بد دیانتی ہے، سفارش بازی ہے اور تلاش کرنے پر شاید ہی کوئی کلرک یا افسر یا بابو وغیرہ دیانتدار مل سکے۔ مگر یہ سب ہی دیانت دار اور شریف ہیں کیونکہ یہ بے نقاب نہیں ہوتے اور اگر وہ بے نقاب ہو جائے تو وہ بد دیانت بھی، ملزم بھی اور قابل تعزیر مجرم بھی۔ روپ لال ملک نے غلطی سے یا لحاظ و مروت سے ایک شخص کو تقریروں کے سلسلہ میں پانچ چھ روپے زیادہ دے دیئے یا بغیر تقریر کے دے دیئے، روپ لال کا یہ جرم افسروں کی نظر میں توجہ کا مرکز بن گیا۔ اعلیٰ افسروں کو رپورٹ ہوگی اور روپ لال کو تب ہی علم ہوا جبکہ ان کی موقوفی کا حکم آن پہنچا۔ جب حکم ان کو سنا دیا گیا تو یہ اپنے گھر آ گئے۔ ان کی نوجوان بیوی کھانا تیار کئے شوہر کے انتظار میں تھیں۔ انہوں نے اپنے بیوی کو موقوفی کی خبر سنائی تو بیوی پر سکتہ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ کچھ نہ بول سکیں۔ عرصہ کی بیکاری کے بعد شوہر کو سرکاری ملازمت ملی تھی۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ میاں بیوی آرام سے گزر کر رہے تھے۔ اس صدمہ سے اس خاتون کو بخار ہو گیا۔ ایک ہفتہ بخار نہیں اترا۔ ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ ایک پھیپھڑے پر تپ دق کا اثر ہو چکا ہے روپ لال جی نے بہت علاج کیا۔ مگر جب بیوی کو بیماری کے ساتھ شوہر کے بے کار ہو جانے کا غم ہوا تو اس کا تپ دق سے بچنا کیوں کر ممکن تھا۔ صرف یہ صدمہ ہی اس خاتون کی زندگی کو ختم کر دینے کا باعث ہوا۔

''ریاست'' کے پرنٹر اور پبلشر مسٹر ظفر احمد کی والدہ کی صحت بہت اچھی تھی۔ اس خاتون کو بھائی کو بیٹی سے بہت محبت تھی۔ ایک روز انہوں نے اپنی بھتیجی کے متعلق بری خبر سنی تو یہ خاتون اس خبر کو سنتے ہی فوراً اپنے دماغی توازن سے محروم ہو گئیں۔ دو تین روز بعد پاگلوں کی سی باتیں شروع کر دیں حالت دن بدن بگڑتی گئی اور کئی برس کے علاج کے بعد بھی یہ اچھی نہ ہو سکیں۔ اور دماغ بالکل جواب دے چکا تھا، یعنی صرف ایک ناخوشگوار خبر سنتے ہی اس خاتون کے دماغ پر پاگل پن کا اثر ہوا اور اس بچاری کے اچھا ہونے کی توقع نہ رہی۔

ایڈیٹر ''ریاست'' کے ماموں زاد بھائی سردار ہرنام سنگھ کپور لاہور ڈسٹرکٹ کورٹ کے خزانہ کے ہیڈ خزانچی تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے ایک روز مذاقاً کہا کہ وہ دوسری شادی کر لیں گے۔ بات بالکل مذاق میں کہی گئی یہ خاتون بہت نیک اور کئی بچوں کی ماں تھیں۔ مگر اس مذاق کا ہی اس بیچاری کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اگر ان کے محلہ میں کسی کے ہاں شادی ہوتی تو سردار ہرنام سنگھ کے گھر میں غم والم کی گھٹائیں چھا جاتی تھیں، یہ خاتون سمجھتی تھیں کہ شاید ان کے شوہر کی شادی ہو رہی ہے ان کے گھر میں کسی عورت یا فلم ایکٹریس کی کوئی تصور نہ جا سکتی تھی۔ فوراً پھاڑ دی جاتی تھی رشتہ داروں میں سے کوئی عورت آئے تو اسے بھی مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا کہ شاید یہ ان کے شوہر کی شادی کے لئے کوئی بات چیت کرنے آئی ہیں کوئی شخص کسی کی شادی کے متعلق بات نہیں کر سکتا تھا۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ کیفیت یہ کہ جب اخبار ''ریاست'' ان کے ہاں جاتا اور اس میں کسی خاتون کی تصویر چھاپی ہوتی تو بیوی شوہر سے کہتی۔ ''دیوان سنگھ کہاں کا شریف آدمی ہے جو عورتوں کی تصویریں چھاپ چھاپ کر اپنے بھائی کو بھیجتا ہے اس کو شرم نہیں آتی کہ بھائی کے بچے ہوتے ہوئے بھی بھائی کی شادی کی کوشش کرتا ہے۔'' پھر غصہ کے ساتھ اپنے شوہر سے پوچھتیں۔ ''اس اخبار میں سے کون سی عورت سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ سچ کیوں نہیں بتاتے؟'' چنانچہ اگر ''ریاست'' میں کسی عورت کی تصویر ہوتی تو یہ پرچہ ہی پھاڑ دیا جاتا اور کبھی کبھی دماغی حالت اس قدر خراب ہو جاتی کہ بچاری کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اس خاتون کی یہ کیفیت صرف ایک واقعہ کے باعث ہوئی جو مذاق تھا اور جس میں سچائی کا ایک شائبہ بھی نہ تھا۔ ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں مرد دن رات مصائب اور مشکلات کے باعث بھی اپنے ہوش وحواس سے محروم نہیں ہوتا۔ اور وہ جدوجہد میں بڑے بڑے صدمے برداشت کرتا ہے۔ عورت کے لئے بعض اوقات صرف ایک چھوٹی سی بات پر ناقابل برداشت اور بعض صورتوں میں ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

(بحوالہ: ناقابل فراموش۔ دیوان سنگھ مفتون)

طوائفوں کی قابل رحم زندگی

میں اس سے پہلے ایک مضمون میں اپنے صحیح جذبات کا اظہار کر چکا ہوں کہ مجھے طوائفوں سے بے حد نفرت ہے اور میرے لئے گندگی کے کسی ڈھیر کے قریب سے گزرنا اتنا گوارہ نہیں جتنا طوائفوں کے بازار میں سے اور میرا یقین ہے کہ سوائے بیوقوفوں کے کسی حلقہ کے طوائفوں کے متعلق ہر شخص کی یہی پوزیشن ہے۔ کیونکہ ایک صحیح الدماغ شخص کا ایسی عورت نے محبت کرنا کیونکر ممکن ہے۔ جس کی عصمت درجنوں نہیں سینکڑوں کے لئے وقف ہو۔ اور اگر مسکراتی بھی ہو۔ تو صرف روپیہ کے لئے۔ مگر باوجود ان جذبات کے انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے کے لئے میں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں طوائفوں سے باتیں کیں ان کا گانا سنا اور ان کے پرائیویٹ حالات معلوم کئے۔

کئی برس ہوئے میں برسات کے موسم میں بمبئی گیا۔ مرحوم لالہ دینا ناتھ (ایڈیٹر ''ہندوستان'' ودیش'' لاہور) وہاں بناسپتی گھی کا کاروبار کرتے تھے۔ لالہ صاحب کے دل میں میرے سیلف میڈ ہونے کے باعث بہت عزت تھی اور وہ میرے ہم وطن بھی تھے۔ جتنے روز بمبئی رہا لالہ جی ہر روز ملتے رہے اور مختلف موضوع پر باتیں ہوا کرتیں۔

لالہ دینا ناتھ میں تجارتی اعتبار سے چاہے کتنی کمزوریاں تھیں اور کاروبار کے اعتبار سے ان کے دوستوں کو چاہئے ہزار شکایتیں ہوں مگر واقعہ ہے کہ مرحوم لالہ دینا ناتھ چال چلن کے اعتبار سے بہت ہی بلند تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی اپنے حلق کے اندر نہ جانے دیا اور آپ نے زندگی بھر غیر عورت کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لالہ دینا ناتھ سے بمبئی میں ایک روز باتیں ہو رہی تھیں تو زیر بحث موضوع طوائفوں کی زندگی تھا۔ لالہ دینا ناتھ کا خیال تھا کہ ان کی زندگی بہت آرام وراحت کی ہے میں کہتا تھا کہ نہیں ان کی زندگی جہنم سے کم تکلیف دہ نہیں باتوں باتوں مین فیصلہ ہوا کہ طوائفوں کی حالت اور ان کے جذبات کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی روز مغرب کے بعد ہم دونوں مع مرحوم مولانا عرفان سیکرٹری خلافت کمیٹی ''طوائفوں کے دورہ'' پر روانہ ہوئے۔

ہم سب سے پہلے ایک ایسی طوائف کے ہاں گئے جس کو سینما کے چار آنہ کلاس کی طرح طوائفوں کی چار آنہ والی کلاس میں سے کہا جا سکتا ہے اس طوائف کا گھر بارہ مربع فٹ کا ایک کمرہ تھا۔ اس کمرہ کے نصف حصہ میں ایک پلنگ تھا۔ جس پر میلی سی چادر بچھی تھی۔ اور ایک میلا سا تکیہ رکھا تھا، یہ بچاری شکار کی تلاش میں یا راہ گزرنے والوں کو دعوت حسن وعشق دینے کے لئے خود دروازہ میں بیٹھی تھی ...... اس کمرہ میں دو تین تصویریں بھی

دیوار سے لٹک رہی تھیں جو دیوی دیوتاؤں کی تھیں ہم لوگ اس طوائف کے دروازہ کے پاس کھڑے ہو گئے تو اس بچاری نے مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم لوگ اس کمرہ کے اندر گئے اس نے بیٹھنے کے لئے کہا ایک چارپائی کے علاوہ بیٹھنے کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ تھی اور اس پلید اور میلے بستر سے بھی کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اور کوئی صورت نہ تھی ہم تینوں اس چارپائی پر بیٹھ گئے۔

یہ بچاری اس خیال میں تھی کہ ہم تینوں پنجاب کے فوجی تلنگے ہیں اور نفسانی خواہش سے مجبور ہو کر سویلین لباس میں طوائفوں کے بازار میں دھکے کھا رہے ہیں۔ چنانچہ گفتگو شروع ہونے سے پہلے تک اس بچاری کے چہرہ پر فرضی مسکراہٹ قائم رہی اور یہ خوش تھی کہ کیسا سعید و مبارک دن ہے۔ ایک نہیں تین شکار ہاتھ آئے جو اگر دو دو روپیہ بھی فیس بھی ادا کریں گے تو چھ روپیہ مل جائے گے۔ چنانچہ ڈیپوٹیشن کی ترجمانی کا فرض لالہ نے ادا کیا اور ذیل کی گفتگو ہوئی۔

طوائف: مجھے گھر سے آئے ہوئے چار پانچ برس ہو گئے۔

لالہ دینا ناتھ: آپ کمرہ کا کرایہ کتنا دیتی ہیں۔

طوائف: اس کھولی کا کرایہ ایک روپیہ روز ہے۔

لالہ دینا ناتھ: کتنی ماہوار آمدنی ہو جاتی ہے۔

طوائف: آپ کو آمدنی سے کیا۔ آپ کام کی بات کریں جس کے لئے آپ یہاں آئے ہیں۔

لالہ دینا ناتھ: ہمارا ارادہ شادی کرنے کا ہے اگر تم کو اس سے اچھا مکان، اچھا کھانا اور اچھا کپڑا اور آرام کی زندگی ملے تو کیا تم شادی کر لوگی۔

طوائف: آ کے شادی کرنے والے۔ تمہارے جیسے سینکڑوں موالی (بدمعاش) پھرتے ہیں۔ جو بچاری عورتوں کو بھگائے جاتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں اس بازار میں درجنوں عورتیں موالیوں کی جان کو رو رہی ہیں ان کے گھر برباد ہو گئے۔

اس طوائف نے یہ کہا اور کہنے کے ساتھ ہی اس نے پڑوس کی ایک بوڑھی عورت کو بلا لیا۔ جو اس کی رشتہ دار یا پڑوسن تھی۔ اس بوڑھی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا "دیکھو یہ موالی مجھے شادی کرنے کو کہتا ہے ان لوگوں کا پیشہ ہی یہ ہے کہ شریف عورتوں کو بھگا لے جائیں اور گھروں کو برباد کریں۔ اس بوڑھی عورت نے بھی ہم لوگوں کو ترچھی اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ لالہ دینا ناتھ نہ صرف خود معقولیت پسند آدمی تھے۔ بلکہ دوسرے شخص کو قائل کرنے کے اعتبار سے بھی بہت قابل تھے۔ اور اس خیال سے ہی بات چیت کر رہے تھے اور انہوں نے بوڑھی عورت پر اصل پوزیشن ظاہر کر دی اور کہا کہ ہم لوگ طوائفوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ چنانچہ اصل واقعہ ظاہر ہونے کے بعد فضا بالکل بدل گئی۔ ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ان بچاریوں کی زندگی دوزخ سے کم نہیں جو آمدنی ہو سب خرچ ہو جاتی ہے ایک پیسہ بھی

نہیں بچتا۔ جب تک شباب قائم ہے۔ تب تک تو گزارہ چلتا ہے اس کے بعد ان بچاریوں کو گداگری کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو لوگ ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں وہ بدچلن اوو بدمعاش اور فرض ناشناس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور شادی کرنے کے بعد یا تو ان کو فروخت کر دیتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں۔ شرفاء کا طبقہ طوائفوں سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ان حالات میں طوائفوں کو شادی سے بے حد نفرت ہے اور اگر اچھے فرض شناس اور شریف شوہر ملیں تو دنیا میں شاید ایک طوائف بھی اس پیشہ میں نہ رہے سب ہی شادی کر لیں۔ اس طوائف سے انٹرویو کے بعد ہم لوگوں نے رات کو گیارہ بجے تک (کیونکہ طوائفوں کی دوکانداری کا وقت مغرب کی نماز کے بعد اور رات گیارہ بجے ریڈیو کے آخری آداب عرض تک ہوتا ہے، کئی دوسری طوائفوں کے ہاں جا کر بھی بات چیت کی اور ان تمام طوائفوں کی بات چیت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ جو اوپر بتایا جا چکا ہے۔

دہلی میں پرو (پریم بائی) اور لالی دو مشہور طوائفیں تھیں لالی بہت اچھی گانے والیوں میں سے تھی اور راجہ چرکھاری کے پاس ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار پر ملازم تھیں پرو دہلی کے ایک بہت بڑے رئیس کے پاس ملازم تھی۔ اور دہلی کے اس رئیس کے ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ بہت ہی گہرے دوستیانہ تعلقات تھے ان رئیس صاحب کے ہاں جب کبھی پرائیویٹ دعوت ہوتی تو آپ کے دوستوں کے علاوہ پرو۔ لالی بعد دوسری متعدد طوائفیں بھی اس دعوت میں شریک ہوا کرتیں۔ ایک روز ایڈیٹر "ریاست" بھی دعوت میں شریک تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایڈیٹر نے لالی سے کہا کہ جس صورت میں تمہارے پاس کافی روپیہ اور جائیداد ہے تم حرام کی زندگی کیوں ترک نہیں کر دیتیں۔ میرے اس سوال کے جواب میں لالی نے جو جواب دیا۔ میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اس نے کہا:

"اگر ہم حرام کی زندگی بسر کرتی ہیں یہ تو دنیا میں حلال کی زندگی کون بسر کرتا ہے۔ آپ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی میلا کچیلا، گندہ، سیاہ، بدصورت بھدہ، تو ند نکلی ہوئی منہ سے بدبودار اور کمینہ خصلت کا سیٹھ آئے ہمارا دل چاہتا ہے کہ اس شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ مگر روپیہ کے لئے ہم اس کو خوش کرنے کے لئے سنگھار کر کے اس کے سامنے بیٹھتی ہیں مسکراتی ہیں محبت سے باتیں کرتی ہیں۔ اپنے دل کو مار کر اخلاص کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے منہ کی بدبو کی پرواہ تک نہیں کرتیں۔ اور وہ جو کچھ بھی چاہے ہم کرتی ہیں تو آپ ہی ایمان داری سے بتائیے کہ کیا ہماری یہ کمائی حرام کی ہے یا حلال کی۔ لوگ ہمارے روپیہ کو حرام کا روپیہ کیوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہم دنیا کے ہر شخص کے مقابلہ میں روپیہ زیادہ محنت سے اور اپنی جان مار کر پیدا کرتی ہیں۔

لالی کی اس دلیل کا میرے پاس کیا جواب تھا۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ طوائفوں کے دل کا محبت کے ایک مرکز پر قائم رہنا ہی ان کے لئے ایک ایسی سزا ہے۔ جس کا ہزار دوزخ بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔

بہت برس ہوئے ملک میں جب کھدر اور چرخہ کا زور تھا اور باوجود چرخہ اور کھدر سے انتہائی نفرت ہونے کے

بھی ایڈیٹر ''ریاست'' نے فضا سے متاثر ہو کر کھدر سے سوٹ سلوا لئے تھے۔ ایک بار ایک طوائف سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایس طوائف نے کھدر کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایڈیٹر ''ریاست'' جب کھدر کا لباس دیکھا تو یہ حیران رہ گیا اور اس کو یقین ہو گیا کہ مہاتما گاندھی کی کھدر پوشی کی سپرٹ لہرا چھے اور برے شخص پر اثر انداز ہے۔ راقم الحروف سے رہا نہ گیا اور اس نے اس طوائف سے سوال کیا کہ آپ نے کھدر کیوں پہنا عورت تو صرف خوبصورتی کے لئے پیدا ہوئی ہے اور کھدر میں سب سے زیادہ بدنما اور بدصورت کپڑا ہے میرے اس سوال کا اس طوائف نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

''ہم طوائفوں کا نہ کوئی ضمیر ہے نہ ایمان ہم دوسروں کی خوشی کے لئے پیدا ہوئیں اور دوسروں کی خوشی پر ہماری زندگی کا انحصار ہے میں نے محسوس کیا کہ لوگ کھدر پہنتے ہیں اور کھدر کو پسند کرتے ہیں اس خیال سے میں نے بھی کھدر کا لباس اختیار کیا اور ریشمی کپڑے ترک کر دیئے کہ شاید لوگوں کی نگاہوں میں میرا کھدر کا لباس زیادہ کشش کا باعث ہو، لوگ مجھے زیادہ پسند کریں گے اور میری آمدنی میں اضافہ ہو۔ ورنہ جب ہم طوائفوں کا کوئی دھرم ایمان ہی نہیں۔ روپیہ کے لئے ہندو ہوتے ہوئے مسلمانوں سے اور مسلمان ہوتے ہوئے ہندوؤں سے تعلقات پیدا کر لیتی ہیں ہمارے دل میں گاندھی یا کھدر کے لئے کیا محبت ہو سکتی ہے۔''

دہلی میں ایک طوائف مجیدن اچھی گانے والیوں میں شمار ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دہلی کی گزشتہ یا موجودہ تین یا چار بہترین گانے والیوں میں سے ایک ہے چند برس ہوئے دہلی کے زندہ دل مسلمانوں نے مرحوم مولانا محمد علی جوہر کے انتقال کے بعد مولانا کی یادگار قائم کرنی چاہی اور فیصلہ ہوا کہ سینما میں طوائفوں کے رقص اور گانے کی محفل منعقد کی جائے اور اس شو سے جو آمدنی ہو۔ وہ مولانا کے یادگاری فنڈ میں دی جائے۔ مجیدن سے اس شو میں گانے کی درخواست کی گئی تو بچاری مولانا محمد علی کا نام سن کر بغیر معاوضہ کے گانے کے لئے تیار ہو گئی۔ حالانکہ اس کو گانا چھوڑے عرصہ ہو چکا تھا اور موسیقی کے فن کے شوقین اس کے گانے کو ترستے تھے۔ مجیدن عمر میں کچھ بڑی تھی اور اس شو میں جو دوسری طوائفیں ناچنے اور گانے کے لئے آئیں۔ نوجوان تھیں۔ میں اس شو میں موجود تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مجیدن کا گانا سننے ہی گیا تھا۔ پہلے تھرکنے اور پھڑکنے والی چھوکریوں کا ناچ ختم ہوا۔ لوگوں نے جی کھول کر تالیاں بجائیں اور داد دی اس کے بعد مجیدن کا تعارف ہوا تو لوگوں نے مجیدن کا نام سن کر تالیاں بجائیں کیونکہ موسیقی کے اعتبار سے دہلی میں اس کی بہت شہرت تھی۔ مگر جب وہ گانے لگیں تو لوگوں کا شور ہوا۔ تالیاں بجائیں گئیں، بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ فلاں بائی کو بھیجو، فلاں جان کو بھیجو کے نعرے بلند ہوئے۔ یہ شور سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا اور میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوست (جو موسیقی) کے بہت شوقین اور میوزک کانفرنس کو کامیاب بنانے والوں میں سے تھے) شکایت کی تو اس دوست نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔

''طوائف کی زندگی اس کے شباب کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ مجیدن کے شباب کا زمانہ جا چکا ہے۔ یہ تو

بڑھاپے میں قدم رکھ رہی ہے اور اکثر بیمار رہتی ہے۔ مگر لوگ چاہتے ہیں کہ یہ سولہ سترہ برس کی کم سن لڑکی بن کر گائے۔ اس بیچاری سے اب یہ کیونکہ ممکن ہے۔"

اس شور میں مجیدن کی خودداری نے بھی گوارا نہ کیا کہ وہ گاتیں وہ پردہ کے پیچھے چلی گئیں۔ اس کے بعد پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس کی طوائفوں نے رقص کیا اور گایا جن کو نہ موسیقی کا علم تھا نہ سر تال کا اور جن لوگوں کے فلمی گیتوں پر لوگوں نے فراخدلی کے ساتھ داد دی۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے لوگ تو پچاس، ساٹھ، اسی یا سو سال تک زندہ رہتے ہیں اور لوگ ان کو بھول نہیں سکتے۔ مگر کامیاب سے کامیاب طوائف کی زندگی بھی اس وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ اس کے شباب اور بڑھاپے کے اتصال کا زمانہ نہیں آ جاتا۔ اس کے بعد تو وہ اگر چاہے بھی کہ لوگ اس کو دیکھیں یا یاد رکھیں۔ پبلک نہ دیکھنے کے لئے تیار ہے نہ یاد رکھنے کے لئے۔ یعنی شباب کے گزرنے کے بعد اس کی پبلک موت ہو جاتی ہے۔

جو لوگ طوائفوں کی زندگی کو آرام وراحت کی زندگی یا جو عورتیں طوائفوں کے رہنے سہنے کے طریقہ اور ان کے حالات کو باعث کشش محسوس کرتی ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں طوائفوں کی زندگی انتہائی غلیظ، دوزخ نما، انتہائی تکلیف دہ اور انتہائی قابل رحم ہے اور اگر ان کو یہ یقین ہو جائے کہ کوئی شخص شادی کرنے کے بعد ان سے اچھا سلوک کرے گا۔ تو یہ طوائفیں اپنے پیشہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر آمادہ ہو سکتی ہیں۔

(بحوالہ: ناقابل فراموش۔ دیوان سنگھ مفتون)

عورت، سماج اور جنس

ہر شادی شدہ خاتون کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ شادی جتنی خود اس کے لیے اہم ہے اتنی ہی اس کے شوہر کے لیے بھی ہے۔ کچھ مرد ایسے ضروری ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عورت شادی محض اپنے مفاد کی خاطر کرتی ہے لیکن اس خیال سے رشتہ ازدواج کو زیادہ ضرر نہیں پہنچتا۔ ضرر تو اس وقت پہنچتا ہے جبکہ بیوی یہ خیال کرنے لگتی ہے کہ شادی صرف عورتوں کے لیے ہی اہم ہے مردوں کے لیے نہیں۔

شادی کو کامیاب بنانے کے لیے ایک بات اور ضروری ہے۔ دنیا بھر کی خواتین کو چھوڑ کر کسی بھی خاتون کو اپنی شادی کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کرنا چاہئے۔ اور مرد ہو یا عورت اگر دونوں میں محبت نہ بھی ہو تب بھی ازدواجی رشتہ میں بندھنے کے بعد ایک دوسرے کو پسند کیا جا سکتا ہے۔ محبت کرنا گو بہت اہم ہے لیکن پسند کرنا ضروری ہے۔ محبت کے بغیر شادی تو کامیاب ہو سکتی ہے لیکن مشترکہ پسند کے بغیر شادی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

محبت کے معنی کیا ہیں؟ جنسی کشش جب پسند کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے تو اسے محبت کہتے ہیں۔ یہ پسند، یہ دوستی زیادہ اہم ہے جنسی کشش ضروری ہے لیکن ایک مرد ایک عورت میں جنسی کشش محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے نظریات، اس کے مشاغل مختلف ہو سکتے ہیں۔ شادی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے انفرادی رجحانات کی تکمیل کا موقع دیں۔ ایک کو سنجیدہ موضوع پر کتابیں پسند ہیں۔ دوسرا مطالعہ کے لیے محض ہلکے پھلکے مذاق سے بھرپور کتابوں کا انتخاب کر سکتا ہے ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ سنگترہ کے عرق میں کالی مرچ ڈال کر پینا پسند کرتی ہیں اور ان کے شوہر عرق میں چینی ملا کر پینا پسند کرتے ہیں۔

اسی طرح شادی چھوٹے چھوٹے اختلافات کے تانوں بانوں سے بنتی ہے۔ لیکن یہ اختلافات چھوٹے نہیں ہیں۔ ان کے پس پردہ دونوں فریقین کی فروگذاشت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ افراد جو ذہنی طور پر بالغ نہیں ہوتے وہ ان اختلافات کو برداشت نہیں کر پاتے۔ شوہر چاہتا ہے کہ بیوی اس طرح سے سنگترہ کا عرق استعمال کرے۔ بیوی چاہتی ہے کہ شوہر اس کے کہنے پر چلے۔ حالانکہ یہ عرق کسی بھی طرح استعمال ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی اصول متعین نہیں کیا گیا۔

شادی میں مالی حالت بھی اہمیت رکھتی ہے' لیکن صرف اس حد تک کہ دونوں کی آمدنی کس طرح خرچ ہوتی ہے۔ ایک شادی شدہ جوڑے کی آمدنی دو سو روپے بھی ہو سکتی ہے۔ اور دو ہزار روپے بھی۔ یہ رقم کھانے، کپڑوں، دوسرے تفریحی مشاغل میں خرچ ہو سکتی ہے۔ اہمیت تو اس بات کی ہے کہ جس طرح بھی خرچ ہو۔ اس میں دونوں کی رضا شامل ہونا چاہئے۔

شادی کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک رفیق دوسرے رفیق کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ اور اسی پہلو میں اکثر خواتین دھوکہ کھاتی ہیں اور گھاٹے میں رہتی ہیں۔ اکثر شوہروں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ بیوی میں پہلی سی محبت نہیں رہی۔ مثلاً وہ خواتین جو اس ضروری کو پورا نہیں کرتیں اور اپنے آپ کو جذباتی طور پر اپنے شوہر کے حوالے نہیں کرتیں۔ وہ اچھی طرح گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں لیکن شوہروں کو پھر بھی شکایت ہوتی ہے اور وہ تلملا کر پوچھتی ہیں:

''تم اور کیا چاہتے ہو۔ کیا میں تمہارے گھر کو نظر انداز کرتی ہوں؟ کیا تمہیں وقت پر کھانا نہیں ملتا......؟''

وغیرہ وغیرہ۔ یہ خواتین دوسرے سے تو بڑی دلبرانہ انداز ولہجہ میں گفتگو کرتی ہیں۔ مثلاً جب کوئی دوست ٹیلی فون کرتا ہے تو بڑی دلکش آواز میں ''ہیلو'' کرتی ہیں۔ اگر شوہر دفتر سے فون کرتا ہے تو پہلے اسے اجنبی سمجھ کر ترنگ بھری آواز میں ''ہلو'' کرتی ہیں لیکن جب معلوم ہوتا ہے کہ دوسری طرف ان کا اپنا شوہر ہے تو آواز میں وہی ریتلا پن پیدا کرتے ہوئے کہتی ہیں ''اوہو تم ہو......'' مجھے اکثر شوہروں سے معلوم ہوا کہ اس واقع پر ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ ٹیلی فون کو پٹک کر کپڑے پھاڑے سڑک پر نکل آئیں اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔

شادی کو کامیاب بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ خواتین کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو کبھی کبھی صرف ''مرد'' ہی سمجھیں۔ شوہر نہیں۔ جس کی قسمت میں ان کی خواہشات کو پورا کرنا ہے، صرف مرد...... شادی کو بیس سال گذر گئے ہیں لیکن وہ اسی لیے تو نہیں پیدا ہوا کہ ایک عورت کی تسلی کا سامان مہیا کرتا پھرے۔ اس عورت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ آخر وہ بھی مرد ہے۔ اس کی اپنی بھی زندگی ہے۔ شاید اس کے دل میں اب بھی چند خواہشیں تشنہ تکمیل ہیں ...... وہ خواتین جو ہمیشہ اپنے شوہروں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کرنے والا کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتیں۔ وہ اپنی شادی کی راہ میں خود کانٹے بوتی ہیں۔ صرف ازدواجی زندگی میں نہیں۔ ایسی عورتیں زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی ناکام رہتی ہیں۔

شادی کو کامیاب بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عورت میں اتنی ثابت قدمی ہونا چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کی بدلتی آنکھوں اور ڈگمگاتے قدموں کے باوجود اس سے محبت کرتی رہے۔ یہاں پر میں شوہروں کو بھی چند باتیں (ضروری) بتاؤں گا۔ شوہر کو ہر روز، ہر وقت بیوی پر تنقیدی نگاہیں نہیں ڈالنا چاہئے اور کبھی تخریبی تنقید نہ کیجئے...... میں کچھ ایسی خواتین سے واقف ہوں جب شوہروں نے ان کی برائیوں پر روشنی ڈالی کہ انہوں نے نفرت کا اظہار کر دیا۔ ایسی خواتین سمجھتی ہیں کہ محبت کے معنی تو یہ ہیں کہ ان کی برائیوں کی بھی تعریف کی جائے۔ ان کی کمزوریوں کو بھی سراہا جائے۔ جب تک شوہر ان کو فرشتہ کامل سمجھتے رہتے ہیں وہ خوش رہتی ہیں لیکن جہاں شوہر نے بے جا طور پر کہا کہ کھانا وقت پر تیار نہیں ہوتا، یا وہ آمدنی ہونے بھی نہیں پاتی کہ وہ سامان خرید لاتی ہیں۔ ایسی خواتین اپنی محبت کی گرمی ختم کر دیتی ہیں اور برف کی طرح سرد مہر بن جاتی ہیں۔

ہم خواہشات یا توقعات سے زیادہ ہم سب دو دنیاؤں میں رہتے ہیں ایک تو وہ دنیا ہے جو ہمارے چاروں

طرف نظر آتی ہے، جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کے افراد سے سابقہ پڑتا ہے، جس کے مصائب کو جھیلنا پڑتا ہے اس دنیا میں اگر کسی لڑکی کی شادی ہو تو وہ جانتی ہے کہ اس کا شوہر جیتا جاگتا ہے، حقیقی انسان ہے، اس میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں جن کو قبول کرنا ضروری ہے برخلاف اس کے دوسری لڑکیاں ایسے شوہروں سے شادی کرنا چاہتی ہیں جو ان کے خیالات میں بستے ہیں جو رومانی دنیا کے ہیں۔ جو ناولوں اور افسانوں میں نظر آتے ہیں.... ایسے شوہر حقیقی دنیا میں کہاں؟ چنانچہ جو شوہر ملتے ہیں شادی کے بعد وہ ان سے نالاں ہو جاتی ہیں۔ اپنے شوہر سے روٹھ کر رہتی ہیں۔ ان خواتین کو یہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے کہ شادی کے بعد ان کے شوہر بدل گئے ہیں۔ حقیقت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے جو کچھ وہ سمجھتی تھیں وہ اس وقت بھی ویسے نہیں تھے اور اب بھی ویسے نہیں ہیں۔ نہ بن سکتے ہیں۔ دراصل ویسا تو کوئی مرد بھی نہیں بن سکتا۔ شادی سے پہلے تو جو اختلافات نظر آتے تھے یہ لڑکیاں ان کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔

کچھ خواتین تو ازدواجی زندگی سے بیس تیس سال بعد بھی اس تصوری محبوب کی منتظر رہتی ہیں۔ اس پورے عرصے میں وہ اس تصوری محبوب سے حقیقی شوہر کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دوسرے تمام غیر مردوں کو بڑی پرامید نگاہوں سے دیکھتی ہیں کہ کیا یہ مرد وہی ہے جس کی وہ منتظر ہے؟ گھر پہنچتی ہیں تو وہ بوڑھا شوہر نظر آتا ہے، وہی ماحول، وہی خشک اور بے مزہ زندگی۔ جب تک یہ خواتین اپنی تلاش سے سبکدوش نہیں ہو لیتیں اس وقت تک ان کی زندگی ریت پر محل کے مصداق رہتی ہے۔

کبھی کبھی عورت چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے فلاں دوست، فلاں عزیز، باپ، بھائی سے مشابہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا...... شوہر بے چارہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے وہ جو کچھ ہے وہی ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا چاہے قبول کیا جائے یا ٹھکرایا جائے۔

ذہین خواتین ایسا نہیں کرتیں یا تو وہ اپنے خیالی محبوب اور اپنے شوہر میں بہت زیادہ مطابقت پیدا کر لیتی ہیں۔ یا اپنے خیالی محبوب سے کنارہ کشی کر لیتی ہیں۔ میرے نزدیک اسکی اچھی مثال بیگم ج ہیں۔ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین خاتون ہیں۔ وہ ایک کالج میں پڑھاتی بھی ہیں۔ ان کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو ان تمام پہلوؤں سے ان سے دبتا ہوا تھا۔ گو بڑا اچھا آدمی تھا۔ اور اچھے شوہر کی تمام لوازمات پر پورا اترتا تھا۔ شادی کے فوراً بعد بیگم ج نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کا شوہر ان کی پرواز میں ساتھ نہیں دے سکتا۔ انہوں نے رفتہ رفتہ سماجی تقاریب سے کنتا شروع کیا۔ اپنے کالج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ دوستوں سے گریز کرنے لگیں۔ کیونکہ ان کے شوہر اپنے تعلیم مکمل نہ کر پائے تھے۔ کالج کی ملازمت چھوڑ دی۔ بیگم ج نے یہ فیصلہ کیا کہ اب شادی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی اچھائیوں سے پیار کریں گی۔ ان کی کمزوریوں اور کمیوں سے نفرت نہیں کریں گی۔

بیگم ج کی طرح اور بھی خواتین ہیں جو سماج کے کاموں میں پیش پیش رہ سکتی ہیں لیکن ان کی شادی ایسے افراد سے ہوتی ہے جو میل جول اور پیش پیش رہنے کے مخالف ہیں۔ کچھ خواتین بڑی مصیبتوں بھری زندگی گذار رہی

ہیں۔ میں ایسی خواتین سے پوچھتا ہوں کہ شادی سے پہلے جبکہ آپ تعلیم یافتہ تھیں اور اپنے حقوق کی عزت کرتی تھیں اور اپنے ہونیوالے شوہروں کو جانتی تھیں تو پھر آپ نے ان سے شادی ہی کیوں کی؟ انکار کیوں نہیں کر دیا...... ؟ یا آپ چند دنوں سے اپنے شوہر میں یہ غیر سماجی عادات پا رہی تھیں اور وہ یکسر بدل گئے ہیں؟

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ذہنی بلوغت تو اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آپ توقعات، تصورات اور خواہشات سے زیادہ حقائق پر عمل کریں۔ ذہنی لاابالی کی مثال بیگم ف سے ملتی ہیں جن کو شادی سے پہلے ہی دن یہ محسوس ہو گیا تھا کہ انہوں نے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ ان کے خاندانوں میں جتنی بھی شادیاں ہوئی تھیں۔ سب کی سب ناکام رہیں۔ اس لیے ان کی شادی کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔

وہ تو یہ سوچتے سوچتے جوان ہوئی ہیں کہ تمام مرد خطرناک درندے ہیں، ظالم ہیں، خود غرض ہیں۔ ان کی والدہ اپنے شوہر کو ہزار بار ان القاب سے یاد کر چکی تھیں۔ ان کی تمام سہیلیاں عزیز دار لڑکیاں بھی یہی کہتی تھیں۔ بیگم ف ڈرتی رہیں کہ جہاں ان کی زندگی میں کوئی مرد آیا اور وہ تباہ ہوئیں۔ اسی لیے وہ اپنی ماں سے زیادہ سے زیادہ وابستہ اور قریب ہوتی گئیں۔

بیگم ف نے اپنے لیے ایک ایسے شوہر کو منتخب کیا جو بظاہر بڑا اچھا تھا۔ لیکن دل میں یہ یقین کیے رہیں کہ تمام مرد ظالم ہوتے ہیں۔ اپنے اس خیال کو یقین کی حد تک پہنچانے کے لیے وہ اپنے شوہر کو ٹہوکے دیتی رہتیں۔ پہلے تو شوہر نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب یہ روزمرہ کا دستور ہو گیا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اور زبان اور ہاتھوں سے بیگم ف کی خوب خبر لی۔ بیگم ف ڈر کر اپنے گھر چلی گئیں اور اپنی ماں سے کہا'' ...... وہ تو مجھ کو مار ڈالنے کو کہتا تھا'' حالانکہ شوہر یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر تم مجھ سے ظالمانہ توقعات رکھو گی تو میں مجبوراً تم کو مایوس نہیں کروں گا...... ماں اور بیٹی ایک دوسرے کے لیے ثبوت بن گئیں۔ دراصل بیگم ف خود اپنے حشر کی طرف رفتہ رفتہ دانستہ طور پر بڑھ رہی تھیں۔ اس میں ان کے بیچارے شوہر کا کیا قصور تھا؟

دوسری مثال بیگم ایل کی ہے۔ بیگم ایل نے اپنے لیے ایسے شوہر کا انتخاب کیا جو تشدد پسند تھا۔ بیگم ایل کا کہنا ہے کہ مسٹر ایل میں دلیری اور مردانہ پن دیکھ کہ ان کی طرف رجوع ہوئیں۔ دراصل مسٹر ایل ضرورت سے زیادہ تشدد پسند اور جابرانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ رفتہ رفتہ بیگم ایل کو اس پھندے کا احساس ہوتا گیا۔ جو انہوں نے خود اپنے لیے تجویز کیا تھا۔ دوسری طرف مسٹر ایل کو ایسی رفیقہ کی تلاش تھی جو خود بھی مظلومیت پسند ہو اور ان کے جابرانہ رویہ کے خلاف احتجاج بھی نہ کر سکے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے لیے موزوں ترین رفیق تھے۔ بیگم ایل لاشعوری طور پر ایسے شوہر کی متلاشی تھیں جو ان کے ساتھ برا رویہ اختیار کرے اور مسٹر ایل لاشعوری طور پر برے رویہ کی طرف رجوع تھے۔

کبھی کبھی تو ایسی شادیاں تیس چالیس سال تک کسی نہ کسی طرح برقرار رہتی ہیں اور دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔

لوگ مجھ سے اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ جذباتی صحت سے کیا مراد ہے؟

جذباتی صحت سے مراد ہے کہ ایک فرد اپنی ہستی سے آسودہ رہے۔ خود اپنے سے برسر پیکار نہ ہو۔ جو افراد جذباتی بلوغت حاصل کر لیتے ہیں وہ یا تو اپنی کمزوریوں کو محسوس کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا ان سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اب بدل نہیں سکتے۔ وہ خود ترسی میں مبتلا نہیں ہوتے اور نہ اپنے اپ کو تکلیف پہنچاتے اور ٹھوکے دیتے رہتے ہیں۔ وہ بیماری کا بہانہ بنا کر گھر کی چار دیواری میں اپنے آپ کو مقفل نہیں رکھتے۔ دوسروں کے بے جا ہمدردی حاصل کرنے کی ضد نہیں کرتے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں ہچکچاتے نہیں کہ ان میں چند کمزوریاں ہیں۔ وہ اپنی کمزوریوں کا زیادہ غذا کے استعمال یا جنسی تسکین کی افراط میں چھپاتے نہیں۔

آپ صرف ایسے مریض کو لیجئے جو اپنی کمزوریوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے خود کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ ایذا پسند بیویاں اپنے شوہروں کے لیے ازدواجی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہیں۔ ایسی بیوی کبھی کسی حالت میں مطمئن اور سرور نہیں ہوتی۔ اس میں کمزوریاں ہیں لیکن وہ ان کا مقابلہ کرنے کی لیے تیار نہیں۔ بلکہ اپنے لاشعور میں یہ طے کر چکی ہے کہ اسے ان غلطیوں، خامیوں کی سزا ملنی چاہئے اور اسے یہ سزا دے کر رہتی ہے۔ وہ پرانے اور ملگجے کپڑے پہنتی ہے۔ اپنے بناؤ سنگھار میں لاپرواہی برتتی ہے اور اپنے آمدنی سے مقابلتاً مفلسی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور کبھی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش نہیں کرتی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ تفریح کرنے نہیں جاتی۔ کہتی ہے کہ اتنی آمدنی کہاں ہے؟ اس کے سر میں درد ہے۔ اس نے چند اور ضروری کام ہیں۔ اور ایسا کرنے میں اسے لطف آتا ہے۔

ایسی عورت کے خاوند پر کئی طرح کے ردعمل ہوتے ہیں وہ دوسری عورت سے محبت کی پینگیں بڑھا سکتا ہے۔ اور دنیا والے اس کے کردار پر لعنت ملامت کرتے ہیں اور وہ خود بھی اس سے برا بھلا کہتا ہے۔

اس کی بیوی تو اس پر لعن طعن کرے گی ہی، جو طرز زندگی اس نے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس کی معاونت کے لیے ایک اور بہانہ اس کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ وہ اس حادثہ سے کوئی سبق نہیں لیتی کہ شوہر اپنی ازدواجی زندگی میں کمیاں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کی تسلی اس سے نہیں ہوتی۔ وہ اس طرح کے کسی خیال کو دل میں جگہ نہیں دیتی کہ کمزوریوں کو دور کرنے کی نوبت آئے۔

شادی کو ناکام بنانے کی ایک اور بھی وجہ ہے۔ جو متذکرہ بالا وجہ سے ملتی جلتی ہے۔ ہم میں سے کچھ افراد اپنی جذباتی بالغی کی وجہ سے ایسے ضمیر کے مالک ہوتے ہیں کہ اس ضمیر کی وجہ سے خوش ہی نہیں رہ سکتے۔ ایسے افراد کے ضمیر بالکل بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بچپن میں معمر افراد کو وہ خوف اور دھمکیوں سے سمجھتے تھے۔

اس کی مثال لیجئے:

بیگم ب ہمیشہ گھر کی صفائی میں لگی رہتی ہیں اور انہیں اپنے گھر کی صفائی پر ناز ہے۔ دراصل وہ ہر وقت کوڑا

کر کٹ صاف کرنے پر مجبور ہیں وہ کسی دوسری جگہ محض اس لیے آرام سے نہیں بیٹھ سکتیں کہ ان کا اپنا گھر نہیں ہے۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ گھر کی مالکہ کو صفائی کا خیال ہے۔ صبح ہوتے ہی بیگم ب جھاڑو اور پونچھن سے گھر کی صفائی میں لگ جاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتی جاتی ہیں۔ ''اوہ یہ گھر...... یہ گھر تو مجھے کہیں کا نہ رکھے گا۔ چھت کے جالے صاف کرنا ہیں، دروازوں کی کنڈیاں میلی ہوگئی ہیں۔ دیواریں گندی ہیں گھر سے چھٹکارا ملتا ہے تو کپڑوں کی باری ہے۔ بچوں کے کپڑے ہیں، ان سب کو وہ خود دھوتی ہیں اور پھر کھانا پکانے پر جت جاتی ہیں۔ شام ہوتے وہ تھک کر چور ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر کا آرام ملتا ہے اور رات ختم ہوتے ہی دن بھر کی یکساں مصروفیت۔ گھر کے بعد، کپڑے کپڑوں کے بعد کھانا۔

بیگم ب نے ضمیر ہی کچھ ایسا پایا ہے، جو ان کو دم ہی نہیں لینے دیتا۔ وہ اپنے گناہوں کے دھبوں کو دھونا چاہتی ہیں۔ ان کے شوہر پریشان ہیں۔ کچھ کہہ تو سکتے نہیں کہ کیونکہ صفائی کی عادت بری نہیں کہلائی جا سکتی۔ اسی وجہ سے وہ اپنی بیوی کی مدد سے قاصر رہتے ہیں۔

اسی طرح سے کچھ مردوں میں بھی ایک کمزوری پائی جاتی ہے۔ یہ کمزوری تعطیل کے دنوں سے متعلق ہے۔ مثلاً اتوار کے دن ایسے افراد گھر پر آرام کرنے کی بجائے اور الجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہفتہ کی شام وہ اچھل کر پیر کے دن میں پہنچ جائیں۔ اس درمیانی وقفہ میں ان کو اپنے وجود کا احساس نہ رہے۔ کچھ ایسے افراد بھی ملیں گے جو چالیس سال کی ازدواجی زندگی میں ایک دن کے لیے بھی آرام سے نہیں بیٹھے۔

ذہنی بلوغت کی ایک اور پہچان بھی ہے کہ فرد اپنے ازدواجی رفیق کی پروا کرتا ہے۔ بعض افراد محض اپنے ہی سے محبت کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اپنے لیے کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خود پرستی، یہ خودانسی اس حد تک کیسے بڑھ جاتی ہے کہ گویا اپنی ذات ہی میں، محبوب شامل ہے اور عاشق بھی؟

ایک مثال لیجئے:

''ز'' کو اس کے باپ نے کبھی لڑکی نہیں سمجھا۔ بلکہ وہ اسے گڑیا سمجھتا رہا۔ ''ز'' اپنے کالج کے حسن کے مقابلہ میں سب سے زیادہ حسین منتخب کی گئی۔ ان دو وجوہ سے وہ خود پرستی اور خودانسی میں مبتلا ہوگئی۔ شادی ہوئی لیکن یہ خودانسی ختم نہ ہوئی۔ اس کا شوہر ایک ایسا آئینہ تھا جس میں وہ اپنی ہی شکل دیکھتی تھی۔ ذہنی نابالغی کی یہ ایک بہترین مثال ہے۔ جسے غلطی سے جوانی کا نشہ کہا جاتا ہے وہ ہمیشہ اس نشہ میں مبتلا رہی اور اپنے آپ کو لڑکی سمجھتی رہی۔ جب ''ز'' کی لڑکی جوان ہوئی اور اگر کوئی ''ز'' کو اس لڑکی کی بہن تصور کرتا ہے تو ''ز'' بہت خوش ہوتی ہے۔

اب ایسے افراد پر آئیے جو بلاوجہ ہی اس خیال میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کو محبت کے بدلے میں محبت نہیں ملی۔ ان کو کسی نے چاہا نہیں۔ ایسی خواتین لاشعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیتی ہیں کہ اگر کوئی دوسرا فرد نہیں چاہتا تو وہ خود سے پیار کریں گی اور محبت کی تشنگی دور کریں گی۔

ان دونوں اقسام کی عورتوں کے لیے ازدواجی زندگی اسی وقت تک جنت کا نمونہ بنی رہتی ہے جب تک ان کے شوہر ان کی مدح سرائی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ خواتین اپنے شوہروں سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتی رہتی ہیں کہ ان کو یقین ہوتا رہے کہ شوہر اب بھی ان کی پرستش کرتا ہے۔ یہ وہ خواتین ہیں جو قانوناً اور جسماً اپنے شوہروں کی بیویاں ہیں لیکن نفسیاتی طور پر وہ اب تنہا رہتی ہیں۔ شادی کو ایک مدت گذر جاتی ہے کئی کئی بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔ بچوں کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن وہ جذباتی طور پر کنواری ہی رہتی ہیں۔ ان خواتین کو کبھی اپنے شوہر کی محبت کو محسوس کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ انہوں نے کبھی اپنے شوہر کو محبت نہیں بخشی، اس کے جذبات کا احترام نہیں کیا۔

ایسی خواتین اپنے شوہروں کی موت پر آنسو بہاتی ہیں لیکن اس لیے نہیں کہ بیچارہ اپنی جان سے گیا بلکہ اس لیے روتی ہیں کہ ان کے منصوبے تشنہ تکمیل رہ گئے۔

کامیاب ازدواجی زندگی میں اپنے رفیق سے محبت کے ساتھ ہی ساتھ خود کی بھی پرواہ رہتی ہے۔ اور اکثر ایک دوسرے کے لیے اپنی ذاتی خواہشات کی قربانی کرتے رہتے ہیں۔

بعض خواتین ایسی ہوتی ہیں جو اپنے شوہر اور بچوں میں اتنی غلطاں ہو جاتی ہیں کہ ان کو کوئی سدھ ہی نہیں رہتی اور کوئی دل چسپی نہیں رہتی۔ جب بچوں کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گھروں کے ہو جاتے ہیں اور شوہر کی موت واقع ہو جاتی ہے تو ان کی زندگی کا کوئی مصرف نہیں رہتا۔ وہ اپنی زندگی میں مقصد کی عدم موجودگی سے پریشان ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تو بچوں اور شوہر کی موجودگی میں یہ تنہائی، یہ بے کیفی کا عالم طاری ہو جاتا ہے تو یہ خواتین اس وقت زندگی کی دھڑکنیں سنتی ہیں جب شوہر اور بچے دونوں قریب ہوتے ہیں۔ یہ محبت نہیں ہے بلکہ جذباتی بیماری ہے۔ یہ خواتین بذات خود زندگی سے لطف اندوز نہیں ہوسکتیں وہ ایک سہارے پر جیتی ہیں اور جب یہ سہارا اٹھ جاتا ہے تو وہ گر جاتی ہیں۔ ایک ذہین بیوی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے۔ اس کی الجھنوں میں برابر کی شریک ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی انفرادی زندگی کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مقصد پیدا کرتی ہے۔ وہ بہ حیثیت فرد کے بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں دونوں کو اہم پارٹ ادا کرنے ہیں۔ لیکن بیوی کے پارٹ زیادہ اہم ہیں۔ ذہنی بالغ بیوی ہر لمحہ ایک مختلف کردار ادا کرتی ہے۔ مثلاً اس کے چند اہم پارٹ یہ ہیں:۔

1۔ اس کو پاکباز ہونا چاہیے۔

2۔ اس کو دوسری عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ دلکش بننے کی ضرورت ہے۔

3۔ اسے ایک بہتر رفیق بننا ہے۔ اور جب کبھی ضرورت پڑے تو اپنی تسکین کی پرواہ کیے بغیر شوہر کے ساتھ ہمدردی کرنا ہے اور اس کی ہمت بڑھاتا ہے۔

4۔ اس میں آمدنی پیدا کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیے تاکہ جب ضرورت ہو تو وہ گھر کو نقصان سے بچا سکے۔

5۔ اسے بچوں کی ذمہ داریاں اپنے شوہر کے ساتھ مشترک طور پر قبول کرنا ہیں۔ لیکن اگر وقت پڑے تو ماں

باپ کے فرائض اٹھانا ہے۔

6۔ اسے ایک ہی وقت میں بہترین باورچی، دھوبی، خاکروب بننا ہے۔

7۔ اسے ایک ہی وقت میں شوہر کی بیوی، دوست، ہمدم اور مشیر بننا ہے۔ اور اسے شراب دو آتشہ بننا ہے، کہ اس کا شوہر اس کے خمار میں چور رہے۔

8۔ اسے گھر کے بحث و مباحثہ میں سرگرمی دکھانا ہے۔ اپنے شوہر کی باتوں کو سننا ہے اور صرف وہی سوال کرنا ہے جن کا جواب شوہر دے سکتا ہے۔ اسے ایک نرس کے فرائض انجام دینا ہیں۔

9۔ اسے اپنے شوہر کے خیالات جاننے کے لیے علم نفسیات سے واقف ہونا چاہئے اور اسے خواتین کے ایک کلب کا ممبر بننا ہے۔

ان لوازمات پر غور کیجئے۔ عورت سے زیادہ توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔ شوہر پر اتنے فرائض عائد نہیں کیے جاتے۔ ازدواجی مسرت کے لیے عورت سے اتنی توقعات بڑھانا اور ہر پارٹ میں کامیابی کی امید کرنا گو عقل مندی نہیں لیکن ان کے بغیر شادی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ذہنی بالغ عورت ان لوازمات میں سے اپنے شوہر کی رضامندی سے چند لوازمات کو بنیادی اہم متصور کرسکتی ہے گو بعض خواتین ایسی ملیں گی جو اپنے شوہروں کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھتی ہیں۔ وہ اپنے کپڑے آپ سیتی ہیں، کھانا خود پکاتی ہیں، مباحث میں شریک ہوتی ہیں، یہ خواتین یقیناً قابل تحسین ہیں۔

کچھ مرد ایسی عورتوں سے خائف رہتے ہیں جو صرف گھریلو ہیں اور سماجی زندگی کے لیے بالکل ناکارہ۔ اور کچھ مرد ایسی عورتوں سے خائف رہتے ہیں جو گھر کے باہر تو سب کچھ کرسکتی ہیں گھر کے اندر کچھ نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت کو گھر کے اندر گھر کے باہر یکساں طور پر ماہر ہونے کی ضرورت ہے۔

کوئی بھی عورت اس وقت تک ازدواجی زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ وہ بحیثیت فرد، کامیاب بننے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ اگر کنواری زندگی میں لڑکی خوش نہیں رہتی تو شادی کے بعد بھی اس کے خوش رہنے کے امکانات کم ہیں۔ اسے جذباتی طور پر یا جنسی بھوک کی خاطر شادی نہیں کرنا چاہئے۔ ہم شادی اس لیے نہیں کرتے کہ اس کے بعد ہم خوش رہ سکتے ہیں۔ بلکہ اسے لیے کرتے ہیں کہ ہم شادی کے بعد زیادہ مسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں...... ان دونوں خوشیوں میں بہت فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ بیشتر شادیوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ فریقین یا تو پوری محبت دے نہیں سکتے۔ یا بالغ محبت کو حاصل کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو ایک معقول سہارے کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ ایسی خواتین بھی ہیں جو نہ خود سے یہ اعتراف کرتی ہیں اور نہ شوہروں سے کہ ان کی جذباتی زندگی کا دارومدار ان کے شوہر پر ہے۔ اس لیے وہ کبھی شوہر کی محبت کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا کرپاتی اور ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی بے کار کوشش کرتی رہتی ہیں کہ وہ اپنے شوہروں کے بغیر بھی کامیاب زندگی بسر کرسکتی ہیں۔

دونوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔

شوہر کہتا ہے: ''میں چھوڑ کر تمہیں چل دوں گا۔''

بیوی کہتی ہے:

''اپنا منہ کالا کر کے تو دیکھ۔ میں بھی ثابت کردوں گی کہ میں تمہارے بغیر بہتر سے بہتر زندگی بسر کر سکتی ہوں!''

بیوی دل کی گہرائیوں سے شوہر کی جدائی نہیں چاہتی۔ اس لیے وہ اپنے آپ سے کشاکش میں پھنس جاتی ہے اور وہ خود کو یہ اطمینان دلانا چاہتی ہے کہ اسے شوہر کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ دراصل وہ شوہر کی محبت قبول کرنے کے اہل نہیں ہوتی۔

ایسی بھی خواتین ملیں گی جو کسی بھی مرد پر اعتبار نہیں کرتیں...... خواہ ان مردوں میں ان کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ اب پھر ان عورتوں کا تصور کیجئے جو مردوں کو ظالم اور تشدد پسند سمجھتی ہیں۔ کچھ گھروں میں یہ رسم بھی چلی آ رہی ہے کہ ماں اپنے بچوں کے سامنے اپنے شوہر کو گالیاں دیتی ہیں اور برا بھلا کہتی ہیں۔ گویا یہ اس کی زندگی بھر کا تجربہ، زندگی بھر کا نچوڑ ہے جب اس ''تجربہ کار'' عورت کی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو لڑکی کو اپنی ماں کے الفاظ یاد آتے ہیں کہ تمام مرد بورے کتے ہیں اور ظلم کرتے ہیں...... لڑکی سوچتی ہے کہ میرا شوہر بھی مرد ہے وہ بھی کتا ہوگا اور ظالم ہوگا اس لیے وہ اپنے شوہر سے اس طرح گریز کرتی ہے جیسے واقعی اس کا شوہر ایک سر پھرا کتا ہے جو اسے کاٹ لے گا۔

اب آپس کے تنازعات اور روزمرہ کے جھگڑوں کو لیجئے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جھگڑے اتنے برے نہیں جتنا کہ ان کو بنا دیا جاتا ہے۔ تمام شادی شدہ افراد کو جھگڑنا ہی چاہئے۔ کچھ خواتین ایسی بھی ہیں جو بڑے ناز سے کہتی ہیں:

''ہم دونوں میں تو کبھی لڑائی بھی نہیں ہوئی۔''

میرا خیال ہے کہ یا تو وہ اپنے جھگڑوں کو بھول گئی ہیں یا جھوٹ بول رہی ہیں یا ان کی شادی میں زندگی کی سی حرکت نہیں۔ وہ جامد ہے اور وہ اپنے آپ کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا نہیں چاہتیں۔

جھگڑوں کی دو اقسام ہیں ایک جھگڑا وہ ہے جبکہ بیوی یا شوہر اپنے حقوق کی پامالی دیکھ کر اپنے شوہر یا بیوی سے لڑ پڑے۔ اس قسم کا جھگڑا مفید ہے۔ جب صلح ہوتی ہے تو دونوں کو ایک دوسرے کے متعلق مزید معلومات ملتی ہیں اور شادی ترقی کا ایک زینہ اور چڑھ جاتی ہے۔ اس قسم کے جھگڑے ایک تعلیمی قدر رکھتے ہیں۔

لیکن وہ جھگڑے جو محض جھگڑوں کی وجہ سے کیے جاتے ہیں ان کا تعلیمی مقصد نہیں ہوتا۔ کچھ ذہنی نابالغ افراد ایسے بھی ہیں جو اپنے اندر جذبات کے تلاطم کو دور کرنے کی خاطر ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں اور ایسے جملے ادا کرتے ہیں جن سے ایک دوسرے کی شخصیت کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اور کبھی کبھی دونوں ایسی باتیں کہہ جاتے ہی جو کسی صورت میں نہیں کہنا چاہئے تھیں۔ یہ جھگڑے برے ہیں کیونکہ صلح ہونے کے بعد بھی دونوں افراد عمر بھر تک یہ نہیں بھولتے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو کیا کہا تھا۔ اور اپنے متعلق کیا کہا سنا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کنواری لڑکیوں اور لڑکوں کو تعلیم دی جائے کہ جھگڑے کس طرح ختم ہوتے ہیں۔

میرا تجربہ ہے کہ اگر دونوں رفیق ایک دوسرے کے لیے اچھے جنسی رفیق ثابت نہیں ہوتے تو محض اس کی وجہ سے شادی ناکام نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک بری شادی دونوں کو ناموزوں جنسی رفیق بھی بنا دیتی ہے۔

شادی دراصل جسمانی کشش سے نہیں۔ ذہنی مطابقت سے کامیاب ہوتی ہے۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ شادی کے بعد ناجائز تعلقات حق بجانب ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ شادی کے بعد اگر شوہر یا بیوی دوسری بیوی یا شوہر سے تعلقات وابستہ کرتا ہے تو دراصل وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی شادی میں مطمئن نہیں ہے۔

کچھ ایسے بھی نیوراتی مریض ملیں گے جو ناجائز تعلقات سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے جواں مرد ہیں۔ بے وفائی دراصل ایک اضافی چیز ہے۔ ایک شخص کے لیے کچھ معنی رکھتی ہے دوسرے کے لیے کچھ۔

شادی ناکام نہیں ہوتی بلکہ دونوں فریقین ناکام ہو جاتے ہیں اگر دونوں افراد ذہنی طور پر بالغ ہیں تو وہ بہ آسانی اپنی شادی کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔

اب یہ فرض کیجئے کہ ایک فریق تو بالغ الذہن ہے اور دوسرا فریق اس بلوغت تک پہنچا تو کیا کرنا چاہئے؟

ظاہر ہے کہ اگر شادی کو کامیاب رکھنا ہے تو بالغ النظر فریق کو بہت کچھ برداشت کرنا ہوگا۔ اگر دونوں اس بلوغت تک نہیں پہنچے ہیں تو دونوں کا کیا حشر ہوگا؟

جواب یہ ہے کہ پھر ان دونوں کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ دونوں بچے ہیں جو ایک گھر میں ایک دوسرے سے کھیل رہے ہیں، لڑ رہے ہیں، روٹھ رہے ہیں، من رہے ہیں۔ لیکن اگر یہیں تک ناکامی ہوتی تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ مصیبت تو یہ ہے کہ دونوں کی بچگانہ ذہنیت کا اثر ان کے بچوں پر پڑتا ہے اور قوم پر پڑتا ہے۔ تو یہ ایک متعدی بیماری ہے جو دوسرے افراد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

کامیاب شادیاں اور بھی کامیاب ہو سکتی ہیں اور ناکام شادیاں مزید تباہی سے بچ سکتی ہیں اگر دونوں فریقین اپنی ذہنی بلوغت کا صحیح صحیح اندازہ لگالیں اور کمیوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

اکثر ہم اپنی خامیوں کو جاننے سے قاصر رہتے ہیں، اپنی حقیقی شکل نہیں دیکھ پاتے۔ اسی صورت میں ہمیں نفسیاتی ڈاکروں سے مدد لینا چاہئے۔

اپنے سے بار بار سوال کیجئے:

میں اپنی شادی کو کامیاب بنانے کے لیے کیا جدوجہد کر رہا ہوں؟ کونسی قربانیاں پیش کر رہا ہوں؟

اور اس سوال کے جواب کے لیے اپنا جائزہ لیجئے۔ آپ کو اخذ کردہ نتائج دوسرے سے بیان نہیں کرنا ہیں۔ اس سوال کا جو کچھ صحیح جواب ملے اور اس جواب کے جو تقاضے ہوں اس پر صحیح صحیح عمل کیجئے۔ آپ اپنی شادی کو کامیاب بنالیں گے۔

(بحوالہ: عورت اور جنسیات)　　(عابدی جعفر)

عورت اور جنسیات

عورت بنئے! کیسے؟

اس دور جدید میں شریک حیات کے انتخاب کا حق لڑکیوں کا حصہ ہے، والدین کا نہیں۔ کچھ اس لئے بھی کہ لڑکیوں کے اپنے جذبات پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ اور نہ والدین کے بس کی بات ہے کہ انہیں فرسودہ روایات کے کھونٹے سے باندھے رہیں۔

گزشتہ 35 سال میں بڑے بڑے انقلابات آتے رہے ہیں۔ اس دوران میں جنگیں لڑی گئی ہیں معاشی انقلابات آئے ہیں، کتنے ہی انسان بے گھر اور بے در ہو جانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ انسانوں کو مختلف اقوام، مختلف رنگ و نسل کے انسانوں سے تعلقات بڑھانے پڑے ہیں۔ مختلف مذاہب، سماج اور معیشت سے انسانوں نے رشتہ جوڑا ہے ان باتوں سے ایک حد تک رنگ و نسل، مذہب و ملت کی حدود کو توڑ ڈالا ہے۔

پہلے جبکہ ایسے انقلابات نہیں آئے تھے۔ لڑکیوں کی شادی ایک ہی گاؤں شہر، جرگہ یا قصبہ کے مردوں سے ہوا کرتی تھی لیکن اب یہ روایات ختم ہو چکی ہیں زمانہ کی قدریں بدل چکی ہیں آج اگر ایک شہر کی لڑکی دوسرے شہر کے کسی لڑکے کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتی ہے تو ہم کسی تعجب کا اظہار نہیں کرتے۔ اب اس جرات سے کوئی جدت وابستہ نہیں۔

آج اگر ایک انگریز نسل کی لڑکی کسی حبشی سے شادی رچا لیتی ہے تو اس قدر تعجب کی بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر ایک امریکی کسی جاپانی لڑکی کو اپنی منکوحہ بنا لیتا ہے تو بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔

یہ تمام ڈرامے آپ کے اردگرد آئے دن ہوتے رہتے ہیں آپ جب اپنی کم سن سہیلیوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے دیکھتی ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہوگا۔ نہ جانے آپ کی تقدیر میں کونسا مرد ہے وہ کیسا ہوگا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے اور نہ اس سلسلہ میں آپ کسی حتمی فیصلہ پر پہنچ سکتی ہیں آپ کو سب سے پہلے ہی دیکھنا چاہئے شریک حیات کے انتخاب کے لئے کیا کیا ضروری باتیں ہیں؟

کیا آپ شادی پیار و محبت اور خوشگوار رشتہ ازدواج کے لئے کرنا چاہتی ہیں؟...... اگر ایسا ہے، بڑا ہی نیک اور صائب خیال ہے لیکن وقت کا سب سے اہم مسئلہ آپ کے لئے یہ ہوگا کہ آخر اس مرد کا انتخاب کس طرح پھر عمل میں لا سکتی ہیں جبکہ اس تجربہ کے لئے آپ کو ایک عامیانہ رومانس سے گزرنا ہی پڑے گا...... کیا آپ آئندہ زندگی کی خوش گواری کے مدنظر اس کے لئے تیار ہیں؟

اگر آپ کا یہ جواب اثبات میں ہے تو پھر اس حد سے گزر جائیے اور جنس مخالف کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کہ آخر وہ کیسا انسان ہے اور جب ایسے رومانوی رشتہ سے آشنا ہوں تو سوچئے کہ آپ اس شخص سے محبت کر سکتی ہیں۔ آپ کو اس سے محبت پیدا ہو گئی ہے یا جنس مخالف آپ سے محبت کرتا ہے اور کیا شریک حیات کے انتخاب کے

لئے محض محبت کافی ہے؟...... اس کا جواب آپ کو بہ آسانی اپنے اردگرد کے دوسرے ازدواجی زندگی بسر کرنے والے جوڑوں سے مل جائے گا۔ پھر تو آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ کو مزید اور کیا چیزیں دیکھنا چاہئے آمدنی؟...... مذہب، سماجی حیثیت، جنس مخالف کی شخصیت اور پھر فیصلہ کیجئے گا کیا آپ کے مدنظر شریک حیات میں وہ تمام تر خصوصیات ہیں جن کی آپ کو تلاش ہے۔

اور جب آپ کو جنس مخالف میں سے واقعی ایسا کوئی انسان مل جاتا ہے تو آپ کے خیالات کی پرواز سرمئی بادلوں تک جا پہنچتی ہے۔ آپ اس شخص کو منتخب کرنے کے لئے محبت اور خلوص محسوس کریں گے اور جب ایسا آپ محسوس کریں تو سمجھئے کہ آپ کے خیالات بالغ نظریات کے حامل ہیں۔

اس موقع پر جب کہ آپ دونوں مہذب شہری ہیں یہ امر ضروری ہے کہ محبت کی قدریں آپ دونوں صحیح معنوں میں پہچانیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ایسی محبت ناکامی کے اندھیرے میں بھٹک کر رہ جائے گی اور آپ کے پاس یاد ماضی کے سوا کچھ نہ رہے گا اور ایسے سرمایہ حیات ہمیشہ المناک ہوتے ہیں۔

پہلی بار جب آپ صنف مخالف کے قریب ہوں گی تو یہ لمحات مرد کے لئے بڑے سحر آگیں اور دل فریب ہوتے ہیں اس لئے کہ لڑکپن کی حماقتوں پر ڈانٹ پھٹکار سن کر مرد جوانی میں قدم رکھتا ہے اور جب اسے کسی عورت کی محبت ملتی ہے تو اس کی پہلی بار عزت افزائی ہوتی ہے اور وہ اپنی مردانہ صلاحیتوں پر نازاں ہوتا ہے...... آپ اس موقع پر اسے طرح طرح کے مناظر پیش کرتی ہیں جس کی خواہش آپ کا جنس مخالف کرتا ہے۔

ہوسکتا ہے وہ بھی آپ سے محبت سے پیش آتا ہو۔ آپ کے جذبات واحساسات کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن یاد رکھئے۔ اس کے باوجود محبت کی یہ پینگیں آپ کو غلط راستے پر ڈال سکتی ہیں اس لئے کہ زندگی میں خالی خولی محبت سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ کامیاب زندگی کے لئے کئی اور چیزوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے کئی اور ذمہ داریوں کا بھی انسان کو جواب دہ بننا پڑتا ہے۔ انسانی فطرت میں اور بھی چیزیں شامل ہیں غصہ، خوشی ومسرت، ناکامی، احساس کامرانی، یاسیت، مذہبی اور سیاسی رجحان، جذبہ ناداری، بہادری، جھوٹ، سچ، جو ہمیشہ اپنا اظہار چاہتی ہیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ محبت کی منزلیں طے نہ ہوسکیں اور کسی کی چاہت محض ریگستان کی آندھی بن کر رہ جائے...... اس لئے جب بھی آپ کی زندگی میں کوئی مرد آئے آپ کو جذباتی بن کر فیصلہ نہیں کرنا ہے بلکہ سنجیدہ اور باشعور ہو کر کسی صحت مند فیصلہ پر پہنچنا ہے۔

جانبین میں خیالات کی یکسانیت اور مطابقت تعلقات کی خوش گواری کے لئے جزو لازمی ہے اور یہی یکسانیت اور خیالات کی مطابقت جب آپ کو جنس مخالف میں نہیں ملتی ہے تو آپ چیخ اٹھتی ہیں کہ اسے مجھ سے کوئی محبت نہیں'' ...... اور اس ناکامی کا شکار ہونے کے بعد آپ آئندہ بھی ہمیشہ یہی سوچیں گی کہ کوئی محبت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کسی عورت اور مرد کے خیالات میں یکسانیت اور ہم آہنگی مشکل امر ہے۔ لیکن ایسا سوچنا بھی غلط ثابت ہوگا۔

ایک ناکامی بہت ممکن ہے، آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کردے کہ کسی سے محبت کرنے سے بہتر ہے کہ کوئی آپ سے محبت کرے۔ اس طرح کے خیالات آپ کی زندگی کو اور بھی الجھادیں گے۔

آیئے اب اس کا جائزہ لیں کہ وہ واقعی محبت کیا بلا ہے۔ محبت کے معنی ہیں کسی ذات واحد کو اہمیت اور قدر و قیمت بخشنا۔ آپ چاہیں گے، آپ کا جنس مخالف آپ کی محبتوں کا قدر شناس ہو۔ وہ خلوص و پیار کی فیاضیوں کا سرچشمہ ہو۔ آپ اس سلسلہ میں خوش نصیب ہوں گی۔ اگر آپ کو صحیح معنوں میں مرد کی چاہت مل جائے اور جب یہ چاہت مل جاتی ہے تو جانبین کے تعلقات استوار ہو سکتے ہیں اور جانبین میں سے ہر فرد کی چاہت کا مساوی ہونا بے حد ضروری ہے۔ چونکہ اسی پر تعلقات کی خوشگواری کا انحصار ہوتا ہے۔

اگرچہ تعلقات نئے ہیں تو یہ اندازہ لگانا کہ جانبین میں کسے کم اور کسے زیادہ محبت ہے۔ اس کا فیصلہ ایک مشکل امر ہے لیکن تعلقات کو دائمی مشکل اسی صورت میں دی جاسکتی ہے کہ آپ جتنی محبت کسی سے کریں، اتنی ہی محبت آپ کو حاصل ہونی چاہئے۔

بعض اوقات ازدواجی رشتوں کی تشکیل بچپن کے خیالات کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو کسی مرد میں اپنے باپ، بھائی یا عزیز رشتہ داروں کے سے اوصاف نظر آتے ہیں تو آپ اس طرف کھنچتی چلی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے بچپن کا شدت احساس ہوا کرتا ہے، لیکن اس قسم کا انتخاب اکثر غلط ہو جاتا ہے اور مہلک ثابت ہوتا ہے اور ازدواجی رشتہ کا قیام مشکل ہو جاتا ہے، بچپن کے اس ایک احساس کی خاطر زندگی کا سودا بڑا ہی مہنگا پڑتا ہے۔

محبت کی رنگینیوں میں کھو کر اکثر لڑکیاں اپنی زندگی تباہ کر بیٹھتی ہیں۔ جسمانی اور جنسی کشش محسوس کرنا کوئی نئی بات نہیں اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ جانبین میں سے ہر دو مخالف جنس ایک دوسرے سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی محبت جنون کی سرحدوں کو طے کر لیتی ہے اور سنجیدگی و انتخاب کا تصور ہی ایک سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ محبت کے رنگین دور میں دراصل جنسی کشش کی افزائش ایک صحت مند انتخاب اور مقصد سے آپ کو دور پھینک دے گی۔ اور بہت دنوں کے بعد آپ سوچیں گی آپ واقعی غلط راستہ پر تھیں۔ دراصل اس دور میں آپ کے قدم متوازن پڑنا چاہئے ورنہ ایک ذرا سی لغزش آپ کو تحت الثریٰ میں گرادے گی۔

شادی کے بڑے وسیع معنی ہیں۔ اول دو جنس مخالف میں ایک رشتہ کا نام شادی ہے۔ جس میں سے ایک جنس کو ہم شوہر اور دوئم کو زوجہ کہتے ہیں۔

ایک عورت جب رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتی ہے تو اس کا اسے بخوبی احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک عورت ہے اس کے بعد وہ سوچتی ہے کہ وہ کسی کی زوجہ ہے۔ پھر وہ سوچتی ہے بیوی کسے کہتے ہیں اور اس میں کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ پھر ایک ماں کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔ اسے اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کس طرح کرنی پڑے گی اور سب سے آخری تصور اس مرد کا ہوتا ہے، جو شوہر کی حیثیت سے اس کا جیون ساتھی بنتا ہے۔ عموماً

عورتوں کے خیالات اپنی زندگی میں آنے والے مردوں کے بارے میں بڑے اعلیٰ اور ارفع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ محض عورتوں کی اپنی رائے ہوتی ہے اس کا تعلق واقفیت کے اکثر برعکس ہوتا ہے۔ عورتوں کی توقعات عموماً پوری نہیں ہوتیں وہ اس امر کی متوقع ہوتی ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی اور بچوں کی ذمہ داری پوری کرنا ہوتی ہے۔

اسی طرح مردوں کے بھی الگ تصورات ہوتے ہیں جو بہت ممکن ہے۔ آپ کے خیالات کے منافی اور متضاد ہوں اور ان حالات کا اندازہ شادی کے پہلے سال کے بعد ہوتا ہے۔ متضاد خیالات کا انکشاف جنسی جذبات کے بحرانی دور کے بعد ہوتا ہے جب زندگی کے اور دوسرے مسائل سامنے آتے ہیں اور ان حالات میں آپ سوچتی ہیں۔ آپ کو کیا کرنا چاہئے، کیا جواب دینا چاہئے...... آپ کا کونسا فعل شوہر کی خوشنودی کا باعث بن سکتا ہے اس کے لئے آپ اس بات کا جائزہ لیتی ہیں کہ آپ کے شریک حیات کی ماں کا اس زندگی میں کیا رول رہا ہے۔ دوسرے آپ سوچتی ہیں کہ وہ کون سے ذرائع تھے۔ جن کی بدولت میری ماں میرے باپ کو خوش رکھنے میں کامیاب ہوتی تھی۔ اور اس کے باوجود اگر مسائل حل نہیں ہوتے اور اس احساس کا اظہار مشکل ہو جائے گا کہ زندگی میں آپ کس قدر الجھنیں محسوس کرتی ہیں اور ان الجھنوں کا ماحصل غصہ، جھگڑا اور آنسوؤں کی روانی ہوتی ہے۔

اور جب جانبین میں اس امر کا احساس ہو جائے کہ وہ مختلف الخیال ہیں تو اس کا ازالہ ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ ہر دو افراد ایک دوسرے سے خیالات کے متعلق خود کو ڈھال لیں۔ اگر چہ دو مختلف شخصیتوں کے مابین اس قسم کی ہم آہنگی ایک مشکل امر ہے۔ یہ کہنا حقیقت کے منافی ہے کہ جانبین میں خیالات کی ہم آہنگی اور ۔۔۔ ناممکن ہے۔ دراصل اس قسم کی تبدیلی کا انحصار جانبین کے مزاج و کردار پر منحصر ہے۔ جانبین اگر چاہیں تو اس آئیڈیل عورت اور مرد کے متوقع تصور کو ختم کر کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اور تب ہی کوئی ازدواجی رشتہ دیرپا ہو سکتا ہے۔ حقیقت سے اجتناب ازدواجی زندگی کے لیے ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بہت ساری سماجی قدریں اس دور میں بدل چکی ہیں۔ مردوں کا احساس برتری جو اس زمانے میں بھی روایاتی طور پر ان سے وابستہ ہے۔ اور اب بھی یہ چاہتی ہے کہ ان کے بال بچے ان کے مکمل فرمانبردار ہوں حالانکہ یہ اصول اب محض عہد پارینہ کی یادگار بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اس دور جدید میں اس اصول کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ خاص طور پر جب کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خاندان کی آمدنی بڑھانے میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ اور جبکہ وہ بذات خود اپنی کفالت کر سکتی ہیں اور اپنی شخصیت، عزت و برتری کو قائم رکھ سکتی ہیں۔ اس دور جدید میں انہیں ان باتوں کے لیے انہیں مردوں کا رہین منت نہیں ہونا پڑتا۔ اکثر اوقات مردوں کی ناواقفیت کہ انہیں شریک حیات چاہئے، الجھنیں پیدا کر دیتا ہے۔ اکثر تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی شریک حیات محض ایک گڑیا ہو، ایک بیوقوف فرشتہ صفت عورت ہو اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ ذہین اور خود کفیل ہو۔ اور دور جدید کے ازدواجی مسائل اور بچوں کی پرورش و پرداخت سے بخوبی واقف ہو۔ اسی طرح عورتیں بھی مختلف خیالات و توقعات کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتی ہیں۔ ایک طرف وہ روایاتی حفاظت چاہتی ہیں دوسری طرف وہ اپنے تمام تر حقوق اور آسانیوں

کی فراہمی کی تمنا کرتی ہیں جو موجودہ دور کا طرہ امتیاز ہے۔

اکثر دلہنیں ازدواجی زندگی کی تنہائیوں سے گھبراتی ہیں۔ باوجود یہ کہ وہ جیون ساتھی کا بذات خود انتخاب کرتی ہیں اور ان کے سامنے خوش آئندہ زندگی کا ایک تصور ہوتا ہے۔ لیکن ایک گھریلو عورت بن کر تنہائیوں کو خوشگوار بنا لینا اکثر لڑکیوں کے لیے ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ شوہر تو اپنے دفتر سدھارتا ہے ادھر بیچاری بیوی کے لیے، ایک چھوٹے سے گھر میں اتنی دل چسپیاں ہرگز نہیں ہوتیں کہ وہ اپنا دل بہلا سکے۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ اسکول یا دفتر کے وہ دن یاد آتے ہیں۔ دوستوں کی محفل یاد آتی ہے۔ جس میں اس نے سنہری اوقات گذارے ہیں۔ اب ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں بجتی۔ اب تو ایک دلہن کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اوقات گھریلو الجھنوں میں گزارے یا پھر اپنے ناآسودہ جذبات کے ماتم پر۔ ان حالات میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے جانبین میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے کا احترام، جذبات کا پاس، امیدیں اور تمنائیں دنیا کے ہر گوشہ میں اسی ڈھنگ سے ازدواجی تعلقات خوش گوار ہو سکتے ہیں۔ دو مختلف الخیال انسانوں کی ہم آہنگی اسی وقت ممکن ہے جبکہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں۔ ان میں تحمل اور خود اعتمادی کا جذبہ ہو۔ جانبین میں اگر ہر فرد ایک دوسرے کی برائیوں کی تلاش میں رہیں اور انہیں بے موقع محل ٹوکتے رہیں تو اس کا لازمی نتیجہ تعلقات کی ناخوشگواری ہوا کرتا ہے۔ عورت کا سب سے بڑا کردار ہے، اس کا گھریلو عورت ہونا۔ جس حقیقت سے آج کی عورتیں ہمیشہ آنکھ چراتی ہیں۔ مردوں کی برعکس ان کی یہ ذمہ داری بڑی اہم ہے۔ ایک عورت کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ پرکشش، سحر آفریں اور مرد کی خواہشات کے مطابق ہو جس کی ذات سے بہت سی رنگینیاں وابستہ ہوں اور جس کا وجود جنسی کشش کا مظہر ہو۔ اور وہ مردوں کے ہر اشارے کو سمجھ کر اس کی ذات میں دل چسپی لے سکے اور یہی وہ آئیڈیل عورت ہوا کرتی ہے جو اپنی ذات کو اندرون خانہ مصروفیات میں فنا کر دیتی ہے اور عورت کے لیے دراصل یہ وہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جس سے وہ کبھی بھی کنارہ کش نہیں ہو سکتی۔ یہی ان کا سرمایہ حیات ہوتا ہے کہ اس کا گھر کیسا ہے؟ اس کے بچے کیسے ہیں؟ اور یہی وہ چیزیں ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر لوگ تعریف و توصیف کرتے ہیں اور عورت کی گوناں گوں خوبیوں کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے عورت ہمیشہ اپنے آپ کو پرکھتی ہے کہ وہ دوسروں کی نگاہ میں کیسی ہے۔ کوئی عورت سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم اپنے بستر پر کس طرح سوتی ہو؟ عورت کی خوبصورتی جس سے مراد (سیرت وصورت) دونوں ہیں اور اس کی گھریلو ذمہ داریاں، دونوں مل کر اسے ایک مکمل عورت بناتی ہیں۔ اسے سوچنا پڑتا ہے کہ بچوں کا کپڑا کیسا ہوگا؟ کل کیا پکے گا؟ عورت جو ایک شریک حیات، ایک ماں، اور گھر کی معمار ہوتی ہے۔ یہ بھول جاتی ہے کہ وہ مالکہ ہے۔ گھریلو انتظام کی ذمہ داریاں، بچوں کی پرورش و پرداخت اور اس کی زندگی کا نمایاں حصہ بن جاتے ہیں۔ شادی کے ایک سال بعد تمام تر رنگینیاں دھیرے دھیرے دم توڑ دیتی ہیں۔ اور بہت سے خاکے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ اپنے شریک حیات سے اس کی محبت اب اتنی شدید نہیں رہتی تاہم وہ اس سے انکار نہیں کرتی کہ وہ اس کے ساتھ ہم بستر نہ ہو۔ اگرچہ

اس کی یہ رضامندی اکثر دکھاوے کی ہوتی ہے، اکثر بھی وہ تھکاوٹ کا بہانہ کرتی، کبھی فکر و تردد کا۔ بعد اس کی زیادہ سے زیادہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ روزانہ کے اس مہمل مشغلہ کی ساتھی نہ بنے۔ لیکن اکثر تنہائیوں میں اسے مرد کی یاد ستاتی ہے۔ وہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی مرد اس کی تعریف کرے تا کہ اس کی جذبہ انانیت کی تسکین ہو سکے۔ جس کے بغیر اس کی زندگی ویران اور خالی خالی محسوس ہوتی ہے۔

ایک شادی شدہ عورت کی حیثیت سے اسے باشعور اور اپنی شخصیت کو بند رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عورت کے اندر بسنے والی عورت کبھی بھی نہیں مرتی۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہے کہ زن و شوہر کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہیں اور ایک دوسرے کی مکمل آسودگی ہوتی رہے۔ اس کے لیے کسی جدت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ مکمل طور پر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مرد کی حیثیت سے اپنے عاشق سے پیار کرتی ہے۔ وہ اس مرد سے محبت کرتی ہے جو عورت کو عورت بننے میں مدد دے۔ پھر عورت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ صحیح معنوں میں عورت بننے کے فن سے واقف ہو۔ اس کا تعلق مکمل حسن و جوانی اور جسمانی خوبصورتی سے ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ کس حد تک خوبصورت اور بدصورت ہے، اس کا اندازہ اسے بخوبی ہوتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ اپنے اوپر پورا پورا اعتماد رکھتی ہے۔ عورت کے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں کہ اس کے شوہر کو کیا پسند ہے کیا نہیں۔ وہ کس چیز کی تعریف کرتا ہے کس چیز میں دلچسپی لیتا ہے۔ عورت کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کا شوہر عورت کی حیثیت سے اسے کس حد تک چاہتا ہے۔ اس لئے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ مرد بیوی کی ذات سے ماں جیسی شفقتوں کے متوقع ہوتے ہیں۔ پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کب اور کن حالات میں اس سے زیادہ التفات اور پیار کرتا ہے۔ اس لیے عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مساوی طور پر تمام باتوں کا خیال رکھے۔ اور بہت ساری مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ شوہر کا بھی خیال رکھنا لازم ہے۔

مگر اس کا احتساب ذرا مشکل ہے۔ اس لیے کہ شادی جنسیت میں نہیں ہوتی یہ محض ایک رشتہ ہوتا ہے۔ جس کی تجدید بار بار ہونی چاہئے۔ کمی و پورا کرنا چاہیے۔ جانبین میں ہر دو فرد کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہئے تب ہی محبت کا جواب محبت سے مل سکتا ہے اور ازدواجی رشتہ کی کائنات اپنے صحیح محور پر گھوم سکتی ہے۔ ہر عورت کی یہی کوشش ہونی چاہئے کہ یہ محوری نظام کبھی درہم برہم نہ ہو۔

(بحوالہ: عورت اور جنسیات)
(عابدی جعفر)

حکایتیں اور افسانے

کہا جاتا ہے کہ عورت ایک سربستہ راز ہے۔ ایک معمہ ہے۔ سمجھنے نا سمجھنے کا صدیوں سے شاعر، فلسفی، مذہبی رہنما، مفکرین اور دانش ور اس عقدہ لاینحل کی گرہ کشائی میں مصروف ہیں۔ دنیا بھر کے ادب پر نگاہ دوڑایئے عورت کی فطرت اور سرشت پر دوانتہا موافق ومخالف نظریات سامنے آئیں گے۔

موافقین کے مطابق عورت اوصاف حمیدہ کا ایک حسین مرقع ہے۔ فرشتہ ہے جو بچپن ہی میں ہماری پرستار، جوانی میں خوش گوار رفیق اور بڑھاپے میں ہماری تسکین ہے۔ انگریز مصنف ٹامس مور عورت کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے:

''اے عورت تورات کا تارا، صبح کا ہیرا اور شبنم کا وہ قطرہ ہے جس سے کانٹوں کا منہ بھر جاتا ہے۔ تو برے اور تاریک دور میں مشعل راہ ہے۔''

روسی افسانہ نگار چیخوف لکھتا ہے:

''عورت مرد سے زیادہ محنتی، سمجھدار اور نیک ہے۔ نیک کام اس سے اس طرح سرزد ہوتے ہیں جیسے آسمان سے بارش برستی ہے۔''

فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو اس کی عظمت کے راگ یوں الاپتا ہے:

''پھر خدا نے عورت کو بنانا چاہا۔ اس نے سوچا گندھی ہوئی مٹی تو ختم ہو چکی ہے کیوں نہ عورت کو سب سے اہم بنادوں۔ یہ خیال آتے ہی خدا نے چاند سے اس کی چمک، سمندر سے اسکی گہرائی، موجوں سے ان کی روانی، ستاروں سے ان کی دلنواز جھلملاہٹ، سورج سے اسکی تابناکی، شبنم سے اسکی مسحور کن طراوت، سیماب سے بے قراری، چھوئی موئی سے اسکی نزاکت، خرگوش سے اسکی حیا اور قمری سے اس کا نغمہ، ان سب اجزاء سے ایک حسین مجسمہ تیار کیا۔ اس کا نام عورت رکھا۔ فرشتوں نے پوچھا اے خالق ارض وسما! تو نے اپنی طرف سے اس میں کیا شامل کیا ہے۔ خدا نے جواب دیا ''محبت'' اس پر فرشتے سربسجود ہوگئے۔''

عورت مجموعہ اخلاق خداوندی ہے۔ وہ ایک آسمانی نور ہے جس سے کائنات روشن ہے۔''

ہارگو کے مطابق:

''عورت ذہن کی دلکشی اور جادو اثر نظم کا نام ہے۔''

شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے عورت کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے تصویر کائنات کا رنگ قرار دیا ہے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

مخالفین نے عورت کو شدید ترین الفاظ میں ہدف تنقید بنایا ہے اور دنیا بھر کی برائیاں اور خامیاں اس کے سر

منڈھ دی ہیں۔

کسی نے کہا عورت آگ ہے اس کو پھونک دینے والا شیطان ہے۔ وہ ایک مہلک وبا بھی ہے۔ کسی نے کہا وہ ایک بچھو ہے جو ہمیشہ نیش زنی کرتا ہے۔ اس کی زبان وہ تلوار ہے جو کبھی زنگ آلود نہیں ہوتی۔ اگر انسان آگ سے جل جائے تو اس کا علاج ممکن ہے، سانپ اسے ڈس جائے تو بھی بچ نکلنے کا امکان رہتا ہے مگر عورت کا ڈسا جانبر نہیں ہوتا۔

ایک فلسفی نے انتہائی نفرت سے کہا:

''میں اس دنیا سے صرف اس لیے بیزار ہوں کہ اس میں عورت جیسی ناپاک ہستی پیدا کی گئی ہے۔ اس کا دیکھنا اور چھونا سراسر خطرناک ہے۔''

کوئی کہتا ہے:

''وہ جہنم کا دروازہ، معصیت کا سرچشمہ اور بدی کی جڑ ہے۔''

بعض کہتے ہیں:

''اس کی عقل چٹیا کے پیچھے ہے۔''

کرائی سوسٹم اسے ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت قرار دیتا ہے۔

شکسپیئر کے ڈرامے کا ایک کردار ایک موقع پر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

''اے کمزوری تیرا نام عورت ہے۔''

پنجاب کے مشہور رومانوی شاعر وارث شاہ کے نزدیک زن، فقیر، تلوار اور گھوڑا چاروں چیزیں کسی کی دوست نہیں ہوتیں۔''

ان موافق ومخالف نظریات پر سرسری نگاہ دوڑایئے تو ایک حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ یہ خیالات انتہا پسندانہ ہے۔ ان میں شاعرانہ خیال آفرینیوں، افراط وتفریط اور غلو سے کام لیا گیا ہے۔ بے لاگ سائنسی تجزیئے اور ٹھوس حقائق کی غیر جانبدارانہ چھان بین سے عورت کی بنیادی فطرت اور سرشت کو سمجھنے اور پرکھنے کی مربوط سعی نہیں کی گئی۔ ایسے نیم صادق اقوال ونظریات کسی فرد کے ذاتی اثرات پسند وناپسند تو ہو سکتے ہیں۔ عالم گیر صداقت کے حامل یا حرف آخر نہیں ہو سکتے۔

کوئی شاعر یا فلسفی عورت کے نشہ محبت میں مخمور ہوا تو اسے آسمانی مخلوق بنا دیا۔ اور نفرت وانتقام کی زد میں آ گیا تو اسے پست ترین مخلوق کے زمرے میں شامل کر دیا۔ ذاتی کیفیات اور ذاتی تعصبات پر مبنی ایسے نیم حکیمانہ اور یکطرفہ خیالات دل چسپ تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسی سنجیدہ توجہ کے مستحق نہیں۔

بحوالہ: عورت کی نفسیات

ایم۔ اے۔ ملک

عورت مجموعہ اضداد، مجموعہ عادات، مجموعہ بدعات

عورت......مجموعہ اضداد

ماہرین نسائیات کے مطابق عورت مجموعہ اضداد ہے اس کا ذہین متضاد خواہشوں اور امنگوں کی آماجگاہ ہے۔ مزاج میں اتار چڑھاؤ اور زیر و بم بکثرت آتے ہیں۔ کئی معاملات پر اس کا طرز عمل (Ambi valence) یعنی محبت ونفرت کے ملے جلے جذبات کا مظہر ہوتا ہے۔

آزادی کی وہ پرستار ہے لیکن اس سے وابستہ عدم تحفظ سے خوفزدہ بھی ہے حاکمانہ اختیار کی خواہاں ہے لیکن سکون وقرار اسے فقط کسی مرد کے چھپر چھاؤں تلے ہی میسر آتا ہے۔ حفظ ناموس کے لئے جان پر کھیل جاتی ہے لیکن اٹل حقائق کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں بھی پیش پیش دکھائی دیتی ہے۔

منطق اس کی انتہائی منفرد ومخصوص ہے۔ مردانہ منطق کی عین ضد اور بسا اوقات فریقین میں وجہ نزاع بھی۔ معروضی حقائق کے برعکس تخیلاتی زیادہ اور تجرباتی کم۔ مفروضوں اور خوش فہمیوں پر مبنی حقائق کو افسانوں اور افسانوں کو حقائق کا رنگ دیتے ہوئے حقیقت کو سراب اور سراب کو حقیقت کو حقیقت سمجھنے لگتی ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کی چشم کرشمہ ساز کرے

اس کے الفاظ ومعانی میں اکثر تفاوت پایا جاتا ہے بسا اوقات جو وہ کہتی ہے وہ چاہتی نہیں۔ اظہار و بیان اور مدعا میں اس کے مطابقت کا فقدان ہے۔

خلیل جبران خلیل اس کیفیت کو ایک تمثیل کے رنگ میں یوں بیان کرتا ہے۔ ایک حسین ونوخیز دوشیزہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے جایا کرتی تھی۔ وہ جہاں سے گزرتی اس کے انداز دلبرانہ دیکھنے کے لئے نوجوانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے، کچھ محض اسے گھورتے، کچھ فقرے چست کرتے اور کچھ اور کچھ اس کا تعاقب کرتے۔ وہ گھر آ کر شکایت کرتی کہ بستی کے نوجوان تہذیب وشرافت سے بے بہرہ ہیں۔ جس پر اس کا بوڑھا باپ زیر لب مسکرا دیتا۔"

گزرتے وقت کے ساتھ حسن وشباب بھی رخصت ہوگیا۔ زمانے کے تیور بدلے اور پھر جب وہ میلہ دیکھنے نکلی تو۔ ؎

پھرتے میر خوار کوئی پوچھتا ہی نہیں

والی صورت حال کا سامنا ہوا۔ واپس آئی تو بہت برہم تھی اور اس بات پر شاکی بھی کہ بستی کے نوجوان،

آداب معاشرت سے بیگانہ ہیں وہ نہیں جانتے کہ لڑکیوں سے کیسے پیش آیا جاتا ہے اس پر بوڑھا باپ پھر زیر لب مسکرا دیا۔''

شعور میں اپنی ماں کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتی ہے اور لاشعور میں اس کے خلاف نفرت کا لاوا پالتی ہے اس تفاوت کو خلیل جبران خلیل نے حکایت کی صورت میں بیان کیا ہے۔

''ایک لڑکی نے خواب میں اپنی ماں کو ڈائین کے روپ میں دیکھا کہ وہ اس کا گلا دبا رہی ہے وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی اور بستر پر اپنے قریب سوئی ہوئی ماں کے ساتھ ''ہائے امی میری پیاری امی۔'' کہہ کر لپٹ گئی۔

شعوری طور پر وہ ماں سے مشابہت چاہتی ہے لیکن لاشعوری طور پر بقول فرائیڈ باپ کے اوصاف اپنانا چاہتی ہے اس کی داخلی زندگی مردانہ اور نسوانی تشخص کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ وہ بیک وقت ماں اور باپ دونوں سے مشابہت کی آرزو مند ہے۔

بقول ڈاکٹر اجمل شعوری طور پر وہ ایک مرد کو پسند کرتی ہے اور یک زوجیت کی حامی ہے۔ لیکن للشعوری طور پر سینکڑوں مردوں کی شخصیت اور آراء افکار سے متاثر ہوتی ہے۔ تحلیل نفسی کے لئے آنے والی خواتین کے خوابوں اور واہموں کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ہر دوسرے تیسرے خواب میں ایک نیا مرد نظر آتا ہے اور اس کا مقام بالواسطہ یا بلاواسطہ محبوب کا ہوتا ہے۔

ایک پینتیس برس کی اعلیٰ تعلیم یافتہ...... شادی شدہ عورت نے تحلیل نفسی کے دوران اپنا ایک خواب بیان کیا کہ اس کی شادی ایک ایسے مرد سے ہو رہی ہے جو اس کا ہم نام ہے اور اس کے شوہر سے سماجی مرتبے میں کم ہے۔ لیکن وہ کار آگاہ اور ہوشیار اور ملنسار ہے ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیے سے جہاں اس مفروضے کی تائید ہوتی ہے کہ عورت مظلوم اور سماجی اعتبار سے کم مرتبہ مردوں کے لئے نرم گوشہ رکھتی ہے وہ اس کی لاشعوری خواہشات کا بھی پتہ چلتا ہے تاہم ان کا انکشاف انتہائی دلچسپ ہے کہ مرد جو کثرت ازدواج کا قائل ہے (بظاہر) لاشعور میں ہمیشہ ایک ہی مثالی عورت کا تصور دیکھتا ہے۔

عورت کے متضاد پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے انہوں نے ایک ہندو لوگ کہانی سے مدد لی ہے۔ جو کچھ یوں ہے کہ ابتدائے آفرینش میں ہندو دیوتا نے جب دنیا تخلیق کی تو اس نے دیکھا کہ سارا سامان تو اس نے مرد پر صرف کر دیا ہے اور عورت کی تخلیق کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ تو بہت پریشان ہوا اور سوچ میں پڑ گیا۔ جب وہ عالم محویت سے ابھرا تو اس نے عورت کی تخلیق میں مختلف عناصر کو شامل کر دیا۔

اس نے چاند کی گولائی۔ سانپ کا زیر و بم، شاخ پیچاں کی پیچیدگی گھاس کی لرزش، گلاب کی پنکھڑی کی نزاکت، پھول کی ملامت، پتے کی لطافت ہرن کی نگاہ سورج کی کرنوں کی شوخی، دھند کے آنسو، ہوا کی بے وفائی خرگوش کی بزدلی، حور کی خود پسندی، فاختہ کی گردن کی لچک، ہیرے کی سختی، شہد کی مٹھاس، شیر کی ستم گری، آگ حرارت، برف کی خنکی کوے کی بکواس اور کوئل کی کوک کو یکجا کر کے عورت کو مجسم کر دیا۔

پھر اس نے یہ مجموعہ اضداد مرد کو تحفے میں دے دیا۔ آٹھ دن کے بعد مرد دیوتا کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''میرے آقا یہ مخلوق جو تو نے مجھے دی ہے۔ میرے وجود کے لئے ستم قاتل ہے دم لئے بغیر بک بک کرتی رہتی ہے اور میرا وقت ضائع کرتی ہے۔ بے جا شکوہ شکایت اس کی عادت ہے ہر وقت بیمار رہتی ہے اسے واپس لے لو۔

دیوتا نے اسے واپس لے لیا۔

چند دن گزرنے کے بعد مرد پھر دیوتا کے پاس واپس آیا اور کہنے لگا۔

میرے آقا! اس مخلوق کو تُو نے کے بعد میں بہت تنہا ہو گیا ہوں مجھے یاد ہے کہ وہ میرے ساتھ ناچتی تھی گاتی تھی۔ خاص نظروں سے دیکھتی تھی اور مجھ سے چمٹ جاتی تھی وہ عورت مجھے واپس کر دو۔

دیوتا نے اسے عورت واپس کر دی۔

صرف تین دن ہی گزرے تھے کہ مرد واپس آیا اور کہا:

''میرے آقا! مجھے معلوم نہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ عورت باعث زحمت زیادہ ہے اور موجب مسرت کم، خدا کے لئے مجھے اس سے نجات دلواؤ۔''

'اس پر دیوتا ناراض ہو گیا اور غصے سے چلایا چلے جاؤ جس طرح بھی ہو اس سے نبھا کرنے کی کوشش کرو۔

مرد نے کہا۔ لیکن میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

''مگر تم اس کے بغیر بھی تو نہیں رہ سکتے۔'' دیوتا نے درشتی سے جواب دیا جس پر مرد وہاں سے دل برداشتہ ہو کر بڑبڑاتا ہوا چلایا۔

لعنت ہو مجھ پر۔ نہ میں اس کے قریب سے خوش رہ سکتا ہو نہ مجھے اس کی جدائی راس آتی ہے۔''

میری بونا پارٹ کو فرائیڈ نے ایک خط میں لکھا۔

''ایک بڑا سوال جس کا ابھی تک جواب نہیں ملا اور جس کا میں نسائی روح میں تین سال کی تحقیق کے باوجود جواب نہیں دے سکا وہ یہ ہے کہ آخر عورت کیا چاہتی ہے؟

فرائیڈ ہی بڑے بڑے دانش ور اور فلسفی بھی شاید اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔

البتہ ڈاکٹر شوارز نے عورت کی تخلیق میں اس تضاد کا جواب کچھ اس طرح سے دیا ہے کہ وہ صرف دماغ ہی نہیں ''رحم'' بھی رکھتی ہے۔ کئی رشتوں میں منقسم ہے وہ کیا کرے؟ وہ ایک ماں بھی تو ہے اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کا رحم ہے۔

(بحوالہ: عورت کے نفسیات۔ ایم اے ملک)

نسوانی نفسیات کے چند نمایاں خدوخال

○ مفروضے یا حقیقتیں

نسوانی سیرت وکردار کی چند نمایاں خصوصیات ایسی ہیں جنہیں دنیا بھر کی خواتین میں بالعموم قدر مشترک تصور کیا جاتا ہے۔ کیا وہ محض مفروضہ ہیں یا حقائق کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہے؟ ماہرین نفسیات کی رائے ان کے بارے میں کیا ہے؟ صداقت کا عنصر ان میں کس حد تک ہے؟ آیئے حقائق کی کسوٹی پر انہیں پرکھیں۔ کچھ مفروضات حسب ذیل ہیں۔

☆ خواتین میں ایک گونہ احساس محرومی ہوتا ہے۔
☆ خواتین بہت جذباتی ہوتی ہیں۔
☆ گریہ وزاری کرتی ہیں۔
☆ ہسٹریائی رجحان رکھتی ہیں۔
☆ بسیار گو ہیں۔
☆ راز افشا کر دیتی ہیں۔
☆ افواہ سازی میں کمال رکھتی ہیں۔
☆ بہتان طرازی کرتی ہیں۔
☆ ورغلانے میں ماہر ہیں۔
☆ ضمیر قدرے کمزور ہوتا ہے۔
☆ عدل وانصاف کا ان میں فقدان ہوتا ہے۔
☆ قوت مشاہدہ محدود ہے۔

○ احساس محرومی

لڑکوں کے ساتھ اعضائے جنسی کی رقابت کی بناء پر جس محرومی اور احساس کم مائیگی کا سامنا اوائل حیات میں لڑکی کو ہوتا ہے، فرائیڈ کے مطابق وہ اس کے لاشعور میں کچھ اس طرح رچ بس جاتا ہے کہ رہتی زندگی تک وہ اس کے اثرات سے نجات نہیں پا سکتی۔ چنانچہ ایک اہم احساس جو ہر عورت کے ذہن اور لاشعور میں سمایا رہتا ہے۔ وہ خودترسی اور محرومی کا ہے اور اس امر کا بھی کہ وہ ایک ستم رسیدہ اور مظلوم شے ہے۔ احساس جو محض مفروضہ نہیں ایک حقیقت ہے اور جس کی چھاپ اس کے ہر قول وفعل پر نہایت گہرائی سے ثبت ہوتی ہے بالخصوص اس وقت اور

گہرا ہو جاتا ہے۔ جب اسے کسی ابتلا کا سامنا ہوتا ہے اور ایسے مواقع پر وہ اپنی بے بسی ولاچاری کا ذمہ دار کبھی فطرت، کبھی معاشرت اور کبھی بقول فرائیڈ اپنی ماں کو قرار دیتی ہے۔

کسی بھی ملک کی لوک کہانیوں اور گیتوں کا مطالعہ کیجئے کبھی میں ماں بیٹی بڑے ہی رقت آمیز لہجے میں شکوہ کناں نظر آتی ہیں کہ اسے اس دنیا میں دکھ جھیلنے اور غم اٹھانے کے لئے اس نے کیوں جنم دیا تھا۔

بیشتر عوامی فلمیں (جنہیں خواتین بڑی دلچسپی سے دیکھتی ہیں) اسی غم واندوہ کی عکاس ہوتی ہیں جس سے سوانی روح ازل سے دوچار ہے ان کے افکار وخیالات اور افعال واعمال کے محرکات اس کے غماز ہیں کہ ان کا عورت ہونا ہی ان کے مصائب کی جڑ ہے۔

○ جذباتیت

ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ صنف نازک فطرتاً مرد کی نسبت زیادہ ذکی الحس ملائم الطبع اور جذباتی ہوتی ہیں۔ پیار کی حالت میں ہوں یا نفرت کی، خوشی کا موقع ہو یا غمی کا وہ ہر جگہ ہر صورت جذبات کا مظاہرہ کرتی ہے۔

جذبات ان کے دل ودماغ پر گہرے، دوررس اور دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں جبکہ جذبات مرد کی زندگی میں فقط ایک جزو ہیں۔ عورت کی ساری زندگی جذبات سے عبارت ہے وہ اس کا سرمایہ حیات ہیں جذبات کو اس کی زندگی سے نکال دیجئے، تو راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں بچتا۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کی تخلیقی سکیم میں جذباتیت چند بلند پایہ مصلحتوں کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے۔ حیات انسانی کی بقا کا ضامن صرف ایک جذبہ ہے جسے ممتا کہتے ہیں یہ خالصتاً نسائی جذبہ ہے ہر جذبے پر فوقیت کا حامل۔

ایک خاص عمر تک ماں ہی بچے کی حیاتیاتی اور جذباتی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ وہی اس کے دکھ اٹھاتی اور سہتی ہے باپ کا رول زیادہ تر کفالت تک محدود ہے۔ وہ کچھ دیر بعد ہی بچے کی جذباتی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

جذبات کی یہ فراوانی ماں کو ودیعت نہیں ہوتی تو وہ جان ناتواں جو اس کی ممتا بھری آغوش نہیں پرورش پاتی ہے، کبھی پروان نہ چڑھتی اس خیر کثیر سے فطرت سے اسے غالباً اسی لئے نوازا ہے۔ محبت، ہمدردی رحم وشفقت، رقت قلب، ذکاوت حس اور لطافت جذبات کی صلاحیتیں نہ صرف وافر مقدار میں ہیں بلکہ فطری طور پر موجود ہیں۔

تاہم جہاں جذبات کی فراوانی اور حسیات کی نزاکت ہو وہاں کسی نہ کسی حد تک کچھ غیر معمولی رجحانات کا رونما ہو جانا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ ماہرین امور خواتین نے جنہوں ان کی نفسیات میں گہرا ادراک حاصل ہے۔ اکثر محسوس کیا ہے کہ اہم مسائل کے بارے میں ان کا پہلا ردعمل بالعموم جذباتیت پر مبنی ہوتا ہے اور نتیجتاً انہیں تاسف سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کے لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی سوچ پر عمل درآمد کرنے

کے بجائے زیادہ ٹھنڈے دل و دماغ پر مبنی اپنی دوسری سوچ کو ترجیح دیا کریں۔ اگر وہ عادتاً جلد باز ہوں تو صلاح کار کو چاہئے کہ انہیں ''سیکنڈ تھاٹ'' کی تربیت دیں۔ ان کی چند نمایاں خصوصیات جن کا ذکر آگے آئے گا۔ زیادہ تر جذباتیت ہی کی مظہر ہیں۔

○ گریہ وزاری

دکھ، درد، الم انگیز حالات، پریشان حالی و درماندگی میں آہ بکا، گریہ وزاری اور اشک فشانی انسانی کمزوری ہے لیکن جس سرعت، فراوانی اور بے ساختگی سے خواتین آنسو بہانا جانتی ہیں۔ اس سے یہ فعل خالصتاً ایک نسوانی خصوصیت بن کر رہ گیا ہے اور اسے عموماً خواتین ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

آنسوان کی آنکھوں سے یوں رواں ہوتے ہیں، جیسے برسات کی بن مانگی بارش موقعہ بہ موقعہ ہر آن برسنے کو تیار۔ تقریب مسرت ہو یا محفل غم، ادنیٰ سی تحریک پر آنسو کچھ یوں ابل پڑتے ہیں۔ جیسے بربط سے نغمے بے تاب ہوں نکلنے کے لئے'' گفتگو کرتے ہوئے شدت جذبات سے رو دینا نسوانی خصوصیت ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دست شناس کی حیثیت سے مجھے دنیا بھر کی خواتین سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ کینیڈا میں خواتین کا ہاتھ دیکھتے ہوئے بڑی مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ حال دل سناتے ہوئے اکثر خواتین رونے لگیں۔ روتی ہوئی خاتون کو رومال پیش کرنا آداب میں شامل ہے مگر میں اپنا اکلوتا رومال کس کس کو پیش کرتا۔ آخر کاغذ کے رومال منگوائے اور پاس رکھ لئے جونہی کوئی خاتون شدت جذبات سے آنسو بہانا شروع کرتیں تو میں فوراً میز کی دراز سے ایک رومال نکالتا اور ان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ بالعموم معمولی باتیں بھی خواتین کو رلا دیتی ہیں، روزمرہ کے واقعات جنہیں مردوں کی دنیا میں معمول کے مطابق سمجھا جاتا ہے مثلاً چند دنوں یا چند ہفتوں کے لئے کسی عزیز کا بچھڑنا یا کسی بچھڑے ہوئے عزیز کا اچانک مل جانا۔ کام کاج کے لئے کسی اپنے کا بیرون ملک جانا۔ ایسے رقت آمیز مناظر پیش کرتا ہے جیسے کوئی بہت بڑی آفت ٹوٹ پڑی ہو۔

نسوانی آنسوؤں کی حقیقت کو شاید ہی کوئی جان پایا ہو۔ شعراء انہیں ادائے دلربائی سمجھتے ہیں۔ مزاح نگار انہیں مگرمچھ کے آنسو قرار دیتے ہیں۔ ریڈکلف براؤن کے نزدیک ان کی حیثیت بچگانہ ہے۔ کوئی اہم وجہ ان کے پس پشت کارفرما نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر پیٹر بک کے مطابق ان کی حیثیت فرمائشی گانے کی سی ہے کبھی فی البدیہہ اور کبھی فیشن اور پھر یہ جانے بغیر کہ ماجرا کیا ہے۔ اوروں کو روتے دیکھ کر شریک گریہ ہو جاتی ہیں۔ ایک دور افتادہ قصبے سے گزرتے ہوئے مصنف نے ایک گھر میں خواتین کو آہ بکاہ کرتے دیکھے۔ اتنے میں کسی اور گاؤں کی خواتین کا وہاں سے گزر ہوا تو وہ یہ جانے بغیر کہ حقیقت حال کیا ہے۔ اسی شدومد کے ساتھ شریک ماتم ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ خاتون خانہ نے ایک بچی کو جنم دیا۔ جو غالباً اس کی پانچویں بچی تھی۔

قدیم ثقافتوں کے ماہر آٹو لیکن برگ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ خواتین مال کے کسی عام واقعہ کو ماضی میں دبی ہوئی اپنی کسی گہری محرومی سے منسلک کرنے کا رجحان رکھتی ہیں اور رونے کو حقیقت کا رنگ دے دیتی ہیں۔ ان کے رونے کا سبب بظاہر اور بہ باطن اور ہوتا ہے۔ یعنی جس بات پر وہ خارجی دباؤ یا مصلحت کی بنا پر آنسو نہیں بہا سکتی اس پر وہ کسی اور سبب کی آڑ میں رو لیتی ہیں۔ بھائی کے پردے میں محبوب سے غم فراق کے آنسو بہانے کا پنجابی مقولہ شاید ایسی صورت حال کا غماز ہے۔

فرائیڈ ان آنسوؤں کو ''محرومی قضیب'' کے آنسو قرار دیتا ہے لیکن میڈیم سائمن ڈی بوائر کے مطابق آنسو عورت کی روح میں پنہاں ان زخموں کے غماز ہیں جو اہل جہاں ابتدائے آفرینش سے اسے لگاتے آئے ہیں اس کا رونا در حقیقت رونا ہے اپنی بے بسی اور محرومی کا، بقول اس کے آنسو اس کی بے زبانی کی زبان، اس کے دکھ درد کے ساتھی اور اس کے غم گسار ہیں۔ جب نکاس جذبات کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں تو یہ آنسو سیل رواں بن کر بہہ نکلتے ہیں۔ یہ اس کی بقا کے ضامن ہیں اور اس کے لئے ''سیفٹی والو'' کا کام بھی دیتے ہیں۔ ان کی حیثیت اس کے لئے سکومن آور پلز کی سی ہے۔

آنسو اگر نہ ہوتے تو عورت کب کی ٹوٹ پھوٹ چکی ہوتی۔ اعصابی تناؤ کم کرنے کے لئے ان کا رول بلاشبہ بڑا اہم ہے، یہ دبی دبی سسکیاں اور خاموش گرم آنسو ایک مدافعتی حربہ بھی تو ہیں۔ مردانہ جارحیت سے بچنے کے لئے۔ مردوں سے بات منوانے، انہیں رام کرنے، اکسانے، جوش دلانے یا اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ایسا کم ہی ہوا ہے کہ یہ حربہ کبھی بے اثر و رائیگاں گیا ہو۔

ہسٹیریائی رجحان

جب آنسو کا حربہ غیر موثر اور بے نتیجہ ثابت ہو اور حصول مقصد کی تمام راہیں مسدود ہوتی دکھائی دیں تو بالاخر خواتین ایک طاقت ور حربہ بروئے کار لاتی ہیں۔ یہ ہسٹریائی ردعمل ہے جو عموماً شدید جذباتی ہیجان کی صورت میں نمودار ہوتا ہے یہ دبے ہوئے غم غصے اور محرومی کا علامتی اظہار ہے۔

عمر بھر عورت زمانے کے ظلم و ستم، ناروا پابندیوں، مردانہ جارحیت، بے انصافیوں، بے رحمانہ جبر، استحصالی قوتوں کے تشدد و تضحیک کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔ آہ و بکا، نالہ و فریاد، عجز و نیاز جب کچھ بھی اس کے کام نہیں آتا تو آنسو منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور پھر کسی نازک لمحے میں وہ یکدم پھٹ پڑتی ہے مغلوب الجذبات ہو کر تہذیب و شرافت، اخلاق و آداب ہر چیز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مرنے مارنے پر اتر آتی ہے اور اس پر کچھ ویسی ہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو مرزا غالب کے ایک مصرعے میں بیان ہوئی ہے۔

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

جو چیز بھی اس کی راہ میں حائل ہونا چاہتی ہے اسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانا چاہتی ہے ایک مجنونانہ سی کیفیت کا اظہار اس سے ہونے لگتا ہے۔ اس کے اس غیض و غضب کا نشانہ اس وقت بالعموم اس کا شوہر

یا محبوب یا بڑا بیٹا ٹھہرتا ہے جس پر اچانک برس پڑتی ہے۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا شاید یہی واحد راستہ ہے جو اس کے پاس رہ جاتا ہے۔

ٹالسٹائی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی بیوی ہسٹیریائی کیفیت میں اس کی خوب جھاڑ پونچھ کیا کرتی تھی۔ لیکن وہ اسے چائے کی پیالی میں طوفان سمجھ کر درگزر سے کام لیتا تھا۔

ایک ایسی ہی ہسٹریائی مزاج کی حامل خاتون کی کہانی اس کے شوہر کی زبانی سنی جائے جس سے اس کیفیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ موصوف لکھتے ہیں:

مجھے دنیا میں کوئی پریشانی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے، میں ہر لحاظ سے مطمئن ہوں میرے آٹھ بچے ہیں۔ دو لڑکیاں شادی شدہ ہیں تین لڑکے اور دو لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ ایک ماں کی گود میں ہے۔

"الجھن صرف یہ ہے کہ میری بیوی بڑی غصیلی ہے اور طوفان سر پر اٹھائے رکھتی ہے بات کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن وہ فساد برپا کر دیتی ہے۔ مرنے مارنے پر تل جاتی ہے۔ اگر سمجھایا جائے تو گلے کا ہار ہو جاتی ہے اور یہ نہیں دیکھتی کہ کوئی کیا کہے گا۔ ہم ب اسے نفسیاتی کیس سمجھتے ہیں اس سے سختی اور محبت دونوں سے کام لیا جاتا ہے مگر بے سود۔ سارا دن لڑتے رہنا گویا اس کا مشغلہ ہے۔ مجھ سے ہٹی تو بچوں کی شامت، بچوں سے ہٹی تو نوکروں کی درگت، ان سے ہٹی تو میں توپ کے منہ میں آجاتا ہوں کیا آپ اس کا کوئی علاج تجویز فرما سکتے ہیں۔"

کثرت اولاد اور گھریلو ذمہ داریوں کے بوجھ نے غالباً خاتون کو حد سے زیادہ تلخ مزاج اور چڑچڑا بنا دیا ہے۔ نیز اس ہیسٹریائی رویے سے وہ لاشعوری طور پر توجہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔

ہیسٹریائی ردعمل کا تجزیہ کرتے ہوئے فرائیڈ اسے، اضطراب رحم یا جنسی بے قراری، سے منسوب کرتا ہے اور بالعموم ایسی لڑکیوں کو قرار دیتا ہے جو ریڈی پس دور میں محرمات یعنی باپ، بھائی کی جنسی ترغیبات کا نشانہ بنی ہوں اور اس واقعے کو اپنے لاشعور میں دبائے بیٹھی ہوں۔

تاہم سمجھدار مرد خانہ بربادی یا بدنامی کے ڈر سے یا اپنے کسی جرم زیادتی کا احساس کرتے ہوئے ٹالسٹائی کا سا طرز عمل اختیار کر لیتے ہیں اور ہسٹریائی حملے کو حکمت عملی سے ٹال دیتے ہیں۔ البتہ بعض ناسمجھ اسے انا کا مسئلہ بنا کر گھریلو فضا کو جہنم زار بنا لیتے ہیں۔

○ بسیار گوئی

خواتین کی محافل و مجالس میں شریک لوگ شاہد ہیں کہ عورتیں بالعموم بسیار گو ہوتی ہیں وہ زیادہ دیر منقار زیر پر نہیں رہ سکتیں۔ عموماً طوالت بیانی سے کام لیتی ہیں۔ سطحی و فروعی باتوں میں الجھی رہتی ہیں ان کے موضوعات زیادہ تر لباس، آرائش و زیبائش، فیشن، غیبت، گلے شکوے، افواہیں سکینڈل ہوتے ہیں۔ جس میں لفاظی اور گپ بازی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے اور ٹھوس حقائق کم۔ ہمہ تن گوش اور کم سخن خواتین خال خال ہی نظر آتی ہیں اور ابنارمل سمجھی جاتی ہیں۔

خواتین کی بسیار گوئی کی تصدیق بعض محققین نے بھی کی ہے مشہور ماہر جنسیات مادام بوئر کے نزدیک خواتین کی بسیار گوئی مفروضہ نہیں حقیقت ہے۔ یہ گھٹن کے خلاف ایک سے معرض وجود میں آتا ہے اگرچہ یہ محض تضیع اوقات ہے لیکن خواتین کے لئے سود مند اور صحت بخش تفریح ہے تاہم غیر مردوں سے طویل اور بے مقصد مذاکرات اور توجہ طلبی کے لئے حکایات غم دراز کرنے والی خواتین کسی چکر میں کھو جاتی ہیں اور بسا اوقات سخت پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

○ راز افشائی

کہا جاتا ہے کہ خواتین میں راز داری کا فقدان ہوتا ہے جو محسوس کرتی یا دیکھتی ہیں۔ اس کا برملا اور بہ عجلت اظہار کرنے کا رجحان رکھتی ہیں۔ جب رہنا ان کے لئے ممکن نہیں یارائے ضبط یعنی (Reression) ان میں کم ہے موقع بے موقع بولے چلی جاتی ہیں ان کی بسیار گوئی افشائے راز پر منتج ہوتی ہے۔ جذبات کی رو میں بڑے سے بڑا راز اگل کر رکھ دیتی ہیں۔

یہ طرز عمل ان کے اور ان کے مرد لواحقین کے لئے بسا اوقات بڑی خفت اور ذلت کا باعث بنتا ہے۔ لیکن غیر متوقع معلوم نہیں ہوتا۔ کثرت گفتار سے افشائے راز کا امکان بہر حال موجود ہوتا ہے۔ عوامی نفسیات کے ماہرین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ دشمن کی سراغ رساں ایجنسیاں بالعموم مخالف قوم کی خواتین سے مراسم کو حصول مقاصد میں اول اہمیت دیتی ہیں۔ تفتیشی ادارے ادراک حقیقت کے لئے انہی کی وساطت اختیار کرتے ہیں شعوری اور لاشعوری طور پر وہ بہترین مخبر ثابت ہوتی ہیں۔

○ افواہ سازی

ژونگ کے حوالے سے یہ ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین میں افواہ سازی کا رجحان پایا جاتا ہے واقعہ یوں ہے کہ:

ایک مرتبہ کسی مدرسے میں کسی استاد کو بدنام کیا جا رہا تھا کہ اس نے ایک طالبہ کے ساتھ بوس و کنار کیا ہے حکام اور اساتذہ دونوں کے لئے بات یہ بڑی ذلت آمیز تھی۔ جس سے مدرسے کی شہرت کو نقصان پہنچنے کا شدید احتمال تھا۔ انہوں نے ژونگ سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کو سلجھانے میں ان کی مدد کریں گے۔

ژونگ نے اس کے ماخذ کا پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے نوجوان استاد نے اس کا بوسہ لیا ہے۔ یہ خواب اس نے اپنی دوستوں کو سنایا جو رفتہ رفتہ حقیقت کا روپ دھار کر مدرسے میں گردش کرنے لگا۔ سہیلیوں نے اس میں خوب حاشیہ آرائی کی اور ایک بوسے کو جنسی اختلاط دے کر اس کی تشہیر کرنے لگیں۔

ژونگ کا تجزیہ تھا کہ لڑکیوں کی اس افواہ سازی میں ان کی دبی ہوئی لاشعوری اور تشنہ تکمیل جنسی آرزوئیں شامل تھیں۔ اس کا تجزیہ یہ بھی ہے کہ طویل عمر تک نا کتخدا رہنے والی لڑکیاں ایسے سکینڈلوں کی آڑ میں زیادہ ملوث

ہوتی ہیں اور ان سے حظ اٹھاتی ہیں۔

مادام بوئر کے بقول افواہ سازی شغل بیکاری ہے اور جن خواتین کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا وہ اس مشغلے کو اپنا لیتی ہیں۔

ڈاکٹر اجمل افواہ سازی کو البتہ نفسیات کا حصہ قرار دیتے ہیں۔

○ بہتان طرازی

اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور احساس جرم سے بچنے کے لئے دوسروں پر الزام تراشی یا بہتان طرازی نفسیاتی اصطلاح میں ''پروجیکشن'' کہلاتی ہے۔ یہ طرز عمل بنیادی طور پر احساس جرم اور بزدلی کی پیداوار ہے۔ اسے زیادہ تر وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا موقف کمزور ہو یا اپنے اعمال کے منطقی نتائج کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، خود اعتمادی سے محروم ہوں۔ اس طرز عمل کا اظہار مردوں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ رجحانات طبقہ اناث سے زیادہ منسوب ہے۔

عورت مسند اقتدار پر ہو، عدالت کے کٹہرے میں یا رائے عامہ کی کچہری میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور مظلومیت ثابت کرنے میں بالعموم اتنی آگے نکل جاتی ہے کہ نوبت بہتان طرازی تک پہنچ جاتی ہے۔ اور سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ایسے مواقع پر اکثر بڑے سے بڑا غیر جانبدار مبصر بھی مبتلائے فریب ہو کر صنف نازک کا ہمنوا بن جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں زلیخا کے شوہر کے حوالے سے خواتین کے مکر عظیم کے تذکرے کا نفسیاتی پس منظر غالباً یہی ہے دیکھنے اور سننے والے اگر مرد ہوں تو بادی النظر عورت کے بیان کو ہی مبنی بر صداقت قرار دینے لگتے ہیں اس نفسیاتی کمزوری کو خواتین خوب سمجھتی ہیں۔ تاہم حقیقت حال اس وقت کھلتی ہے جب واضح حقائق عائد کردہ الزامات کی تردید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

○ ترغیب دہی

ورغلانا یا ترغیب دہی جسے نفسیاتی زبان میں سڈکشن (Seduction) کہا جاتا ہے۔ اگرچہ مردانہ کردار کا بھی حصہ ہے اور اس کے لئے وہ چاپلوسی، لفاظی، افسانہ طرازی، غلط بیانی، سیم وزر، سبز باغ اور فریب محبت غرض کہ ہر قسم کے جائز و ناجائز ترغیبی حربے بروئے کار لاتا ہے تاکہ عورت کا جنسی استحصال کر سکے۔ تاہم ماہرین نفسیات اسے بالتخصیص نسوانی خصوصیت قرار دیتے ہیں، اہم مگر خطرناک۔ جس کی دسترس سے الاماشاءاللہ شاید ہی کوئی مرد بچ نکلتا ہو۔

ورغلانے کی سب سے پہلی اور کامیاب واردات بی حوا نے کی تھی اور حضرت آدم علیہ السلام شجر ممنوعہ چکھنے کی پاداش میں بہشت بریں سے نکلے تھے جب سے ورغلانا حوا کی بیٹیوں کا آزمودہ حربہ چلا آ رہا ہے وہ اس کا استعمال خفی وجلی، شعوری ولاشعوری ہر طرح سے کرتی ہے۔ بہکانا، اکسانا، کان بھرنا، شیشے میں اتارنا، لبھانا

ورغلانے ہی کے مختلف انداز ہیں۔

تاہم ترغیب دہی سے خواتین کا منتہائے مقصود محض جنسی استحصال نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوت تسخیر کا آزمانا، شعوری ولاشعوری آرزوؤں کی تکمیل یا اپنی نفسیاتی کمزوریوں کی تلافی کرنا ہے۔ اس لئے جہاں غم وغصے، گریہ وزاری، عجز و نیاز اور طعن وتشنیع سے کام لیا جاتا ہے وہیں ناز وادا عشوہ وغمزہ اور چاہت ومحبت کے حلاوت آمیز الفاظ کو بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ بعض اوقات انائے مرد کی تحقیر بھی اس کا ایک موثر ذریعہ ہے ادب میں لیڈی میکتھ اور قلوپطرہ جیسی خواتین کی مثالیں خواتین کے کردار کے اس پہلو کی کامیاب عکاسی کرتی ہیں۔ ان خواتین کو مردوں کو ورغلانے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ جو جرائم مردوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً چوری چکاری، قتل وغارت، دنگا فساد، رشوت ستانی، سمگلنگ اور ڈاکے جیسے سنگین جرائم کے پس پشت ہمیشہ کوئی نہ کوئی خفیہ ہاتھ یا پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔ وہی ان کو شہ دیتی ہیں۔ اس شہ سے کبھی کبھی بیٹے کے ہاتھوں باپ اور بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتل ہو جاتا ہے قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل روئے زمین پر پہلا ارتکاب جرم کچھ ایسی ہی شہہ کا نتیجہ تھا۔

ماہرین نفسیات کے مطابق جنسی جرائم کی حقیقی محرک بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ عورت ہی ہوا کرتی ہے مگر اس کا رول چونکہ بڑا گہرا، لطیف اور بالعموم لاشعوری ہوتا ہے اس لئے مورد الزام اکثر مرد ہی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

○ ضمیر کی کمزوری

فرائیڈین نقطہ نگاہ کے مطابق خواتین میں ضمیر کی نشوونما ذرا تاخیر سے ہوتی ہے اس میں استدلال اور عقل واستدلال کی بجائے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے جب کوئی خاص آرزو، یا امنگ انہیں ایک بار اپنی گرفت میں لے لیتی ہے تو اس سے نجات حاصل کرنا ان کے بس میں نہیں رہتا۔

تکمیل خواہشات کا یہ انداز کچھ طفلانا سا ہے جبلی آرزوؤں کو تخلیقی اعمال اور تعمیری افعال میں ڈھالنے کی اہلیت ان میں نسبتاً کم پائی جاتی ہے جنسی خواہش سے ان کی مراد جنسی عمل ہے اس کے اظہار ونکاس کی ارفع واعلیٰ اور متبادل صورتیں ان کے امکان تصور سے خارج ہیں۔

بقول فرائیڈ عورت، تعقید (Sublimation) کے عمل سے بیگانہ ہے۔ افلاطونی عشق کی اصطلاح سے قطعی نابلد ہے۔ اجتماعی شعور اور شخصی تعلقات سے اسے زیادہ دلچسپی ہے۔ معاشرتی اور اخلاقی قدریں بھی غالباً اسی وجہ سے بقول فرائیڈ قدرے ڈھیلی واقع ہوئی ہیں۔

معاشرتی دلچسپیوں کا دائرہ محدود ہونے کے سبب خواہشات کے مقابلے میں رائے عامہ کی اہمیت بھی اس کے نزدیک زیادہ نہیں سماجی دباؤ کا احساس اگر اسے ہوتا ہے تو فقط مرد کے توسط سے ورنہ اس میں سماجی خطرات سے آنکھیں چرائے رکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے کچھ تھوڑا بہت خارجی دباؤ بھی مفقود ہو تو پھر

سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا

ضمیر کے اس ضعف یا لچکیلے پن کی بنیادی وجہ فرائیڈ کے مطابق یہ ہے کہ لڑکی کو ماں کی طرف سے ضمیر منتقل ہوتا ہے۔ جو اخلاقی ضوابط کے نفاذ جو باپ کے مقابلے میں ماں اور باپ کے کردار کے بالکل برعکس بھی تشکیل پا جاتا ہے تاہم ''ماں پر دھی پتا پر گھوڑا'' کے معروف العام مقولے کا مفہوم یہ ہے کہ لڑکی افکار و اعمال میں عموماً ماں سے مشابہت رکھتی ہے تو فرائیڈ کے اس نقطہ نگاہ میں کسی حد تک صداقت کا گماں گزرتا ہے۔

تاہم ماں بیٹی میں اس درجہ مشابہت کو قاعدہ کلیہ قرار دینا کوئی زیادہ وقیع معلوم نہیں ہوتا۔ آغوش مادر میں مرتب ہونے والے اثرات بلاشبہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن آن ہیئت اور نا قابل تغیر نہیں۔ مزید برآں ہر فرد کا ضمیر متنوع اور گوناں گوں عناصر سے تشکیل پاتا ہے اس میں اس کے ثقافتی پس منظر، معاشرتی اقدار، تعلیم و تربیت، ذاتی تجربات و مشاہدات، شخصی رجحانات کو بھی گہرا دخل ہے انہیں نظر انداز کرنا ایک بے رحم جبریت کے نظریئے کو فروغ دینا ہے۔ یہ سراسر قنوطیت اور انسان کے ذہنی ارتقاء اور آزادی عمل کی مکمل نفی ہے۔

کمسنی کے تجربات پر مبنی نتائج اخذ کرنے میں فرائیڈ نے کچھ زیادہ ہی زور دیا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسے مفروضات کی حیثیت نیم صادق اقوال سے زیادہ نہیں۔

○ عدل وانصاف کا فقدان

ماہرین نفسیات وحیاتیات اس بات پر متفق ہیں کہ خواتین میں کسی ایسے منصب کی اہلیت قدرے کم ہے جس میں ذہنی توازن واعتدال برقرار رکھتے ہوئے غیر جانبدارانہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی ضرورت ہو۔ حقائق کے برعکس ان میں جذباتی فیصلے کرنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ حیاتیاتی اور جسمانی تغیرات کے تحت ان کی زندگی میں کچھ ایام یا ادوار ایسے بھی آتے ہیں جن کے اثر سے ان کے جسم و ذہن کی فعالیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اس کی تصدیق اکثر اکابرین حیاتیات اور عضویات کے مشاہدات سے بھی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وشسکی نے گہرے مشاہدہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان ادوار میں عورت کے اندر مرکزیت خیال اور دماغی کارکردگی کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

پروفیسر لاینسکی اپنی کتاب ''نسوانی شخصیت کی نشوونما'' میں رقم طراز ہے کہ ایام مخصوصہ عورت کو آزادی سے محروم کر دیتے ہیں۔ وہ اضطراری حرکات کی غلام ہو جاتی ہے۔ ذہن پراگندہ اور دماغ توازن سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کے تمام عناصر روح ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں شعور، فکر، سوجھ بوجھ اور فیصلہ کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔

ہیولاک ایلس، البرٹ اور بعض دوسرے ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اس کی زندگی میں کچھ ایام تو ایسے آتے ہیں کہ وہ کسی بڑے منصب کی ذمہ داری کا بار اٹھانے یا کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔

ادھر آمرانہ مسند اقتدار پر متمکن خواتین کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تمام تر ذہانت

وتدبر کے باوجود ان میں سے بیشتر عالم اضطرار یا کسی جذباتی لہر کے زیر اثر کوئی ایک آدھ عاجلانہ قدم ضرور اٹھا لیتی ہیں جو ان کی سابقہ کامیابیوں کو گہنا دیتا ہے۔ مثلاً اندرا گاندھی کا سکھوں کے مقدس مقام پر حملہ جو بالآخر ان کی اپنی تباہی پر منتج ہوا، مبصرین کی رائے میں کچھ ایسا ہی عاجلانہ قدم تھا۔

جہاں خواتین خود تو بااختیار نہ ہوں لیکن کوئی آمر مطلق ان کا تابع فرمان ہو۔ وہاں اس کے عاجلانہ اقدامات کی بالعموم وہی محرک ہوا کرتی ہیں۔

خارجی عوامل: ''سائیکالوجی آف سیکس'' کے مصنف آسولڈ شوارز کے مطابق عورت صرف دماغ ہی نہیں رحم بھی رکھتی ہے بسا اوقات وہ ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کے مختلف متضاد جذباتی رشتوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتی کہ وہ کس کا ساتھ دے اور کس کا نہ دے قوت فیصلہ کی کمی، تذبذب اور عاجلانہ اقدامات کا سب سے بڑا سبب غالباً ان کا یہی مخمصہ ہے۔

گونا گوں حیاتیاتی نفسیاتی اور جذباتی عوامل کی بنا پر خواتین میں شہادت یا گواہی کی اہلیت کو بھی ماہرین نفسیات نے محل نظر قرار دیا ہے واقعات کے بیان میں مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کا رجحان ان میں غالب ہے۔ داخلی اور بیرونی دباؤ کے تحت حقائق سے انحراف اور مہذب بیانی کا سرزد ہو جانا بھی بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

○ محدود قوت مشاہدہ

جذبات کی آمیزش کے بغیر حالات و واقعات کا بے لاگ تجزیہ اور ذاتی تعصبات سے بالاتر مطالعہ و مشاہدہ بالخصوص جب کہ واقعات جذباتی نوعیت کے ہوں بڑے دل گردے کا کام ہے کمزور طبع جذباتی لوگ حقائق کو توڑ موڑ کر مسخ کر دینے کا رجحان رکھتے ہیں ایسے کمزور طبع لوگ مردوں میں بھی موجود ہیں۔ لیکن حقائق سے فرار، اغماض یا چشم پوشی کا رجحان خواتین میں مردوں کی نسبت زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر ماہرین نفسیات کے نزدیک ان کی قوت مشاہدہ محل نظر ہے۔

آسولڈ شوارز کے مطابق خواتین حقائق سے آنکھیں چراتی ہیں اور دیکھتے ہوئے بھی دیکھنا نہیں چاہتیں وہ فقط وہی چیز دیکھتی ہیں۔ جو دیکھنا چاہتی ہیں

حقائق سے یہ چشم پوشی اشیاء کی حقیقت و ماہیت بدل کر رکھ دیتی ہیں گویا کہ کچھ اور انہیں نظر آتے ہیں کچھ۔ مشاہدے کی یہ تحدید و تخصیص و تفتیش کی ساری بساط الٹ کر رکھ دیتی ہے۔

انصاف کی کرسی پر براجمان لوگوں کا یہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ گونا گوں حیاتیاتی، نفسیاتی، معاشرتی اور جذباتی عوامل کی بنا پر طبقہ اناث میں متنازعہ معاملات میں شہادت کی صلاحیت بہ مقابلہ مردوں کے کم ہے تحریص و ترغیب، خوف اور کئی دیگر داخلی و خارجی کچھ اس انداز سے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ اس کی قوت مشاہدہ دھندلا کر رہ

جاتی ہے اور بات کو جیسی وہ ہے بلا کم وکاست اور من وعن بیان کرنے کی صلاحیت متاثر ہونے کا امکان ہے ذاتی دلچسپی، تعصبات اور رجحانات دخل در معقولات کا سبب بننے لگتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک سے زائد خواتین کو ایک ہی چشم دید واقعہ بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو ہر کسی کی الگ روداد ہوگی بلکہ بعض اوقات متضاد ہوگی۔ بات اگر ایک کے منہ سے نکل کر دوسری تک پہنچی تو رائی کا پہاڑ بن چکا ہوگا۔

ڈاکٹر ہارڈنگ اپنی کتاب (The way of all women) میں متعدد عملی مثالوں کے ساتھ زیر نظر نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ ''عورتوں کے لئے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ وہ کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ بیان کریں۔''

اس کے مطابق ایسے مسائل جہاں جزئیات پر بحث وتنقید اور جرح وتنقیح ہوتی ہے۔ مثلاً متنازعہ فیہ معاملات، مقدمات وغیرہ۔ جہاں بال کی کھال اتاری جائے۔ عورت بالعموم ان کی صراحت میں غیر واضح رہ جاتی ہے۔

کچھ اور محققین نے بھی عورت میں کسی ایسی کمزوری کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایسے مواقع پر وہ غیر معمولی گھبراہٹ اور پریشانی کا مظاہرہ کرتی ہے اور عالم اضطراب میں جو کہنا چاہتی ہے۔ بخوبی کہہ نہیں پاتی۔ غالباً یہی وہ پس منظر ہے جس میں قرآن پاک نے عورت کی نفسیات کے بارے میں ایک حکیمانہ اور انتہائی حقیقت پسندانہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ وہ ''زیورات میں پرورش پاتی ہے اور جھگڑے کے تحت اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں غیر مبین رہتی ہے۔'' (43/184)

خواتین میں اسی کمزوری کا حل قرآن پاک نے دو خواتین کی مشترکہ گواہی کی صورت میں تجویز کیا ہے تاکہ اگر کسی ایک سے بھول چوک ہو الجھاؤ کا شکار ہو جائے یا اس کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسری کے بیان سے اس کی تلافی ہو جائے۔ مقصد اس کا عورت کو کمتر مخلوق قرار دینا نہیں بلکہ کسی امکان احتمال کی قانونی روک تھام ہے اور شہادت کی توثیق کرنا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ عورت اپنی نفسیاتی ساخت، حیاتیاتی مجبوریوں اور معاشرتی ذمہ داریوں کی بنا پر جن امور کے کرنے کی کم اہل سمجھی گئی ان میں ایک امر شہادت یا گواہی کا بھی ہے۔

(بحوالہ: عورت کی نفسیات۔ ایم اے ملک)

عورت کی نفسیات

(1) چند حیاتیاتی اور نفسیاتی حقائق:

عورت کی نفسیاتی ساخت اور طبعی رجحانات کو سمجھنے کے لئے بنیادی اہمیت کے حامل چند حیاتیاتی اور نفسیاتی حقائق کا جاننا ضروری ہے۔ ان میں سے کچھ تو معروف عام ہیں اور کچھ چند سر کردہ ماہرین حیاتیات اور نفسیات کی تخلیق جدید کے نتیجے میں منظر عام پر آئے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

تمام ماہرین حیاتیات اس بات پر متفق ہیں کہ عورتوں کی جسمانی نشو ونما مرد کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے جس سرعت سے ایک بچی کم سنی کے مراحل طے کرتے ہوئے سن بلوغت کو پہنچتی ہے اور شادی کے قابل ہوتی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ جغرافیائی اور نسلی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام طور پر عنفوان شباب کا آغاز لڑکیوں میں لڑکوں کی نسبت کم وبیش دو تین برس پہلے ہو جاتا ہے۔ گرم ملکوں میں دس گیارہ برس اور سرد ملکوں میں تیرہ چودہ برس کی عمر میں لڑکیاں عہد شباب کو پہنچتی ہیں جبکہ لڑکے پندرہ سولہ سال کی عمر میں بلوغت کو پہنچتے ہیں۔

نسل انسانی کو بقا دینے والے اعضاء بھی لڑکیوں میں نہ صرف جلد پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ فعال بھی ہو جاتے ہیں یہی کیفیت ان کی ذہنی ونفسیاتی نشو ونما کی ہے اپنی ذات اور جنس کا شعور بھی لڑکیوں میں لڑکوں کی نسبت بہت پہلے بیدار ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہم عمر لڑکوں کی بجائے لڑکیاں اپنے سے کہیں بڑی عمر کے مردوں کو اپنی جذباتی امنگوں کے قریب تر پاتی ہیں، جسمانی اعضاء اعصاب اور حرکات وسکنات پر بھی وہ لڑکوں کی نسبت جلد قابو پا لیتی ہیں اور نہ صرف چلنا اور بولنا جلد سیکھ لیتی ہیں۔ بلکہ اپنے روزمرہ کے کام کاج، بول و براز کی تربیت، جسم کی نگہداشت، لباس وزیبائش، امور خانہ داری پر بھی جلد دسترس حاصل کر لیتی ہیں۔ رشتے ناطے کا شعور بھی ان میں اپنے ہم عمر لڑکوں کی نسبت زیادہ ہو جاتا ہے ان کی سوجھ بوجھ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر ایک پانچ چھ سالہ بچی کو اپنے چھوٹے بہن بھائی کی نگہداشت کے فرائض بھی سونپ دیئے جائیں تو وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے جبکہ لڑکا اس عمر میں نرا بدھو ہوتا ہے۔

ماہرین حیاتیات نے اس حقیقت کا انکشاف بھی کیا ہے کہ لڑکیاں ابتداء میں کہیں زیادہ زود فہمی اور ذہانت وفطانت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں   سبقت لیتی دکھائی دیتی ہے۔ دنیاوی مسائل بالخصوص جنسی معاملات میں ان کی دلچسپی اور معلومات کافی چونکا دینے والی ہوتی ہیں۔ جنسی ماہرین کے مطابق چونکہ اس دور میں عقلی پختگی کا فقدان ہوتا ہے، اسی لئے جنسی طور پر ورغلائے جانے کا امکان بھی اس دور میں بالعموم زیادہ ہوتا ہے۔ تاہم ذہنی یا جسمانی ترقی کی رفتار بعد ازاں برقرار نہیں رہتی۔ عنفوان شباب کا آغاز ہوتے ہی لڑکے لڑکیوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔

عورتوں اور مردوں کے ذہنی ارتقاء کا موازنہ کرتے ہوئے فرائیڈ جو ماہر حیاتیات بھی تھا۔ ایک نہایت اہم

نکتے کا انکشاف کرتا ہے اس کے مطابق عورت کو جو کچھ بننا ہوتا ہے، کم وبیش تیس بتیس برس کی عمر تک بن چکتی ہے۔ بعد ازاں ارتقاء کا یہ عمل سست پڑ جاتا ہے بلکہ اس پر ایک قسم کا جمود طاری ہو جاتا ہے۔ جب کوئی روش، رجحان یا عادت ایک بار راسخ ہو جاتی ہے۔ تو اصلاح احوال کی تمام تدابیر تعلیمی، تربیتی اور نفسیاتی علاج معالجے اس پر کچھ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتے۔ اس کی آراء قطعی اور حتمی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم سے معذور ہو جاتی ہیں۔

مرد اس کے برعکس لچک اور تغیر کا رجحان رکھتا ہے وہ کم وبیش عمر بھر ارتقاء کی منازل طے کرتا رہتا ہے اور اگر چاہے تو علم و آگہی کے نت نئے اسرار کی جستجو میں کامیاب رہتا ہے اعلیٰ تحقیقاتی کام، حیرت انگیز فنی کمالات اور عظیم سائنسی کارنامے مردوں نے بالعموم چالیس برس یا اس سے اوپر کی عمر میں انجام دیئے ہیں جبکہ عورتوں کی تخلیقی قویٰ اس عمر کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہونے لگتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عورتیں اعلیٰ پائے کی جینئس بہت کم پیدا ہوئی ہیں۔

لڑکے اور لڑکیوں کے تعلیمی رجحانات پر بھی بعض نے ریسرچ کی ہے ان کے مطابق لڑکے بالعموم حساب، شماریات، سیاسیات، معاشیات اور سائنسی وتکنیکی علوم میں بہتر استعداد کا مظاہرہ کرتے ہیں جب کہ لڑکیاں پیدائشی طور پر رنگوں کی شناخت، فنون لطیفہ، معاشرتی علوم، مذہب اور لسانیات کا بالعموم بہتر ادراک رکھتی ہیں۔

ہائی سکولوں کے متعدد گروپس، پر نفسیاتی ٹیسٹوں کا اطلاق کرتے ہوئے سی۔سی مائیلز C.C.Miles اپنی کتاب "سیکس ان سوشل سائیکالوجی" میں رقم طراز ہے کہ لڑکوں میں تحقیق وتجسس، تخلیق وایجادات، اشیاء کی ماہیت کا ادراک، مہم جوئی، عقدہ کشائی، کاروباری، ذہانت، جرات اظہار، جارحیت اور حقوق کے لئے جدوجہد کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ جبکہ لڑکیاں قدرے کمزور دل واقع ہوئی ہیں اور لگے بندھے کام کاج، بول چال، رکھ رکھاؤ، ادب وآداب، روایت پسندی، جذبہ ہمدردی اور جمالیاتی حس میں لڑکوں پر سبقت رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی نیا تجربہ کرنے کی جرات وہمت نہیں ہوتی چنانچہ وہ اس کے نتیجے پر پہنچا ہے کہ عورت فقط وہی تخلیق کرتی ہے۔ جو فطرت نے طبیعت ومزاج کا موازنہ کرتے ہوئے فرائیڈ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ صابرہ اور متحمل قرار دیتا ہے بقول اس کے لڑکی لڑکے کی نسبت زیادہ سعادت مند، کم جارح، فرماں بردار، مصالحت پسند، سلیقہ شعار اور پابند نظم ہے یہ فرق اس کے نزدیک تربیت کی بنا پر نہیں، طبیعت کی بنا پر ہے۔

اس نے عورت اور مرد کی نفسیات پر اہم ترین انکشافات تحلیل نفسی کی بنا پر کئے ہیں اس لئے یہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اگر تحلیل نفسی کے طریق کار، تکنیک اور مقاصد کو یہاں ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ زیر بحث لایا جائے تا کہ فرائیڈ نے عورت اور مرد کی نفسیات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ وسیع تناظر میں کیا جا سکے۔

عہد طفولیت (تشکیل کردار میں اس کی اہمیت)

بچپن کے واقعات اور کمسنی کے تجربات انسانی سیرت وکردار اور تعمیر شخصیت پر گہرے اَن مِٹ اور دور رس اثرات مرتب کرتے ہیں۔ زندگی کے ابتدائی چند برس بالخصوص ابتدائی پانچ چھ برس تو تعمیر کردار میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہمارے کردار کی نشوونما ہوتی ہے عادات واطوار تشکیل پاتے ہیں۔ عقل وضمیر شعور ولاشعور کی تخلیق ہوتی ہے۔ ذہن وجذبات تربیت کے مراحل طے کرتے ہیں۔ اشیاء کے بارے میں ہمارا مثبت اور منفی ردعمل مخصوص نہج اختیار کر لیتا ہے مخصوص طرز زندگی، مطمع نظر اور افتاد طبع جنم لیتی ہے۔ تعصبات، توہمات، لایعنی خدشات، حجابات، خبط ہائے باطل، محبت ونفرت، پسند وناپسند کے رجحانات اور کئی قسم کے کمپلیکس فروغ پاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس اثر پذیر دور میں انسان جس سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ کم وبیش مستقل ہوتا ہے۔

جذباتی محرومی کے بچوں پر اثرات: والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ کسی فرد کے مراسم کو عمر کے اس حصے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ تو قعات بچے کی ذہنی نشوونما کا سنگ بنیاد ہیں۔ بالخصوص والدین تو اس کی زندگی میں آنے والے اہم ترین اور اولین لوگ ہیں۔ انہی کی رفاقت میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ وہی اس کی ذہنی، جذباتی اور اخلاقی تربیت کا لوازمہ فراہم کرتے ہیں۔

بوقت پیدائش بچہ گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہے۔ چند حیاتیاتی جبلتوں کے ساتھ وہ کارزار حیات میں قدم رنجاں ہوتا ہے وہ جو کچھ بنتا ہے۔ والدین اور بعد ازاں ماحول اور معاشرہ کی زیر تربیت بنتا ہے۔ والدین کے ساتھ اس کے تعلقات باہمی اعتماد ومحبت پر استوار ہوں، تو اس کی شخصیت صحت مند، متوازن اور نارمل ہوگی۔

جذباتی محرومی خواہ والدین کی باہمی چپقلش، سخت گیری، عدم توجہ، غفلت، علیحدگی یا وفات کی وجہ سے ہو، زندگی میں بڑی تباہ کن ہوتی ہے۔ اس کے مضر اثرات رہتی زندگی تک گوناگوں ذہنی وجسمانی امراض اور سیرت وکردار کی خامیوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں بالعموم ایسے افراد حسب ذیل نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا پائے گئے ہیں۔

- ☆ وہ غم زدہ، اداس، فکر مند، کچھ کھوئے کھوئے اور ڈپریسڈ رہتے ہیں یوں جیسے زندگی میں کوئی خلا رہ گیا ہو۔
- ☆ خشک مزاج، چڑچڑے، مردم بیزار بلکہ خود بیزار، تنہائی پسند، ہمیشہ کسی انجانے خوف اور عدم تحفظ میں مبتلا بزدل اور جھینپو قسم کے ہوتے ہیں۔
- ☆ وہ عموماً جسمانی اعتبار سے کمزور، جذباتی اعتبار سے ناپختہ اور عقلی اعتبار سے پسماندہ رہ جاتے ہیں۔

☆ وہ چاہت اور پیار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ان میں توجہ اور ہمدردی حاصل کرنے کی بے پناہ خواہش پائی جاتی ہے۔بالعموم بیماری کوتوجہ کے لئے بطور حربہ اختیار کرتے ہیں۔

☆ شعوری یالاشعوری طور پر حادثات کودعوت دیتے ہیں یا ایسے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں جس سے تشہیر ہو۔ اور والدین کی بدنامی بھی۔

☆ محرومی محبت اور کثرت مے خواری، سگریٹ نوشی اور منشیات کے استعمال سے کرتے ہیں۔لذت کام و دہن میں کھوئے رہتے ہیں۔زیادہ کھاتے ہیں یا انتہائی کم

☆ خوداذیتی کارجحان رکھتے ہیں اور اسباب راحت حیات سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

☆ نفرت وعداوت، غم وغصے اور کینے کو سینے میں دبائے رکھتے ہیں۔ذرا سی تحریک پر انتہائی اشتعال انگیز اقدامات پر اتر آتے ہیں۔

تربیت بول و براز میں انتہا پسندی کے منفی اثرات

بچے کی زندگی کا دوسرا سال بول و براز کی تربیت (Toilet Traning) کا سال ہے۔اس دور میں ماں کا طرزعمل جو وہ بچے کو صفائی کی تربیت دیتے ہوئے اختیار کرتی ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے اگر وہ درشت مزاج، سخت گیر اور تشدد پسند ہو اور بے صبری اور جلد بازی سے کام لیتے ہوئے بچے کو گندگی میں لتھڑا دیکھ کر تشدد اور مار پیٹ پر اتر آئے تو اس اثر پذیر دور میں بچے کے ذہن میں اپنے نجس و ناپاک ہونے کے دائمی خوف مسلط ہو جاتا ہے جو بڑے ہو کر بھی کم نہیں ہوتا۔

اس میں صفائی کا خبط جنون کی حد تک بڑھ جاتا ہے۔وہ مرض وہم حاوی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جب دیکھو کپڑے دھونے، نہانے اور کف دست ملتے ہوئے پاکی پلیدی کے چکر میں کھویا ہوا پایا جائے گا۔اس ضمن میں ایک مریضہ کا خط ملاحظہ فرمائیے جو اسی وہم مادی کے مرض میں مبتلا ہیں۔موصوفہ لکھتی ہیں۔

''میں ہر وقت پاکی پلیدی کے چکر میں رہتی ہوں۔یوں لگتا ہے میرے ہاتھ پاؤں جسم اور کپڑوں میں گندگی سما گئی ہے جسے دور کرنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔گرمی ہو یا سردی نہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔غسل خانے میں داخل ہوتی ہوں تو دیر تک نہائے چلے جاتی ہوں۔ہاتھوں پر ذرا سی میل بھی نا قابل برداشت ہے۔ یہی حال کپڑوں کا ہے ادھر پہنتی ہوں ادھر بدل کر دھونے لگتی ہوں۔''

بعض اوقات سارا گھر دیواروں سمیت دھو ڈالتی ہوں۔نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں لیکن ایک بار وضو کرنے کے بعد سوچتی ہوں کہ شاید کوئی کمی رہ گئی ہے۔چنانچہ از سر نو وضو کرنے لگتی ہوں۔بعض اوقات تو اتنی مرتبہ وضو کرتی ہوں کہ نماز کا وقت ہی گزر جاتا ہے۔''

ازدواجی زندگی میں بھی ان باتوں سے بری طرح متاثر ہو رہی ہوں لیکن ان دنوں میری پریشانی کی دو وجوہ ہیں پہلی یہ کہ نماز کے دوران انتہائی بے ہودہ اور گناہ آلودہ خیالات آنے لگتے ہیں۔دوسری (جن کے تصور ہی

سے کانپ اٹھتی ہوں) یہ کہ مجھے وہم ہو گیا ہے کہ میں اپنے نوزائیدہ بچے کو بالائی منزل کی کھڑکی سے نیچے پھینک دوں گی حالانکہ میں اپنے بچے سے بے حد محبت کرتی ہوں اور اس کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی ہوں۔''

تفصیلی کیس ہسٹری سے معلوم ہوا کہ ایسے ہی اثر پذیر دور میں جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ایسے مریضوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی تک ان کی کوئی غصیلی آواز ان سے مخاطب ہے۔ تم نجس ہو۔ ناپاک ہو اور گندے ہو، جاؤ اپنا منہ ہاتھ دھو آؤ ورنہ......''

یہ لاشعور میں چھپی ہوئی ماں کی آواز ہے۔ جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور مریض معاً بچپن کی طرف لوٹ جاتا ہے اور بار بار ہاتھ منہ دھو کر ماں کے احکامات کی بجا آوری کرنے لگتا ہے۔

ماں کی سخت تربیت کا نتیجہ اس دور میں ایک اور شکل میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ مریض ایک قسم کے احساس جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ناپاک سمجھنے لگتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ اس نے خیال و عمل میں کوئی نجس کام کیا ہے۔ اس کے باطن میں گندگی سما گئی ہے اور وہ اس احساس جرم و گناہ سے بچنے کے لئے ایسی حرکات کرنے لگتا ہے جس سے اسے اپنے گناہ سے نجات حاصل ہو سکے۔

بار بار منہ دھونا محض علامتی (Symolic) ہے غور سے دیکھا جائے تو یہ کارکردگی اپنے ضمیر کو نفس کی آلائشوں سے پاک و صاف کرنے یعنی ''پاپ دھونے'' کی ایک تدبیر ہے ایسی حرکات بہ تکرار کرنے سے اسے ضمیر کی آسودگی حاصل کرتی ہے۔ وہ ایسا نہ کرے تو اسے ہر دم سزا کا خوف ستاتا رہتا ہے۔

بہر حال پاکی پلیدی کے چکر میں کھوئے ہوئے مریضوں کی نفسیاتی الجھنوں کے محرکات دور کہیں بچپن کے سال دوم میں ماں کے متشددانہ طرز تربیت میں نہاں ہوتے ہیں۔ وہ ہر شے میں اکملیت تلاش کرتے ہیں۔ مسلسل زیر عتاب رہنے کی وجہ سے ان میں خود اذیتی یا غیر اذیتی رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف انتہائی غیر مستقل مزاجی، نرم دلی یا لاپرواہی سے بول و براز کی تربیت دینے والی ماؤں کے بچوں میں بالعموم ضبط نفس، ذمہ داری اور ڈسپلن کی کمی ہوتی ہے۔ دونوں صورتیں بہر حال بچوں کی صحت مند اور متوازن نشوونما کے لئے سم قاتل ہیں۔ بہترین طریق کار توسط، اعتدال اور میانہ روی ہے۔ نہ انتہائی سختی اور نہ انتہائی نرمی دونوں کے بین بین، سختی اور نرمی کا امتزاج۔

(بحوالہ: عورت کی نفسیات۔ ایم اے ملک)

خواہش تحفظ

یہ روایتی نظریہ ہے کہ عورت ایک جنس زدہ حیوان ہے اور دنیا کی ہر شے کے مقابلے میں جنس کی اہمیت اس کے نزدیک زیادہ ہے ایک نارمل عورت کی بنیادی فطرت اور نفسیات سے عدم واقفیت پر مبنی ہے امر واقعہ یہ ہے کہ زندگی میں سب سے زیادہ عزیز شے اگر اس کے لئے ہے تو وہ خواہش تحفظ ہے یعنی اپنی عزت، ناموس اور اپنی اولاد کا معاشی و معاشرتی اور جذباتی تحفظ۔

اس سے پہلے کہ وہ کسی مرد کے ساتھ رشتہ مناکحت میں منسلک ہو وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اسے اور اس کی ہونے والی اولاد کو وہ عزت و مرتبہ اور تحفظ فراہم کر سکے گا جو معاشرے میں باوقار زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ بلاشبہ سیکس ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اور ازدواجی زندگی کی بنیاد بھی لیکن شاید ہی کسی اور عورت نے ازدواجی بندھن میں بندھے جانے سے قبل جنس کو کبھی شرط اولین کے طور پر پیش کیا ہو۔ مغرب جہاں جنس کو بہت اچھالا جاتا ہے۔ وہاں بھی خواہش تحفظ ہی کو شریک حیات کے انتخاب میں اولین اہمیت حاصل ہے۔

یہ تحفظ اسے میسر آ جائے تو وہ مقابلتاً معمر مردوں سے بھی نباہ کر جاتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اخلاقی حدود سے بالاتر ہے یا اس کی غیر ازدواجی دلچسپیوں پر کوئی قدغن نہیں اور جنسی تسکین کے متبادل ذرائع اسے باآسانی میسر ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ماں، اولاد، گھربار، عزت و مرتبہ اور جذباتی تحفظ جو اسے شوہر کی طرف سے حاصل ہے وہ اسے محض لذات جنس کی خاطر معرض خطر میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ انہی تحفظات کے لئے بسا اوقات وہ رنگ، نسل، مذہب اور عمر کے تفاوت کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے اور اپنے ہم نسل، جواں سال، خوش شکل لیکن غیر ذمہ دار اور کھلنڈرے مردوں پر غیر نسل کے عام شکل و صورت رکھنے والے ذمہ دار مردوں سے شادی کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

تحفظ کی خواہش عورت میں کتنی شدید ہے اس کا کچھ اندازہ آئندہ صفحات میں زیر بحث اس کے حیاتیاتی اور جنسی طرز عمل سے کیا جا سکتا ہے۔

○ شادی

عورت کا جنسی رویہ مرد کے مقابلے میں زیادہ تعمیری اور ذمہ دارانہ ہے جبکہ مرد کے عزائم زیادہ تر استحصالی ہیں۔ عورت کا مقصد اولیٰ فقط ایک اور ترجیحاً ایک ہوتا ہے اور وہ ہے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا اس کے بغیر اس کی شخصیت نامکمل اور ادھوری ہے اگر وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہتی ہے تو وہ خود کو فریب خوردہ، استحصال زدہ اور گم کردہ راہ تصور کرتی ہے۔

طویل، بے لوث اور بے مقصد دوستی یا معاشقے کی نہ وہ قائل ہے اور نہ اس کی متحمل کیونکہ وہ جانتی ہے کہ نقصان اس میں سراسر اسی کا ہے اپنے غیر محفوظ ہونے کا فکر اسے اس وقت دامن گیر رہتا ہے جب تک وہ کسی مرد کو

شادی کے دائمی بندھن میں محبوس کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتی یہی اس کی محبت کی معراج ہے۔

مرد مجرد اور تنہا رہ سکتا ہے لیکن عورت اگر بالکل بے بس، حواس باختہ یا بے راہرو نہ ہو چکی ہو تو خواہ اس کا شمار مشاہدان بازاری میں ہو سبھا کی پریوں میں، اس کی آرزوں کا منتہا شادی کے سوا کچھ اور نہیں۔ شوہر برا بھلا جیسا کچھ بھی ہے کسی قانون، کسی ضابطے کے تحت تو آتا ہے۔ دباؤ سے ہی سہی کچھ تحفظات فراہم کرنے کا پابند تو ہے بار کفالت اٹھانے کے لئے اسے مجبور تو کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال وہ اس عاشق نامراد سے بدر جہا بہتر ہے جو محبت کا خالی خولی دم تو بھرتا ہے۔ لیکن کسی معاشرتی، اخلاقی یا قانونی محاسبے سے خود کو بالاتر سمجھتا ہے۔ یکطرفہ ایثار کا طلبگار رہتا ہے خود غرض، مطلب پرست اور غاصب ہے۔ حقوق پر نگاہ رکھتا ہے لیکن فرائض سے بری الذمہ ہے اس کی رفاقت دائمی کا یقین بھی نہیں ہے بچہ ہو جانے کی صورت میں اس کی کفالت وحفاظت سے یکسر آزاد ہے۔

○ یک زوجیت

حیاتیاتی اور جنسی اعتبار سے مرد کا شماران کثیر الازدواج نہ جانوروں میں ہوتا ہے جو اپنے ہمراہ ماداؤں کا جم غفیر لے کر چلتے ہیں اور جب تک کوئی کڑی داخلی یا خارجی پابندی اس پر عائد نہ ہو وہ حرم آباد کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ عورت اس کے برعکس حیاتیاتی اعتبار سے یک زوج ہے وہ کسی ایک مرد کی بن جانا یا اسے اپنا لینا چاہتی ہے۔

متعدد مردوں کے ہاتھوں میں مانندِ جامِ ے گردش اس کے لئے مرگ مفاجات سے کم نہیں آئے دن کی اکھاڑ پچھاڑ، طلاطم خیز حالات اور انقلابات اسے راس نہیں آتے جبکہ مرد تنوع پسند، سیماب وش اور مہم جو ہے عورت طبعاً ساکت و جامد ہے ارتکاز جذبات کی صلاحیت رکھتی ہے وہ مردوں کے درمیان شٹل کاک نہیں بننا چاہتی، وہ پیکر خاکی جو فطرت نے اسے عطا کیا ہے۔ کسی ادھیڑ بن اور کھینچا تانی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

اسکی شخصیت حیاتیاتی اور معاشرتی مجبوریوں میں محبوس ہے کبھی ایام مخصوصہ کے چکر کبھی بار امانت کی فکر اور کبھی ازدواجی زندگی ناکام ہو جائے تو زبان خلق کے نشتر طلاق اس کے لئے ہزاروں آفات اور بدنامی کے داغ لے کر آتی ہے فکر معاش اگر نہ بھی ہو تو بھی تفکرات حیات اسے چین نہیں لینے دیتے۔

معاشرتی عدم تحفظ، تنہائی، جذباتی محرومی، ممتا کے تقاضے، ڈھلتی عمر، ہزاروں غم اور اندیشہ ہائے دور دراز ہیں۔ جو اسے گھیرے رہتے ہیں تاوقت یہ کہ اس کی فطرت بالکل مسخ ہو کر نہ رہ گئی ہو اور وہ خود بربادی پر نہ تلی بیٹھی ہو۔ سبز باغ دکھا کر ورغلائی نہ گئی ہو۔ یا اس کی زندگی مکمل طور پر جہنم نہ بنادی گئی ہو۔ بہت کم عورتیں فقط لذائذ نفس کی خاطر اپنا گھر بار، مال واولاد چھوڑنے پر آمادہ ہوتی ہیں۔ طلاق نسائی شخصیت کی نفی اور نسوانی اوصاف کی تنسیخ ہے۔

○ آشیاں سازی

ہر عورت فطرتاً گھر پرست اور گھریلو مزاج ہوتی ہے۔ صحرا نوردی کے بجائے اقامت گزینی کا رجحان رکھتی ہے۔ آشیاں سازی اس کی سرشت ہے گھر اس کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا مادہ پرندے کے لئے آشیانہ۔

ازدواجی بندھن میں منسلک ہونے کے **بعد فطری** طور پر اس کا پہلا اور اگلا قدم اپنے لئے ایک گھر کا حصول

ہے۔ جہاں وہ بافراغت وظائف فطری کی تکمیل کر سکے۔ اس مشقتوں بھری دنیا میں گھر اس کے لئے سکون و راحت کا گوشہ ہے یہ اس کے لئے دارالقیام ہی نہیں، دارالامان بھی ہے ایک محفوظ پناہ گاہ جس کے بغیر اسے ہمیشہ عدم تحفظ کا کھٹکا سا رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرد گھر بناتا ہے اور عورت اس میں رہتی ہے جبکہ مرد اس میں رہتا نہیں فقط ٹھہرتا ہے مرد کی حقیقی رہائش گاہ اس کا دفتر، کارخانہ یا وہ جگہ جہاں حصول معاش کی جدوجہد میں سارا دن گرداں رہتا ہے۔ گھر میسر نہ ہو تو وہ ہوٹلوں کا رخ کرتا ہے۔ مگر عورت، سوائے غیر معمولی حالات کے ہوٹل گزینی۔ اختیار نہیں کرتی گھر اور عورت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ عورت اس کی روح رواں ہے وہ گھر جس میں خاتون خانہ نہیں جسد بے روح، تن مردہ اور راکھ کا ڈھیر ہے۔

ازمنہ قدیم میں جب مرد سراسر صحرانورد وحشی تھا۔ جنگلوں کی خاک چھانتا تھا۔ جہاں سینگ سمائے رہن بسیرا کرتا تھا۔ عورت نے محبت سے رام کیا، تعمیر آشیاں کی ترغیب دی آسائش اقامت سے روشناس کرایا۔ آغوش محبت وا کی۔ بستر استراحت بچھایا، چولہا گرم کیا، لذت کام ودہن سے آشنا کیا۔ آوارگی جذبات کو مرکزیت بخشی، اولاد کی نعمت سے سرفراز کیا حیوان ناطق سے معاشرتی مخلوق بنایا۔ اجتماعی زندگی اور معاشرتی آداب سے بہرہ ور کیا اور اس طرح تمدن کی داغ بیل ڈالی۔ وہ انسانی معاشرے کی بانی ہے مرد کو پالتو بنانے کا سہارا سراسر اسی کے سر ہے۔

○ ممتا

آسولڈ شوارز کے مطابق مرد کی جنسی خواہش کا مقصد اولی حصول مسرت ہے جبکہ عورت کی اس خواہش کا مقصد محض لذت نفس نہیں حصول اولاد ہے۔ وہ ماں بننا چاہتی ہے جنسی جذبہ کی تسکین اس کا مقصود بالذات نہیں، ایک ذریعہ ہے بچہ حاصل کرنے کا۔ بچہ نسوانیت کی تکمیل اور عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کی تصدیق ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک جسد بے جان ہے کشت ویران ہے۔ ایک ایسا شجر ہے جو بے برگ وبار ہو۔ ازدواجی بندھن کا استحکام اور معاشرے میں اس کا تحفظ اور مقام اسے بچے ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اگرچہ ماہرین عمرانیات کے نزدیک ممتا یا مادری جبلت بھی ایک ثقافتی قدر ہے اور معاشرے کی سکھائی ہوئی ایک صفت ہے تاہم ماہرین حیاتیات نے اس کی نشاندہی فطرت نسوانی میں کی ہے۔

اطالین ماہر حیاتیات جنسی نے تجربے کے طور پر ایک مادہ پرندے کی جنسی غدود نکال کر ایک نر پرندے کے جسم میں پیوند کئے تو نہ صرف اس کے جنسی رویے میں تبدیلی رونما ہوگئی اور مادینہ اوصاف بھی ظاہر ہونے لگے۔ بلکہ اپنے ننھے منے بچوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بھی مادرانہ شفقت کا مظہر ثابت ہونے لگے۔ طرز عمل کی اس تبدیلی سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مادہ پرندوں میں یقیناً کوئی ''ممتائی غدود'' موجود ہیں جو اس کے نسوانی کردار کے محرک ہیں جبکہ نر اس سے مستثنیٰ ہیں۔

قدیم ثقافتوں کے ماہرین نے تاریخ کے مختلف ادوار کے ایسے قبائل کا ذکر کیا ہے جو بچوں کی پرورش ونگہداشت مردوں کے سپردگی میں دے کر عورتوں کو بیرون خانہ کسب معاش کی ذمہ داری سونپ دیا کرتے تھے لیکن تقسیم کار کا یہ غیر فطری نظام زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے اس تقسیم کار کو الٹ دیا اور محسوس کیا کہ بچے کی صحیح پرورش اور نگہداشت فقط ماں ہی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے اور یہ کہ ماں کا نعم البدل اور کوئی نہیں۔

عورت کی اس اہم ترین خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مسلمان مفکر یوں رقم طراز ہیں:

''حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس امر کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں کہ فطرت کے اس فیصلے کو بدل سکے۔ جو معاشرہ اس فطری تقسیم عمل کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ خود مٹ جائے گا۔''

عورت اپنی افتادِ طبع اور اپنی فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی نہ کسی حد تک مرد کے کاموں کا بوجھ سنبھال لے جائے گی۔ لیکن مرد کسی طرح بھی بچے جننے اور پالنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ تمام دنیا کے مرد چاہے کتنا ہی سر مارلیں وہ اپنی پوری صنف میں ایک معمولی درجہ کی ماں بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

علم الحیات کی رو سے عورت بنی کو بچہ کی پیدائش اور پرورش کے لئے بنایا گیا ہے۔''

○ عفت وحیا

اگرچہ ماہرین حیاتیات وعمرانیات میں اس امر پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے تاہم ہمارے پاس یہ باور کرنے کی کافی وجوہ ہیں کہ مرد میں غیرت اور عورت میں حیاء دو ایسی خصوصیات ہیں، جن کی اساس ماحول اور معاشرے پر نہیں انسانی جبلت پر ہے تا وقتیکہ مکمل برین واش، گمراہ کن تصورات اور ترغیب وتحریص سے ان کی فطرت بالکل مسخ کر کے نہ رکھ دیا جائے، مرد ''بے غیرت'' اور عورت ''بے حیا'' نہیں ہوتی۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی، بہن یا بیٹی کو کسی نامحرم کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پا کر اشتعال میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادھر مردانہ جارحیت سے اپنی عفت وعصمت کا تحفظ نسوانی جبلت ہے۔

چھپنا، چھپانا، شرمانا، بلش کرنا، جھینپنا، جنہیں بعض مغربی ماہرین نے محض ناز وادا اور غمزہ وعشوہ قرار دے کر ان کی اہمیت گرانے اور شرم وحیا کی جڑ کاٹنے کی کوشش کی ہے۔ درحقیقت بنیادی نسوانی اوصاف ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کوئی عورت ماسوائے بیسوا کے جنسی پیش قدمی نہیں کرتی۔ نہ ہی کھلم کھلا دعوت نظارہ دیتی ہے اور عمداً خود کو ایسے حالات میں پھینکتی ہے جہاں اس کی عزت وناموس کو خطرہ لاحق ہو۔ حفاظت عصمت سے ہی اس کی عظمت ہے جس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

ایک مفکر نے اس کی تشریح وتعبیر یوں کی ہے۔

''فطرت نے عورت میں صنفی کشش اور خواہش کے ساتھ شرم وحیا اور تمانع وفرار اور رکاوٹ کا مادہ بھی رکھ دیا

ہے یہ تمانع اور فرار کی کیفیت اگرچہ دوسرے حیوانات میں بھی کسی حد تک نظر آتی ہے مگر انسان کی صنف اناث میں اس کی قوت وشدت بہت زیادہ ہے یہی شرم وحیا اور جذبہ حفظ ناموس کی بنیاد ہے۔''

حیا سے مراد وہ حجاب یا روک ہے جو فطرت خود کسی فعل منکر سے باز رکھنے کے لئے انسان کو ودیعت کرتی ہے۔اس کا مبدا جبلی ہے اور فطرت انسانی کی گہرائیوں میں پیوست ہے بعض اعتبار سے یہ ضمیر سے مشابہہ ہے اپنی اس خداداضمیر سے جس کی نشاندہی بعض ماہرین نفسیات نے انسانی ذہن ولاشعور میں کی ہے۔

تاریخ کے اوراق مشاہد ہیں کہ عصمت مآب بیٹیوں نے حفظ ناموس کی خاطر اپنی جان کے نذرانے پیش کئے اور عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک زوال پذیر نہیں ہوتی جب تک اس کی عورتیں زیور حیا سے مزین اور اس کے مرد شمشیر غیرت سے مسلح ہوں لیکن جب اس کے مرد وزن ان اوصاف گراں مایہ سے تہی دامن ہو جائیں تو شکست وذلت اور نکبت وادباران کا مقدر بن جاتا ہے۔

مرد جب مار کھاتا ہے اپنے ہی گھر سے کھاتا ہے یہی وجہ ہے کہ دشمن جب کسی قوم کو اپنے زیر تسلط لانا چاہتا ہے تو اس کے حوصلے پست کرنے کے لئے سب سے پہلے وہ اس قوم کی بہو بیٹیوں کو حیا سوز افعال وکردار کی ترغیب دیتا ہے تاکہ شرم وحیا نام کی کوئی چیز ان کے دامن میں نہ رہے جب عورتیں بے حیا بن جائیں اور مرد بے غیرت تو اقوام اپنے دفاع سے غافل ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ کامیاب جنگیں ہمیشہ حفظ ناموس زن کے لئے لڑی گئیں۔ کسی قوم کی فتح وشکست کے اسباب اس کی خواتین میں تلاش کئے جانے چاہئیں۔ شاعر مشرق نے کیا خوب کہا ہے۔

اک زندہ حقیقت ہے مرے سینے میں مستور
کیا سمجھے گا جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نہ پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا سرد

○ازدواجی بے وفائی کے محرکات

یہ روایتی تصور کہ عورت میں مستقل مزاجی اور استقامت کا فقدان ہے۔ ترغیبات جنس کا جلد شکار ہو جاتی ہے اور وفاداریاں بدلنے کا رجحان رکھتی ہے زیادہ تر ذاتی اور معاشرتی تعصبات پر مبنی ہے اور مردانہ انا کا عکاس ہے سائنس اور نفسیاتی حقائق سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

عورت میں حفظ ناموس کا جذبہ جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے، دیگر تمام جذبوں سے قوی تر ہے۔ پھر اس کے اپنے مفادات اور مصالح کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ کسی اصول وضابطے کی پابندی کرے اور مردانہ

جارحیت سے خود کو بچائے ورنہ اس کی بقا خطرے میں ہے چند انفرادی اور استثنائی واقعات کو چھوڑ کر بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی شادی شدہ عورت محض جنسی مہم جوئی کے شوق فضول کی خاطر اپنے گھربار کو خیر باد کہہ کر بازارِ حسن کی زینت بنی ہو۔

عورت ازدواجی زندگی میں مرد سے زیادہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ بے وفائی کا ارتکاب مرد کے مقابلے میں اس سے کم ہوتا ہے۔ اگر ہوتا ہے تو انتہائی غیر معمولی حالات میں۔

اڈلر کے نزدیک عورت کی ازدواجی بے وفائی شوہر کے خلاف ایک انتقامی کارروائی ہے خود شوہر کی اپنی بے وفائی کا ردعمل۔

مادام بوائر کے مطابق عورت کی بے وفائی جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے کم اور اپنی محرومیوں کی تلافی کے لئے زیادہ ہے۔

مشوارز کی نگاہ میں بے وفا عورت شوہر کی حلیف اور رفیق ہونے کی بجائے اس کی رقیب ہوتی ہے اور مردانہ تشخص رکھتی ہے۔

فرائیڈ کے نزدیک ازدواجی بے وفائی کی مرتکب عورت بنیادی طور پر فریجیڈ (Frigid) ہوتی ہے۔ اپنی غیر ازدواجی سرگرمیوں سے وہ لاشعوری طور اپنے آپ کو یہ باور کرا رہی ہوتی ہیں کہ وہ فریجیڈ نہیں۔ بہر حال عورت کی بے وفائی ہمیشہ کسی ابنارمل صورت حال کی غماز ہے جذباتی طور پر مطمئن عورت شوہر سے بے وفائی کی مرتکب نہیں ہوتی۔ دوسری طرف یہی بات کچھ غیر شادی شدہ لڑکیوں پر بھی صادق آتی ہے وہ لڑکیاں جن کے تعلقات اپنے والدین بالخصوص اپنی ماں سے باہمی اعتماد و محبت پر استوار ہوں، وہ ان لڑکیوں کی نسبت جن کے تعلقات اپنی ماؤں سے نفرت اور بیزاری پر مبنی ہوں۔ جنسی بے راہ روی کا بہت کم شکار ہوتی ہیں اور دامن تر ہونے سے بچائے رکھتی ہیں۔

○ جنسی سرد مہری کی حقیقت

بعض ماہرین جنسیات عورت کو جنسی اور حیاتیاتی طور پر سرد مہر قرار دیتے ہیں لیکن بعض کے مطابق وہ جنسی جنونی ہے۔ حیوانی خواہشات اور جنسی جذبات کا مجموعہ ہے۔ مختلف زاویہ ہائے سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔

ہندی کوک شاستر جسے اس موضوع پر سند حاصل ہے۔ عورت کو سات اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔ ان میں صرف پدمنی عورت کو مثال عورت کا درجہ دیا گیا ہے۔ باقی تمام اس کے مطابق ناقص الساخت ہیں۔

ماہرین نجوم کسی فرد کے جنسی رجحان کو ستاروں کا کھیل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر انسان کی تاریخ پیدائش سے وابستہ ایک ستارہ ہے جو عناصر اربعہ یعنی پانی، مٹی، آگ، ہوا میں سے کسی ایک عنصر کی نمائندگی کرتا ہے۔ کسی مرد اور عورت کی جنسی خصوصیت کا تعین اس کے برتھ چارٹ کو مدنظر رکھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

برتھ چارٹ

عنصر	نام ستارہ بزبان اردو	نام ستارہ بزبان انگریزی	تاریخ پیدائش	نمبر شمار
مٹی	جدی(1)	CARRI CORM	23 دسمبر تا 20 جنوری	1
ہوا	دلو(2)	AQUA RIAS	21 جنوری تا 19 فروری	2
پانی	حوت(3)	PISCEAS	20 فروری تا 20 مارچ	3
آگ	حمل(4)	ARIES	21 مارچ تا 20 اپریل	4
مٹی	ثور(5)	TAURAUS	21 اپریل تا 22 مئی	5
ہوا	جوزا(6)	GEMINI	23 مئی تا 21 جون	6
پانی	سرطان(7)	CANCEE	22 جون تا 22 جولائی	7
آگ	رسد (8)	LEO	23 جولائی تا 22 اگست	8
مٹی	سنبطیہ (9)	VIRGO	23 اگست تا 22 ستمبر	9
ہوا	خیران (10)	LIBRA	23 ستمبر تا 22 اکتوبر	10
پانی	عقرب(11)	SCARPIO	23 اکتوبر تا 21 نومبر	11
آگ	قوس(12)	SASSITTARIU	22 نومبر تا 22 دسمبر	12

1) آگ اور ہوا کے نمائندہ ستاروں کی زیر تاریخ پیدا ہونے والے مرد وزن کی جنسی مطابقت مثالی ہوگی۔ کیونکہ ہوا آگ کو بھڑکاتی ہے۔

2) مٹی اور پانی کے نمائندہ ستاروں کی زیر تاریخ پیدا ہونے والے مرد وزن کی جنسی مطابقت بہتر ہوگی۔ کیونکہ ہر دو عناصر کا ملاپ فطری ہے۔

3) البتہ آگ اور پانی، ہوا اور مٹی کے نمائندہ ستاروں کی زیر تاریخ پیدا ہونے والے مرد وزن کا ملاپ عدم مطابقت اور سرد مہری پر منتج ہوگا۔ یہ عناصر باہم دگر متحارب ہیں۔

ماہرین دست شناسی کے مطابق کسی فرد کی جنسی خصوصیات کا اندازہ اس کے ہاتھ پر واقع زہرہ کی دست و بلند ہونے سے کیا جا سکتی تھی۔ انگوٹھے کے زیریں حصے اور خط حیات کے درمیان واقع ابھار اگر نمایاں، کشادہ اور

بلند ہوتو مثبت زہرائی خصوصیات کا مظہر ہے لیکن اگر غیر نمایاں، پست چوسے ہوتے لیموں کی مانند ہوتو منفی زہرانی خصوصیات کا مظہر ہوگا مثبت زہرانی صفات کے حامل مردوزن، مضبوط، توانا اور اعلیٰ جنسی اوصاف کے مالک ہوتے ہیں جبکہ منفی زہرائی صفات کے حامل جنسی اعتبار سے ناتواں، کمزور اور سرمہر ہوتے ہیں ان کے ہاں اولاد کم یا تاخیر سے پیدا ہوتی ہے۔

فرائیڈ کے مطابق ہر عورت حیاتیاتی طور پر سردمہر ہوتی ہے۔ بقول اس کے فطرت کو اپنے تخلیقی مقاصد کی تکمیل کے لئے عورت کے فعال کے تعاون کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کی بجائے مرد کے اعضائے تولید کی تکمیل اور مفالیت پر توجہ دی ہے اور جنسی اعتبار سے عورت کو مقابلتاً کمزور اور تخلیقی اعتبار سے ناپائیدار بنایا ہے۔

اس کمتری کا احساس عورت کو پیدائشی طور پر ہوتا ہے اپنے نسوانی رول سے ایک گونہ لاشعوری نفرت اور مرد، بننے کی حسرت اس احساس کی غماز ہیں ادھر مردوں کی غیر ہمدردانہ روش جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے اور اس کا ردعمل جنسی، عدم تعاون اور سردمہری کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ مادام بوائر کے مطابق اس سردمہری کی محرک مذہب اور معاشرے کی ناروا پابندیاں اور شرم وحیا کی اخلاقی اقدار ہیں اس کے نزدیک نسوانی حیاء جبلی نہیں معاشرتی ہے تاہم وہ اس بات کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے کہ جن معاشروں میں حیا نام کی کوئی چیز نہیں اور عورت ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے یکسر آزاد ہے وہاں بھی یہ مرضیاتی کیفیت عام کیوں ہے۔

مشہور ماہر جنسیات ڈاکٹر کنسزے جس نے بارہ ہزار امریکی مردوزن کی جنسی زندگی کے خفیہ حالات پر مشتمل تحقیقی رپورٹ مرتب کی ہے، لکھتا ہے کہ عورت کو اپنی جنسی تکمیل کے لئے مرد کے فعال تعاون کی ضرورت ہے اور اس کی سردمہری کے اسباب اس کے شوہر میں پنہاں ہیں اغلباً یہی بات زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے۔

○ جور پسندی

خواتین کی ایک عالمگیر خصوصیت جور پسندی ہے ہر عورت طبعاً مریض ندت آزاد ہے خوگرام ہے۔ غم کھانا اور خون جگر پینا اس کی فطرت ثانیہ ہے اندوہ پرستی اس کا خبر وحیات ہے ازل ہی سے وہ دکھ جھیلتی اور درد سہتی آئی ہے۔ بقول کسے وہ پیدا ہی دکھوں کے لئے ہوئی ہے ہندو فلسفیوں کے بقول وہ جنم جنم کی دکھیاری ہے۔

ابتدائے آفرینش سے ہی رنج الم اس کا نوشتہ تقدیر ہے صبر آزما حالات میں جہاں مرد اکثر جان ہار دیتا ہے وہ اپنی ایذا پرستی کی بدولت جانبر ہو جاتی ہے۔ غم دوراں اور غم جاناں دونوں ہی سہنے پر اسے مرد پر فوقیت حاصل ہے۔

نفسیاتی اصطلاح میں فرائیڈ اس جور پرستی کو (Masochism) مسوکیت کا نام دیتا ہے یہ ایک لاشعوری جنسی کیفیت ہے۔ جس کا حامل ''پیار میں ''مار'' کھانے کا متمنی ہوتا ہے جنس مخالف کے ہاتھوں ذہنی یا جسمانی اذیت اٹھا کر اسے ایک گونہ جنسی خط حاصل ہوتا ہے انتہائی ابنارمل کیفیت میں ایذا پرست اپنے محبوب سے مار پیٹ کا خواہش مند ہوتا ہے اور نتیجۃً اس درد اور اس خلش سے اسے جنس آسودگی ملتی ہے یہ بات بڑی مضحکہ خیز

اور نا قابل یقین ہے لیکن جنسی برصداقت ہے محبوب کے لب ہائے شیریں سے آرزوئے دشنام اور تیر ہائے نیم کش بے لذت آلام محض شاعرانہ نازک خیالی ہی نہیں، ٹھوس نفسیاتی حقیقت اور نشاط آور ذہنی کیفیت بھی ہے۔

بقول فرائیڈ ہر مرد طبعاً، سادی، Sadist اور عورت، مسوکی Mochicistic ہے مرد اذیت رساں ہے تو عورت اذیت خواہاں۔ مرد ستم گار ہے تو عورت ستم کی طلب گار۔ مرد جفا کیش ہے تو عورت جفاکش۔ مرد کی سادیت اور عورت کی مسوکیت، دونوں طبعی اور لاشعوری عوامل ہیں۔ اس سے بقول فرائیڈ انسانی زندگی میں الجھاؤ کے بجائے سلجھاؤ پیدا ہوتا ہے اور فطرت کی چند بڑی مصلحتوں کی تکمیل بھی۔

عورت اگر اذیت پسند نہ ہوتی تو زچگی کے تکلیف دہ عمل سے ایک بار گزرنے کے بعد دوسری بار گزرنے کا نام نہ لیتی لیکن اس کی فطرت کی بلندی اسی نوائے غم سے ہے۔ وہ کرب تخلیق سے بار بار گزر کر لذت یاب ہوتی ہے اسی پر اس کی بلکہ نوع انسانی کی بقا کا انحصار ہے اسی کی بدولت وہ زندگی کے انتہائی تلخ حقائق سے بھی نباہ کر لیتی ہے۔

بقول ایک مسلمان مفکر ”نوع انسانی کی یقیناً یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے عورت کو جفاکش بنایا ہے ورنہ بنی نوع انسان کی بقا کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن سی بات ہو جاتی۔“ تاہم عورت کی یہ مسوکیت اس حد تک تو نارمل ہے لیکن اس سے بڑھ کر اگر یہ خبط یا جنون کی صورت اختیار کر لے اور لاشعوری طور پر وہ کچھ ایسی حرکات کا ارتکاب کرنے لگے جو ذلت وخواری اور سزایابی کو دعوت دینے لگیں تو یہ مرضیاتی کیفیت کی عکاس ہے۔ اس طرح مرد کی سادیت فقط اتنی ہو جتنی اسے تخلیقی فرائض سرانجام دینے اور افعال بنانے کے لئے درکار ہو تو یہ نارمل حدود کے اندر ہے لیکن یہ اگر صنف نازک پر جبر وتشدد اور ظلم وتعدی کی صورت اختیار کرے تو یہ ابنارملٹی کی علامت ہے جیسا کہ مصنف کو ملنے والے حسب ذیل خط سے ظاہر ہے۔

”ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ کو پکار رہی ہوں۔ اپنی گزری ہوئی زندگی کو یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سوتیلی ماں کی مار پیٹ، سوتیلے بھائی کے دیئے دکھ، بھوک اور فاقے، پڑھائی کا شوق تھا۔ مگر کتاب کا نام لینا بھی جرم تھا۔ بارہ برس کی عمر میں ایک ظالم حیوان کے پلے باندھ دی گئی۔ عذاب وصعوبت کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ رات رات بھر میرے دونوں ہاتھ چارپائی کے پایوں کے نیچے دے کر ظالم شوہر سویا رہتا۔ جلتے ہوئے سگریٹ میرے جسم پر بجھاتا۔ گرم دودھ اور ابلتی چائے میرے جسم پر پھینک دیتا راتوں کو بری عورتوں کو ساتھ لاتا اور ان کے سامنے مجھے مارتا پیٹتا۔ یہ سب برے کام میرے سامنے ہوتے تھے میں ہمیشہ خاموش رہتی۔ بول کر جاتی بھی کہاں۔ کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ شوہر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ قرآن پڑھ کر سمجھایا۔ مگر اس نے کلام پاک کا احترام نہ کیا۔ اور لگا گالیاں دینے اگر گھر سے نکال دیتا میں باہر دروازے پر بیٹھی رہتی ماں باپ سوتیلے تھے۔ دوسرے ان کا پتہ نہ تھا کہ کہاں ہیں سارے ظلم سہتی رہتی صرف اس خیال سے کہ اپنے گھر میں تو ہوں۔ شوہر کے سامنے بے عزت ہوں تو کیا ہوا عصمت تو محفوظ ہے۔

''اتفاق سے ہماری تبدیلی ملک کے دوسرے حصے میں ہوگئی اسے وہاں بھی بری عورتیں مل گئیں۔ ان عورتوں کو میرا وجود گوارا نہ تھا۔ اس لئے شوہر نے میری التجاؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جہاز پر بٹھا دیا۔ بے یار و مددگار ہوائی اڈے پر اتری۔ میری چھوٹی بچی بھی میرے ساتھ تھی کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ بس پر بیٹھ کر شہر پہنچی اندھیرا ہو رہا تھا۔ ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اچھے لوگ تھے۔ انہوں نے کام کاج کے لئے رکھ لیا۔ سارا دن کام کرتی ہوں۔ سینا، پرونا، کھانا پکانا مصیبت اب یہ آن پڑی ہے کہ یہاں بھی عصمت محفوظ نظر نہیں آتی۔ یہاں رہنے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ گھر کے مالک کو اپنی آخری متاع بھی دے دوں ورنہ وہ نہ جانے کیا الزام لگا کر گھر سے نکال دے گا۔''

''سوچتی ہوں خودکشی کرلوں لیکن بچی کا کیا بنے گا۔ کبھی خیال آتا ہے کہ بچی سمیت دریا میں ڈوب مروں۔ لیکن خدا کے عذاب سے ڈر لگتا ہے گو یہ زندگی بھی عذاب سے کم نہیں۔ میں گھر کا ہر کام کرسکتی ہوں کوئی شریف گھرانہ مجھے رکھ لے۔ صرف سر چھپانے کو جگہ اور اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پالنے کو روٹی چاہئے اپنی مصیبتوں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ بچی کو تعلیم دلاؤں۔ میں تعلیم یافتہ ہوتی تو بھلا اتنے دکھ کیوں اٹھاتی۔ اچھے بھائی خدا کے لئے میری مدد ضرور کریں۔''

صورتحال کبھی دگرگوں صورت بھی اختیار کر جاتی ہے یعنی عورت سادیت کا رول ادا کرنے لگتی ہے اور مرد ماسوکیت کا۔ جہاں الٹی گنگا بہنے لگے وہاں ضرور کوئی خرابی مضمر ہے اور معاملہ تجزیہ طلب ہے مثال کے طور پر ایک خط ملاحظہ کیجئے۔ جو ایک ایسی بیوی کا ہے جس کے شوہر مار کھانے کے شوقین ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

میری شادی کو پانچ برس ہوگئے ہیں۔ میرے شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں ان کی ایک عادت بڑی عجیب ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ چاہتے ہیں کہ انہیں گھر کے کام کاج میں لگائے رکھوں، نوکروں کی طرح کام لوں، غلطیوں پر ٹوکوں، برا بھلا کہوں اور سختی سے پیش آؤں۔ اسی پر اکتفا نہیں ان کا مطالبہ جسمانی سزا اور مار پیٹ کا ہوتا ہے۔ مجھے کھلی چھٹی دے رکھی ہے روز بروز ان کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔''

''میں خود ایک مشرقی لڑکی ہوں۔ مشرقی روایات کی پابند ہوں نہیں چاہتی کہ ان کے مطالبات کا ساتھ دوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ اگر ان کی خواہش کی تکمیل نہ ہوئی تو وہ کہیں دوسری شادی کرلیں گے۔ سخت تذبذب کا شکار ہوں بتائیے کیا کروں اور کیا نہ کروں؟؟؟

○ اٹل حقیقتوں سے سمجھوتہ

حیات انسانی ہر دم آفات و آلام کی زد میں ہے رزم گاہ حیات میں انسان کو کبھی کبھی سخت ناموافق حالات، اعصاب شکن حادثات اور جاں گسل صدمات سے دوچار ہونا پڑتا ہے عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ مرد قوی الاعصاب ہونے کی بدولت بقوت آزمائش عورت سے زیادہ سخت جان ثابت ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے عورت اپنی تمام تر لطافتوں اور نزاکتوں کے باوجود حوادث سے جاں بر ہونے کی استعداد مرد کے

مقابلے میں زیادہ رکھتی ہے۔ مرد تناور درخت ہے طوفان ہائے بلاخیز میں ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن جھک نہیں سکتا۔ جبکہ عورت ایک لچکیلی شاخ سے مشابہہ ہے جو سرنگوں ہو کر محفوظ رہتی ہے وہ اٹل حقیقتوں کو نہ صرف تسلیم کر لیتی ہے بلکہ ان سے مفاہمت بھی جلد کر لیتی ہے۔

رقیب کا تصور اس کے لئے برق فنا ہے اور پیغام اجل سے کم نہیں لیکن جب یہ افتاد اس پر آن پڑے تو بادل نخواستہ اسے بھی سہہ جاتی ہے مجبوریوں کا نام اس کے نزدیک مفاہمت ہے حد یہ کہ عورت نکاح بالجبر اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اغوا کنندہ سے بھی بنا کر جاتی ہے شوہر سے ماحول اور کلچر کے واضح تفاوت کے باوجود ازدواجی زندگی میں بالعموم حیرت انگیز مظاہرہ کرتی ہے اگرچہ جذباتی گہرائی اور یکسوئی بہ نسبت مرد اس میں زیادہ ہے۔ تاہم دل مگر دیتی ہے عورت ایک بار۔ وغیرہ قسم کے شاعرانہ اقوال و فرمودات فقط دل کو خوش رکھنے کے لئے اچھا خیال تو ہیں مگر حقائق کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جذباتی معاملات میں مرد و زن دونوں کی نفسیات یکساں ہے جذباتی تغیر پذیری کا شکار دونوں ہوتے ہیں...... مرد قدرے بسرعت اور عورت قدرے بتدریج اور یہی تدریج عورت کے بارے میں ایسے فرمودات کی محرک ہے۔

مادام بوائر نے تاریخی حوالہ جات یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب قوم دشمن کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوتی ہے تو مفتوح قوم کی عورتیں فاتح کا ساتھ دینے لگتی ہیں بلکہ دشمن کے قدم چومنے میں پیش پیش ہوتی ہیں۔ عورتیں تنازعہ ابقاء میں بنیادی طور پر جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کی قائل ہے "ہیرو ورشپ" کا رجحان رکھتی ہے طبعاً فرمانبردار اور اطاعت شعار ہوتی ہے چڑھتے سورج کی پجاری ہے۔ آمرانہ صفات رکھنے والے مردوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔ "گربہ کشتن روز اول" مثال کافی حد تک اس پر راست آتی ہے۔

بقول مادام بوائر جنرل ڈیگال اور ٹیٹو جیسے آمر حکمرانوں کو سب سے زیادہ تائید عورتوں ہی سے حاصل ہوئی۔ تاہم تاریخ کے حوالے سے مادام بوائر کا یہ تجزیہ کسی عالمگیر صداقت کا عکاس نہیں۔ اس کی نگاہ غالباً کمزور کردار کی حامل خواتین پر پڑی ہے۔ بہادر اور باعزت اقوام کی خواتین کے کردار کا مطالعہ شاید اس نے نہیں کیا۔ حضرت محل اور چاند بی بی جیسی خواتین اس کے مفروضے کی نفی کرتی ہیں۔

البتہ ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی کی اٹل حقیقتوں کو تسلیم کرنے کا رجحان خواتین میں بمقابلہ مرد زیادہ ہے جس کی بنیادی وجوہ ہمارے نزدیک دو ہیں۔

اول: ان کا قانع بتن بہ تقدیر اور راضی بہ رضا ہونا۔

دوم: ان کی غیر معمولی خواہش تحفظ و عافیت۔

بدامنی اور جنگ ان کے میلان طبعی کے منافی ہے وہ فطرتاً صلح جو اور امن پسند ہیں۔ ایسا امن جہاں وہ اپنے وظائف فطری کی تکمیل بہ فراغت کر سکیں اور رہی جنگ تو وہ ان کے لئے تباہی و بربادی کا پیغام لے آتی ہے

سہاگ اجڑتا ہے۔ توان کا۔ خاک وخون میں تڑپتے ہیں۔ تو باپ، بھائی اور بیٹے ان کے۔ عزتیں لٹتی ہیں تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ عورت سے بڑا جنگ دشمن کوئی اور نہیں۔ اس الاؤ میں اسے کوئی دھکیلتا ہے تو فقط مرد۔ قرآن حکیم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت مبارزت کے جواب میں ملکہ بلقیس کا اپنے وزراء کو مفاہمت اور صلح جوئی کا دانش مندانہ وعظ عورت کی اسی جنگ دشمنی، سلامت روی اور خواہش تحفظ کا آئینہ دار ہے۔

○ اقدام خودکشی کی اصلیت وماہیت

غیر جانبدارانہ تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی زندگی بحیثیت مجموعی مرد کی نسبت زیادہ بے بسی، لاچاری اور گھٹن کا شکار ہے۔ اسے اپنی محرومی کا احساس بھی بلاشبہ بہت ہے۔ اس اعتبار سے خودکشی کا ارتکاب عورتوں میں مردوں کی نسبت زیادہ ہونا چاہئے۔ لیکن مختلف ممالک سے دستیاب ہونے والے اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں میں خودکشی کی واردات مردوں کی نسبت بہت کم ہے۔

غالباً اس کی وجہ ان میں مصائب وآلام جھیلنے کی وہ غیر معمولی استعداد ہے جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے نیز کثرت آلام نے اسے خوگر آلام بھی بنادیا ہے درد کا حد سے گزرنا اس کے لئے دوا بن چکا ہے۔

اس کے علاوہ رنج والم سے انحراف کی وہ فطری راہیں بھی ہیں جو فطرت نے ان کے لئے ارزاں کی ہیں اشک فشانی، شکوہ شکایت سیار گوئی اور بعض حالات میں، ہسٹریائی ردعمل ہے وہ ذہن کے تکدر کی تلافی کر لیتی ہیں اور اس انتہائی نقطے تک بہت کم پہنچتی ہیں جہاں انسان مجبور ہو کر زندگی کا خاتمہ کر لینے کو ہی اپنے مصائب کا واحد اور آخری حل تصور کرنے لگتا ہے۔

تاہم ان کا اقدام خودکشی ارتکاب خودکشی پر بہت کم منتج ہوتا ہے ان کی یہ آرزوئے خودفنائی بالعموم تشنہ تکمیل رہتی ہے لاشعوری طور پر وہ ایسے طریقے اختیار کرتی ہیں جن میں مرنے کا کم اور زندہ بچ نکلنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے مرغوب طریقہ ہائے خودکشی دو ہیں زہر نوشی اور غرقابی۔ زیادہ تر غرقابی جہاں باریابی کے امکانات زیادہ ہوں۔

ہسٹریائی ردعمل کی طرح اقدام خودکشی بھی مرد کی بے اعتنائی یا ظلم وجبر کے خلاف حد سے بڑھا ہوا طریق احتجاج یا توجہ طلبی کا ایک ذریعہ ہے۔ جس کا مقصد بسا اوقات اپنا چراغ حیات گل کرنا نہیں مطالبات منوانے کے لئے دھمکی یا ڈراوا دینا ہے مادام بوائر کے لفظوں میں یہ محض ایک ناٹک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

(بحوالہ: عورت کی نفسیات۔ ایم اے ملک)

مشاہدات

بابا جی

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور میرے گرد و پیش میں اندھیرا دبے پاؤں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میری نظریں سامنے رکھے ہوئے ایک کاغذ پر جمی ہوئی تھیں جس پر ایک لڑکی کے ہاتھ کی لکیروں کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ مجھے یکا یک اندھیرے کا احساس ہو گیا۔ کیونکہ ان لکیروں کے نقوش رفتہ رفتہ مدہم پڑتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے ملازم کو آواز دی اور اس سے کہا کہ ٹیبل لیمپ کمرے سے نکال کر باہر صحن میں لگا دے اور اندر میز پر رکھا ہوا محدب شیشہ اٹھا لائے تاکہ لکیریں صاف اور بڑی بڑی دکھائی دیں۔ ان لکیروں کا بغور مطالعہ کرتے وقت میرے ذہن میں شاہ صاحب کی بیان کردہ داستان گھوم رہی تھی۔ اس انتہائی اور پراسرار داستان کو سننے کے بعد سب سے پہلا خیال جو میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ لڑکی یقیناً پاگل ہے۔ لفظ ''پاگل'' ابھی ذہن کی لوح پر ابھر رہا تھا کہ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر ایک شوخ نسوانی قہقہے کی آواز سنائی دی اور اس سے بیشتر کہ میرے منہ سے کچھ نکلتا۔ اس نسوانی آواز نے نہایت طنزیہ انداز میں کہا:

''نجومی صاحب، لڑکی پاگل نہیں۔ آپ کا قیاس بالکل اور قطعاً غلط ہے۔''

یہ الفاظ معمولی نہ تھے۔ ایک وزنی ہتھوڑا تھا جو میرے ذہن کے اوپر یک لخت پوری قوت سے برس گیا۔ میں نے بدحواس ہو کر پیچھے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک حسین و جمیل نوجوان لڑکی سرتاپا سفید لباس پہنے نہایت وقار اور تمکنت سے کھڑی مسکرا رہی ہے اس کی آنکھوں پر نہایت قیمتی سیاہ چشمہ چڑھا ہوا تھا اور اس چشمے نے لڑکی کی شخصیت اور چہرے کا وقار اور شان بڑھانے میں بڑی مدد کی تھی۔ میرا ذہن اس لڑکی کو اس پراسرار انداز میں وہاں کھڑے دیکھ کر ماؤف ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لڑکی کون ہے اور ایک دم کہاں سے آ گئی ہے۔ پھر اسے میرے دل کی بات کیسے معلوم ہو گئی۔ یقین کیجئے ذہن کی اتنی صحیح اور بروقت ریڈنگ بے مثال اور حیرت انگیز تھی۔

ابھی میں اس الجھن سے دوچار تھا کہ شاہ صاحب جو اوپر میرے کمرے میں کسی کام سے گئے تھے باہر نکل آئے اور لڑکی کو دیکھتے ہی چہرہ متغیر ہو گیا اور وہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ لڑکی نے شاہ صاحب کو مخاطب کر کے نہایت بے تکلفی سے کہا:

''السلام علیکم شاہ صاحب، کہیے مزاج کیسے ہیں؟ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ آپ تشریف لائے ہیں۔ اس لیے آپ سے ملاقات کرنے کو جی چاہا۔ خیریت تو ہے؟''

میں حیران و سراسیمہ کبھی نوجوان لڑکی کی جانب دیکھتا اور کبھی شاہ صاحب کی طرف۔ شاہ صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔ انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

پھر وہ سنبھل کر چند قدم آگے بڑھے اور میرے پاس پہنچ گئے اور آہستہ سے پنجابی زبان میں کہا:

''باباجی آگئے ہیں......''

ایک لمحے کے لیے خوف کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی اور میں سمجھ گیا کہ یہ ''باباجی'' کون ہیں جو آ گئے ہیں۔ کیونکہ تھوڑی دیر پیشتر شاہ صاحب نے مجھے داستان سنائی تھی وہ انہی پراسرار ''باباجی'' کے بارے میں تھی جو شاہ صاحب کی بیٹی کے جسم میں حلول کر گئے تھے۔

شاہ صاحب سے میرا تعارف ان کے ایک مرید کی معرفت ہوا۔ یہ مرید میری رہائش گاہ کے زیریں حصے میں مقیم تھا۔ شاہ صاحب کی شخصیت بھی عجیب وغریب تھی۔ پچاس پچپن کا سن، چہرہ سرخ وسفید، براق داڑھی، گفتگو نہایت سلجھی ہوئی، بامعنی اور پراز معلومات، مزاج سادہ نہایت خاکساری فرونی کے پیکر تھے۔ میں نے اس سے پیشتر بے شمار پیروں کو دیکھا تھا اور پیروں کے بارے میں جو نفرت انگیز احساسات میرے دل میں تھے وہی احساسات میں نے ان شاہ صاحب کے بارے میں قائم کر لیے لیکن جب ان کو دیکھا اور ان سے بات کی تو مجھے یہ منفی خیال دل سے نکالنا پڑا۔ پیری مریدی کے کاروبار سے شاہ صاحب سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ شہر میں ان کی آمد بقول ان کی ایک شدید پریشانی کے باعث تھی۔ میرا ہمسایہ ان کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ کوئی متبادل انتظام نہ ہونے کے باعث انہیں مجبوراً اس کے ہاں ٹھہرنا پڑا۔

اپنی پریشانیوں کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ وہ کسی قابل ڈاکٹر کی تلاش میں ہیں جس سے وہ اپنی جواں سال بیٹی کے بارے میں مشورہ کر سکیں۔ جو کسی پراسرار عارضے میں مبتلا ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ لڑکی کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ ہے، وہ بالکل ان پڑھ ہے۔ اس کی زبان میں لکنت ہے۔ لیکن کچھ دن ادھر کی بات ہے کہ اس پر اچانک دورہ پڑا اور کچھ عرصہ بے ہوش رہنے کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اس سے بیسیوں کرشموں کا ظہور ہونے لگا۔ مثلاً وہ اردو تعلیم سے بے بہرہ ہے حتی کہ پنجابی زبان بھی وہ اچھی طرح نہیں بول سکتی۔ لیکن اس پراسرار حالت میں اس کی گفتگو کی فصاحت وبلاغت دیکھ کر بڑے بڑے اہل زبان دنگ رہ جاتے ہیں۔ لڑکی نے پردے کو خیرباد کہہ دیا ہے اور مردوں کی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے لگی ہے۔ وہ ہر موضوع پر عالمانہ بحث کرتی ہے اور ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اس کا لب ولہجہ بھی مردانہ ہو گیا۔ وہ اپنا نام بھی مردانہ بتاتی ہے۔

چند روز اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ اپنی سابقہ حالت میں لوٹ آئی۔ لیکن اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ گزشتہ دنوں میں کتنی بدل چکی تھی، اس دن کے بعد سے لڑکی پر وقتاً فوقتاً دورے پڑنے لگے جن لوگوں نے اسے اس کیفیت میں دیکھا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ سب کسی نیک روح یا جن کا اثر ہے جو لڑکی کے جسم پر مسلط ہے لوگ اسے ولی اللہ سمجھتے اور ''باباجی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ شاہ صاحب نے میرے بارے میں سن لیا تھا کہ مجھے فن دست شناسی سے دلچسپی ہے اور لوگوں کے ہاتھ دیکھا کرتا ہوں۔ اس لئے وہ شام سے کچھ پہلے اپنی

صاحبزادی کو میرے پاس ہاتھ دکھانے لائے تھے۔ لڑکی دیہاتی وضع کا سفید برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کے نقوش اتار لیے کیونکہ خیال تھا کہ انکا تفصیلی جائزہ لے کر ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گا پرنٹس لینے کے دوران میری جو گفتگو اس لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس سے شاہ صاحب کے بیان کی تصدیق ہوگئی تھی کہ لڑکی نہایت معمولی سوجھ بوجھ کی مالک ہے اور ہکلا کر بولتی ہے۔ جب لڑکی نیچے چلی گئی اور شاہ صاحب بھی کسی کام سے اوپر چلے گئے تو میں نے ان نقوش کا مطالعہ شروع کیا اور ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وہی لڑکی نئے لباس اور نئی وضع قطع کے ساتھ ''باباجی'' کے روپ میں میرے سامنے آن دھمکی اور جب شاہ صاحب نے اسے دیکھا تو چپکے سے کہا کہ ''باباجی آگئے ہیں'' اس سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہی صورتحال درپیش ہے جس کے بارے میں وہ مجھے بتا چکے تھے۔

''باباجی'' نے شاہ صاحب کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن لئے تھے۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا:
''آپ ٹھیک کہتے ہیں شاہ جی...... میں آگیا ہوں'' یہ کہہ کر باباجی نے میری جانب دیکھا اور نہایت سنجیدہ لہجے میں فرمایا:

کہیۓ نجومی صاحب۔ لڑکی کے ہاتھ کی لکیریں آپ نے ملاحظہ فرمائیں؟''

''جی ہاں!'' میں نے جواب دیا۔ ''ابھی ابھی ایک محترمہ برقع اوڑھے میرے پاس آئی تھیں اور مجھے اپنے ہاتھوں کے نقش دے گئی ہیں کیا وہ خاتون آپ ہی ہیں؟

''باباجی'' کے لبوں پر ایک خندۂ استہزائیہ نمودار ہوا اور انہوں نے فرمایا۔ ''اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید گفتگو کروں یہ بات واضح کر دینا بہتر ہے کہ آپ کسی ''جنس لطیف'' سے مخاطب نہیں ہیں بلاشبہ جو کچھ آپ کی ظاہری آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ ایک لڑکی ہی ہے لیکن یہ محض نظر کا دھوکہ ہے آپ اس ''شئے لطیف'' کو اپنی ان بشری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکیں گے جو اس لڑکی کے جسم میں موجود ہے...... میرا نام ''جرار حیدر'' ہے اور میں قوم جنات میں سے ہوں اور اس لڑکی کے جسم پر قابض ہوں۔ کیا آپ کو اس بارے میں کچھ شک ہے؟''

''باباجی'' نے یہ جملے جس ڈرامائی انداز میں کہے، اس سے میرا دل لرز گیا۔ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ ہمارے قریب ہی کھڑا ہوا ملازم، جو ''باباجی'' کی باتیں سن رہا تھا۔ جنات کا لفظ سنتے ہی ایسا حواس باختہ ہوا کہ الٹے قدموں بھاگ گیا۔

ادھر میری کیفیت یہ تھی کہ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پسینے کے قطرے میری پیشانی پر نمودار ہو چکے تھے۔ جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا تھا۔ میں نے منہ ہی منہ میں قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کر دیا ''باباجی'' چند ثانئے تک میری جانب دیکھتے رہے۔ شاید وہ میری حالت کا اندازہ کر رہے تھے۔ یکایک انہوں نے فرمایا:
''آپ کچھ تلاوت کر رہے ہیں؟''

یہ سن کر میں دنگ رہ گیا اور واقعی مجھے یقین ہوگیا کہ اس لڑکی کے جسم پر کوئی مافوق الفطرت قوت قابض ہے۔

ورنہ دل کی بات اس طرح بوجھ لینا انسان کا کام نہ تھا...... میں نے اعتراف کیا کہ" باباجی! تلاوت کر رہا ہوں۔"

یہ سن کر باباجی ہنسے اور کہا:"نجومی صاحب آپ کو شاید علم نہیں کہ سورۃ الناس دافع شر ہے اور میں ان جنات میں سے نہیں ہوں جو شریر ہوتے ہیں۔ میں اصحاب خیر میں سے ہوں اور بحمد للہ مسلمان ہوں۔ پس آپ مجھ سے خائف نہ ہوں۔"

میرے ذہن کا یہ دوسری بار حیرت انگیز اور درست مطالعہ مجھے یقین دلانے میں مزید موثر ثابت ہوا کہ میں واقعی سورۃ الناس کی تلاوت کر رہا تھا۔ تاہم" باباجی" کیا الفاظ سن کر میری جان میں جان آئی اور اب میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جرات مندانہ طرز عمل اختیار کیا جائے اور مزید افہام وتفہیم کی غرض سے کچھ سوالات کئے جائیں۔

میں نے کہا:"اگر آپ اصحاب خیر میں سے ہیں اور مسلمان بھی، تو آپ اس بے قصور اور معصوم لڑکی پر کیوں مسلط ہیں؟"اس میں ہماری خواہش اور رضا کو دخل نہیں ہم کسی اور کے تابع ہیں" جواب ملا۔

"وہ کون ہے جس کی اطاعت آپ کر رہے ہیں؟ میرا اگلا سوال تھا۔

"یہ ایک کائناتی راز ہے اور اس رب قدیر کے علم میں ہے جس نے مجھے اور تمہیں بنایا۔" باباجی نے نہایت عالمانہ مگر مبہم جواب دیا۔ چند لمحے تک ہم خاموش رہے، پھر باباجی نے کہا:"یہ تو بتایئے کہ اس بارے میں آپ کا دست شناسی کا فن کیا کہتا ہے؟"

میں ابھی لڑکی کے ہاتھ کی لکیروں کا مطالعہ کر رہا ہوں تفصیلی مطالعے کے بعد کچھ عرض کر سکوں گا۔"میں نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے...... لیکن مجھے بتایئے کہ آپ کا یہ علم کہاں تک سچا ہے؟

"جناب! اس علم کا انحصار بہت کچھ دست شناس کی اپنی قابلیت، فہم وفراست اور مسلسل ریاض پر ہے۔ ویسے ہاتھ ایک ذریعہ ہے انسان کے فطری رجحانات، خواہشات اور آرزوؤں کے مطالعے اور ان کے امکانی نتائج کا۔"

"کیا آپ کو اس سے پہلے بھی کسی ایسی ہی لڑکی کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔" باباجی نے پوچھا۔

جی نہیں، میرے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ ہے۔"میں نے جواب دیا۔

لیکن آپ کے نزدیک تو یہ سب کچھ دیوانگی...... ایک پاگل پن تھا۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے اس لڑکی کو پاگل ہی سمجھا۔ سچ ہے کہ خاکی انسان ہر اس شے میں شک وشبہ کرتا ہے جس شے کا اسے عینی مشاہدہ نہ ہو......" پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔

"لیکن ایک مسلمان کے نزدیک قرآن مجید سے بالاتر کون سی شہادت ہو سکتی ہے جو وہ جنات کے بارے میں بیان کرتا ہے۔"

اس کے بعد ''باباجی'' یا جرار حیدر جن نے نہایت شرح وبساط کے ساتھ جنات کی تخلیق و پیدائش اوران کی اصلیت وماہیت کے بارے میں تقریر فرمائی۔ گفتگو کی روانی کا یہ عالم تھا کہ فصاحت وبلاغت بلائیں لے رہی تھی۔ اتنی صاف، شستہ اور پاکیزہ اردو بولی جارہی تھی کہ میں عش عش کر اٹھا تقریر کے دوران جابجا قرآنی آیات واحادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے اور عربی وفارسی شعراء کے اشعار نگینے کی مانند جڑتے چلے جارہے تھے...... ایک لڑکی کی زبان سے اردو زبان کے بارے میں یہ پراز معلومات اور فصیح وبلیغ تقریر سن کر شک وشبہ کی وہ معمولی سی رمق جو میرے دل میں تھی۔ مطلق باقی نہ رہی۔ اب ادب واحترام سے سر جھکائے میں باباجی کی باتیں سن رہا تھا اور شاہ جی بھی دست بستہ نظریں جھکائے کھڑے تھے۔

گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ شومئ قسمت مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی۔ یوں بات یہ ہوئی کہ جب میں ''باباجی'' سے محو تکلم تھا۔ تو حقیقت خواہ کچھ بھی تھی۔ میرے سامنے بہرحال ایک حسین نسوانی چہرہ تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بہ تقاضائے بشری کبھی کبھی میری نگاہیں بہک کر اس کے حسن وشباب کا جائزہ لینے لگتی تھیں۔ یکایک ''باباجی'' نے مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

''نگاہوں کو پہلے صاف کیجئے اور پھر ان کی طرف دیکھئے۔ اچھا ہم جاتے ہیں۔ پھر ملاقات ہوگی۔''

''باباجی'' کے اس اعلان کے ساتھ ہی لڑکی چاروں شانے چت فرش پر گر پڑی اور لوٹ پوٹ ہوگئی۔ اور شاہ صاحب حواس باختہ ہو کر پانی کا گلاس لینے دوڑے کچھ دیر بعد لڑکی ہوش میں آ گئی اور شاہ صاحب اسے سہارا دے کر مکان کی نچلی منزل میں لے گئے۔ جہاں اس کے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔

یہ پراسرار تماشہ جب ختم ہوا، تو رات بھیگ چکی تھی، غالباً ایک بجے کا عمل تھا۔ میری حالت یہ تھی کہ بھوک و پیاس سب اڑ گئی تھی۔ میرا ملازم خوف زدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ چولہے پر ہنڈیا پکتی ہوئی چھوڑ گیا اور سالن سب جل کر سیاہ ہو گیا۔ میں جب اپنے بستر پر لیٹا، تو نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ بار بار اس لڑکی کی تصویر میرے سامنے آجاتی اور کانوں میں جرار حیدر جن کی باتیں گونجنے لگتیں بلاشبہ میں نے اس قسم کے واقعات پہلے بھی دیکھے اور سنے تھے۔ لیکن ایسے عالم فاضل اور مسلمان جن سے کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ پھر شاہ صاحب کی بیان کردہ داستان کے الفاظ میرے ذہن میں تازہ ہونے لگے اور میں ان واقعات کا عقلی تجزیہ کرنے لگا۔

انہی خیالات کے گرداب میں غوطے کھاتے کھاتے میں نہ جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ ابھی مجھے سوئے ہوئے بمشکل دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ ہر شے کانپ رہی ہے...... میں نے اپنے آپ کو زمین پر پڑے پایا اور چارپائی میرے اوپر سوار تھی۔ یہ حادثہ اتنا فوری اور اچانک پیش آیا کہ میرا ذہن مفلوج ہو گیا۔ چاروں طرف مہیب سناٹا طاری تھا۔ لیمپ میں پہلے ہی بجھا کر سویا تھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا ہی اندھیرا...... میرا اندازہ تھا کہ رات کے تین بج رہے ہیں یکایک گلی میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور میں یک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔ مجھے فوراً ''باباجی'' کا خیال آیا۔ جنہوں نے میری

چارپائی الٹ دی تھی۔ بے شک یہ کام جنوں کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال آتے ہی دہشت سے میرے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی۔ میں نے پوری قوت سے چارپائی کو پرے پھینکا اور بے تحاشا دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ اور سیدھا اپنے دوست عرفان چغتائی کے گھر پہنچ گیا اور دروازے پر دستک دی، رات کے اس غیر متوقع لمحات میں جب میرے دوست نے مجھے دروازے پر کھڑے پایا تو حیرت کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور جلدی سے پانی کا ایک گلاس لے آئے۔ پانی پی کر میرے اوسان کچھ بحال ہوئے تو وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

ان سے میں نے جب اس واقعے کا تفصیلاً ذکر کیا تو وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ اور ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتے رہے جیسے میں باختہ ہوں یا شب فرامنی کا مریض ہوں۔ انہوں نے میری کہانی ختم ہونے کے بعد میرے شانے پکڑ کر جھنجوڑا اور کہنے لگے:

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرے خیال میں تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ یہ اس کا اثر ہے۔ بہر حال یہیں آرام کرو صبح تمہارا قصہ اطمینان سے سنیں گے۔''

صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ وہ تو مجھے آرام کرنے کی تلقین کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے لیکن میرا یہ حال کہ اب تک ''باباجی'' کی ہیبت طاری تھی۔ خدا جانے وہ مجھ سے کیوں ناراض ہو گئے اور میری چارپائی الٹ دی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں بھی تشریف لے آئیں۔ یہ خیال میرے لیے بھی سوہان روح تھا۔ جوں توں کر کے رات کا پچھلا پہر ختم ہوا اور صبح صادق کے وقت آنکھ تھوڑی دیر کے لیے جھپکی ہی تھی کہ میرے دوست نے آ کر بیدار کر دیا۔

ناشتے کے بعد انہیں دوبارہ ساری داستان سنائی وہ نہایت متعجب اور حیرت میں تھے۔ بعد ازاں میرے گھر تک گئے۔ دستک دی تو شاہ صاحب ہی دروازہ کھولنے آئے۔ مجھے اتنی سویرے گلی میں پا کر حیرت سے پوچھنے لگے: ''آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟''

میں نے چارپائی الٹنے کا واقعہ بیان کیا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے ''ایسا حادثہ میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ شاید ''باباجی'' ناراض ہو گئے ہیں۔''

میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ''باباجی'' رات کو آئے تھے۔ تو شاہ صاحب نے بتایا کہ انہیں اس بات کا کچھ علم نہیں۔ باباجی کے آنے جانے کا کوئی وقت متعین نہیں۔''

میں نے شاہ صاحب سے کہا: ''جب بھی باباجی تشریف لائیں تو مجھے فوراً بتا دیجئے۔ کیونکہ میرے دوست ان سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ شاہ صاحب نے وعدہ کر لیا۔ میں نے نہا دھو کر کپڑے پہنے اور دفتر چلا گیا۔ لیکن وہاں بھی کام میں جی نہ لگا۔ بار بار باباجی کا خیال مجھے پریشان کرتا رہا۔ سہ پہر کو گھر پہنچا تو گھر اچھی خاصی زیارت گاہ بن چکا تھا اور مرد عورتوں کا ہجوم مکان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکی پر جن سوار ہونے کی خبر جنگل

میں آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی ہے۔ اور اب مشتاقان دید کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ میری غیر موجودگی میں بابا جرار حیدر لڑکی میں تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے اور حاجت مندوں کو دم کیے ہوئے بتاشے ریوڑیاں بانٹ کر گئے تھے۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ انہوں نے ''باباجی'' سے میری خواہش کا ذکر کیا تھا لیکن انہوں نے یہ جواب دیا ''نجومی صاحب کا ایمان کمزور ہے اور وہ اپنے دوستوں میں میری غیبت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔''

یہ بات سن کر میں پھر دانتوں میں انگلی داب کر رہ گیا۔ ''باباجی'' کی یہ بات حرف بحرف درست تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ رات کے تحیر خیز واقعات کے باوجود دن بھر مجھ پر تشکک کے اور گمان کے دورے پڑتے رہے تھے۔ اس خدشے کا اظہار میں نے اپنے دوست سے بھی کیا تھا کہ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔ عقلی طور پر جب میں اس واقعے کا تجزیہ کرتا تو مجھے ذہنی آسودگی نہ ملتی اور بار بار ایک کانٹا سا دل میں کھٹکتا۔ میرے دوست احباب بھی یہی کہتے کہ باباجی کے پس پردہ کوئی راز ہے؟ کیا تھا؟ اس کی نشاندہی یا کوئی تسلی بخش واضح توجیہہ کرنے سے وہ یکسر قاصر اور عاجز تھے۔ میرے لیے حقیقت حال کو تمام جزئیات کے ساتھ معلوم کرنا اور اس راز کا پس منظر سمجھنا ضروری تھا۔ تاہم ایسا کرنے کے لیے موثر و مناسب بلکہ بے ضرر طریقہ اس وقت تک مجھے نہیں سوجھا تھا یقین و گمان اور شک کی اس زبردست کش مکش میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ ذہنی و فکری یکسوئی کی جگہ اندوہ و پریشانی نے لے لی تھی۔

ایک روز عرفان صاحب، جن کے ہاں میں نے رات کو گھر سے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ تشریف فرما تھے اور ہم دونوں ''باباجی'' کے مسئلے میں سر جوڑے غور کر رہے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دفعتاً انہوں نے مجھ سے پوچھا:

''کیا تم نے لڑکی کے ہاتھ کی لکیروں کے مطالعے سے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں؟''

ان کا یہ سوال سن کر میں یک لخت چونک پڑا اور ذہن کے آگے سے گویا ایک پردہ سا اٹھ گیا اور مجھے کچھ کچھ روشنی دکھائی دی۔ واقعہ یہ تھا کہ میں اس حادثے میں پڑ کر ایسا بدحواس ہوا کہ پامسٹری و امسٹری سب کچھ بھول گیا تھا۔ ایک مرتبہ خیال بھی ہوا کہ ان لکیروں کو دیکھوں مگر پھر یہ سوچا کہ جن کی موجودگی میں جو نہ جانے کس عمر کا ہے۔ میرے اس دست شناسی کی کیا حقیقت ہے۔ اور ویسے بھی مجھ پر اس کا کافی دبدبہ بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اپنے دوست کے سامنے اقرار کیا کہ لڑکی کے ہاتھوں کے نقوش میں ابھی تک اچھی طرح دیکھ نہیں پایا۔ یہ سن کر میرے دوست کہنے لگے:

''تم عجیب آدمی ہو۔ تم نے اپنا اصل کام ترک کر دیا ہے اور لایعنی باتوں کے چکر میں پھنس گئے۔ بندۂ خدا ابھی میرے سامنے ان نقوش کا معائنہ کرو اور دیکھو کہ وہ کیا بتاتے ہیں۔''

ان کے اصرار پر میں بادل نخواستہ اٹھا اور میز کی دراز میں سے شاہ صاحب کی لڑکی کے ہاتھوں کے پرنٹس نکال لایا اور نہایت ہی توجہ اور غور سے انہیں دیکھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہاتھوں کی ان لکیروں میں

آہستہ آہستہ جان پڑ رہی ہے، وہ مجھ سے مخاطب ہیں، ان لکیروں نے مجھ سے جو کچھ کہا وہ میرے لیے مزید حیرت کا باعث تھا۔ لکیریں اس طرح کہتی تھیں:

''لڑکی شادی شدہ ہے، اس کے بطن سے اولاد ہوئی ہے، مطلقہ ہے، بیرون ملک جا چکی ہے، غیر معمولی ذہانت وفطانت کی مالک ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ پراسرار علوم، حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، فطرتاً عیش پرست اور ڈرامائی صفت رکھتی ہے۔ اسے کچھ خطرے درپیش ہیں، کسی قتل وتل کا معاملہ...... کوئی قانونی الجھن...... گرفتاری وغیرہ۔''

میں نے یہ باتیں جب اپنے دوست کو بتائیں تو فرط مسرت سے وہ اچھل پڑے۔ وہ نہ صرف فن دست شناسی کے مجھ سے بھی کہیں زیادہ معترف تھے بلکہ پامسٹری کے خود بھی رسیا تھے۔ انہوں نے ان نقوش کا مطالعہ کیا تو میرے اخذ کیے ہوئے نتائج کی تائید کی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس ریڈنگ کی تصدیق کیے کی جائے۔ دوست مصر ہوئے کہ براہ راست شاہ صاحب سے بات کیسے کی جائے۔ لیکن میں بضد تھا کہ لڑکی ہی سے علیحدگی میں بات ہو گی تو زیادہ مناسب ہے۔ بہرحال ہمارے پیش نظر دو خدشے قوی تھے۔ پہلا خدشہ غیر معمولی اخف سے تھا جس کی وجہ سے شاید کسی ایک بات کی بھی تصدیق ناممکن ہوتی۔ دوسرا خدشہ غلط ریڈنگ سے تھا جو باباجی یا جرار حیدر جن کے انتقام کی صورت میں مجھ پر نمودار ہوتا۔ ظاہر ہے جب جن انتقام لیتے ہیں تو جان بچنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ بہرحال جان پر کھیل کر میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا اور طے ہوا کہ لڑکی سے علیحدگی مین بات کی جائے۔ چنانچہ میں موقع کی تلاش میں رہا۔ آخر ایک روز خوش قسمتی سے یہ موقع مل ہی گیا۔ شاہ صاحب ایک ضروری کام سے اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ لڑکی وہ اپنے ایک مرید کے گھر یعنی میری رہائش گاہ کے ایک الگ کمرے میں چھوڑ گئے تھے۔ میں نے جرات کی اور لڑکی کے ہاتھ کی لکیروں والا کاغذ اٹھایا۔ اور اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک پلنگ پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر چونکی اور میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی نظروں میں ابھرتے ہوئے خوف کی واضح علامات دیکھ لیں۔

''معاف کیجئے۔ میں آپ کا ہاتھ ایک بار پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے اسے کاغذ دکھایا تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ یہ نقوش آپ کے ہاتھ ہی کے ہیں اور اس کی اجازت کے بغیر ہی میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ باری باری دیکھے۔ اس کے ہاتھ کی ایک ایک علامت اور ایک ایک لکیر کاغذ پر ابھرے ہوئے نقوش اور لکیروں سے ملتی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اپنے لہجے میں ڈرامائی انداز پیدا کرتے ہوئے کہا:

''کاش میں یہ ہاتھ اسی دن دیکھ لیتا...... بات کتنی واضح اور صاف تھی اور لکیریں کس قدر سچی ہیں...... محترمہ! آپ ایک زبردست خطرے میں ہیں۔''

میں نے صرف اتنا کہا اور کمرے سے باہر آ گیا اور ایک دوسرے کمرے میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے

کے کواڑ میں نے بند کر دیئے تھے۔لیکن چٹخنی نہیں لگائی۔میرے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں اپنی اس حرکت کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔میں نے چند ہی منٹ بعد کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سنی۔پھر دروازے پر دستک ہوئی میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔اور ذرا سخت لہجے میں کہا:

''اندر آجایئے!''

دروازہ کھلا،لڑکی اندر داخل ہوئی،خاموش اداس اور اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔اور خوبصورت چہرہ کسی انجانے خوف سے زرد پڑ چکا تھا۔دبے پاؤں چلتی ہوئی وہ میرے بالکل قریب آن کر کھڑی ہوگئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی:''میرے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''وہی جو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔''میں نے بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم...... میں......''اس نے ہکلا کر کچھ کہنا چاہا۔اس کی آواز کانپ رہی تھی۔میرے لیے بس اتنا اشارہ کافی تھا۔اب سارا خوف میرے دل سے نکل چکا تھا اور پورا معاملہ روز روشن کی طرح میرے سامنے ظاہر تھا۔میں نے ترکش کا آخری تیر چلایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''محترمہ مجھے اس بات سے کوئی دل چسپی نہیں کہ ماضی میں تم نے کیا کیا ہے۔میری نگاہ تمہارے مستقبل پر ہے۔''

وہ بغیر اجازت سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور یکا یک ''بابا جی'' کی آواز میں بولنے لگی۔اس کا لہجہ نہایت صاف اور شستہ تھا۔اور زبان کی لکنت دور ہو چکی تھی۔اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا:''آپ مجھے کچھ بھی بتانا یا مجھ سے پوچھنا چاہتے ہیں؟''میں نے جواب دیا کہ''میں بتانا بھی چاہتا ہوں اور پوچھنا بھی چاہتا ہوں......بشرطیکہ تم دیانت اور جرات کا ثبوت دیتے ہوئے بلا کم و کاست سب حقیقت بیان کر دو۔''

اس نے وعدہ کیا،تو میں نے اس کے ہاتھ کی لکیروں سے جو نتائج اخذ کیے تھے وہ تفصیل سے بیان کیے۔وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری جانب دیکھتی رہی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدن میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی جب میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ قتل کے جرم کا ارتکاب کر چکی؟ تو اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید ہو گیا اور ہونٹ خشک ہو گئے اور اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔اس نے میری بیان کردہ باتوں کا اقرار کیا اور بولی:

''آپ نے جو کچھ میرے بارے میں بتایا ہے اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔''

اس نے بعد ازاں رو رو کر اپنی زندگی کے حالات تفصیل سے بیان کیے جن کا خلاصہ یہ ہے:

وہ دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئی۔اس کی عمر اس وقت چھبیس ستائیس برس ہے۔والدین بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے اور اس کی پرورش انہی شاہ صاحب نے کی جو رشتے میں اس کے چچا لگتے ہیں اور اب اسے اپنی بیٹی کہتے ہیں۔اس کی تعلیم میٹرک تک ہے۔سولہ سترہ برس کی عمر میں اسے ایک نوجوان ڈاکٹر سے محبت ہوگئی اور اس نے ڈاکٹر صاحب سے شاہ صاحب کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ڈاکٹر کی پہلی بیوی موجود تھی۔

جو ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ڈاکٹر کی شہہ پر اس نے ڈاکٹر کی بیوی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور بعد میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مشرق وسطیٰ چلی گئی۔ جہاں ان کا قیام چار پانچ برس رہا۔ وطن واپس آئے تو اس کے تعلقات ڈاکٹر سے بھی کشیدہ ہو گئے اور اس نے ڈاکٹر سے طلاق لے لی بعد ازاں اس نے دو برس تک ایک پرائیویٹ تعلیمی ادارے میں لائبریرین کی حیثیت سے کام کیا۔ جہاں اسے علمی، ادبی اور مذہبی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ اور اس طرح اس کا علم وفضل بڑھتا گیا۔ حافظہ خداداد تھا، جو کتاب پڑھتی، اس کے مطالب ازبر ہو جاتے، اسے جنوں بھوتوں کی کہانیوں اور مسمریزم کے کمالات سے بڑی دل چسپی تھی۔ اتفاق سے تعلیمی ادارے کا مالک اس کو بری نیت سے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے چچا شاہ صاحب کو ڈھونڈ نکالا ان دنوں میں وہ تارک الوطن ہو کر ایک گاؤں میں نہایت عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سوچتے سوچتے انہوں نے لوگوں کو بے وقوف بنا کر روپیہ پیدا کرنے کا ڈھونگ رچا لیا "باباجی" کا پلاٹ شاہ صاحب کے اختراع ہے اور انہوں نے لڑکی کو اس کی خوب مشق کروائی۔ دراصل شاہ صاحب پہلے ہی سے تعویذ گنڈے کا معمولی کاروبار کرتے تھے۔ اب انہیں ایک ساتھی مل گیا جو ان کی دکان داری کو اپنے علم اور جرات سے اوج کمال پر پہنچا سکتا تھا۔ اول اول "باباجی" کے کردار کی ریہرسل سادہ لوح جاہل دیہاتی عوام کے سامنے ہوئی جو حسب معمول بہت جلد مرعوب ہو گئے اور نذرانوں کے ڈھیر شاہ صاحب کے قدموں میں لگنے لگے۔ دیہاتیوں سے اکتا کر یہ لوگ بڑے بڑے شہروں میں پہنچے اور ہزاروں پڑھے لکھے لوگوں اور ان پڑھ افراد کو یہ ڈرامہ دکھا کر اپنا مرید بنا لینے میں کامیاب ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک کامیاب ترین خاتون تھی۔ فن دست شناسی کے سولہ سالہ تجربے کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ ایسی خوبصورت اور ذہین عورت میرے مشاہدے میں آئی۔ میرے دل میں اس کی کہانی سن لینے کے بعد بھی ایک تقدس اور رعب کی کیفیت طاری رہی اور استعجاب مجھے اس امر پر تھا کہ وہ میرے نہاں خانہ دل کی گہرائیوں میں کیسے اتر گئی اور مائنڈ ریڈنگ (Mind Reading) کا جو حیرت انگیز مظاہرہ اس نے کیا اس کی کم کیا حقیقت تھی؟ میں نے اس سے جب اس کا راز پوچھا ایک پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی اور اس نے کہا:

"میں جب سے اس پیشے میں داخل ہوئی ہوں۔ بلا مبالغہ ہزار ہا ذہن اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو بے وقوف بنا چکی ہوں اور اس معاملے میں میرا تجربہ اور مشق بہت وسیع ہے۔ ایک پڑھے لکھے آدمی کا جناب زدہ خاتون کو پاگل سمجھنا، خوف کی حالت میں قرآنی آیات کا ورد کرنا، عورت کے حسن و جمال سے بہک جانا اور مافوق الفطرت باتوں پر وہم وگمان اور شک میں مبتلا، یہ سب کامن سنس میں آنے والی باتیں تھیں جس کا جائزہ لینا میرے لیے بڑا سہل تھا۔

اس کی ذہانت اور علمی استعداد کی بے پناہ داد دینے کے بعد ایک مخلصانہ مشورہ اسے میں نے یہ دیا کہ وہ اس ناپسندیدہ روش کو ترک کر کے کوئی آبرومندانہ طرز معاش اختیار کرے تو شاید ان خطروں سے محفوظ رہے۔ جس کی

گواہی اس کے ہاتھ کی لکیریں دے رہی تھیں۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ اس دھندے سے تنگ آ چکی ہے لیکن شاہ صاحب کے بس میں ہے۔ جونہی اسے موقع ملا وہ الگ ہو جائے گی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آدھی رات کو میری چارپائی تم نے ہی پلٹی تھی؟ تو وہ ہنسنے لگی اور کہنے لگی:...... ''وہ حرکت شاہ صاحب کی تھی۔''

اس واقعے کو بیتے ایک سال گذر گیا...... اچانک ایک روز اخبار میں ایک خبر پر نظر پڑی۔ واقعات یوں بیان کئے گئے تھے کہ فلاں مقام پر مقامی پولیس نے ایک شاہ صاحب اور ان کی صاحبزادی کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ صاحبزادی نے اپنے اوپر ایک فرضی جن سوار کر رکھا تھا جس کے ذریعے اس نے ایک مالدار مرید سے بہت بڑی رقم اور زیورات ہتھیا لیے اور بعد ازاں افشائے راز کے ڈر سے اپنے خاص دو تین مریدوں کی معرفت اسے ٹھکانے لگا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی شاہ صاحب اور ان کی صاحبزادی ''بابا جی'' ہیں۔ اس کے بعد ان مجرموں پر کیا بیتی؟ مجھے اس کا علم نہ ہو سکا کیونکہ تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے پاکستان سے باہر جانا پڑا۔ اب بھی تنہائی کے لمحات میں جب مجھے اس خاتون کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ قدرت نے اس کو حسن و جمال کے علاوہ کتنی فیاضی سے ذہانت اور علم کا خزانہ عطا کیا تھا۔ لیکن مناسب ماحول اور اچھی تربیت نہ ہونے کے باعث وہ غلط راستے پر چل نکلی اور کون کہہ سکتا ہے کہ اب بھی ہمارے معاشرے میں ایسی کتنی ہی عورتیں اور شاہ صاحبان موجود ہیں جو شب و روز ایسے ہی کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں۔

بحوالہ: ہاتھ کی زبان

ایم اے ملک

عورت اور عامل تعویز

بزرگی کا جال

انہی بزعم خود ''غیب دان'' حضرات کے اہم وعظیم فرد کے متعلق تقریباً انہی کے مسلک اور علاقہ والے ستر سالہ واقف بزرگ نے ان کی اپنی بزرگی اور مذکورہ غیب دانی وغیب بیانی کے دو تین واقعات بتائے۔ راوی نہایت ثقہ عالم دین ہیں۔ اول ایک متمول خاندان کی عورت جو صحیح کردار کی نہ تھی ان کے پاس آئی اور ایسے تعویذ کی طلب ہوئی جس سے اس کا خاوند مر جائے۔ ظاہر ہے سوائے کھلانے پلانے کے یہ مقصد کسی اور طریقے سے حل نہ ہو سکتا تھا اور اس خوراکی عمل کو بھی تقدیسی شکل دیکر اور متبرک بنا کر ہی کثیر معاوضہ وصول کیا جا سکتا تھا۔ اس زمانہ میں پین سیاہی کا رواج نہ تھا۔ دوات میں تھوڑا سا کپڑے کا ٹکڑا سیاہی اور پانی ملا کر لوہے کی نب یا سرکنڈے یا و اسیطنی قلم سے لکھائی کی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت نے علیحدہ دوات بنا کر اس میں سیاہی کے ساتھ تھوڑا سا زہر (سنکھیا) بھی ملا دیا۔ اور اسے چند تعویذ اس سے لکھ کر دے دیئے کہ نہار منہ کسی چیز دودھ، شربت وغیرہ میں گھول کر روزانہ ایک تعویذ پلا دیا کریں۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا، مگر سنکھیا کی اتنی قلیل سی مقدار سے اس کے شوہر نے مرنا تو کیا تھا البتہ اس کے پیٹ میں شدید درد ہو گیا۔ امیر آدمی تھا، شہر میں ڈاکٹر نے چیک کیا اور کہا جو چیز تم نے کھائی ہے اس میں زہر ڈالا گیا ہے۔ خاوند پہلے ہی کچھ نالاں تھا، تھانہ میں اطلاع کر دی، عورت اور عامل صاحب دونوں پر پولیس کا نزلہ گرا اور خاصی رقم دے کر گلو خلاصی کرائی۔

دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔ کئی دیہاتی ان پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہماری چوری ہو گئی ہے۔ چور بتا دیجئے! پیر صاحب جن کا نقصان ہوا تھا ان میں سے ایک دو کو اندر لے گئے اور پوچھا کس پر یا کن پر شک ہے؟ انہوں نے بتا دیا۔ پھر پوچھا زیادہ شک کس پر ہے؟ انہوں نے اس کا نام بتا دیا۔ پھر کہا سب مشکوک لوگوں کو بلا لو۔ دوسرے دن سب لوگ آ گئے۔ اور ان سب کے نام لکھ لیے اور مٹی کی کوری ٹھیکریاں بھی اتنی تعداد میں بنا لیں جتنے وہ اشخاص تھے۔ پھر ان کو باہر قطار میں بٹھا دیا اور اندر جا کر سب ٹھیکریوں کے باہر کی طرف ہر آدمی کا نام علیحدہ علیحدہ ایک ایک ٹھیکری پر لکھ دیا اور جس پر زیادہ شبہ تھا۔ اس کی ٹھیکری کا اندر (کبڑی طرف) پارہ اچھی طرح مل دیا اور جب دھوپ تیز ہو گئی تو ان سب ٹھیکریوں کو قطار میں دھوپ میں رکھ دیا اور فرمایا دیکھنا ابھی تھوڑی دیر بعد میرے جنات چور کی ٹھیکری قطار میں سے دور پھینک دیں گے۔ جب پارہ والی ٹھیکری کو دھوپ کا سینک لگتا تو وہ اچھل کر دور جا گرتی اور پھر عامل صاحب اس پر لکھا ہوا نام دکھاتے، اس طرح ''چور صاحب'' پکڑے

جاتے۔

ایک مریضہ کو جسے اصل مرض تو مراق کا لاحق تھا مگر وہ اپنی تکالیف کا باعث جنات، کبھی جادو، تعویذ وغیرہ کو سمجھتی تھی، بندہ کے ایک برادر حکیم صاحب نے غالباً اپنی جان چھڑانے کو بندہ کے پاس بھیج دیا۔ بندہ بھی ایسے مریضوں سے ذرا گھبراتا ہے۔ تھوڑی سی تسلی کی بات کر کے تعویذ دے دیا۔ ایک دو ماہ بعد پھر آئی کہ فائدہ ہوا تھا مگر وہ تعویذ اڑ گیا۔ اب نیا دے دو۔ معمولی سی تردید وتشفی کی کوشش کے بعد پھر تعویذ دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر آ گئی، کہ مرکھایا سوتک (موت اور ولادت کے موقع) میں چلی گئی تھی۔ تو تعویذ بے اثر ہو گیا۔ کہا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام لکھا ہوا ہو تو اس پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علہ وآلہ وسلم نے وہاں جانے سے روکا ہے مگر وہ نہ مانی، جان چھڑانے کے لیے نیا تعویذ دیدیا۔ پھر آئی اور کہنے لگی، سب سے پہلے والا تعویذ بہت مفید ہے۔ بندہ نے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ مریض ڈاکٹر تو کہتا ہے کہ میں یہ دوائی نہ لوں گا بلکہ اپنی مرضی کی وہ پہلے والی دوا استعمال کروں گا۔ خیر آٹھ دس بار اس طرح ہوا بالآخر بندہ نے تنگ آ کر اسے خلاف معمول جواب دے دیا کہ میرے پاس وہم کا کوئی تعویذ نہیں۔ اس پر وہ طوعاً کرہاً چلی گئی۔ تین چار ماہ بعد پھر آئی اور کہنے لگی جو آپ کی مرضی تعویذ دے دو۔ خلاف معمول میں نے اس سے یہ خیال کر کے کہ اتنے دن یہ بیچاری ٹک کر تو نہ بیٹھی ہوگی، پوچھا کہ اس عرصہ میں کوئی تعویذ لیا تو کہاں سے؟ تو اس نے انہی عاملین کا نام لیا کہ وہاں بڑی دیر سے میری باری آئی اور اوپر بالا خانہ میں لیجا کر حساب کتاب کر کے بتایا کہ کسی نے تعویذ ڈالے ہیں اور علاج کے طور پر تعویذ دے دیا کہ ایسے وقت جب کوئی دیکھتا نہ ہو اور ایسی جگہ جہاں کسی کا پاؤں پڑا ہو، اس جگہ بیٹھ کر اس تعویذ پر پیشاب کرنا۔ (اب ظاہر ہے کہ ایسا وقت رات ہی کو ہو سکتا ہے) تو میں رات کو اکیلی باہر جنگل میں گئی اور ایک جھاڑی میں گھسی اور وہاں پر عمل پورا کیا۔ ذرا تصور فرمایئے! رات کو جنگل میں اکیلی عورت کا جانا اور جھاڑی میں گھسنا کتنا خوفناک عمل ہے غالباً عامل صاحب نے اس لیے بتایا کہ یہ اس پر عمل تو کر نہیں سکے گی۔ لہٰذا الزام ہم پر نہیں بلکہ اپنی قسمت پر ہی دھر لے گی۔ بندہ نے پوچھا پھر کوئی افاقہ ہوا؟ کہا نہیں۔ پوچھا پھر دوبارہ گئیں؟ کہا ہاں! پھر کیا ہوا؟ کہا دوبارہ حساب کتاب کرنے کے بعد فرمانے لگے تعویذ نہیں باہر کی کسر (یعنی جنات) ہیں! پھر نیا تعویذ دیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

آئندہ کے صفحات میں عبدالرشید صاحب کی ٹانگ درد، (عرق النساء، لنگڑی کے درد) کے سلسلہ میں ایک عامل کا ذکر ہے جو فاسفورس سے آگ لگا کر جنات کی کارستانی بتاتا اور صوفی محمد حسین کے ذکر میں ایک عامل، صابن سے کاغذ پر تحریر کی خوفناک شکل بناتا جو بالکل نظر نہ آتی تھی۔ پھر مریضہ کے بدن پر کاغذ پھیرتا اور کہتا کہ یہ کاغذ خود بتائے گا کہ اصل میں تکلیف کا سبب کیا ہے؟ پھر پانی کے پیالہ میں وہ کاغذ ڈبوتا اور وہ خوفناک شکل پوری طرح نمودار ہو جاتی اور اس طرح وہ حضرت عامل صاحب سادہ لوح لوگوں کے ایمان اور مال پر ڈاکہ ڈالتے۔

طلائی آویزہ

مضافاتی بستی سے ایک معمر عورت ہمارے ہاں دودھ دینے آتی تھی۔ اہلیہ نے راقم سے کہا کہ یہ بڑی پریشان ہے۔ پتہ کیا تو بتایا کہ میری ایک شریک رشتہ دار عورت کا طلائی آویزہ گم ہو گیا تھا۔ وہ دیہاتی عورت حاجت اور پٹھے وغیرہ لینے کے لیے باہر کھیتوں میں جاتی ہے اور بہت سے دوسرے گھروں میں بھی، اور ہم نے سب جگہ بہت تلاش کیا مگر نہ ملا پھر وہ کسی کے مشورے سے ایک میاں جی کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ میں ''حاضرات'' کا عمل کروں گا۔ کوئی نابالغ لڑکا لے آؤ! وہ ہمارے ہی ایک عزیز لڑکے کو لے آئے اس نے اس کے انگوٹھے پر سیاہی لگائی اور کچھ پڑھتے ہوئے دم کرنا شروع کیا! ساتھ پوچھتے جاتے کہ جھاڑو دینے والے آ گئے؟ بچہ کہتا ہاں۔ پھر پوچھا دری بچھانے والے آ گئے؟ کہا ہاں، پھر پوچھا تخت رکھ دیا گیا؟ کہا ہاں۔ آخر میں پوچھا کیا جان کا بادشاہ آ گیا؟ کہا ہاں۔ پھر کہا اسے کہہ کہ چور حاضر کرے! پھر اچانک بچہ کہنے لگا یہ تو میری چچی...... ہے۔ (یعنی میرا نام لے دیا) تب فوراً اس کے خاوند نے جو عامل کے پاس آ کر یہ عمل کروا رہا تھا بچے کو بازو سے پکڑا اٹھایا اور کہا چل۔ لڑکے سے ابھی ''اثر'' دور نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا وہ کانپنے لگا۔ اس پر عامل نے کہا ذرا صبر کر ''اثر'' دور ہونے دو۔ پھر وہ گھر آئے اور مجھ سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا کہ تو ہی چور ہے۔ ہمارا آویزہ دے۔ ادھر میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں۔ لہٰذا میں نے قسمیں کھائیں مگر انہوں نے یقین نہیں کیا اور وہ تھانے جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اب میں کیا کروں؟ بندہ نے کہا اگر واقعی تھانہ جائیں گے تو وہاں پولیس کا خصوصی چھتر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر دے گا۔ اور عامل صاحب کی کرامات کا پول بھی کھل جائے گا۔ (کہ عامل صاحب تھانہ والوں کی چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے کیسوں میں کیوں حضرات کے ذریعے رہنمائی نہیں کرتے) اور اگر محض دھمکی ہے تو آپ لوگ یوں کرو کہ عامل صاحب کے پاس دوبارہ آدمیوں کو بھیج اور کہہ کہ جناب، آپ کا شکریہ! چور تو بتا دیا مگر اب دوبارہ پھر اسی حاضرات کے ذریعہ ہمیں یہ بتا دیں کہ چوری کا مال کہاں موجود ہے۔ تاکہ ہم اسے اپنے قبضہ میں لے لیں۔ وہ بولی، ہم لوگ ان کے پاس گئے تھے تو عامل صاحب فرمانے لگے کہ ''جاؤ بھاگ جاؤ میرا دماغ نہ کھاؤ''

تحقیق:۔

فہم سلیم اگر موجود ہو تو اس مکر شیطانی کی ساری حقیقت بحمد اللہ فوری طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ چوری کا مال تو نہ ملا البتہ کئی گھروں میں فتنہ فساد ضرور شروع ہو گیا اور اس سارے قضیے اور تگ و دو میں یہی کچھ حاصل ہوا یعنی مالی نقصان، ایمانی نقصان اور ذہنی پریشانی (جانی نقصان)۔ کاہن، المنجد (اردو) میں اسرار الٰہی اور غیبی باتوں اور خبریں بتانے والا لکھا ہے۔ اور یہ حاضرات کا عمل یا تو تلبیس ابلیس یا نفسیاتی عمل کی وجہ سے ہوتا ہے جس کا صداقت اور حقائق سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ دنیوی لحاظ سے دیکھیں تو ایک ہی کیس کے متعلق ایسے عاملین

علیحدہ علیحدہ مختلف وجوہات واسباب بیان کریں گے کوئی کسی کو چور بنائے گا اور کوئی کسی اور کو۔ اور اگر کوئی مریض آ جائے تو کوئی عامل اسے تعویذ ڈالے جانے، کوئی سحر جادو، کوئی دیگر آسیب کی کارستانی بتائے گا۔ عقلمند لوگوں کے لیے تو یہی دلیل ایسے لوگوں کے پھندوں سے بچانے کے لیے کافی ہوتی ہے خاص طور پر مریضوں کے لیے کہ انہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ان کے سامنے جو کیس ہے اس کے تین مرحلے ہیں۔ تشخیص، تجویز اور شفاء! ظاہر ہے کہ جب پہلی چیز (تشخیص) ہی غلط ہے تو تجویز بھی لازماً غلط ہی ہوگی۔ اور شفاء تو ان کے ہاتھ میں کسی درجہ میں بھی نہیں کیونکہ نیک نیتی کے ساتھ اگر معالج اگلا کام بھی اصول کے مطابق اور صحیح کرے تو شاید اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد اس کے ساتھ شامل حال ہو مگر یہاں تو نیک نیتی کا شائبہ تک نہیں ہوتا کہ لوگوں کو بیوقوف بنانا اور ان کا مالی و جانی ناجائز استحصال کرنا ہی مقصد ہوتا ہے۔ رہا تیسرا مرحلہ استحصال ایمانی تو وہ خود ہی نتیجتاً وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ خواہ اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ دینی نقطہ نظر سے تو اس پر جتنی شدید وعید آئی ہے وہ آپ حدیث مبارک کے فقد کفر کے الفاظ سے پھر متحضر فرمالیں۔ نیز ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ غیب سے تعلق رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ "زمین اور آسمان کی پوشیدہ چیزوں (غیب) کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (اس میں ماضی حال اور مستقبل سب آ گئے) اور جب غیر اللہ کو کسی چیز کا علم ہی نہیں تو اس میں تصرف کا کیا سوال؟ اور اس سے کسی کام بنوانے یا بگاڑنے کی امید و درخواست کی کیا تک؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عامل جائے وقوعہ کے جنات سے اپنے جنات کے ذریعے اصل مجرمین کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ تو آیئے ہم اس بارے میں بھی اللہ کریم سے رہنمائی لیتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے جنات سے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے سلسلہ میں کہ ابھی تعمیر نامکمل تھی کہ حضرت کی وفات کا بھی وقت آ گیا تو آپؑ نے تسلسل و تکمیل کار کے لیے یہ ترکیب کی کہ ایک عصاء چوبی کا سہارا لیا اور حضرت عزرائیلؑ نے آپؑ کی روح قبض کر لی۔ ایک سال تک آپ فوت شدہ حالت میں نگرانی میں موجود رہے۔ حتی کہ مسجد اقصیٰ کی تکمیل ہوگئی اور ادھر مشیت الٰہی سے دیمک نے عین اسی وقت پورا عصا کھا کر کھوکھلا کر دیا۔ اور وہ عصا آپ کے بوجھ سے ٹوٹ گیا اور آپؑ گر پڑے) مادلھم علی موتہ الا دابۃ الارض تاکل منساتہ فلما خدنبینت الجن ان لوعا لو یعلمون الخیب ما لبثو فی العذاب المھین (سورہ سبا 34) جنات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا تب پتہ چلا جب دیمک نے ان کا عصا کھالیا اور آپ گر پڑے، تب جنوں نے خوب جان لیا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے (یہ ایک سال کے ذلیل کرنے والے) عذاب میں تو نہ پھنسے رہتے۔ اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب جو کہہ رہی ہے کہ چند گز دور تک بھی انہیں اس غیب کا علم نہ ہو سکا مگر ہم لوگ اسی کتاب پر ایمان لانے والے پکے مسلمان، عملاً یہی ثابت کرتے ہیں کہ جنات تو ہزاروں میل دور کی خبریں بھی ہمیں بتا دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی بہت آگے پہنچ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان سے زیادہ ایسی خرافات پر

ایمان رکھتے ہیں اور ان کو حل المشکلات سمجھتے ہیں۔ بل کانو یعبدون الجن اکثرھم بھم مومنون بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے ہیں ورنہ اکثر تو انہیں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (سورہ سبا 34 آیت 41

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ان غیبی باتیں بتانے والے کاہنوں وغیرہ کے متعلق بیان فرماتی ہیں کہ انھم یسوا بشیء یعنی وہ کچھ بھی نہیں۔ لہذا اب ہمارے لیے صحیح طریقہ کار یہی ہے کہ ہم اپنے مشاہدہ، دانش وروں، احبار و رہبان اور مروجہ توہمات سے جو خلاف شریعت ہوں کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کے ''حنیف و مسلم'' بندے بن جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے سچے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے عقائد و اعمال پر اتنا یقین کرنے والے بن جائیں جس کا اشارہ صریح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں ملتا ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے علی! اگر چاہو تو جنت کا یہیں مشاہدہ کرا دوں؟ تب حضرت علیؓ نے عرض کیا۔ ''حضور! آپ کے (ان غیبی امور کے متعلق بیان شدہ) ارشادات پر الحمدللہ ایسا یقین ہے کہ دیکھ لینے کے بعد اس میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوگا۔'' (او کما قال) اور یہ اس یقین والی زندگی کی برکت تھی کہ ان تھوڑے سے بے مایہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین نے تقریباً تیس سال ہی میں آدھی دنیا پر دین حق کو غالب کر دیا اور ہم آج اس یقین والی زندگی سے محروم اور انہیں اغلال و اصر کے غلام (جنہیں کاٹنے کی ایک صفت اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی) ساری دنیا میں ساٹھ کے قریب مملکتوں اور بے پناہ مادی وسائل سے مالا مال اور ایک ارب سے زائد تعداد میں ہوتے ہوئے بھی مظلوم و مقہور ہیں جن کی فریاد کی بھی کہیں شنوائی نہیں۔

بحوالہ جنات اور جادو حقیقت اور علاج

پاکستانی خواتین کیا پوچھتی ہیں؟

میں نے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون کی طرف دیکھا، شکل وصورت سے وہ اٹھائیس برس سے زیادہ کی نہ تھی۔ پر تکلف اور بڑھیا لباس پہنے ہوئے، بھاری زیورات سے لدی پھندی، آنکھوں میں حسرت ومحرومی اور غم کی پرچھائیاں...... وہ ایک لمبی سی خوبصورت گاڑی میں آئی تھی۔ ڈرائیور باہر انتظار کر رہا تھا۔ استفسار سے پہلے ہی بول اٹھی:

''میری شوہر بہت بڑے زمین دار ہیں۔ چھ سال پہلے میری شادی ہوئی۔ اس وقت میں نے ایم بی بی ایس کا امتحان دیا تھا۔ خیال تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے پریکٹس کروں گی۔ مگر شادی کے بعد موقع نہ مل سکا۔ میرے چار چھوٹے بچے ہیں۔ کوئی مالی مشکل نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ رک گئی اور فرش کی طرف دیکھنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے ہاں خواتین بہت جلد دست شناس سے نہیں کھل سکتیں اور ان میں وہ بے حجابی، بے تکلفی، وہ صاف گوئی نہیں جو مغربی خواتین کا خاصہ ہے۔ اس لیے خاموش رہا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ دل کی بات زبان پر کیسے لائے؟ میں نے اس کی ہمت بڑھائی۔ اچانک ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ کہنے لگے۔

''ملک صاحب! میری زندگی ایک جہنم ہے۔ محسوس ہوتا ہے جیسے سونے کے پنجرے میں قید ہوں۔ پر پھڑ پھڑا سکتی ہوں لیکن پنجرے سے باہر نہیں آسکتی۔ شادی کے دن سے لے کر آج تک اپنے شوہر کی زبان سے ہمدردی، پیار اور محبت کا ایک لفظ نہیں سنا۔ اسے سیر وتفریح، شکار، شراب اور دوستوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ مہینوں اس کی صورت نہیں دیکھتی، آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گھر میں جنگلی جانور گھس آیا ہو۔ بات کرنے کی تمیز ہے نہ بولنے کا سلیقہ۔ کھانے کی میز پر ساتھ بیٹھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ یقین جانیئے اس بدتمیزی سے کھاتا ہے کہ ابکائی آنے لگی ہے۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ذرا رک کر اس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور آہستہ سے بولی۔

''گھر میں میری شادی کا مسئلہ ہوا تو تین پیغام آئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب ڈاکٹر تھے اور ہسپتال میں ملازمت کر رہے تھے۔ دوسرے لیکچرار تھے۔ تیسرے میرے شوہر حسن کی تعلیم معمولی تھی۔ مگر بہت سی زمینوں کے مالک ہونے کی وجہ سے دولت میں کھیلتے تھے۔ ایک فرمانبردار اور اطاعت شعار لڑکی کی طرح میں خاموش رہی اور والدین کی پسند کے آگے سر جھکا دیا۔ ایک بھائی نے اس رشتے کی مخالفت کی کیونکہ وہ میرے ہونے والے شوہر کی تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ مگر اماں مصر تھیں۔ یوں میں اس شخص کے ساتھ بیاہ دی گئی جس کے پاس ''سب کچھ'' تھا۔ وہ سب کچھ جو پیسے سے خریدا جا سکتا ہے لیکن محبت کہیں بکتی ہے؟''

میں نے بڑی ہمدردی سے اس کی بات سنی اور مناسب مشورے دیئے۔ اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ متوسط اور بالائی طبقے کے اکثر والدین لڑکیوں کا رشتہ کرتے وقت مالدار گھرانوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہونے والا داماد لڑکی کے ذہنی معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

پاکستان خواتین کا ہاتھ دیکھتے وقت بارہا اس امر کا احساس ہوا کہ ہمارے ہاں خواتین میں نسوانیت، شرم اور حیا کا مادہ مغرب سے کہیں زیادہ ہے۔ عدم تحفظ کا احساس بھی شدت سے ہے۔ چنانچہ بات کرتے وقت اچانک سوچنے لگتی ہیں کہ واقعی سب کچھ کہہ دینا چاہئے؟ دست شناسی انہیں یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے کہ سب باتیں پردۂ راز میں رکھی جائیں گی تو وہ کھل جاتی ہیں اور شروع سے آخر تک سارا حال کہہ دیتی ہیں۔ مغربی خواتین نسبتاً چالاک اور مصلحت اندیش ہیں اور کچھ نہ کچھ چھپا لیتی ہیں۔ مگر ہماری خواتین بہت نیک دل، سادہ لوح اور معصوم واقع ہوئی ہیں۔ کہنے پر آ جائیں تو ایسی ایسی باتیں کہہ جاتی ہیں کہ عام حالات میں ہرگز ان کی زبان پر نہیں آ سکتیں۔

پاکستانی خواتین کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے چند ایسی حقیقتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو دنیا بھر کی خواتین کا خاصہ ہیں اور جن میں ملک و مذہب کی کوئی قید نہیں۔ مثال کے طور پر جذباتیت دنیا بھر کی عورتوں میں قدر مشترک ہے۔ بات کرتے کرتے شدت جذبات سے رو دینا خواتین کی فطرت ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کینیڈا میں خواتین کا ہاتھ دیکھتے وقت بڑی مشکل کا سامنا ہوا...... رونے لگتی ہیں۔ روتی ہوئی خواتین کو رومال پیش کرنا آداب میں شامل ہے مگر میں اپنا رومال کس کس کو پیش کرتا۔ آخر کاغذ کے رومال منگوائے جنہیں "Nepkins" کہتے ہیں اور پاس رکھ لیے جونہی کوئی خاتون آنسو بہانا شروع کرتی، فوراً میز کی دراز سے ایک رومال نکالتا اور اس کی خدمت میں پیش کر دیتا۔

خواتین کی ایک اور بین الاقوامی خصوصیت، پراسرار اور مافوق الفطرت باتوں پر حد سے زیادہ یقین ہے۔ تحیر آمیز گفتگو ان کے ذوق تجسس کو تسکین بخشتی ہے۔ وہ تخیل پرست ہوتی ہیں اور زیادہ تر خواب و خیال کی دنیا میں رہتی ہیں۔ ذہن زندگی کی ٹھوس عملی حقیقتوں کے بجائے سہانی آرزو، خوش کن تمناؤں اور قصے کہانیوں کو قبول کرتا ہے۔ کردار شناسی کی قدر کم کرتی ہیں۔ ان کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ مستقبل کے بارے میں زیادہ سے زیادہ پیش گوئیاں کر سکیں۔

آسانی کی خاطر ہم پاکستانی خواتین کو تین بڑے طبقوں سے تقسیم کریں گے۔ بالائی طبقہ، متوسط طبقہ اور نچلا طبقہ۔ ہر طبقے کے مسائل و مشکلات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس لیے باری باری ان طبقوں کی خواتین کا ذکر کریں گے۔

بالائی طبقے سے تعلق رکھنے والی شہری خواتین تہذیب، ثقافت اور معاشرت کے اعتبار سے مغرب کا ایک مشرقی ایڈیشن ہیں۔ ان میں اور مغربی خواتین میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ یہاں بھی وہی مسائل ہیں جو ہم نے مغربی خواتین کے بارے میں بیان کئے تھے۔ شاندار بنگلوں، زر و جواہر، چمکتی ہوئی کاروں اور مسکراتے چہروں

کے باوجود حقیقی مسرت اور سکون قلبی بہت کم میسر ہے۔ ہاتھ دکھانے اور مشورہ طلب کرنے کے لیے میرے پاس آنے والی خواتین صاحب علم، سلجھی ہوئی، تہذیب یافتہ اور باوقار ہوتی ہیں۔ نفاست طبع، خوش گفتاری اور بے تکلفی ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ بیشتر ملک سے باہر بھی جا چکی ہیں۔ ان سے مل کر اور ان کے ذہنوں میں اتر کر پہلا احساس یہ ہوا کہ ظاہری آسائش، مال و دولت کی فراوانی اور شان و شوکت انسان کو سچی خوشی نہیں بخش سکتی۔ یہ کہنا کہ انسان محض معاشی حیوان ہے، سچ نہیں۔ اس طبقے کی خواتین کا سب سے عام سوال یہ ہے:

''میرا خاوند کام کاج میں اس قدر مصروف رہتا ہے کہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔''

ایک خاتون نے کہا:

''مجھے اپنے شوہر سے صرف ایک شکایت ہے۔ اس کے ذہن پر کاروبار اس قدر سوار رہتا ہے کہ میں جھنجھلا اٹھتی ہوں۔ کئی کئی ماہ گھر سے باہر دورے کرتا رہتا ہے۔ ایک بار میری تنہائی کا خیال رکھتے ہوئے ساتھ لے گیا۔ ہم ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرے۔ صبح سویرے جاتا اور رات گیارہ بارہ بجے واپس آتا۔ میں دن بھر اکیلی اپنے نصیبے پر ماتم کرتی۔''

بالائی طبقے کی عورت تنہائی دور کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقے اختیار کرتی ہے۔ ''سوشل سروس'' سے لیکر کھیل تماشوں تک وقت گزارنے کا ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ملنے جلنے والوں کے متعلق نئے نئے اسکینڈلز دلچسپی سے سنے اور بیان کیے جاتے ہیں۔ باہمی چشمک میں دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ جان کر تعجب ہوا کہ متعدد خواتین ریس کھیلتی ہیں۔ انہوں نے لکی نمبر دریافت کیے۔ زمیندار خواتین کے سوالات سے اندازہ ہوا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ زمین کی فکر لگی رہتی ہے۔ حریف خاندانوں کو گرانے کی تدبیریں بھی دریافت کی جاتی ہیں۔ بعض اعلیٰ افسروں کی بیگمات نے اپنے خاوندوں کی کثرت شراب نوشی کی شکایت بھی کی۔ عام سوالات یہ تھے:

''میں ملک سے باہر کب جاؤں گی؟''

''نئی گاڑی کب ملے گی؟''

''شوہر بلڈ پریشر (یا عارضہ قلب) میں مبتلا ہے۔ وہ کب صحت یاب ہوں گے؟'' (دونوں امراض بالعموم بالائی طبقے کو لاحق ہوتے ہیں۔)

اکثر خواتین یہ سوال کرتی ہیں:

''ہاتھ دیکھ کر بتائیں کہ عنقریب کسی بزرگ انسان کی موت تو واقع نہیں ہوگی؟''

یہ بزرگ سسر ہوتا ہے۔ شروع میں سمجھا شاید یہ اپنے سسر کی صحت کے بارے میں فکرمند ہیں مگر آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ وہ سسر کی موت کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ (بالائی طبقے میں سسر کی موت پر اکثر اوقات زمین جائیداد یا روپیہ پیسہ ملنے کی توقع ہوتی ہے)۔

بعض خواتین یہ سن کر کہ سسر کے مرنے کی فی الحال کوئی امید نہیں، بہت مایوس ہوئیں۔ ایک نے تو صاف صاف کہہ دیا:

''پانچ چھ سال بعد کیا فائدہ؟ اس وقت تو ہم بوڑھے ہو جائیں گے اور ساری آرزوئیں ختم ہو جائیں گی۔''

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ بالائی طبقے کی خواتین زیادہ تر اپنے بارے میں سوالات کرتی ہیں۔ بچوں سے ان کی دلچسپی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ بیٹوں کے بارے میں البتہ یہ سوال بہت عام ہے:

''کیا میرا لڑکا اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جا سکے گا؟''

''کہیں وہ غیر ملکی عورت سے شادی تو نہ کرے گا؟''

اکثر لڑکیاں مغربی لڑکیوں کی طرح کھل کر پوچھتی ہیں:

''آج کل ''بوائے فرینڈ'' سے ناراض ہوں۔ ہماری صلح کب ہوگی؟ کیا وہ بھی مجھے تہہ دل سے چاہتا ہے یا وقت گذارنے کی خاطر باتیں بنا رہا ہے؟''

یہ خواتین اعلیٰ خون اور حسب و نسب کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اکثر نے مجھ سے پوچھا:

''کیا ہمارا بیٹا (بیٹی) اپنے سے کم تر خاندان میں شادی تو نہ کرے گا؟''

بالائی طبقہ کے لوگ بالعموم محبت کی شادی کے مخالف نہیں ہوتے لیکن اگر شادی اپنے سے کم تر خاندان میں ہو تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ذات پات کا خیال کم کیا جاتا ہے۔ دولت مندوں کی اپنی ایک برادری تصور کی جاتی ہے۔ اگر لڑکا یا لڑکی کسی دولت مند گھرانے سے ہے تو ذات کوئی بھی ہو قابل قبول ہے۔ پاکستان کے بالائی طبقے کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کا ذکر بہت ضروری ہے۔ یہ طبقہ دولت کو اپنے تک محدود رکھنے کا شدت سے خواہش مند ہے۔ کسی دولت مند گھرانے میں دولت جائے (یا وہاں سے آجائے) تو کوئی تشویش کی بات نہیں۔ لیکن کسی غریب یا متوسط طبقہ سے بیاہ شادی جیسے قریبی تعلقات محض اس خیال سے استوار نہیں کیے جاتے کہ اس طرح دولت کے غریب گھرانے میں منتقل ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ یہ احساس بڑی شدت سے کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا متوسط طبقہ غریب طبقہ سے قریب نہیں ہوتا۔ بہت مالدار گھرانوں میں بالعموم چچازاد سے شادی Cousin Marrige رائج ہے۔ تاکہ دولت زیادہ نہ بٹنے پائے۔

زمین دار گھرانوں کے مسائل بالائی طبقے سے ذرا مختلف ہیں۔ میرا قیام کئی سال تک جھنگ، لائل پور، اور کیمبل پور میں رہا۔ ان اضلاع کے بڑے بڑے زمینداروں کی بیگمات سے ملنے جلنے کا موقع ملا ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے:

فلاں خاندان سے ہماری پرانی چشمک ہے۔ انہوں نے گذشتہ سال ہمارا ایک آدمی بھی قتل کر دیا تھا۔ ہم ان سے بدلہ لیں یا نہ لیں۔ انتقام کے لیے کون سا دن اور وقت مناسب ہوگا؟''

پیشہ ور دست شناس، عامل اور پیر ایسے موقعوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ اس قسم کی گفتگو کرتے

ہیں:

''جلد ہی اپنے دشمنوں سے بدلہ لیجئے۔ وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی سوچ رہے ہیں۔ آپ کے لیے فلاں فلاں دن اور وقت مناسب رہے گا۔ یہ ہمارا تعویذ لیجئے، آپ کا بال بیکا نہ ہوگا۔''

سادہ لوح خواتین متاثر ہو جاتی ہیں اور مردوں کو بدلہ لینے پر آمادہ کرتی ہیں۔ میں ہمیشہ نرمی، محبت، درگذر اور افہام وتفہیم کی نصیحت کرتا۔ ان کے دلوں میں مزید خوف ڈالنے کی بجائے یقین دلاتا ہوں کہ پرانے جھگڑے ختم ہو گئے ہیں۔ دشمنوں کا دل آپ کی طرف سے صاف ہے۔ آپ بھی اپنا دل صاف کرلیں اور ان سے صلح کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرا بڑا سوال لڑکیوں کی شادی کے بارے میں ہوتا ہے:

''ہم نے بدلے کی شادی کی تھی۔ انہوں نے ہماری بیٹی کو طلاق دے دی ہے۔ ان کی بیٹی ہمارے گھر ٹھیک سے رہتی ہے مگر اسے بھی طلاق دینا چاہتے ہیں۔''

نام نہاد روحانی عامل، دست شناس اور پیر فقیر ایسے موقعوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور ''دشمنوں کے وار'' سے بچنے کے لیے تعویذ گنڈے وغیرہ دے کر منہ مانگی قیمت وصول کرتے ہیں۔

اب ہم متوسط طبقے کی خواتین کا ذکر کریں گے۔

میرے پاس ہاتھ دکھانے والی خواتین کی زیادہ تعداد اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ متوسط طبقے کی چند عمومی خصوصیات یہ ہیں:

یہ عورتیں باسلیقہ، سگھڑ اور وفاشعار ہوتی ہیں۔ شوہر اور بچوں سے محبت رکھتی ہیں۔ ایثار اور قربانی کا مجسمہ ہیں۔ ان کے بیشتر سوالات بچوں کے گرد گھومتے ہیں۔ کیونکہ بچہ آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔ مائیں بچوں کی تعلیم، صحت، کردار، سیرت اور بیاہ شادیوں کے بارے میں ازحد فکر مند نہیں ہوتیں۔ معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کے مستقبل کا دارومدار بچوں کی اعلیٰ تعلیم وتربیت پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقے کی ماں ''آئیڈیل ماں'' تصور کی جاتی ہے۔ یہ طبقہ ہماری اخلاقی قدروں کا محافظ بھی ہے۔ سوالات بالعموم یہ ہوتے ہیں:

''میرے کتنے بچے ہوں گے؟''

''کیا بچے تعلیم حاصل کرسکیں گے؟''

''ان کی شادیاں کہاں ہوں گی؟''

''بڑھاپے میں بچے ہمارا بوجھ اٹھائیں گے یا نہیں؟''

''بچہ اس امتحان میں پاس ہوگا یا نہیں؟''

''کیا کہیں سے اچانک دولت ملنے کی امید ہے؟''

(اچانک دولت سے مراد لاٹری، بانڈ یا ٹکٹ نکلنے کی توقع ہوتی ہے۔ یہ سوال بڑی معصومیت سے کیا جاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ آرزوئیں زیادہ ہیں اور وسائل کم)

''خاوند کی ترقی کب ہوگی؟''

''کاروبار کب سنبھلے گا؟''

''ہمارا ہاتھ کب کشادہ ہوگا؟''

''لڑکی کی شادی کب اور کہاں ہوگی؟ رشتے داروں میں ہوگی یا خاندان سے باہر؟''

''سسرال میں لڑکی کی کیسے نبھے گی؟''

''بچپن میں لڑکی کی منگنی تو کر دی تھی۔ اسے باقی رکھیں یا توڑ دیں۔ لڑکا اچھی عادات کا مالک نہیں؟''

لڑکی کو کالج میں داخل تو کر دیا ہے لیکن ڈرتی ہوں کہ زمانہ بہت خراب ہے۔ کہیں اپنی مرضی سے شادی نہ کرے گی؟''

شوہر کی خواہش ہے کہ لڑکی کی شادی اس کے رشتے داروں میں ہو، میں اپنے عزیزوں میں چاہتی ہوں، شوہر کو کیسے مناؤں؟''

(ملاحظہ ہو کہ لڑکی کی رضا معلوم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)

''لڑکی پڑھ رہی ہے لیکن لڑکے والے جلد شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔ تعلیم مکمل کراؤں یا شادی کراؤں؟''

اس طبقے کو اپنی عزت کا بہت پاس ہے۔ ہر وقت یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں ناک نہ کٹ جائے۔ ذات پات اور قومیت کا تعصب بھی اس طبقے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ بالائی طبقے کی نقالی عام ہے۔ خواتین اپنی بساط سے بڑھ کر خرچ کرنے کی وجہ سے اکثر مقروض رہتی ہیں۔ بالعموم یہ سوال پوچھا جاتا ہے:

''فلاں عزیز بہت مالدار ہے۔ اس کے پاس، بنگلہ، موٹر، روپیہ سبھی کچھ موجود ہے۔ ہم اپنا مکان کب بنوا سکیں گے؟''

متوسط طبقے کی خواتین شادی کے بعد بھی میکے کی وفادار رہتی ہیں۔ انہیں اپنے بھائیوں سے بالخصوص دلچسپی بہت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات بھائیوں کی ملازمت، کاروبار، یا شادی بیاہ کے بارے میں بہت سوالات کیے جاتے ہیں۔ خواتین شروع شروع میں بہت جھجکتی ہیں۔ لیکن کسی نازک پہلو سے چھیڑ دیا جائے تو سادگی، صفائی اور سچائی سے کھل جاتی ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ؎

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے

خاوند کی زیادتی، بچوں کی نافرمانی، ساس کے جھگڑے اور تنگ دستی سب بیان کر دیتی ہیں۔

مذہب اخلاق اور تہذیب کی حفاظت میں متوسط طبقہ ایک نمایاں کردار انجام دیتا ہے۔ اکثر خواتین سوال کرتی ہیں:

''میں اور میرا شوہر حج پر کب جائیں گے؟''

''زیارتوں کے لیے ہمارا قرعہ کب نکلے گا؟''

اس طبقے کے کچھ لوگ نقالی اور سفید پوشی کی دھن میں دولت حاصل کرنے کے ناجائز طریقے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسے گھرانے کی خواتین کو احساس جرم بہت پریشان کرتا ہے۔ وہ پیروں فقیروں سے دم کرواتی پھرتی ہیں۔

ایک بات کا ذکر خاص طور پر کروں گا۔ پچھلے پندرہ بیس برس سے بے شمار خواتین کے ہاتھ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ آج کل مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ اس طبقے میں زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کرنے، راتوں رات امیر بن جانے اور جائز ذرائع سے دولت جمع کرنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ آج سے دس برس پہلے یہ سوال کبھی معمر خواتین کے لبوں پر نہ آیا تھا مگر آج کل خواتین بڑی بے تکلفی سے پوچھتی ہیں:

''بہت سارو پیہ ہاتھ آئے گا یا نہیں؟''

بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کا ذکر چلا ہے تو ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ آج سے دس پندرہ سال پیشتر بن بیاہی لڑکیاں ہاتھ دکھاتے وقت بہت شرماتی تھیں۔ برقعے میں لپٹی لپٹائی اور گٹھڑی بن کر بیٹھی رہتیں۔ مجھے وہ لڑکی اچھی طرح یاد ہے۔ جس نے کواڑوں کے پیچھے سے ہاتھ باہر نکالا تھا اور کہا تھا:

''میرے ہاتھ کو چھوئیے گا مت۔''

شادی کی بات زبان پر لانا بہت معیوب خیال کیا جاتا، خود ذکر چھیڑ دیتا تو لڑکیوں کے چہرے حیا سے سرخ ہو جاتے۔ اکثر ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتیں۔ آج کل معاملہ ذرا مختلف ہے۔ میں ذکر چھیڑوں یا نہ چھیڑوں شادی کی بات فوراً زبان پر آ جاتی ہے۔ کنواری لڑکیاں اکثر محبت، نفرت، پسند، ناپسند کے الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ زیادہ شرمیلی لڑکیاں کچھ اس طرح سوال کرتی ہیں:

''میری ایک سہیلی ایک جگہ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن والدین کو بتانے کی ہمت نہیں پڑتی کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی؟''

میں فوراً پہچان لیتا ہوں ''گفتہ آید حدیث دیگراں'' والا قصہ ہے۔ جمہوریت، تعلیم، نسوانی بیداری اور معاشی انقلاب کی وجہ سے متوسط طبقے میں بے تکلفی، بے باکی اور آزادی پیدا ہو گئی ہے تاہم ابھی تک بہت سے گھرانے تہذیبی کشمکش سے دوچار ہیں۔ لڑکیاں بالعموم سوال کرتی ہیں:

''شادی کے معاملے میں والدین کی خواہش کے سامنے سر جھکا دوں یا اپنی مرضی کو ترجیح دوں؟''

''امی میری شادی اپنے عزیزوں میں کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے وہ جگہ پسند نہیں۔ اگر میں کسی دن انہیں ساتھ لے کر آؤں تو کیا آپ انہیں میری مرضی سے آگاہ کر سکیں گے؟''

معلوم ہوتا ہے۔ اکثر والدین اپنی لڑکیوں کی مرضی دریافت کرنا پسند نہیں کرتے۔ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں سے شادی بیاہ کے معاملے میں بہت کم مشورہ لیا جاتا ہے۔ والدین کا لڑکیوں میں ایک حجاب سا ہے۔

متوسط طبقہ ذات، برادری اور خاندان کے تعصب میں مبتلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی شادی کے

مسائل عام ہیں۔ اپنے خاندان میں اچھے رشتے نہیں ملتے خاندان سے باہر رشتہ کرنا منظور نہیں۔ بارہا ایسی معمر لڑکیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کی شادی محض اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ خاندان میں کوئی رشتہ موجود نہ تھا۔

بگڑے ہوئے آوارہ اور نافرمان لڑکوں کا بھی مسئلہ اہم ہے۔ سیدھی سادھی مائیں بڑی معصومیت سے سوال کرتی ہیں:

''بیٹے کو پڑھایا، لکھایا، لیکن بری صحبت میں پڑ گیا اور خراب ہو گیا۔ کیا آپ کے پاس کوئی تعویذ ہے، جس سے وہ راہ راست پر آ جائے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ دس گیارہ بجے اٹھ کر کپڑے بدلتا ہے اور گھر سے نکل جاتا ہے۔ رات بارہ ایک بجے سے پہلے واپس نہیں آتا۔ ہزار بار سمجھایا، منتیں کیں، واسطے دیئے، خفگی کا اظہار کیا مگر اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ خدا کے لیے بتایئے اسے کب ہدایت آئے گی؟''

شادی بیاہ کے علاوہ جہیز بری اور قرض کے مسائل بھی زیادہ تر اسی طبقے کو درپیش ہیں۔ وجہ وہی ہے لوگ اپنی استطاعت سے بڑھ کر ہر کام کرتے ہیں اور رسوم و رواج کے بہت پابند ہیں۔ روز افزوں گرانی کے ساتھ ساتھ سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کی وجہ سے یہ طبقہ پس کر رہ گیا ہے۔

چلتے چلتے اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ تعلیم کے اعتبار سے متوسط طبقہ مجموعی طور پر بالائی طبقے کے نچلے طبقے سے بازی لے گیا ہے۔

نچلے طبقے میں شہری اور دیہاتی دونوں قسم کی خواتین شامل ہیں۔ دست شناسوں، پیروں، فقیروں اور عاملوں کو زیادہ تر اسی طبقے سے روٹی ملتی ہے۔ مافوق الفطرت باتوں پر ان کا اعتقاد ایمان کی حد تک مضبوط اور غیر متزلزل ہوتا ہے۔ معاشی پستی کی وجہ سے مسائل بھی زیادہ ہیں۔ تقدیر پرستی، سادگی، معصومیت، لاعلمی اور ناسمجھی اس طبقے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ خواتین، پامسٹ کی بہت کم تردید کرتی ہیں۔ خیالات کی پرواز بہت محدود ہوتی ہے۔ ایک واقعے سے آپ بخوبی میرا مطلب سمجھ جائیں گے۔

دو ایک سال پہلے کا ذکر ہے۔ مجھے اندرون شہر جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک خاتون بولیں:

''بیٹا، تم نے جو کہا تھا وہی ہوا۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

تم نے کہا تھا نا کہ سولہ برس کی عمر میں میری بیٹی کی شادی ہو جائے گی اور وہ مجھ سے دور چلی جائے گی۔''

''اچھا پھر کیا ہوا؟''

''میری بیٹی واقعی مجھ سے بہت دور چلی گئی اتنی دور کہ جانے کب دیکھنا نصیب ہو۔''

میں سمجھا شادی کے بعد داماد اس کی بیٹی کو ملک سے کہیں باہر لے گیا ہوگا۔ افریقہ، بحرین، کویت، انگلستان یا پھر کہیں اور تبھی وہ خاتون اتنی حسرت سے اس کا ذکر کر رہی ہے۔

''کہاں ہے وہ آجکل؟'' میں نے دریافت کیا۔

''چیچہ وطنی''

ماں کا جواب اتنا معصوم تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ لاہور سے چیچہ وطنی کا سفر تین ساڑھے تین گھنٹے سے زیادہ کا نہیں۔

یہ بیان کرنا بہت مشکل ہے کہ دست شناس درست بتاتا ہے یا خواتین اس کی کہی ہوئی بات درست ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں مجھے ہاتھ دیکھنے کا شوق نیا نیا پیدا ہوا تھا۔ جموں شہر کی ایک نائن (حمام کی بیوی) میرے پاس آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں مجھے دست شناسی کے بارے میں عملی تجربہ بہت کم تھا۔ میں نے ہاتھ دیکھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میاں سے کچھ ان بَن رہتی ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ تمہاری شوہر سے نہیں بنتی۔ وہ چلی گئی۔ چند دن بعد حجام صاحب میرے پاس تشریف لائے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔

جناب یہ آپ نے میری بیوی سے کیا کہہ دیا۔ لڑائی جھگڑا تو خیر پہلے بھی ہوتا تھا مگر اب وہ کہتی کہ اس کا مجھ سے نباہ نہیں ہو سکا مجھے وہ چھوڑ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے۔۔

اس کی بات سن کر میں پریشان ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ان کے گھر میں لڑائی ہو۔ اتفاقاً وہ جلد ہی مل گئی۔ میں نے دوبارہ اس کا ہاتھ دیکھا اور مصنوعی حیرت سے کہا:

معلوم ہوتا ہے تمہارے شوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں منانے آئے تو مان جانا اور اس کے ساتھ چلی جانا کیونکہ تمہارے مقدر میں یہی ہے اور تمہیں ہر حال میں اسی گھر میں رہنا ہے۔

ادھر حجام کو نصیحت کی کہ جا کر پیار و محبت سے بیوی کو ساتھ لے آئے۔ چند روز بعد وہ مجھ سے ملا اور شکریہ ادا کیا۔ نائن اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ اور اب وہ دونوں صلح صفائی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

اس ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دست شناس گھر میں لڑائی بھی کرا سکتا ہے اور صلح بھی۔ تاہم دست شناسوں، عاملوں، پیروں اور فقیروں کی زیادہ تعداد تخریبی کارروائیاں کرتی ہے کیونکہ انہیں عوام کی بھلائی مقصود نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی مٹھی گرم کرنا چاہتے ہیں۔ فریقین کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کیا اور چلتے بنے۔ بے شمار ہنستے بستے گھروں کو مطلب پرست عاملوں اور دست شناسوں نے تباہ کر دیا ہے۔

نچلے طبقے کا سب سے عام سوال یہ ہے:

''خاوند مجھ پر بہت ظلم کرتا ہے۔ اکثر مارتا پیٹتا ہے۔ باہر سے آتے ہی مجھ پر برسنے لگتا ہے۔ کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ وہ اس ظلم سے باز آ جائے۔''

یا...... ''میرا شوہر ایک دوسری عورت پر مائل ہے۔ کیا آپ کوئی تعویذ دے سکتے ہیں جو اس کا دل'' کالے منہ والی'' سے پھر جائے؟''

لڑکوں اور لڑکیوں کا مسئلہ بھی عام ہے:

''بہن اور بھائی دونوں رشتہ مانگ رہے ہیں۔ کسے'' ہاں'' کہوں؟''

''ہمارے شریکوں نے بیٹی کو گھر سے نکلوادیا ہے۔اب وہ اجڑ کر میرے پاس آبیٹھی ہے۔دوبارہ وہیں بسے گی یا کسی جگہ اور؟''

نچلے طبقے کی خواتین دوسری شادی کے بارے میں کھل کر بات کرتی ہیں۔اس کے برعکس درمیانے طبقے میں وفا کا تصور بہت شدید ہوتا ہے۔خاوند اچھا ہو یا برا ایک مرتبہ شادی ہوگئی تو زندگی بھر نباہ کرنا پڑتا ہے۔دوسری شادی کا خیال تک معیوب سمجھا جاتا ہے۔متوسط طبقے کی لڑکی ذہنی طور پر صرف ایک شادی پسند کرتی ہے۔لیکن نچلے طبقے میں زندگی کی ٹھوس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک مرد سے دوسرے مرد کے پاس جانے میں کوئی شرم و جھجک محسوس نہیں کرتی۔نچلا طبقہ زندگی کے کٹھن حالات سے جلد مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔

''دشمنوں نے ہم پر تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے کروائے ہیں۔آپ کے پاس ان کا توڑ موجود ہے؟''

اس سوال کے جواب میں اکثر عامل، دست شناس اور پیر فقیر فوراً دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی دی ہوئی ''چیز'' دشمنوں کا خانہ خراب کردے گی۔ہاتھ دکھانے والی خواتین اپنا پیٹ کاٹ کر ان مطلب پرستوں کی مٹھی گرم کرتی ہیں۔اور وہ ''چیز'' لے کر رکھ لیتی ہیں۔عام طور پر خود غرض فقیر کچھ اس طرح گفتگو کرتے ہیں:

''عنقریب دشمن تم پر وار کرے گا۔یہ وار مال، مویشی پر ہو سکتا ہے اور انسانی جسم جان پر بھی۔تم فوراً میرے بتائے ہوئے طریقے پر عمل شروع کردو۔دشمن غارت ہوگا اور تمہارا گھر محفوظ ہوگا۔

یہ سن کر بیچاری عورتیں پریشان ہو جاتی ہیں۔اور عامل، پیر فقیر یا دست شناس کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی ہیں۔

تنگ دستی کی وجہ سے اکثر بچے معاش کی تلاش میں دور نکل جاتے ہیں۔مائیں لاپتہ اور گم شدہ بچوں کے متعلق سوالات پوچھتی ہیں:

''ذرا ہاتھ دیکھ کر بتایئے کہ میرا بیٹا کس سمت میں ہے۔زندہ بھی ہے یا نہیں؟''

گم شدہ بچوں کا پتہ بتانے والے جوتی چلا کر لوٹا گھما کر اور جن بلا کر استفسار کرتے ہیں اور غریب ماں کو کچھ اس طرح معلومات بہم پہنچاتے ہیں:

''بی بی تمہارا بیٹا مشرق کی سمت ہے۔زندہ ہے اور عنقریب تم سے ملنے آئے گا۔''

وہ جملہ کسی پڑھی لکھی خاتون سے کہا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ مزید جاننے کی خواہش ظاہر کرے کیونکہ مشرق میں تو بیسیوں شہر ہو سکتے ہیں۔مگر نچلے طبقے میں پیروں، فقیروں، دست شناسوں اور عاملوں پر اعتقاد بہت مضبوط ہوتا ہے۔دوسرا سوال کرنا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔عام سوالات یہ ہیں:

''بیٹے کی خیریت کی چٹھی کب آئے گی؟''

''کسی مقدمے میں پھنسنے کی توقع تو نہیں؟''

''بیٹے کو دھندا کب ملے گا؟''

''بچوں کی ''جان کی خیر'' منانے کی کوئی تدبیر؟''

''کوئی ایسا تعویذ دیجئے جس سے حاکم کا دل موم ہو جائے۔''

''ایسا وظیفہ بتائیے کہ پٹواری کا قلم ہمارے حق میں ہو جائے۔''

''بچے فوج سے کب واپس آئیں گے؟''

''ہمارے شریک ہم پر کب وار کریں گے؟''

''ہر دفعہ میرا بچہ ضائع ہو جاتا ہے۔ ذرا ہاتھ دیکھ کر بتایئے کہ مجھ پر جھاڑ پھونک کس نے کی ہے؟''

''کسی نے میری بیٹی پر جادو کر دیا ہے۔ توڑ بتائیں۔''

دیہاتی علاقوں میں تو ہمات، شہروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ کسی گاؤں میں چلے جائیں۔ پیر فقیر، بزرگ یا درویش کا مزار ضرور ہوگا۔ جہاں جمعرات کو سرسوں کا تیل چڑھایا جاتا ہے۔ مزار نہ ہو تو مسجد ہی سے کام لیتے ہیں۔ گاؤں سے باہر کسی پرانے درخت کی شاخوں پر سرخ رنگ کے کپڑے لٹکائے جاتے ہیں۔ یہ سب ٹونے ٹوٹکے ہیں جو ''پہنچے ہوئے'' پیروں فقیروں اور عاملوں نے (قیمتاً) مرحمت فرمائے ہیں۔ اس طبقے کی بیشتر آرزوئیں اور تمنائیں دنیا میں بند ہیں۔ اولاد نرینہ کی حالت، گم شدہ لڑکے کا پتہ، شریکوں کے وار کا توڑ، حاکم کا دل موم کرنے کے لیے نسخے، سب ان چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں میں بند کر دیا۔ ہینگ، گندم، چنے اور چاولوں کے دانے ،مرچیں یا چاندی کے کاغذ کے پرزے کر کے تعجب دکھائی دیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری خواتین دست شناسوں، پیروں، فقیروں کے پاس کیوں جاتی ہیں۔ ظاہر ہے اُن کے کچھ مسائل ہیں جن کا حل تلاش کرنے کے لیے وہ بے چین تھیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو معاشرتی علم اور نفسیاتی مسائل کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ حل تجویز نہیں کر سکتا۔ دست شناسی بلاشبہ ایک سائنٹیفک فن ہے۔ اس کے لیے ایسے مستند اور تجربہ کار مخلص اصحاب کی ضرورت ہے جو انسانی نفسیات اور علم معاشرت کی مدد سے بے یقینی، عدم اعتماد، شک اور خوف میں مبتلا لوگوں کو مشکل امور کے بارے میں مشورہ دے سکیں۔ فی الحال ہمارے ہاں ایسے ماہرین کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ کسی ایسے ادارے کا سراغ بھی نہیں ملتا جو (یورپ کے اداروں کی طرح) معقول اور مناسب معاوضہ لے کر مشورہ دے سکے۔ تاہم امید کی جاتی ہے کہ صاحب علم لوگ اس طرف توجہ دیں گے۔ جسمانی بیماریوں کے شفا خانوں کی طرح ذہنی پریشانیوں اور الجھنوں کے شکار خواتین و حضرات کے لیے کلینک قائم ہو جائیں گے۔

بحوالہ: ہاتھ کی زبان، ایم۔ اے ملک

مغربی خواتین نے کیا پوچھا

خواتین وحضرات! سٹال نمبر 5 میں ایک پاکستانی پامسٹ سے ملئے اور صرف پانچ ڈالر میں اپنے مستقبل کا حال دریافت کیجئے۔

اناؤنسر کی یہ آواز جب بھی سنائی دیتی، میں ایک انجانے خوف سے کانپ اٹھتا۔ سٹال نمبر 5 بڑا آرام دہ اور خوبصورت تھا۔ چاروں طرف قد آدم شیشے لگے ہوئے تھے۔ باہر پنڈال میں رنگ و بو کا ایک طوفان برپا تھا۔ سب لوگ بھڑکیلے لباس پہنے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ شوخ و شنگ لڑکیاں رنگین تتلیوں کی مانند اڑتی پھر رہی تھیں۔ ماحول کی رنگینی نے بوڑھوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ چنانچہ وہ جا بجا عمر رفتہ کو آواز دیتے نظر آ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ میرے سٹال کے باہر لوگ جمع ہونے لگے۔ یہ اناؤنسر کی دلکش آواز کا اثر تھا یا اتنے بڑے سٹال میں میرے تن تنہا ایک کرسی پر خالی ہاتھ بیٹھنے کا کرشمہ، اس کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دائیں بائیں جتنے اسٹال تھے۔ ان میں طالب علموں کی ٹولیاں مختلف کرتب دکھا رہی تھیں۔ ایک میں ابھی تک بے کار تھا۔ آخر میرے پہلے گاہک نے دروازے میں سے اندر جھانکا۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ بیس بائیس برس کی عمر ہوگی۔ اتنی ہی عمر کا نوجوان ساتھ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے ساتھی کو کہنی ماری اور بولی:

"ذرا اندر چلو ابھی پوچھ لیتے ہیں۔"

یہ 1962ء کا ذکر ہے میں برٹش کولمبیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا کہ جشن بہار شروع ہو گیا۔ بہار کی آمد پر یہ تہوار امریکہ اور یورپ کے بیشتر ممالک میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ہماری یونیورسٹی کے انٹرنیشنل ہاؤس کی تعمیر کے لیے رقم درکار تھی۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ جشن بہار کے سلسلے میں ایک نمائش کا اہتمام کیا جائے۔ شہر کے لوگ نمائش دیکھنے کے لیے ٹکٹ خریدیں گے تو اچھی خاصی رقم جمع ہو جائے گی۔ نمائش کے سبھی پروگرام دلچسپ تھے۔ عجیب وغریب ناچ اور مختلف ممالک کی علاقائی تہذیب کی جھلکیاں، رقص وسرود کی محفلیں، کھیل تماشے وغیرہ۔ ہم سب خوش تھے کہ چلو سیر و تفریح کے مزے لوٹیں گے۔ ایک روز کلاس روم سے باہر نکلا تو یک نوٹس دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ لکھا تھا:

"غیر ملکی طلباء سے گذارش"

ساری عبارت پڑھی تو سوچ میں پڑ گیا۔ یونیورسٹی نے غیر ملکی طلبہ سے درخواست کی تھی کہ اگر ان میں کوئی خاص جوہر یا وہ کسی فن لطیف سے واقف ہوں تو اپنے نام دفتر میں پہنچا دیں۔ اساتذہ کی ایک کمیٹی ان کا انٹرویو لے گی۔ جن طلبہ کے پروگرام واقعی دل چسپ ہوں گے۔ انہیں نمائش میں ایک سٹال دیا جائے گا تا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر سکیں۔ دست شناسی میرا محبوب مشغلہ تھا اور کسر نفسی سے کام نہ لوں تو اس فن کا وسیع مطالعہ بھی کیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے دست شناسی پر میری ایک کتاب بھی پاکستان میں چھپ چکی تھی۔ لیکن مغرب کی ایک

یونیورسٹی میں ایک دست شناس کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دست شناسی ایک سائنٹیفک علم ہے لیکن عموماً لوگ اسے جادوٹونے، ٹونکے اور جھاڑ پھنکار وغیرہ سے الگ نہیں سمجھتے۔ سوچا اتنے ترقی یافتہ ملک کے لوگ مجھ ایسے شخص کا جو بہر حال ایک کم ترقی یافتہ ملک سے آیا ہے مذاق اڑائیں گے۔ یوں بھی دست شناسی کا کاروبار بنانا مجھے پسند نہیں لیکن یونیورسٹی کی اپیل کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہ تھا۔ عمارت کی تعمیر کے لیے رقم درکار تھی اور ہر طالب علم کا فرض تھا کہ اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ کئی دوستوں سے مشورہ کیا، انہوں نے ہمت بندھائی، چند روز گومگو کے عالم میں رہا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ دفتر میں نام ضرور پہنچا دینا چاہئے۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دفتر سے فارم لیا اور پُر کر کے دے دیا۔ اگلے روز نمائش کی منتظمہ کمیٹی نے انٹرویو کے لیے بلایا۔ بہت سے سوالات کیے گئے میں نے مناسب اور موزوں جواب دیئے۔ ایک چھوٹا سا امتحان بھی لیا گیا اور آخر مجھے میرے سٹال کا نمبر پانچ دیا گیا تھا۔

''تشریف رکھیے۔'' میں نے لڑکی اور لڑکے سے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ انتظامیہ کی طرف سے ہدایت تھی کہ کسی گاہک کو پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ دوں۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ دیکھا اور موٹی موٹی باتیں بتلا دیں۔ لڑکے سے نپٹ کر فارغ ہوا تھا کہ لڑکی نے پوچھا:

''ہم شادی کرنا چاہتے ہیں کیا یہ شادی ہو جائے گی؟''

بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ اشتیاق سے دمک رہا تھا۔ اس کے دلی جذبات کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر دونوں کے ہاتھ دیکھے جہاں تک میرے علم، تجربے اور مشاہدے کا تعلق تھا۔ ان کی شادی ناممکن سی محسوس ہوتی تھی۔ میں جھجک گیا۔ غالباً ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ لیکن ان کے سامنے ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دونوں بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''معاف کیجئے گا، کیا میں آپ سے باری باری گفتگو کر سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

جواب ملا: ''بڑے شوق سے۔''

''میرا مطلب ہے تنہائی میں؟''

''یہاں تنہائی نہیں ہے کیا؟ آپ صاف صاف بتا دیں، ہم برا نہیں . نیں گے۔''

میں نے مناسب الفاظ میں اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔ خیال تھا کہ ان کو رنج ہوگا مگر یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ مسلسل ہنس رہے تھے۔

''بہت خوب، آپ نے درست کہا، آپ تو واقعی بہت اچھے پامسٹ ہیں۔'' نوجوان نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''روزا سنجیدہ تھی میں اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ اصل میں میری نظر اس کے ذاتی سرمائے......''

وہ چلے گئے میں ان کے بارے میں سوچنے لگا۔ شادی بیاہ کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا

جاتا ہے کہ مغرب میں یہ فریضہ انجام دینا بہت آسان ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔اس مضمون میں چونکہ مغربی خواتین کا ذکر ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ پہلے ہم شادی بیاہ کے نظام کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔

لڑکی پندرہ سولہ سال کی ہوتی ہے تو اسے ملاقات کی پیش کش ہونے لگتی ہے۔انہیں مغربی اصطلاح میں ڈیٹس (Dates) کہتے ہیں۔شباب کا آغاز ہوتا ہے۔اس لیے بہت سے لوگ ڈیٹس مانگتے ہیں۔لڑکیاں خوشی سے پھولی نہیں سماتیں۔چاہنے والوں کی تعداد زیادہ ہو تو یہ بات باعث فخر سمجھی جاتی ہے۔والدین بھی خوش ہوتے ہیں کہ ان کی لڑکی مردوں میں مقبول ہو رہی ہے۔مغربی دانش وروں کا خیال ہے کہ ڈیٹس سسٹم لڑکیوں کے لیے اپنا شوہر منتخب کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔اس لیے انہیں زیادہ سے زیادہ نوجوانوں سے ملنا چاہئے تاکہ خوب سے خوب تر کا انتخاب کیا جا سکے۔یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات والدین لڑکیوں کے لیے خود ان کی ملاقاتوں کا بندوبست کرتے ہیں۔میرے قیام کے دوران میں بے شمار ماؤں نے مجھ سے سوال کیا:

''خدا کے لیے ہماری لڑکی کے بارے میں بتائیے۔اسے کب عقل آئے گی؟ ہفتے کے آخری دنوں میں بھی گھر میں گھسی رہتی ہے۔کہیں باہر گھومنے نہیں جاتی۔آج تک اس کے ساتھ کوئی نوجوان نہیں دیکھا گیا۔کم بخت کو اول تو ڈیٹس نہیں ملتیں اور ملتی ہیں تو انکار کر دیتی ہے۔آخر اس طرح گزارہ کیسے ہوگا؟ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ہم کب تک سمجھاتے رہیں گے۔''

کبھی مائیں اپنی لڑکیوں کو نصیحت کرتی ہیں کہ تیزی سے دوست بدلو اور کبھی ایک مرد سے زیادہ دیر وابستگی نہ رکھو تاکہ زیادہ سے زیادہ مردوں کو جانچنے کا موقع مل سکے۔لڑکیاں اس طرح اس ہدایت پر پوری طرح سے عمل کرتی ہیں۔کیونکہ خود انہیں بھی خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی ہے۔جس لڑکی کے پاس ہفتے میں زیادہ ڈیٹس ہوں وہ اپنی فوقیت جتلانے کے لیے اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ کچھ اس طرح گفتگو کرتی ہے:

''اف میرے خدایا اس ہفتے تو اتنی مصروف ہوں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔آج شام مسٹر جون کے ساتھ بازار جانا ہے۔کل دوپہر مسٹر ایڈم نے کھانے پر مدعو کیا ہے۔کل شام مسٹر اسمتھ اور میں سینما دیکھنے جا رہے ہیں۔پرسوں سہ پہر کی چائے مسٹر ایکٹ کے ہاں پینی ہے۔پرسوں شام مسٹر......''

بات کرتے وقت لڑکی کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا ہے۔غرور اور نخوت سے گردن میں ذرا خم آ گیا ہے۔گفتگو کے دوران بار بار سامعین کی طرف دیکھتی اور خوش ہوتی ہے کہ وہ اس سے کتنے مرعوب ہیں۔

مغربی مفکرین کی نظر میں شادی ایک کاروبار ہے۔اس لیے فریقین کو جانچ پرکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے۔لڑکیاں مردوں کے ساتھ دن کے اجالے میں اور رات کی تاریکی میں چائے پیتی، کھانا کھاتی اور سیر و تفریح کرتی ہیں۔گو بنیادی مقصد شریک حیات کی تلاش تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک ڈھونگ ہے۔لڑکیاں خود بھی جلد شادی کرنا نہیں چاہتیں۔ایک آدمی کے ساتھ زندگی بسر کرنا کچھ زیادہ دل

چسپ نہیں لگتا ہے۔ حسن و شباب کی وجہ سے بے شمار مردان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں۔ اس وقت ان لڑکیوں کا ذہنی تجزیہ کیا جائے تو بڑے دل چسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ میرے پاس ہاتھ دکھانے کی غرض سے بے شمار لڑکیاں آتی تھیں۔ اس لیے ان کا جائزہ لینے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی:۔

- زیادہ تعداد ایسی لڑکیوں کی ہے جو جی بھر کے عیش کرنا چاہتی ہیں۔ شادی سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے اور ڈیٹس ملنے کے امکانات نہیں رہتے۔
- بعض لڑکیاں سنجیدگی سے شادی کرنا چاہتی ہیں لیکن سمجھ نہیں آتا کہ شادی کس سے کریں۔ ان کی حالت اس بچے کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے کھلونوں کا ڈھیر لگا ہو اور اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کون سا کھلونا منتخب کرے۔ ایسی بے شمار لڑکیوں سے واسطہ پڑا۔ ایک لڑکی کا ہاتھ دیکھنے کے بعد کریدا۔ وہ بولی:

''مسٹر ایکس کی ناک بہت لمبی ہے۔
مسٹر رینس فورڈ بہت امیر ہیں۔ لیکن بے تحاشہ پیتے ہیں۔
مسٹر ریزر بہت صحت مند ہیں۔ مگر رومان سے آشنا نہیں۔ اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔
مسٹر ہیڈ کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہے۔ فن رقص سے بے گانہ ہیں۔
مسٹر بیگر کا نام بالکل فقیروں جیسا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ
مزید تحقیق کی تو پتہ چلا کہ موصوفہ کی سب سے دوستی ہے۔
پکنک پر جانا ہو تو مسٹر جے ساتھ ہوتے ہیں کیونکہ وہ خوبصورت ہیں اور خوبصورت مرد ساتھ ہو تو دوسری لڑکیاں خوب جلتی ہیں۔
علمی گفتگو کا شوق چرا آئے تو مسٹر ایکس کی لمبی ناک بھی برداشت کر لی جاتی ہے۔ وہ بہت پڑھے لکھے ہیں۔
دعوتوں میں مسٹر رینس فورڈ بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی امارت سے لوگ متاثر ہیں۔ وہ ساتھ ہوں تو بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔
مسٹر ریزر کی صحت قابل رشک ہے۔ بعض اوقات اسکی اوٹ پٹانگ باتیں سننے میں بھی مزہ آتا ہے۔
مسٹر ہیڈ اچھے، بڑے موسیقار ہیں۔ ان سے مل کر لطیف احساسات کو تسکین ملتی ہے۔
مسٹر بیگر کا نام فقیروں جیسا ہے ورنہ وہ سرو قد ہیں۔ اور بڑی لچھے دار گفتگو کرتے ہیں۔
مسٹر ملک! اگر کسی طرح ان سب آدمیوں کو ملا ایک انسان تیار کیا جائے تو میں فوراً اس سے شادی کر

لوں گی۔ مجھے ان صفات سے عشق ہے مگر یہ مختلف لوگوں میں ہیں۔ میں کسی ایسے انسان کی تلاش میں ہوں جس میں یہ سب صفات موجود ہوں۔ ذرا میرا ہاتھ دیکھ کر بتائیے کہ وہ شخص کب اور کہاں ملے گا؟''

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ڈیٹ سسٹم سے اصل مقصد (مغربی دانش وروں کے قول کے مطابق) باہمی افہام وتفہیم ہے لیکن مطلب پرست مرد زبانی افہام وتفہیم سے مطمئن نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیس بائیس برس کی عمر تک پہنچنے والی لڑکیاں محض نام کی کنواری رہ جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ عورت بالخصوص کنواری لڑکیوں کے ساتھ شرم و --- -- -- ...

حیا، عفت وعصمت اور طہارت و پاکیزگی کا تصور پایا جاتا ہے۔ وہ مغرب میں ہرگز موجود نہیں۔ ہر نیا مرد لڑکی کو شادی کا جھانسہ دیتا ہے اور اپنی خواہشات کی تسکین کے بعد چھوڑ دیتا ہے۔ لڑکیاں پھر نئے دھوکے کی تلاش شروع کر دیتی ہیں۔ میرے پاس آنیوالی لڑکیوں میں سے بہت سی ایسی الجھن کا شکار ہیں۔

تہذیب کی ظاہری چمک دمک، مادی خواہشات کی تسکین، دعوتوں، تفریح گاہوں، سینماؤں، کلبوں اور ناچ گھروں کی چھوٹی چھوٹی مصروفیتیں، شباب کے تقاضے اور معاشرے کے رکھ رکھاؤ ان لڑکیوں کو کچھ اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں کہ انہیں وقت گذرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ان کے شب وروز اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یہ خواب اور یہ طلسم جب ٹوٹتا ہے تو عمر تیس اور چالیس کے درمیان ہوتی ہے۔ چاہنے والوں کی صورتیں دکھائی نہیں دیتیں۔ خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ شامیں بے رونق محسوس ہوتی ہیں۔ نام کے ساتھ ابھی تک ''مس'' کا دم چھلا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس وقت انہیں شادی کی سوجھتی ہے۔ بہتیری کوشش کرتی ہیں لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ وہی مرد جو کل تک ان کا دم بھرتے تھے آج نوخیز لڑکیوں کے ساتھ شامیں مناتے ہیں۔ اس لیے سوسائٹی نے انہیں ''شکاری عورتیں'' کا خطاب دیا ہے۔

اوپر میں نے آپ کو مغرب کی گھریلو زندگی کے بارے میں چند موٹی موٹی باتیں بتائی ہیں۔ مقصد محض یہ تھا کہ ایک تصویر آپ کے سامنے آ جائے تو دوسری بہت سی باتوں کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، برٹش کولمبیا یونیورسٹی کے جشن بہار میں، اپنے سٹال پر شادی کے آرزومند ایک بوڑھے کو بھگتا رہا تھا۔ خاصا وقت گذر چکا تھا۔ باہر مجمع بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ زیادہ تعداد نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی تھی۔ تاہم ادھیڑ عمر خواتین اور مرد بھی موجود تھے۔ عموماً لوگ شادی اور محبت کے بارے میں بہت زیادہ استفسار کرتے تھے۔ مجموعی طور پر پہلی نشست میں جو باتیں محسوس کیں وہ یہ تھیں:۔

ا۔ لوگوں کی دلچسپی اپنی ذات تک محدود ہے۔ ہمارے لوگ بچوں، بھائیوں اور دیگر عزیزوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہاں بہت کم لوگوں نے اپنے سوا کسی دوسرے شخص کا ذکر کیا ہوتا ہے۔

ب۔ مرد اور عورتیں سیر و سیاحت، خصوصاً بیرونی ممالک کے سفر کی بہت شوقین ہیں

سنسنی خیز باتیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ عورتیں بالخصوص ہیجان Thrill کی بڑی شائق ہیں۔ اپنے بارے میں کسی انکشاف پر اچھل پڑتی اور کہتی ہیں: ''ہائے یہ آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' یا

ج۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔''

د۔ خواتین بڑی صاف گوئی سے اپنے انتہائی نجی مسائل کا تذکرہ کرتی ہیں جنس سے لے کر جھوٹ، مکر اور فریب کی وارداتوں تک ہر مسئلے پر بے تکلف ان سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

میں تین دن تک روزانہ دو گھنٹے سٹال میں بیٹھتا رہا۔ نمائش ختم ہوئی تو 300 ڈالر کما چکا تھا۔ اس دوران قسم قسم کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بہت سے اشخاص نے اپنے ہاں مدعو بھی کیا۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اعلیٰ کارکردگی کی ایک سنہری سند عطا کی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اعلیٰ طبقے کے قریب جانے اور وہاں کی معاشرت کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ ہوا یوں کہ تیسرے روز میرے گاہکوں میں اخبار کا ایک رپورٹر بھی شامل تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دیکھا اور اپنی سمجھ کے مطابق چند باتیں بتا دیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ صاحب بری طرح مرعوب ہوا اور اگلے روز روزنامہ ''سن وین کور'' میں ایک تصویری فیچر شائع کر دیا۔ عنوان تھا: ''مشرق سے ایک پامسٹ۔'' فیچر میں میری تصویر بھی شامل تھی۔ اب تو دن رات مجھے فون آنے لگے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میرا مقصد ہرگز پیشہ ور پامسٹ بننے کا نہ تھا۔ لیکن سوشل ورک کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ تاکہ مغربی معاشرت کو اچھی طرح سے سمجھ سکوں۔ انہیں دنوں گرین ووڈ کلب کی طرف سے مجھے ایک دعوت نامہ ملا۔ یہ کلب شہر سے باہر ایک خوبصورت اور خوشنما مقام پر واقع ہے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ یہاں ویک اینڈ گذارتے۔ Week End آخری دو دنوں یعنی ہفتہ اور اتوار کو کہتے ہیں۔ دوسرے بہت سے یورپی ممالک کی طرح امریکہ اور کینیڈا میں اتوار کے علاوہ ہفتے کو بھی چھٹی ہوتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ ان دو دنوں میں تفریح کا لطف اٹھاتے ہیں۔ میں ہفتے کی شام کلب میں گذارنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد انتظامیہ کی طرف سے اعزازی رکنیت کی پیش کش کی گئی جو میں نے فوراً قبول کر لی۔ ایک چھوٹا سا کمرہ بھی مل گیا تھا۔ میں بلاناغہ وہاں بیٹھنے لگا۔ بڑی رونق رہتی۔ بیش بہا لباس پہنے ہوئے بیگمات، نوجوان لڑکیاں، بوڑھی عورتیں غرض ہر عمر کی خواتین نظر آتی تھیں۔ کلب کی زندگی بڑی رنگین اور پر کشش تھی۔ شراب، رقص و سرود، بہترین کھانے، گلف، پنگ پانگ، بلیرڈ، تاش، لڑکیاں اور سکینڈل۔ یہاں بے شمار خواتین کے ہاتھ دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے پیشتر کہ میں ان ملاقاتوں سے چند ایک کا حال بیان کروں خواتین کے بارے میں بنیادی معلومات بہم پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔

1۔ گھریلو خواتین "Hous Wives"

یہ عورتیں مجموعی طور پر مشرقی بیویوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ سوائے اس کے کہ سکرٹ پہنتی ہیں اور برتن خود دھونے کے بجائے مشین میں رکھ دیتی ہیں۔ کھانا پکاتے وقت گیلی لکڑیوں سے کشتی نہیں لڑتیں۔ گیس اور بجلی کے چولہے استعمال کرتی ہیں۔

2۔ ملازم پیشہ خواتین "Career Women"

یہ خواتین دفتروں، کارخانوں، دکانوں، تجربہ ہوا، میں جسمانی اور ذہنی ہر قسم کے کام کرتی ہیں۔

3۔ نوخیز لڑکیاں

جنہیں بہت سی ڈیٹس DAtes ملتی ہیں اور جن کی ہر شام مصروف گزرتی ہے۔

4۔ شوہروں کی متلاشی معمر خواتین

جو کسی زمانے میں نوخیز لڑکیاں تھیں۔ مگر شباب ڈھل چکا اور پروانے غائب ہو گئے تو انہوں نے سنجیدگی سے شوہر کی تلاش شروع کر دی۔

5۔ ''رمسیں'' (کنواری عورتیں)

جو کئی شادیاں کر چکی ہیں لیکن ہر شادی کی ناکامی کے بعد دوبارہ مس کہلانے لگتی ہیں۔ ان میں تیس برس سے لے کر ستر، اسی برس کی خواتین شامل ہیں۔

6۔ آفس سیکریٹریز "Office Secretaries"

یہ ملازم پیشہ خواتین کی ایک خاص قسم ہے۔ بالعموم ان کا تعلق مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ مالک کی بیوی ان سے جلتی ہے اور یہ اس سے خار کھاتی ہیں۔ مغرب کے دانش ور بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ ان خاتون سیکریٹریوں کا کیا کریں۔ یہ لوگوں کی خاندانی زندگی کے لیے ایک مستقل مسئلہ بنتی جا رہی ہیں۔

''ذرا میرا ہاتھ دیکھ کر بتائیے کہ میرا شوہر کب جہنم رسید ہوگا؟''

میں نے سوال کرنے والی خاتون کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ ہرگز غصے میں نہ تھی۔ تیس پینتیس برس کی قبول صورت عورت میرے سامنے میز پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ شکل وصورت سے پڑھی لکھی۔ تمام گفتگو بڑی شائستہ اور معقول مگر یہ سوال سن کر میں چکرا گیا۔ آخر اس پر کیا مصیبت آن پڑی کہ اپنے خاوند سے اس قدر بیزار ہے۔ مجھے اس وقت تک شادی بیاہ اور طلاق کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہ تھیں اور میں اپنے بہت سے ہم وطنوں کی طرح یہ سمجھتا تھا کہ مغرب میں شادی کرنا اور طلاق دینا آسان ہوگا۔ لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ شادی ضرور آسان ہے۔ طلاق آسان نہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں کے دو بڑے فرقے ہیں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔ رومن کیتھولک کٹر عیسائی سمجھے جاتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ، مارٹن رتھر کی اصلاح کی

تحریک۔ اصلاح کلیسا کی پیداوار ہیں۔ رومن کیتھولک فرقے میں طلاق دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ عورت طلاق دے سکتی ہے نہ مرد۔ کینیڈا میں ویسے بھی رومن کیتھولک فرقے کی اکثریت ہے مگر عدالت طلاق کی اجازت صرف اس صورت میں دیتی ہے۔ جب فریقین میں سے کوئی ایک یہ ثابت کر دے کہ اس کا شریک حیات بے وفا ہے اور کسی دوسرے مرد یا عورت میں دل چسپی لیتا ہے۔ چنانچہ پیشہ ور فوٹو گرافر ثبوت مہیا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ برہنہ تصویریں دیکھ کر عدالت طلاق کی اجازت دیتی ہے۔ فریقین باہم رضامند ہوں تو ایک دوسرے کو خود تصاویر مہیا کرتے ہیں۔ تاکہ عدالت میں پیش کی جا سکیں۔ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے عورتیں اس بات پر متفق ہیں کہ شادی کے باوجود عورت شوہر کی ملکیت نہیں ہوتی۔ اسے دوسرے مردوں سے دوستی کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہ اس کی کوئی غلطی معاف کرنے یا اس سے درگزر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب بھی مرد نے ٹوکا وہ بپھر اگئی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بیشتر عورتیں کام کرتی ہیں۔ معاشی تحفظ کی وجہ سے انہیں شوہر کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں صورت حال برعکس ہے۔

آفس سیکریٹریوں کا مسئلہ بھی خاصا پیچیدہ ہے۔ میرے پاس بے شمار خواتین آئیں جنہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ ان کے شوہر اپنی سیکریٹریوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ بعینہ بہت سی آفس سیکریٹری قسم کی لڑکیاں ہاتھ دکھاتے وقت تسلیم کرتی تھیں کہ ''صاحب'' سے ان کے تعلقات بڑے وسیع ہیں۔

''کیا صاحب مجھ سے شادی کریں گے؟''

اکثر لڑکیاں یہ سوال کرتی تھیں۔ بعد میں تو میں اس قدر مشاق ہو گیا کہ آفس سیکریٹری کی شکل دیکھتے ہی پیش گوئی کر دیتا ''تم صاحب سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' ننانوے فی صد میری پیش گوئی درست ثابت ہوتی۔

نوجوان لڑکیاں زندگی میں حسن اور رومان کی متلاشی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر لڑکی ہاتھ دکھاتے وقت کہتی:

''اور کچھ بتایئے، کوئی نہ بات۔''

شروع میں اس سوال کا مطلب سمجھ نہ سکا۔ میں انہیں قسمت، دولت، سیر سیاحت اور تعلیم وغیرہ کے بارے میں یہ سب کچھ بتایا مگر یوں محسوس ہوتا جیسے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ تجربہ بڑا استاد ہے جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ اور میں یہ رٹے رٹائے جملے استعمال کرنے لگا:

''زندگی خوش گوار گذرے گی۔ کیونکہ آپ کی شخصیت پر کشش اور جاذب نظر ہے۔ آپ کے اندر بے پناہ جنسی کشش ہے۔ رقص میں خاص مقام پیدا کریں گی۔ اور ملنے جلنے والوں میں بہت مقبول ہوں گی۔ مجموعی طور پر آپ کی زندگی میں ایڈونیچر، سنسنی خیز واقعات اور رومان پایا جاتا ہے۔ عنقریب ایک ایسا واقعہ پیش آئے گا کہ آپ رقیب کو شکست فاش دیں گی۔ شوہر آپ کی پرستش کرے گا اور غلام بن کر رہے گا۔ دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ......''

یقین جانئے۔ ہر لڑکی یہ سن پھڑک جاتی۔ ان چند جملوں میں دلچسپی کے سارے لوازمات آ جاتے ہیں۔ اور پر

کے جملوں سے آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں لڑکیوں کا آئیڈیل کیا ہے میں صرف ایک بات کی طرف اشارہ کروں گا۔ اکثر لڑکیاں یہ چاہتی ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ دوست بنا سکیں مگر شوہر برا نہ مانے۔ عورت کی بنیادی فطرت یعنی شوہر غلام بن کر رہے وہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہاتھ دکھاتے وقت ایک خاتون نے پوچھا:

''شوہر میرا مقروض ہے، کیا وہ میرا قرض ادا کرے گا؟''

اسی طرح ایک مرد نے سوال کیا:

''مجھے بیوی سے دس ہزار ڈالر لینے ہیں۔ وہ یہ رقم کب لوٹائے گی؟''

میں نے دونوں سے پوچھا کہ کیا ان کے ازدواجی تعلقات اچھے نہیں؟ جواب ملا بہت اچھے ہیں۔ یہ بات بھی میرے لیے دلچسپی کا باعث تھی۔ ہمارے ہاں میاں بیوی ایک دوسرے کی چیزوں کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ لیکن مغرب میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شوہر کا اکاؤنٹ الگ ہوتا ہے بیوی کا الگ۔ چونکہ اکثر حالتوں میں دونوں کماتے ہیں۔ اس لیے خاصی رقم پس انداز کر لیتے ہیں۔ اسی طرح گھر میں لین دین شروع ہوتا ہے۔ بیوی شوہر سے قرض لیتی ہے تو شوہر بیوی سے۔ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے مغربی معاشرت میں مرد روپے پیسے کے معاملے میں مظلوم ہے۔ عورتیں خود کمانے کے باوجود یہ توقع رکھتی ہیں کہ مرد ان کے اخراجات برداشت کرے۔ گھر کا خرچ بھی اکثر مرد کو اٹھانا پڑتا ہے۔ بیوی بازار میں اپنے لیے خرید و فروخت کرتی ہے تو بل شوہر کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اکثر بیویاں اپنا سرمایہ محفوظ رکھتی ہیں تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔ اس صورت حال سے تنگ آکر بعض شوہر گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ گھر میں بیوی بچے سب موجود ہیں لیکن شوہر کا پتہ نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیویاں ملازمت کیوں کرتی ہیں؟

عام طور پر خواتین کے ملازمت کرنے کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

- مرد کی معاشی محکومی سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر
- معیار زندگی بلند کرنے کی خاطر۔
- اپنی ذات کے لیے سامان تعیش حاصل کرنے کے لیے۔
- احساس تنہائی کے خاتمے کے لیے۔

ہوسکتا ہے کہ آپ تیسری وجہ کو دوسری وجہ سے الگ نہ سمجھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تیسری وجہ اپنی جگہ پر ایک منفرد سبب ہے۔ مغرب کی عورتوں میں لباس اور سامان آرائش کا شوق پاگل پن کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ دعوت میں ایک بیگم صاحبہ کو خاص وضع کا فراک پہنے دیکھ کر ان کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ واپسی پر فوراً کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ رقم پاس نہیں تو بھی صبر نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی طرح کوشش کی جاتی ہے۔ جب تک وہ لباس نہ مل جائے

کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنونی کیفیت میں مبتلا ہیں۔

ملازم پیشہ خواتین شوہر کی طویل بیماری یا بڑھاپے کو برداشت نہیں کرتیں۔

''وہ بڈھا ہو گیا ہے۔ کام نہیں کر سکتا۔ اسے مر جانا چاہئے۔''

''حادثے میں میرے شوہر کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب وہ ملازمت نہیں کر سکتا۔ مجھ پر ایک بوجھ ہے میں دن بھر کام کرتی ہوں تب کہیں گھر کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ آخر وہ کب تک زندہ رہے گا؟ مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا کب ملے گا؟''

یہ خیالات اکثر سننے میں آتے۔ میں لرز کر رہ جاتا۔ ہمارے ہاں بیویاں (ایک خاص طبقے کو چھوڑ کر) ہر حال میں شوہر کا ساتھ دیتی ہیں۔ بیماری ہو جائے تو دن رات پٹی سے لگ کر بیٹھی ہیں۔ بوڑھا یا اپاہج ہو جائے تو بھی اُسے نہیں چھوڑتیں۔ ہر وقت جھگڑا کرنے والی بیویاں بھی شوہر کی علالت میں مطیع و فرمانبردار ہو جاتی ہیں مگر مغرب میں قربانی اور ایثار کے جذبات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ صرف رومن کیتھولک فرقے کی بعض قدامت پسند خواتین شوہروں کو قبول کر لیتی ہیں۔ خواہ وہ کسی حالت میں ہوں۔ ایسی کئی خواتین کا ہاتھ دیکھا۔ میرے استفسار پر بتاتیں:

''شوہر ناکارہ ہو چکا ہے مگر کیا کروں بچوں کی خاطر اسے نہیں چھوڑ سکتی۔''

اوپر میں نے احساس تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بے شمار عورتیں اس تکلیف دہ احساس میں مبتلا ہیں۔ بچپن میں والدین سے انہیں محبت اور شفقت کے جذبات نہیں ملتے۔ جن سے شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ والدین کو فرصت کہاں کہ بچوں پر توجہ دے سکیں۔ سکول میں تنخواہ دار استانیاں اور ٹیوٹر یقیناً بچوں کو والدین کا پیار نہیں دے سکتے۔ لڑکوں کا تو ذکر ہی کیا۔ لڑکیوں کو سولہ برس کی عمر تک گھر سے جواب مل جاتا ہے۔ ایسے ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ بیس برس کی لڑکی کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا گیا۔ حکم ملتا ہے خود کما کر لاؤ، ورنہ اپنا گھر بساؤ۔ افراد خانہ کے مابین محبت ختم ہو چکی ہے۔ ہر شخص کاروباری انداز میں سوچتا ہے۔ والدین کے بارے میں تو خیر یاد رہتا ہے لیکن بہن بھائیوں کی تعداد بہت کم لوگ بتا سکتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی کتنی بہنیں ہیں اور آج کل کہاں ہیں۔ ماں باپ اور اولاد کا رشتہ کسی نہ کسی شکل میں ابھی تک قائم ہے۔ بھائی کبھی کبھار مل لیتے ہیں۔ بہنیں بھی ایک دوسرے سے واقف ہیں مگر بہن اور بھائی کا رشتہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

مجھے بے شمار خواتین کے ہاتھ دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے شدت سے محسوس کیا کہ مائیں اپنے بچوں کے بارے میں بہت کم سوال کرتی ہیں۔ لڑکے یا لڑکی کے بارے میں یہ تشویش کہ وہ ابھی تک شریک زندگی تلاش نہیں کر سکی یا کسی خاص بچے کے بارے میں یہ استفسار ''کیا وہ ملک سے باہر جائے گا؟'' والدین کی دلچسپی یہاں تک محدود ہے۔ لڑکیوں کی طرح لڑکوں سے بھی یہی امید کی جاتی ہے کہ لڑکیوں کو دوست بنائیں۔ چنانچہ ایک ماں نے ہاتھ دکھاتے ہوئے بتایا۔

میں اپنے لڑکے کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ کم بخت لڑکیوں سے بھاگتا ہے۔ میری بڑی لڑکی نے اس کے لیے کئی ڈیٹس بھی لیں مگر وہ عین وقت پر غائب ہو جاتا ہے۔ لڑکی سے ملتا بھی ہے تو اس طرح جیسے کوئی ناخوشگوار فرض ادا کر رہا ہے۔''

یہاں ''بلائنڈ ڈیٹ'' کی وضاحت ضروری ہے۔ شرمیلے اور جھینپو قسم کے لڑکوں کی بہنیں اپنی کسی سہیلی کو فون کرتی ہیں:

''میرا ایک نوجوان بھائی ہے۔ بڑا ہی پیارا لڑکا ہے۔ صحت مند اور خوبصورت ہے لیکن شرمیلا بہت ہے۔ کسی لڑکی سے نہیں ملتا۔ کیا آپ اس کے ساتھ ایک شام بسر کرنا پسند کریں گی؟''

جواب اثبات میں ہو تو لڑکے کو سارا پروگرام سمجھا دیا جاتا ہے۔

نوجوان لڑکیوں کے بارے میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ انسان پر ماحول کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔ برٹش کولمبیا میں میرے ایک جاننے والے پاکستانی تھے۔ یو پی کے بہت ہی شریف اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔ اس لیے وہ بیوی بچوں سمیت یہاں رہتے ہیں۔ ایک روز ان سے ملنے کے لیے گیا۔ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں نے حال دریافت کیا۔ افسردگی سے بولے:

''معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے یہاں آ کر سخت غلطی کی۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''لوگ پیسوں کی خاطر یہاں مستقل رہائش کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس بے ہودہ ماحول کا اثر بچوں پر کیا ہوگا۔''

''آخر قصہ کیا ہے؟''

''میری چھوٹی لڑکی دیکھی ہے نا تم نے۔ ابھی اسکی عمر دس بارہ برس بھی نہیں۔ کل شام میں لان میں بیٹھا تھا۔ کہ وہ ایک موٹے تازے آدمی کے ساتھ میرے پاس آئی۔ وہ شخص مقامی تھا۔ عمر پینتیس چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ قریب آ کر مجھ سے بولی:

"Dady! meet my boy friend"

(ابا جان ذرا میرے دوست سے ملیئے)

''نامراد کہیں کی۔ ابھی سے بوائے فرینڈ بنا رہی ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ مگر ان کی افسردگی دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

کینیڈا کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بھی سیاحت کی۔

امریکی قانون کے مطابق غیر ملکی طلبہ کو ایک خاص ٹکٹ دیا جاتا ہے جس کی مالیت 90 ڈالر (تقریباً 900 روپے) ہے۔ اس ٹکٹ میں آپ تین ماہ تک جہاں جی چاہے جا سکتے ہیں میں نے لاس اینجلز، ڈزنی لینڈ، سان

فرانسسکو، نیویارک، واشنگٹن، ڈلس، سان، ڈیگو اور میکسیکو کا سفر بھی کیا۔ یہاں بہت کم غیر ملکی طلبہ کو اس رعایت کا علم ہے۔ سفر کے دوران امریکیوں کے علاوہ حبشیوں، ہندوستانی، پاکستانی اور دوسرے ملکوں کے باشندوں سے ملنے کا بڑا اچھا طریقہ دریافت کیا تھا۔ کسی مقام پر پہنچتے ہی ڈائریکٹری دیکھتا جس نام میں محمد، احمد، خان اور چودھری کے الفاظ شامل ہوتے فوراً اسے فون کرتا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کرتا۔ اس طرح بہت سے لوگ میرے میزبان بنے۔ پردیس میں یوں بھی انسان اپنے ہم وطنوں سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ اس سفر سے بھی خاطر خواہ فائدہ ہوا اور مغربی معاشرت کا خوب اچھی طرح سے جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔

''صاحب میرے پاس سب کچھ ہے، کار ہے، بنگلہ ہے، بنک میں خاصی رقم جمع ہے۔ بچے بڑے ہو کر اپنے کام پر جا رہے ہیں۔ شوہر بھی زندہ ہے۔ کسی قسم کا کوئی فکر نہیں لیکن تنہائی بہت ستاتی ہے۔ عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے جھرمٹ میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اکیلی ہوں۔ خدا کے لیے میری تنہائی کا کچھ کیجئے۔ زندگی ویران نظر آتی ہے۔ کیا مجھے کوئی سہیلی مل جائے گی؟''

سامنے بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر خاتون نے بڑی حسرت سے سوال کیا۔ اس قسم کی خواتین بھی مغرب میں اکثر نظر آئیں۔ گھر میں سب کچھ ہے لیکن زندگی بھر ہمدردی اور محبت کے دو بول نہ مل سکے۔ چمک دمک اور بناوٹ کے پیچھے دوڑتے رہے۔ بڑھاپا آیا تو محبت کی تلاش ہوئی۔ اخباروں میں اکثر اس قسم کے اشتہارات نظر آتے ہیں:

ایک پچیس سالہ خاتون کو "Companion" کی ضرورت ہے۔

بعض خواتین اس تنہائی کا علاج کرنے کے لیے نئی شادی کا منصوبہ بناتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک عورت اکثر میرے پاس آیا کرتی تھی۔ اس کی عمر ستر، اسی برس سے کم نہ تھی۔ ہر بار مجھ سے پوچھتی تھی:

''کوئی نئی بات''

میں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا تھا۔ نئی چیز کہاں سے لاتا۔ آخر کار رنگ آ کر بولی:

''یہ بتایئے کہ میری قسمت میں کوئی شوہر بھی ہے کہ نہیں؟''

میں نے ایک نظر اس کی جھریوں بھرے چہرے پر ڈالی اور لاحول پڑھ کر رہ گیا۔

اکثر خواتین کے سوالات اپنے شوہروں کے بارے میں ہوتے تھے۔ وہ دریافت کرنا چاہتی تھیں کہ شوہروں کو ان کے خفیہ دوستوں کا علم ہے یا کہ نہیں۔ بعض خواتین کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ اکثر مرد اپنے دوستوں سے بیویوں کے تبادلے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ بہت اعلیٰ طبقے میں بیوی کی حیثیت گھوڑی، کار یا بنگلے سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ بوڑھے معمر، زر پرست لوگ خوبصورت اور نوجوان بیویاں رکھتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے معاشرے میں اپنی ساکھ برقرار رکھ سکیں۔ بعض اوقات بیوی اور شوہر کے مابین کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف دعوتوں اور تہواروں پر بیوی شوہر کے پہلو میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ دوسری چیزوں کی طرح عورت کو بھی آرائش کا سامان تصور کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغرب میں لوگ بہت تعلیم یافتہ ہیں۔ اس لیے توہمات اور

قسمت شناسی کے قائل نہیں ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بے شمار خواتین مجھ سے الٹے سیدھے سوال پوچھتی تھیں:

''رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار تھی۔ روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ سرپٹ دوڑے جارہا تھا کیا آپ مجھے اس کی تعبیر بتا سکتے ہیں؟''

''میں ریس میں کس نمبر پر روپیہ لگادوں؟''

''کیا میرا لاٹری کا ٹکٹ نکل آئے گا؟''

''میں نے ایک نیا گھر بنوایا ہے۔ رسم افتتاح کس دن کروں؟''

''پرسوں مجھے دعوت پر جانا ہے۔ اس روز مجھے کس رنگ کا لباس پہننا چاہیے؟''

''میرے لیے خوش بخت پتھر کون سا ہے؟''

''میرا ستارہ گردش میں تو نہیں؟''

''میں بہت دبلی پتلی ہوں۔ میرا جسم کب تک فربہ ہو جائے گا؟''

''میں روز بروز موٹی ہوتی جارہی ہوں۔ کیا میں دبلی ہو جاؤں گی؟''

''کیا آپ لوگ کوئی تعویذ گنڈے وغیرہ بھی دیتے ہیں؟''

ان توہمات سے چالاک لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں نے ایک جوگی کا بڑا چرچا سنا، معلوم ہوا کہ اس شخص کی داڑھی لمبی تھی اور سر کے بال کمر تک لٹک رہے تھے۔ بے شمار عورتیں اس کی مرید تھیں۔ وہ مغرب کی انتہائی ترقی پسند خواتین کو پندرہ پندرہ بیس بیس منٹ سر کے بل کھڑا کیے رکھتا تھا۔ اتفاق سے میں اسے نہیں دیکھ سکا۔ میرے جانے سے پہلے وہ کہیں اور چلا گیا۔ دوستوں سے معلوم ہوا کہ موصوف جو الٹی سیدھی ہانکتے خواتین فوراً حکم بجا لاتیں۔

مغرب کے بعض توہم پرست لوگ بھی عوام کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قسمت شناسی امریکہ میں قانوناً منع ہے مگر یار لوگوں نے قانون کی پکڑ سے بچنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جا بجا ایسے چائے خانے نظر آتے ہیں جنہیں Tea cup Reading Rooms کہتے ہیں۔ مالک زیادہ تر عورتیں ہیں۔ ان چائے خانوں میں چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے ہیں۔ ہر کیبن میں ایک قسمت شناس بیٹھا ہوا ہے جسے قانون سے بچنے کے لیے ریڈر کہتے ہیں۔ یہاں چائے مہنگی ملتی ہے۔ مثلاً عام چائے خانوں میں آٹھ آنے فی کپ ہے تو یہاں پانچ روپے۔ گاہک چائے کا کپ اٹھاتا ہے اور کسی ایک کمرے میں جا کر ریڈر کے پاس جا کر اسکے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ ریڈر قانون سے بچنے کے لیے وضاحت کرتا ہے:

''میں آپ سے جو کچھ عرض کروں گا اس کی قیمت نہیں لی جائے گی''

اس فقرے کے بعد وہ خرافات بکنے لگتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بعض ریڈر ہاتھ تک نہیں دیکھتے نظریں

چائے ی پیالی پر ہیں اور قسمت کا حال بتا رہے ہیں۔ بعض چائے خانوں میں عورتیں بھی ''ریڈر'' ہیں۔ روحانیات کی ماہر عورتیں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے پاس پراسرار طاقتیں ہیں وہ عجیب وغریب گفتگو سے مخاطب کو خوفزدہ اور مرعوب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو منہ میں آئے وہ کہتی ہیں۔ کچھ باتیں درست ثابت ہوتی ہیں تو کچھ غلط۔ لیکن مخاطب اس قدر مرعوب ہو جاتا ہے کہ تردید نہیں کرسکتا۔ اکثر پیشین گوئیاں مضحکہ خیز اور بے سروپا ہوتی ہیں۔ چائے خانوں کے علاوہ یہ دھندہ گرجا گھروں نے بھی شروع کر رکھا ہے۔ کینیڈا کے مشہور دست شناس نارم جانسن کے ہمراہ مجھے ایک ایسے گرجے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پادری ایک شخص کا تصور ذہن میں رکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے اور جو جی میں آئے کہتا چلا جاتا ہے۔ آخر میں مخاطب کو دعائیں (Blessings) دی جاتی ہیں۔ میری باری آئی تو پادری نے ایک نظر دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور مخصوص لہجے میں بولا:

''روح مجھے اشارہ کر رہی ہے کہ عنقریب تمہیں ایک سفر پیش آنے والا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت دور سیاہ بالوں والی اور سرمئی آنکھوں والی ایک خوبصورت عورت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

دونوں باتیں محض قیافہ تھیں۔ وہ میری رنگت دیکھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا مجھے ایک نہ ایک دن گھر واپس جانا ہے۔ دوسری بات بھی اندازے سے کہی گئی تھی۔

جہلم کے ایک پیر کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب ڈیٹرائیٹ میں پیری مریدی کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہزاروں خواتین ان سے تعویذ حاصل کرتی ہیں۔ اب تو پیر صاحب کے پاس بنگلہ ہے۔ بہترین موٹر گاڑی ہے اور ان گنت روپیہ۔

جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ اگر کوئی شخص ان کی معاشرت کو سمجھ لے اور قیافہ شناسی میں ماہر ہو، باتیں خوب بناتا ہو، گفتگو میں محاورے استعمال کرے سنسنی خیز اور ہیجان خیز بات چیت کر سکے۔ تو بہت اچھا قسمت شناس بن سکتا ہے۔ معاشرت کا علم نہایت ضروری ہے۔ ہر طبقے کے مخصوص مسائل سے واقفیت بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

بیشتر خواتین یہ سوال کرتی ہیں:

''ہمیں محبت کہاں سے ملے گی؟''

اعزہ واقارب کے ہوتے ہوئے بھی یہ سوال بڑا معنی خیز ہے۔ اصل میں وہاں باہمی تعلقات میں وہ گہرائی نہیں جو ہمارے پاس پائی جاتی ہے۔ تعلقات اکثر اوقات سطحی ہوتے ہیں۔ لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ دوسرے سے زیادہ گفتگو کرسکیں۔ بے مروتی اور رکھائی کے بارے میں ایک خاتون نے بڑا دلچسپ واقعہ سنایا:

''مسٹر ملک! ایک عورت بارہ سال سے میرے ساتھ والی میز پر کام کرتی ہے۔ پرسوں میں بعض ذاتی مسائل کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میں نے اسے اپنی مشکل سے آگاہ کرنا چاہا۔ وہ غصے میں آگئی اور بولی:

''شٹ اپ! میرے پاس تمہاری بکواس سننے کا وقت نہیں ہے۔''

باہمی معاشرت کا یہ عالم ہو تو محبت اور خلوص کی تلاش بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ کئی خواتین میرے پاس آتیں، میں ہاتھ دیکھنا چاہتا تو وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہتیں:

''ہم ہاتھ دکھانے نہیں آئے۔ دل پر بوجھ سا ہے، آپ صرف ہماری باتیں سنتے رہیں۔''

کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد واپس چلی جاتیں۔ جاتے ہوئے اپنا کارڈ اور ٹیلی فون نمبر چھوڑ جاتیں تاکہ فرصت کے وقت میں ان کے ہاں پہنچ جاؤں۔

لکی نمبر اور لکی رنگ پوچھنے والی خواتین کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ وہاں عورتیں بے تحاشا ریس اور جوا کھیلتی ہیں۔ اصرار کر کے مجھ سے مشورہ طلب کرتی ہیں۔ پیچھا چھڑانے کے لیے میں کوئی سا بھی نمبر بتا دیتا ہوں۔ میرا بتایا ہوا نمبر غلط نکلتا تو بھی ان کا اعتماد کم نہ ہوتا۔

''ضرور مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے۔ براہ کرم ایک بار پھر نمبر بتا دیں۔''

ان باتوں سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ قوم بے یقینی کا شکار ہے۔ اسے کسی کی اتھارٹی چاہئے۔ اصل میں یہ مذہب سے بے گانگی کا نتیجہ ہے۔ مذہب ہمیں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی آزادی نے اس قوم کا یقین متزلزل کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کی زوردار بات فوراً قبول کر لی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کچھ ایسے بھی ہیں جو باہر سے بیویاں لانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی نے ہاتھ دکھاتے ہوئے دریافت کیا:

''کیا میں اس غیر ملکی لڑکے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی؟''

اسکی داستان سننے کے بعد میں نے خود بھی تحقیق کی۔ ہمارے ہاں جتنے لوگ بھی باہر جا کر شادی کرتے ہیں ان میں سے اکثریت کو یہ شادی مجبوراً کرنی پڑتی ہے۔ میں شکاری عورتوں Husband Hunters کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہ نچلے طبقے کی وہ خواتین ہیں جن کی عمر 25 سے 40 برس تک ہوتی ہے اور جو ہر طرف سے مایوس ہو کر غیر ملکی طلبہ اور کاروباری حضرات پر قسمت آزمائی کرتی ہیں۔ طرح طرح کے لالچ دیتی ہیں۔ سبز باغ دکھاتی اور آخر میں قانون کا خوف دلاتی ہیں۔ ہمارے نوجوان شروع میں تو خوشی خوشی دوستی اگا لیتے ہیں لیکن یہ دوستی انہیں بہت مہنگی پڑتی ہے۔ عورتیں اپنے کسی نوزائیدہ بچے کو ان کی اولاد بنا کر عدالت میں پیش کر دیتی ہیں۔ عدالت سے بچے کا جو ماہانہ خرچ مقرر ہوتا ہے وہ ہمارے طلبہ عمر بھر ادا نہیں کر سکتے۔ حکومت ان عورتوں کی پشت پناہی کرتی ہے۔ اور اگر کوئی غیر ملکی بھاگ جائے تو سفارتخانے کے ذریعے اس کے ملک میں پہنچ کر مقدمہ دائر کیا جاتا ہے۔ حکومت مقدمے کے اخراجات خود برداشت کرتی ہے اور عدالت کو ماہانہ خرچ دلواتی ہے۔ رقم اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ نوجوان کو مجبوراً شادی کرنا پڑتی ہے اکثر نوجوان عدالت کا نام سنتے ہی ڈر جاتے ہیں اور شادی کرنا قبول کر لیتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کی خواتین اور متوسط طبقے کی نوعمر اور خوبصورت لڑکیاں غیر ملکیوں کی طرف متوجہ نہیں

ہوتیں۔ غیر ملکی بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا زیادہ پڑھا لکھا ہو تو علیحدہ بات ہے۔

والدین بچوں سے کچھ زیادہ محبت اور شفقت کا برتاؤ نہیں کرتے۔ بعض اوقات بچے بڑے ہو کر بھی والدین کی زیادتیاں یاد رکھتے ہیں۔ مجھے ایک لڑکی کا ہاتھ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ دوسی نژاد تھی۔ انتہائی خوبصورت، تعلیم یافتہ اور دلکش۔ ایسی حسین وجمیل لڑکی میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کہیں دیکھی ہو۔ بے چاری کا ایک ہاتھ مرجھایا ہوا تھا۔ مجھ سے بولی:

''کیا میں اپنی ماں کو دیکھ سکوں گی۔''

میں نے سوچا کہ شاید ماں کی محبت میں بے چین ہے مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اصل بات کیا ہے۔

''میں اس کا خون پینا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا دیا۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بچی تھی۔ ایک روز ماں میرے باپ سے لڑی اور غصے میں آ کر مجھے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ باہر برف گر رہی تھی۔ میں دیر تک برف میں پڑی رہی۔ سردی سے ہاتھ مرجھا گیا۔ ایک عورت نے اتفاقاً مجھے دیکھ لیا اور اٹھا کر اپنے ہاں لے گئی۔ اسی روز میری ماں گھر سے چلی گئی اور دوبارہ کہیں نظر نہ آئی۔ مل جائے تو اس کا خون پی جاؤں۔''

ملازم پیشہ خواتین کے مسائل بھی دلچسپی سے خالی نہ تھے۔

''کیا میں ملازمت چھوڑ دوں؟''

''میں بہت تھک جاتی ہوں۔''

''مجھ سے گھر کا کام نہیں ہوتا۔''

''میرے بچے بگڑ گئے ہیں۔ میں انہیں وقت نہیں دے سکتی۔''

''مجھے ہفتوں شوہر کی شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔''

ان کے حالات سنے تو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہمارے ہاں ماڈرن خاتون اپنی مظلومیت کا رونا تو بہت روتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری عورتیں مغربی عورتوں کے مقابلے میں بہت سکھی ہیں۔ پاکستان میں عورت روپے پیسے کے معاملے میں مرد کی محتاج ضرور ہے لیکن اسے زندگی کی مختلف نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے شمار مواقع مل جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ذرا مغرب کی عورت کو دیکھئے۔ بیچاری کام کاج کے بوجھ سے ہر وقت تھکی تھکی رہتی ہے۔ اتنی ترقی کے باوجود گھر کے بنیادی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ عورت چھ گھنٹے کی جان لیوا ڈیوٹی دے کر آتی ہے تو تھکن سے جسم ٹوٹ رہا ہوتا ہے مگر گھر کی نگہداشت، سودا سلف لانے کی ذمہ داری، بچوں کی دیکھ بھال، شوہر کی خدمت، کمروں کی صفائی، سب کام اسے کرنے پڑتے ہیں۔ مرد اس کا ہاتھ بہت کم بٹاتا ہے۔ ہمارے ہاں نوکر مل جاتے ہیں مگر وہاں نوکر اتنا مہنگا پڑتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کو چھوڑ کر ایک

متوسط طبقے کا فرد یہ فضول خرچی برداشت نہیں کرسکتا۔ اکثر عورتیں دن بھر بچوں سے دور رہتی ہیں۔ اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگتی ہیں۔ دفتروں میں کوئی ان سے رعایت نہیں کرتا (ہمارے ہاں تو خواتین کو خاصی مراعات ملتی ہیں) وہاں ہر شخص کہتا ہے:

''عورت ہے تو ہم کیا کریں، کام تو بہر حال کرنا پڑے گا۔''

دفتر میں صاحب لوگ ''تنگ'' کرتے ہیں۔ گھر پر شوہر ناراض رہتا ہے کہ اسکی خدمت نہیں ہوتی۔ بعض عورتوں نے مجھے بتایا کہ ان کی ازدواجی زندگی صرف اس بنا پر ناکام ہوگئی کہ وہ شوہر کو خوش نہ رکھ سکیں۔ دفتر سے واپسی پر تھکن سے چور ہوتی تھیں۔ آرام کرتیں یا شوہر کی دیکھ بھال؟ بعض حالات میں بیوی دفتر سے واپس آتی ہے تو خاوند دفتر جارہا ہوتا ہے۔ مہینوں ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ دفتر میں مالک Boss ناک میں دم کردیتا ہے۔ تو گھر میں شوہر کے مزاج کا پارہ آسمان پر رہتا ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ اس ڈر سے کہ ملازمت چھن جائے گی۔ ہر وقت ذہن پریشان رہتا ہے۔ مانع حمل دوائیں مزید نفسیاتی اور جسمانی امراض پیدا کرتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق مغرب کی ہر بیسویں عورت اعصابی امراض کا شکار ہے۔

ہماری بعض ''ترقی یافتہ' عورتیں ہر وقت آزادی نسواں کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں اگر وہ مغربی عورت کے ذہن میں گھس کر دیکھیں تو پتا چلے کہ معاشی آزادی حاصل کرنے کی دھن میں اس نے کتنی مصیبتیں مول لی ہیں۔ ہر چوتھی شادی زندگی کے دسویں برس میں ختم ہوجاتی ہے۔ پاگل عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ماہرین صحت پریشان ہوگئے ہیں۔ سوسائٹی میں بدنظمی گھروں میں انتشار اور بے راہ روی جیسی لعنتیں اس کے علاوہ ہیں۔ نیندیں اچاٹ ہوچکی ہیں۔ عورتیں خصوصاً بے خوابی کا شکار ہیں۔ خواب آور گولیاں بے تحاشہ استعمال کی جاتی ہیں۔ خودکشی کی وارداتیں اکثر ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے تنگ آکر اپنا غم شراب میں ڈبونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مذہب بھی انسان کو ذہنی سکون بخش سکتا ہے مگر وہاں یہ سہارا غائب ہے۔ چیختی چلاتی موسیقی' وحشیانہ رقص اور تیز منشیات' میں زندگی کے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ایک مرد کی غلامی قبول نہ تھی مگر اب ہزاروں مردوں کی چاکری کرنی پڑتی ہے۔ ہر شخص عورت کو کھلونا سمجھتا ہے۔ جی بھر گیا تو توڑ کے پھینک دیا۔ بے شمار خواتین نے مجھ سے کہا:

''سب کچھ موجود ہے لیکن دلی خوشی نہیں ملتی۔''

انہیں کون سمجھائے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ انسان کو خوشی نہیں دے سکتا اور جو کچھ ان کے پاس نہیں، نئی پاکستانی عورت اس سے پیچھا چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کررہی ہے۔

بحوالہ: ہاتھ کی زبان، ایم اے ملک

نرگسیت

(NARCISSISM)

یونانی دیومالائی قصوں میں نرگس ایک حسین شہزادی کا نام تھا۔ جو اپنے حسن جہاں سوز پر بے حد نازاں تھی۔ ایک بار جھیل میں غسل کرتے ہوئے موتی ایسے شفاف پانی کے آئینے میں اس کی نگاہ اپنے ہی عکس جمیل پر پڑی تو وہ اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہوگئی۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

نرگسیت (Narcissism) کی اصطلاح فرائیڈ نے اسی قصے سے مستعار لی ہے نرگسی شخصیت کا حامل خود بین، خود پرست اور حب ذات میں ڈوبا ہوا ایک شخص ہے جس کی عشقیہ دلچسپیوں کا مرکز خود اس کا اپنا وجود ہے انتہائی حالت میں ایسا شخص لاشعوری طور پر خبط عظمت اور احساس کبریائی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اور خود کو عام لوگوں سے ارفع و اعلیٰ خیال کرتا ہے اپنے بے مثل ہونے کا زعم رکھتا ہے۔ اس کی توجہ اپنی ذات سے نہیں ہٹتی۔ خارجی دنیا کے بارے میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ فقط اسی کے لئے تخلیق کی گئی ہے اپنی ساحرانہ قوتوں پر اسے بڑا ناز ہے۔

ہر انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت کسی نہ کسی حد تک نرگسیت مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ اگر وہ حد اعتدال پر رہے تو یہ نرگسیت شخصیت کی نشوونما کا اہم جزو ثابت ہوتی ہے۔ اپنی ذات پر اعتماد استحکام خودی کا موجب ہے بشرطیکہ یہ خود پرستی کے مترادف نہ ہو اور کمپلیکس بن کر نہ رہ جائے۔ ایسی صورت میں یہ نرگسی الجھاؤ کی علامت ہے۔ جس میں مبتلا شخص لاشعوری طور پر جس احساس کبریائی اور برتری کا زعم رکھتا ہے، وہ درحقیقت اس کے احساس کمتری کا غماز ٹھہرتا ہے۔

انتہائی نرگسی الجھاؤ کے حامل افراد ہم جنسیت اور خود لذتیت میں ڈوب جاتے ہیں اور جنسی بے راہ روی کے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب بھی کرنے لگتے ہیں۔

نرگسی شخصیت کی پہچان کسی فرد کے پوشیدہ و ظاہری افکار و اعمال اور گفتار و کردار کے بغور تجزیے سے کی جا سکتی ہے۔ تاہم چند علامات حسب ذیل ہیں۔

- ذوق خود آرائی
- توجہ طلبی
- بدگمانی

- حسد ورقابت
- خوشامد پسندی
- مظلوم مردوں کے لئے نرم گوشہ
- ضعیف الاعتقادی
- مذہبیت

انسانی نفسیات کا تجزیہ کرنے والے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ خواتین مردوں کی نسبت زیادہ نرگسیت کی حامل ہیں۔اس کے ثبوت میں وہ حسب ذیل توضیحات پیش کرتے ہیں۔

- ذوق خود آرائی

آثار قدیمہ کے عجائب گھروں میں محفوظ اشیائے آرائش و افزائش حسن دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زیب وزینت، خودنمائی اور بناؤ سنگھار ہر دور کی عورت کی شخصیت کا تکمیلی جزو اس کی شناخت اور اہم ترین خصوصیت رہی ہے۔جدید دور کے شاپنگ سنٹروں اور فیشن مرکزوں میں سامان زیبائش کی کثرت وفراوانی دیکھ کر کچھ یوں اندازہ ہوتا ہے جیسے یہ عالم رنگ و بو فقط صنف نازک کی نرگسی تمناؤں کی تکمیل کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

؎ جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

یورپ اور امریکہ میں خواتین اپنی آمدن کا ایک بڑا حصہ انہی حسن افروز اشیاء کی نذر کر دیتی ہیں، یہ جنون خود آرائی اور آرزوئے جواں سالی پرستشِ ذات اور طوافِ وجود پر دلالت کرتا ہے۔

شعراء کے نزدیک تو یہ ایک مشق ناز ہے۔لیکن ایک مغربی مفکر نے اس کے محرکات کا تجزیہ کرتے ہوئے طنزیہ لکھا ہے کہ عورت کے پاس کچھ دکھانے کے لئے رکھا ہی کیا ہے وہ مصنوعی چیزوں کا سہارا نہ لے تو بھلا اور کیا کرے۔

مادام بوئر اس نسوانی روش کا ذمہ دار مرد کو گردانتی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ عورت کی قدر و قیمت مردوں کی دنیا میں فقط جنسی کشش کا حامل اور جاذب نظر ہونے میں ہے اسی لئے عورت ان مصنوعی لوازمات کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔

ایڈلر کے بقول خود زیبائی احساس کمتری کی تلافی کرنے کی سعی ہے جبکہ فرائیڈ کے نزدیک یہ نرگسی رجحان کی واضح علامت ہے ایسے لوگوں کی جنسی توانائی خارج سے ہٹ کر اپنی ذات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

- توجہ طلبی

تقریباً تمام ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ خواتین پیار کی رسیا ہیں، ان کے یہاں پیار لینے کا جذبہ پیار دینے کے جذبہ سے زیادہ قوی ہے محبت کی مسلسل یقین دہانیوں اور تصدیق اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

شعوری طور پر اس کا حصول ممکن نہ ہو تو یہ طلب لاشعوری حربے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ گریہ و زاری، ہسٹریائی ردعمل، ہزیانی کیفیات، بسیار گوئی، ترغیب آمیز ادائیں اور بناؤ سنگھار توجہ طلبی کے ہی مظاہرات ہیں۔ اس کے حصول کے لئے وہ بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتی ہے حتیٰ کہ خود اذیتی، بیماری اور خودکشی کی دھمکیوں پر اتر آتی ہے۔

میری کتاب ''زندگی کے جذباتی مسائل'' میں ایک ایسی ہی خاتون کا تذکرہ ہے جنہیں شکایت ہے کہ ان کے شوہر ان کی بیماری کو ایکٹنگ تصور کرتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے وہ خط یہاں درج کیا جاتا ہے۔ موصوفہ لکھتی ہیں:

''میری عمر تیس سال ہے شادی کو بارہ سال گزر چکے ہیں تین بچوں کی ماں ہوں۔ میرے شوہر دفتر میں ملازم ہیں۔ آمدنی معقول ہے۔''

''شادی سے پہلے میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی تھی۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بے انتہا شوق تھا۔ لیکن شادی کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گیارہ سال گزر گئے میں اپنے شوق تعلیم کو نہ دبا سکی ایک خلش سی میرے دل میں تھی کہ کسی طرح اپنے ادھوری تعلیم کو مکمل کر لوں، شادی کے بعد گیارہواں سال شروع ہوا تو شوہر نے مجھے کالج میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔''

کالج والوں نے مجھے فرسٹ ایئر میں داخلہ دیا اور کہا کہ گیارہ سال کے طویل عرصہ میں آپ سب کچھ بھول گئی ہوں گی۔ میری لگن کو دیکھئے میں نے اسی میں داخلہ لیا۔ خیر ایک سال خیریت سے گزر گیا۔ میں نے گھر سنبھالا اور کالج بھی چلا دیا۔ میں بہت خوش تھی۔ سالانہ امتحان ہوئے۔ نتیجہ آنے پر باوجود کم پڑھنے کے ہر مضمون میں میرے نمبر بہت اچھے تھے لیکن میرا ایک بچہ دوسری جماعت میں فیل ہو گیا۔ اس کا مطلب میرے شوہر نے یہ لیا کہ میں گھر اور بچوں سے لاپرواہ ہو گئی ہوں اور میرا کالج جانا بند کر دیا۔''

میں نے کہا بچے تو اکثر فیل ہوتے ہیں پھر بھی میں بچوں کا ذمہ لیتی ہوں کہ وہ پاس ہو جائیں گے اور میں گھر میں رہنے لگی۔ مجھے بہت رنج تھا۔ اس ضمن میں یہ بتانا انتہائی ضروری ہے کہ میری اور میرے شوہر کی زندگی انتہائی ناخوش گوار ہے۔ تقریباً ہر بات پر ہمارا اختلاف ہوتا ہے مختصر یہ کہ میں زندہ ہوں مگر دل مر چکا ہے کالج میں داخلہ اس لئے لیا تھا کہ وہاں میری طبیعت بہل جاتی تھی میرے شوہر اکثر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان بنائے مخاصمت تمہاری ڈگریاں ہیں۔''

میں چاول کھانے کی بہت شوقین ہوں میرے شوہر کو موٹی عورتوں سے سخت نفرت ہے۔ میں کچھ موٹی ہو گئی تھی۔ انہوں نے میرے چاول کھانے پر پابندی عائد کر دی میں چاول کم مقدار میں استعمال کرتی تھی میرے شوہر نے بالکل منع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا میں چھپ کر چاول کھانے لگی۔''

''ایک شام میں چھپا کر رکھے ہوئے چاول کھا رہی تھی ایک نوالہ کھا کر دوسرا جو کھایا تو یوں لگا جیسے حلق میں

اٹک کر رہ گیا ہے۔ میں نے گھبرا کر بہت سا پانی پی لیا۔ اس کے بعد مجھے اپنے دل کی حرکت بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی میں فوراً ڈاکٹر کے پاس گئی۔ معلوم ہوا کہ میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے ڈاکٹر نے ایک انجیکشن لگایا اور کہا کہ کسی دماغی صدمے سے تمہاری یہ حالت ہوئی ہے۔ میں گھر آ کر سو گئی۔ جب صبح اٹھی اور جب ناشتہ کرنے بیٹھی تو یوں لگا جیسے کوئی میرے حلق سے ٹھوس چیز نہیں اترتی۔ میں نے سارا مہینہ دودھ اور پانی سے گزارہ کیا بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر انہوں نے کہا کہ حلق ٹھیک ہے۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ مجھے وہم ہو گیا ہے مگر میں خدا کو حاضر وناظر جان کر کہتی ہوں کہ واقعتاً مجھے یہ تکلیف تھی۔

''میرے شوہر نے بادل نخواستہ سول سرجن کو دکھایا۔ انہوں نے تین دوائیں لکھیں اور کہا اب آپ پورا کھانے کھا سکیں گی۔ پہلی خوراک یعنی تین گولیاں میں نے ایک ساتھ کھائیں۔ اور پھر پورا کھانا کھایا۔ اس بار مجھے حلق میں نوالہ پھنستا ہوا محسوس نہ ہوا لیکن فوراً ہی قبض کی شکایت ہوگئی بعد ازاں معدے اور انتڑیوں کی تکلیف پیدا ہوگئی۔ یہ تکلیف مجھے چھ سات ماہ رہی میرا اہا تھی جیسا جسم گھل گیا مگر میرے شوہر یہی کہتے رہے کہ میں ایکٹنگ کرتی ہوں اور اچھی بھلی ہوں۔''

''پھر سر درد نے آلیا۔ شام کے وقت اس قدر درد ہوتا کہ میں پریشان ہو جاتی اور دل ڈوبنے لگتا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک دوا دی جسے کھا کر درد کی شدت میں کمی آ جاتی۔ میرے شوہر یہی کہتے رہے کہ تمہیں کوئی بیماری نہیں تم جھوٹ بولتی ہو میں کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ درد ہوتا تھا اور ہر شام یہ درد شدت اختیار کر جاتا تھا۔ میرے مجبور کرنے پر میرے شوہر مجھے آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ انہوں نے کہا کہ آنکھیں بہت کمزور ہیں۔ اس لئے سر میں درد ہوتا ہے اور چشمہ دیا۔ چشمہ لگانے کے بعد سر درد میں کمی آ گئی۔ اس کے بعد دوا جس کا عادی مجھے ڈاکٹر نے بنایا تھا اور نہ کھاتی تھی جب بھی خراب رہتی تھی۔''

غرض کہ میری صحت روز بروز گرتی گئی اور میں بہت کمزور ہوگئی۔ گھر کا کام کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ دل ڈوب رہا ہے اور میں مرنے والی ہوں مختلف ڈاکٹروں رائے دی کہ مجھے نفسیات کے ڈاکٹروں کو دکھایا جائے۔ چھ ماہ تک گھر میں یہ بحث ہوتی رہی۔ مگر میرے شوہر نہ مانے۔ ایک دن اس بات پر بدمزگی ہوگئی۔ شوہر مجھے میکے میں چھوڑ گئے۔ بچے گھر میں اکیلے تھے شوہر نے بچوں کو لیا اور اپنی والدہ کے ہمراہ چلے گئے۔

میں کچھ دن اپنے میکے میں رہی پھر اپنی ساس کے ہاں پہنچی۔ یہاں مجھے خوب طعنوں کے زخم لگائے گئے۔ مجبور ہو کر یہیں رہنے لگی۔ میری ساس کے کہنے پر شوہر نے مجھے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا، انہوں نے مجھے داخل کر لیا۔ اب قدرے ٹھیک ہوں پہلے الگ رہتی تھی اب ساس کے پاس رہتی ہوں کچھ وجوہ کی بنا پر میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔''

میرے شوہر پڑھے لکھے ہیں مگر مجھے زدوکوب کرتے اور کہتے ہیں کہ تم بچوں کو تباہ کر رہی ہو، تم انتہائی خود غرض ہو، بھائی تمہیں کھلا نہ سکے۔ اس لئے چلی آئیں۔ تمہیں اپنا درخشاں مستقبل عزیز ہے اور بچوں کی کوئی پروا

نہیں''

ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں۔ پاگل ہو، خود غرض ہو...... میں سراسیمہ ہو جاتی ہوں کسی طرح دل نہیں لگتا۔ نیند بہت کم آتی ہے اکثر رات کو ہائے ہائے کرتی ہوں زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ چاہتی ہوں کچھ کھا کر سو رہوں۔ میرا وجود قطعی بے کار ہے مگر افسوس کہ یہ بھی مجھ سے نہ ہو سکا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ کبھی کبھی دل میں درد محسوس ہوتا ہے جو کبھی دیر تک رہتا ہے۔ اور کبھی چند سیکنڈ میں ختم ہو جاتا ہے مگر کہوں تو کس سے......؟؟ کون یقین کرتا ہے......؟''

محترمہ کے خط کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکٹھے بارہ تیرہ سال گزارنے کے باوجود دونوں میں وہ حقیقی ایجاب قبول جو نارمل ازدواجی زندگی کا جز ولاینفک ہے۔ پیدا نہیں ہو سکا نوالے کا حلق میں اٹک جانا کنایتاً اس بات کا بھی مظہر ہے کہ میاں بیوی کی حیثیت ایک دوسرے کے لئے تلخ نوالے سے کم نہیں۔ دونوں کے درمیان وجہ مخاصمت حصول تعلیم کی خواہش یا ڈگری نہیں۔ کالج میں داخلہ لینا خاتون کے نزدیک ازدواجی محرومیوں کی تلافی کا ایک حربہ تھا۔ جب یہ حربہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اپنی محرومی کی تلافی کے لئے بیماری جیسی شے کو گلے لگا لیا۔''

یہ بھی ایک لاشعوری حربہ ہے جسے جذباتی اعتبار سے ناپختہ لوگ مثلاً عورتیں اور بچے اور وہ تمام لوگ جو زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ محبت، ہمدردی اور توجہ اور مطلب براری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

❁ بدگمانی

محبت کی مسلسل یقین دہانی اور تصدیق حاصل نہ ہونے پر عورت کے احساس تحفظ کو جو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس سے طرح طرح کے شکوک وشبہات اس کے ذہن میں جنم لینے لگتے ہیں گھروں میں طعن و تشنیع، طنزیہ فقرات، تجسس آمیز سوالات اور پیہم مطالبات کی جو فضا نظر آتی ہے اس کے پس منظر میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔ جس کی بنیاد پر ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بدگمانی اور شک وشبہ نسوانی مزاج کا خاصا ہے۔

بہت کم خواتین ایسی دیکھی گئی ہیں، جن کے ذہن ہر قسم کے توہمات وشکوک وشبہات سے آزاد ہوں اور جو مکمل طور پر خود اعتماد ہوں مگر اس میں بلاشبہ غالب حصہ مرد کا بھی ہے۔ جو گھریلو فضا میں کھل کر اظہار محبت کرنے کو بے جا لفاظی، خوشامد اور چاپلوسی پر محمول کرتے ہوئے اسے مردانہ شان کے منافی گردانتے ہیں دوسری جانب خواتین ازدواجی زندگی میں رومانوی جذبات کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں اور محبت کی طلب کے جذبے کی تسکین نہیں ہوتی تو وہ بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اس ضمن میں ایک خاتون کا کیس ملاحظہ فرمائیے جنہیں اپنے شوہر سے شکایت ہے کہ وہ انہیں ٹوٹ کر پیار نہیں کرتے۔ یہ کچھ طویل ہے مگر اس سے خواتین کے ذہن اور انداز فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ موصوفہ تحریر فرماتی

ہیں:

''ہماری شادی کو سوا تین سال ہو گئے ہیں۔ یہ شادی بزرگوں نے کی لیکن اس میں ہماری سات آٹھ برس کی پسند کا بھی دخل تھا۔ اصل میں بچپن ہی سے ہم ایک ہی گھر میں رہتے چلے آئے تھے۔ شوہر میری خالہ کے بیٹے بھی ہیں۔''

''میرے دل میں ان کے لئے پسند کے معصوم جذبات بہت چھوٹی عمر میں پیدا ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس وقت مجھے ان جذبات کا شعور بھی نہیں تھا۔ چند سال بعد دوسری طرف سے کچھ اسی قسم کا اظہار ہوا۔ میں بھی بہت خوش ہوئی کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے کبھی ایک اور لڑکی میں بھی دلچسپی لی تھی۔ یہ بہت شروع کی بات ہے اور اس وقت وہ لڑکپن کی حدود میں تھے تاہم یہ جان کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ انہوں نے از خود مجھے یہ ساری بات بتائی تھی۔''

''قصہ یہ تھا کہ ایک عید پر انہوں نے اس لڑکی کو عید کارڈ بھیج دیا تھا بظاہر مجھے اطمینان ہو گیا لیکن کئی سال تک اس خیال کی وجہ سے پریشان رہی۔ میں ہر رات خواب میں دیکھتی اور اس لڑکی سے جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ لڑکی میری ہم جماعت اور دوست تھی۔ انجانے میں، میں احساس کمتری کا شکار ہو گئی حالانکہ میرا شمار ہر لحاظ سے کالج کی بہترین لڑکیوں میں ہوتا تھا اور اسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ کئی لڑکیوں نے میرے دلی جذبات سے لاعلم ہوتے ہوئے بھی مجھے اس سے برتر قرار دیا۔ لیکن ہمارے خاندان میں اس لڑکی کی بہت قدر و منزلت تھی کیونکہ وہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے مقابلے میں میری حیثیت گھر کی مرغی کی سی تھی۔''

''بہر حال وہ فوج میں آفیسر بھرتی ہو گئے اور میں نے بی اے کر لیا۔ ہماری منگنی ان کے والد کے اصرار پر ہوئی کیونکہ وہ مجھے بہت چاہتے تھے۔ اس کام میں میرے شوہر کی پسند شامل تھی۔ شادی ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے محبت تو کرتے ہیں لیکن اس قدر ٹوٹ کر نہیں جس کی مجھے تمنا تھی۔ حالانکہ میں نے اپنا بیشتر پیار ان کے لئے وقف کر رکھا تھا۔''

''شادی کے باوجود ہم ڈیڑھ دو سال تک ایک دوسرے سے الگ رہے کیونکہ سرکاری طور پر ان کی عمر شادی کے قابل نہ تھی اور وہ مجھے اپنے پاس نہ رکھ سکتے تھے۔ یہ وقت خطوط میں بے قرار اور بے تابی میں گزرا۔ دو تین ہفتے بعد ملتے تو نہایت خلوص اور محبت سے خدا خدا کر کے اپنے پاس رکھنے کے قابل ہوئے اور آج سے ڈیڑھ سال پہلے میں ان کے پاس آ گئی۔ جیسا کہ گھروں میں اکثر ہوتا ہے کبھی کبھی ہماری معمولی جھڑپیں ہو جاتی تھیں لیکن آخر میں نتیجہ خوش گوار ہی نکلتا۔ میں نے ان رنجشوں کا زیادہ خیال نہ کیا۔ ویسے مجھے ان سے یہ شکایت رہی کہ وہ مجھے پورا پیار اور اہمیت نہیں دیتے۔ طبیعت میں لاپرواہی بہت ہے۔ بیمار ہو جاؤں تو کوئی خاص پرواہ نہیں، دور ہوں تو جدائی کو اتنا محسوس نہیں کرتے جتنا میں، مجھے کوئی شکایت ہو تو سننا پسند نہیں کرتے سنیں گے تو جواب نہیں دیں گے۔ بس خاموش رہیں گے، مجھے بے حد غصہ آتا ہے تو اسے دور کرنے کی بجائے آرام سے سو جاتے

ہیں میں رات بھر کڑھتی ہوں اور وہ آرام سے سو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بات کروں تو مذاق اڑاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے حالانکہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی بالاخر بڑی بن جاتی ہیں۔''

''ایک عادت اور ہے کہ گھومنے کے بہت شوقین ہیں۔ یہ عادت گھر، کالج کے زمانے کی ہے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ اب اس کی اصلاح کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی کہ کہا جا رہا ہوں اور کیوں؟ وہ بتا کر نہیں جاتے تو بہت شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے کیونکہ کوئی ملنے والے آتے ہیں کہ آپ کے میاں کہاں گئے۔ پھر فوج میں یہ بھی دستور ہے کہ میاں اکٹھے بیوی اکٹھے گھومنے جاتے ہیں ان کے بہت سے شادی شدہ ملنے والوں میں سے کوئی بھی اکیلا نہیں جاتا۔ ویسے زیادہ تر دوست کنوارے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ وہ کہیں بری جگہ نہیں جاتے۔ اور اکثر میں انہیں روکتی بھی نہیں۔ چھٹیوں میں جب ہم گھر جاتے ہیں تو یہ خوب گھومتے ہیں لیکن میں اعتراض نہیں کرتی۔ مگر یہاں جب اکیلی گھر میں ہوتی ہوں تو شام کو تنہا رہنا بہت مشکل لگتا ہے۔ بچہ بھی تنہائی میں گھبرانے لگتا ہے اس لئے میں پڑھنے لکھنے یا کسی شغل میں اطمینان سے وقت نہیں گزار سکتی پھر میں احتجاج کرتی ہوں کہ آپ گھر میں کیوں نہیں رہنا پسند کرتے؟''

ہمیشہ سے پڑھتے سنتے آئے کہ صرف وہی مرد گھر سے باہر رہنا چاہتے ہیں جنہیں گھر میں سکون نہیں ملتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ میں کیا کمی ہے صورت اگر اچھی نہیں تو بری بھی نہیں۔ لباس بہت سے لوگوں سے اچھا ہی پہنتی ہوں، بچہ بھی صاف رہتا ہے، گھر بھی اکثر لوگوں کے لئے قابل رشک ہے، کھانا وقت پر تیار، ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہوں سب کچھ جو ایک اچھی بیوی کو کرنا چاہئے کرنے کی کوشش کرتی ہوں بہت سے ملنے والے کہتے ہیں کہ خوش قسمت ہے جو ایسی بیوی ملی۔ لیکن ان کو میرے اندر کبھی کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ اگر نظر آئی بھی تو اظہار نہیں کیا۔ دکھائی دیتی ہے تو صرف برائی۔

کچھ لوگ جب میری تعریف کرتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ کیا یہ اچھائی، میرے شوہر کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ میں نہیں کہتی کہ میں سرتاپا خوبی ہی خوبی ہوں لیکن پھر بھی میں یہ تو چاہتی ہوں کہ ان کو مجھ میں جو کمی نظر آتی ہے (صورت کے علاوہ کیونکہ وہ تو اپنے اختیار میں نہیں ہوتی) مجھے بتائیں تاکہ میں اسے دور کرنے کی کوشش کروں اور اگر پتہ چل سکے کہ گھر میں رہنا کیوں نہیں چاہتے اس کا جواب کچھ نہیں بن پڑتا۔ محض یہ کہتے ہیں کہ تم اپنا رویہ ٹھیک کرو۔ اگر پوچھوں کہ کیسا رویہ؟ تو جواب نہیں دے سکتے۔

میں اپنے حقوق کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہو سکتی میں توجہ اور پیار چاہتی ہوں۔ جو ایک بیوی کو ملنا چاہئے۔ سارا دن انتظار کرنے کے بعد صاحب دفتر سے آئیں اور ایک نظر دیکھنا یا ایک بات کرنا بھی پسند نہ کریں۔ تو ایسی زندگی سے کیا فائدہ ہے...... ؟ شام کی تنہائی میں اکیلے جلنا پڑتا ہے تو زندگی بہت ناخوش گوار ہو جاتی ہے۔ جب اس بات پر اپنے غصے کا اظہار کروں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ کئی کئی دن تک چپ سادھے رہتے ہیں اس طرح وقت گزارنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھ ہی کو جھکنا پڑتا ہے، صلح ہوتی ہے تو گویا زندگی روشن ہو

جاتی ہے۔اندھیرے اجالے کا یہ ڈرامہ اتنی بار کھیلا گیا ہے کہ میں عاجز ہوگئی ہے۔ڈر ہے کہیں یہ ڈرامہ حقیقت کا روپ نہ دھار لے۔''

''اب آپ کہیں گے کہ کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی لیکن یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔رہ گیا ازدواجی اور گھریلو تعلقات کا معاملہ تو بہت سی عورتوں کے برخلاف میں ہر طرح سے ان کے ساتھ تعاون کرتی ہوں ہمیشہ ان کی خوشی میں برابر کی شریک رہی اب چند ماہ سے احتجاجاً میں ان سے کچھ بیزار ہوں۔بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے نزدیک میری حیثیت کسی دلپسند کھلونے سے زیادہ کی نہیں کہ جب ضرورت پڑی اٹھالیا۔ آگے پیچھے لاپرواہی اور نظر اندازی۔ مجھے روحانی پیار کی بھی ضرورت ہے اور اس کے بغیر اپنی نسوانیت کی توہین ہوتی ہے مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

''کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کیا کروں۔اگر ان کی کسی بات پر اعتراض نہ کروں اور چپ چاپ جانوروں کی طرح زندگی گزاروں تو دل نہیں مانتا۔پھر یہ بھی ہے کہ میں اپنے لئے الگ مشاغل تلاش کروں۔کسی سے ملنے چلی جاؤں لیکن پہلے لکھ چکی ہوں کہ خاوند کے بغیر جاؤں تو برا لگتا ہے کیونکہ دوسری ملنے والیوں کے شوہر گھر میں ہوتے ہیں ان کے سامنے جانا پڑتا ہے۔پوچھتے ہیں کہ میاں کیوں نہیں آئے؟ ان کی توہین بھی اچھی نہیں لگتی۔ اس لئے ٹالنا پڑتا ہے۔''

گھر پر بیٹھ کر سلائی، کڑھائی، لکھنا پڑھنا یا کوئی اور کام کروں تو یہ کرتی ہی ہوں لیکن اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔پڑھتے پڑھتے آنکھیں تھک جاتی ہیں۔آپ یہ بھی خیال کریں گے کہ خاوند کے مشاغل میں ساتھ نہیں دے سکتی۔اس لئے کہ وہ کتراتے ہیں لیکن یہ بھی نہیں کوئی محفل ہو اس میں اچھی طرح شرکت کرسکتی ہیں اکثر لوگوں کو میری باتیں دل چسپ لگتی ہیں فلم کا ان کو شوق ہے اور مجھے بھی۔تاش کا انہیں شوق ہے اور مجھے بھی۔لیکن جب گھر میں اکیلے ہوں تو میرے بجائے شاہد سے (جو چند ماہ سے ہمارے ہاں پڑھنے آتا ہے) تاش کھیلتے اور وہ بھی دیر تک۔''

ویسے یہ بھی نہیں کہ مجھے کبھی باہر ہی نہ لے جاتے ہوں ان کے شادی شدہ دوست ملنے آئیں تو ہم سب مل جل کر تفریح کے لئے باہر جاتے ہیں مگر میرا خیال ہے اس وقت وہ مجبور ہو کر ایسا کرتے ہیں۔ویسے ان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔خوبصورت ہیں اور اسمارٹ ہیں۔بہت خوش اخلاق ہیں (لیکن صرف محفلوں میں)''

مجھ میں چند خامیاں بھی ہیں طبیعت کی بہت حساس ہوں۔ذرا ذرا سی بات محسوس کرتی ہوں۔جتنا دوسرے کا خیال رکھتی ہوں اتنی ہی توجہ اپنے لئے چاہتی ہوں حسد کا مادہ بھی بہت ہے میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے بجائے کسی اور کی طرف توجہ دیں ویسے میں اظہار نہیں کرتی لیکن کبھی کبھار دبے لفظوں میں اس لڑکی کا ذکر ضرور کرتی ہوں جیسے انہوں نے لڑکپن میں عید کارڈ بھیجا تھا۔اس کا خیال میرے دل سے نہیں ہٹتا۔اس لئے مجھے اپنے شوہر کی محبت کا یقین نہیں آتا۔معلوم نہیں کیوں؟ کئی دفعہ سوچتی ہوں کہ کہیں میرے دل میں چور تو نہیں۔لیکن ایسی بات

ہوتی تو مجھے ان کی پرواہ کیوں ہوتی ؟ اب آپ ہی مجھے بتائیں میں کیا کروں، میں بخوشی اپنی اصلاح کرنے کو تیار ہوں اپنا اصل نام و پتہ مصلحتاً نہیں لکھ رہی لیکن یقین جانئے یہ خط حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی ہے''

ملاحظہ فرمایئے خاتون مذکورہ کا مسئلہ محض توجہ ہے ورنہ اس نے خود اقرار بھی کیا ہے کہ اس کے شوہر کے کردار میں کوئی خامی نہیں شوہر کی جانب سے محبت کی تصدیق، یقین دہانی توجہ طلبی اور جذباتی تسکین کی حد سے بڑھتی ہوئی ضرورت اسے ہر دم محسوس ہوتی ہے جس کا متحمل ہونا شوہر کے بس کی بات نہیں۔ اور یہی بات اس خاتون کو مبتلائے گمان کئے ہوئے ہے۔

شکوک وشبہات عہد طفولیت کی پیداوار ہیں۔ بالعموم ہر بچی کمسنی سے ہی گوناگوں شکوک وشبہات اور توہمات میں مبتلا ہوتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اسے گھر میں وہ توجہ اور محبت حاصل نہیں۔ جو اس کے بھائی کو حاصل ہے اس کی زندگی میں ایک خلا سا رہتا ہے اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سے ٹوٹ کر پیار نہیں کیا جاتا۔ اسے جو بھی رعایت اور توجہ دی جاتی ہے وہ اس پر ترس کھا کر دی جاتی ہے۔

بڑھتی عمر فاصلوں کو بڑھاتی ہے باپ جو بچپن میں اس سے بڑا پیار کرتا تھا۔ بتدریج اس سے دور ہٹتا چلا جاتا ہے اسی دور میں وفات، ماں کی طلاق یا فریقین میں سے کسی کی بے وفائی کے سبب باپ اس کی زندگی سے نکل جائے یا کوئی اور ناخوش گوار تجربہ بچی کے والد کی طرف سے (جو اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے) پیش آ جائے تو بعد ازاں اس کی زندگی میں آنے والے ہر مرد پر اس کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے۔

ایڈلر اس بے اعتمادی کو احساس کمتری کی پیداوار سمجھتا ہے اس کے مطابق جن عورتوں کو شوہروں کے مقابلے میں اپنی ذہنی، جسمانی یا جنسی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بالعموم اس قسم کی بدگمانیوں اور اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہوتی ہیں اور بسا اوقات الزام تراشیوں اور بہتان طرازیوں پر اتر آتی ہیں۔ لاشعوری طور پر ان کا یہ طرز عمل اپنی سبقت اور برتری ثابت کرنے کی ایک کوشش ہے۔

تاہم ماہرین حیاتیات کے نزدیک چالیس پینتالیس برس سے اوپر جب جسمانی دلکشی روبہ انحطاط ہونے لگتی ہے اور مینوپاز کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے تو ایسی بدگمانیاں نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ فرائیڈ کے نزدیک شک ایک نفسیاتی روگ ہے اس میں مبتلا لوگ نفسیاتی اصطلاح میں پیرانائیڈ **(Paranoid)** کہلاتے ہیں۔

ان کے روگ کی پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے ذہن میں دوسروں کے خلاف کچھ غلط قسم کے تصورات اور عزائم رکھتے ہیں۔ ان کی نیت میں خود فتور ہوتا ہے۔ لیکن احساس جرم سے بچنے کے لئے وہ ایک نفسیاتی عمل کے تحت جسے پروجیکشن کہتے ہیں۔ الٹا دوسروں کی نیت میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں۔ (بہتان طرازی کے زیر عنوان اس نکتہ کی وضاحت اس سے قبل کی جا چکی ہے)

اس رجحان کے مطابق جن لوگوں کے خلاف انہیں تھوڑی بہت شکایت ہوتی ہے ان کے بارے میں شدید

عدم اعتماد کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور الزام تراشی پر اتر آتے ہیں۔ گویا وہ اپنے عزائم کی پردہ پوشی کرتے ہوئے اپنے آپ کو یہ یقین دلا رہے ہوتے ہیں کہ وہ نہیں بلکہ کوئی دوسرا ان سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

یہ ایک ابنارمل مرضیاتی کیفیت ہے۔ جس کا اطلاق فقط پیرانایائیڈ کے مریضوں پر ہوتا ہے جو چند مخصوص وسوسوں کے زیر اثر نہ صرف اپنے رفقائے حیات بلکہ دوسرے قریبی رشتہ داروں مثلاً ماں، باپ، بہن، بھائی کے بارے میں بھی شکوک وشبہات اور عدم اعتماد کا شکار ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف پس پردہ سازشوں میں مصروف ہیں۔

ایسے نفسیاتی روگ میں ہر دو اصناف مبتلا ہو سکتے ہیں آیئے آپ کو شک کے روگ میں مبتلا ایک ایسی ہی مریضہ کی داستان سنائیں۔ انہیں اپنے شوہر پر شک ہے۔ موصوفہ کے شوہر لکھتے ہیں:

''میری بیگم خواتین کی درس گاہ میں بحثیت معلمہ کام کر رہی ہیں ہمارے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ ہماری عمریں مساوی ہیں۔

میں پچتالیس کے لگ بھگ ہوں اور بیگم کوئی ایک آدھ برس کم ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی بڑا بحران نہیں آیا تھا۔ لیکن آج سے کچھ عرصہ پیشتر نہ معلوم میری بیگم کو کیا وہم ہو گیا ہے کہ بلاوجہ میرے بارے میں کچھ شکوک وشبہات میں کھو کر رہ گئی ہے۔

میں ایک ایسے ذمے دار عہدے پر فائز ہوں جہاں بہت سے جوان لڑکے اور لڑکیاں ماتحت کام کرتے ہیں۔ میرا رویہ ان سب کے ساتھ مشفقانہ ہے سب کے ساتھ مل کر دفتر میں چائے وغیرہ بھی چلتی ہے اور کوئی خاص فنکشن ہو تو تصاویر بھی اتروائی جاتی ہیں۔ ایک ایسی ہی تقریب میں دفتر کی ایک رفیق کار غیر ارادی طور پر میرے ہمراہ کھڑی ہو گئیں اور تصاویر اتار لی گئیں۔ یہ تصویر میری بیگم کی نگاہ سے بھی گزری۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ لیکن بیگم بلاوجہ چکر میں پڑ گئیں۔ پہلے پہل کچھ اشاروں، کنایوں سے باتیں ہوئیں لیکن بعد ازاں بات بڑھتے بڑھتے الزامات تک جا پہنچی۔ نقل وحرکت پر کڑی نگاہ اور پوچھ گچھ سے کام کیا جانے لگا۔ بیرون خانہ میری سرگرمیوں پر توہ کے لئے ڈرائیور کو لگا رکھا ہے۔ دفتر میں وقتاً فوقتاً فون پر چیک کیا جاتا ہے واپسی پر باقاعدہ جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر جانے لگتا ہوں تو طعن وتشنیع سے کام لیا جاتا ہے۔ کوئی ٹھوس ثبوت آج تک اس کے ہاتھ نہیں لگی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی چھٹی ''حس'' جو بقول اس کے، عورت میں زیادہ ہوتی ہے یہی کہتی ہے کہ تم ازدواجی بے وفائی کے مرتکب ہو رہے ہو اور یہ کہ ''مرد ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ''

''افواہ پھیلا رکھی ہے کہ میں نے کہیں خفیہ شادی رچا رکھی ہے اور بچے بھی ہیں حد سے زیادہ چڑچڑی ہو چکی ہیں۔ اور بات بات پر رونا دھونا شروع کر دیتی ہیں۔ بات گھر سے نکل کر دفتر تک جا پہنچی ہے ان محترمہ پر کئی بار لڑ جھگڑ کر نیکے جا چکی ہیں۔ سخت نالاں ہوں، اصلاح احوال کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔''

یہ مرض چندان نفسیاتی امراض میں سے ہے جس کی تشخیص وعلاج دونوں قدرے مشکل ہیں۔ اس میں مبتلا مریض اپنی روداد اتنے موثر اور مدلل پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ حقائق سے بے خبر لوگ ان کی باتوں کو مبنی برصداقت سمجھنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اناڑی معالج بھی ہو تو وہ بھی ان کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ اپنے موقف کی صداقت پر اتنی سختی سے ڈٹے رہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی طرز استدلال انہیں اس سے ہٹانے میں کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔

آیئے ایک اور کیس ملاحظہ فرمایئے۔ یہ ایک خاتون محترمہ کا خط ہے اپنے بھائی کے بارے میں جنہیں اپنی بیوی پر شبہ ہے وہ رقم طراز ہیں۔

''میرے بھیا کی شادی ہوئے آٹھ برس گزر چکے ہیں اس وقت خط لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آج سے تقریباً چھ ماہ قبل۔ وہ بھابھی کے متعلق عجیب وغریب باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس سے پہلے بھی کبھی کبھار کسی مرد کا نام لے کر بھابھی کو چھیڑا کرتے تھے۔ لیکن وہ سمجھتی رہیں کہ مذاق کرتے ہیں پھر بھیا نے باقاعدہ مطالبہ شروع کر دیا کہ بھائی انہیں مرد دوستوں کی باتیں سنائیں۔ حالانکہ بھابھی نے جس ماحول میں پرورش پائی وہاں ان باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... بھیا کہتے ہیں کہ بھابھی کے دوستوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو خود ان کے دوست ہیں لیکن وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ شادی سے پہلے بھابھی کی واقفیت ان کے دوستوں سے کس طرح ہو سکتی تھی۔ ان کے دل میں شک ہے کہ بھابھی کے پاس آنے والا ہر شخص کسی کا پیغام لے کر آتا ہے یا خود بھابھی سے ملاقات کرنے آتا ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بھابھی کے پاس پستول ہے جس سے وہ انہیں قتل کرنا چاہتی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ان کے پاس ایسا کوئی ہتھیار نہیں شروع میں تو یہ باتیں بھابھی اور بھیا کے درمیان در پردہ ہوتی رہیں اور کسی کو پتہ نہ چلا مگر ایک روز بھیا ہمارے ہاں آئے اور سب لوگوں کو جمع کر کے اپنے شکوک کا اظہار کرنے لگے انہوں نے کہا کہ بھابھی کی والدہ اس سازش میں شریک ہیں۔ دونوں مل کر آدمیوں سے ملتی ہیں اور یہ کہ نوزائیدہ بچہ میرا نہیں ہے۔''

''وہ اکثر کام ختم ہونے سے پہلے ہی گھر آجاتے ہیں۔ سخت گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں اور آتے ہی بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ دل میں درد شروع ہونے لگتا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے اور عجب بے بسی کے عالم میں بھابھی سے کہتے ہیں ان کی فقط ایک ہی حسرت ہے کہ وہ ان باتوں کا خود اعتراف کرلے اور انہیں سب کچھ بتا دے جسے تمام لوگ جانتے ہیں جو ان سے ہی چھپایا جاتا ہے، آخر ایک روز بھابھی نے یہ سوچ کر حالت کہیں زیادہ خراب نہ ہو جائے اور شاید کچھ بتانے سے انہیں سکون مل سکے اپنے پاس سے ایک من گھڑت کہانی سنا دی۔ بھیا کی طبیعت بگڑ گئی۔ بھابھی کے رونے کا بھی ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں عورتیں بڑی مکار ہوتی ہیں اس طرح کی اوٹ پٹانگ باتوں کے بعد وہ بھابھی کو منانے لگتے ہیں اور معافیاں مانگتے ہیں اور آئندہ اس قسم کی باتیں نہ کرنے کا وعدہ کر کے بظاہر خوش وخرم دکھائی دیتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ گزرنے نہیں پاتا کہ وہی ڈھاک

کے تین پات۔''

جب سے سب کے سامنے الزام تراشی کی ہے بھابھی کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ جس کمرے میں وہ ہوں وہاں جانے سے ڈرتے ہیں مبادا کہ بھابھی ان پر اپنے ''دوستوں'' سے حملہ نہ کرادیں۔ ہم انہیں دماغی امراض کے شفاخانے میں لے گئے تھے جہاں انہیں بجلی کے جھٹکے دیئے گئے تھے۔ اس سے کچھ وقتی افاقہ ہوا اور وہ اپنی روش چھوڑ گئے لیکن اب پھر وہی پہلی سی حالت ہے بھابھی سے انہوں نے پھر علیحدگی میں باتیں کرنا شروع کردی ہیں اور خود کہتے ہیں کہ آؤ میں تمہیں تمہارے دوستوں سے ملالاؤں۔''

''سابقہ ہسٹری یہ ہے کہ شادی کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد بھیا کو بہت شدید ٹائیفائیڈ ہوا تھا۔ بخار تو اتر گیا، لیکن وہ ابا جان کے سامنے اول فول بکنے لگے ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ابا جان دوسرے بچوں کے مقابلے میں ان سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ بھابھی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کے نقطہ نظر میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ الٹا کہنے لگے کہ وہی انہیں ہمارے خلاف اکسایا کرتی تھیں۔ یہ سب غلط ہے بھابھی کا سلوک ہمارے ساتھ حد سے زیادہ اچھا رہا ہے انہوں نے ہمیشہ ہمیں خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔''

''بخار کے تھوڑے عرصے بعد بھیا پر ایک مقدمہ بن گیا۔ کاروباری سلسلے میں ان کی واقفیت ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو ہمارے شہر کا تھا۔ لیکن رہتا باہر تھا۔ جب وہ آیا تو بھیا کو دو مرتبہ ملا۔ کچھ عرصے بعد اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک شریف آدمی کی دوستی کے قابل نہیں ہے۔ اس نے اپنے محلے کی ایک لڑکی کو اغوا کر لیا تھا۔ بھیا نے اس آدمی سے تعلقات منقطع کر لئے اور کاروبار بھی ختم کر لیا۔ لیکن انہیں اس شخص کا ساتھ دینے کے الزام میں پولیس نے گرفتار کر لیا اور تقریباً ایک ہفتہ جیل میں رکھا۔ بعد ازاں اس آدمی اور لڑکی کے بیان پر کہ وہ بے قصور ہیں۔ رہا کردیا۔ اس حادثے سے وہ شدید خوف زدہ ہوئے۔ رات کو سوتے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے تھے اور ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے۔''

''مہینے میں دو تین مرتبہ ان پر خاموشی کا دورہ پڑنے لگا۔ ان دنوں بھابھی کے پوچھنے پر بھی بھیا خاموشی کی وجہ نہ بتاتے۔ دو تین دن بعد خود ہی ٹھیک ہو جاتے اور خوش باش نظر آنے لگتے۔ سوچنے کی اس قدر عادت تھی کہ ذرا سی بات بھی ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو پہروں سوچ میں گم رہتے آخر یہ راتوں کا جاگنا اور سوچ کی زیادتی رنگ لے آئی ان کی نیندیں اچاٹ ہوگئیں۔ وہ تمام رات سگریٹ پینے، سوچنے اور ٹہلنے میں گزار دیتے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بستر سے بھاگتے اور کہتے کہ میں گھر سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ آخر انہوں نے ایک رات اسی سوچ میں بھابھی پر تہمت لگائی اور کہنے لگے کہ دوست مجھے راستے میں روک کر حال پوچھتے ہیں کہ سناؤ بھابھی کا کیا حال ہے۔''

بھابھی کے متعلق ان کا وہم سراسر بے بنیاد ہے اگر دنیا میں پاکیزگی اور عصمت کوئی شے ہے تو بھابھی اس کا مجسمہ ہیں وہ بہت مضبوط اور عظیم کردار کی مالک ہیں۔ مجھے یقین ہے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ان کی

زندگی میں آنے والا کوئی مرد نہیں سوائے بھیا کے، وہ بالکل بے گناہ ہیں میں نے تمام باتیں لکھ دی ہیں، ہو سکے تو اس الجھن کا کوئی حل بتائیے۔

بہر حال یہ تمام کیسز ابنارمل صورت حال کے غماز ہیں خواتین کی عام بدگمانی کو ان پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

❁ حسد و رقابت:

حسد ایک مرض ہے اخلاقی و روحانی ہی نہیں نفسیاتی بھی اور نرگسیت کی ہی ایک شکل ہے۔ حاسد اپنی ذات کا پجاری ہے۔ وہ معاشرتی شعور سے بیگانہ، جیو اور جینے دو، کے ڈھنگ سے ناآشنا ہے وہ ہم چو ما دیگرے نیست'' کے زعم میں مبتلا ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ آئینہ دہر میں اس کا کوئی رقیب نہیں۔ مالی، جسمانی، یا دنیاوی اعتبار سے کسی کو ہم پلہ یا بلند مرتبہ دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے خواہ کوئی کتنے ہی اوصاف و محاسن کا حامل کیوں نہ ہو۔ وہ اعتراف نہیں کرتا۔ تنگ نظری اور تعصب کی بدولت اسے عیوب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ حاسدانہ چشمک نہ صرف اس کے قول و فعل سے عیاں ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات زہریلی سازشوں کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔

یہ نفسیاتی کمزوری خواتین میں اکثر نظر آتی ہے خواتین کی حاسدانہ یا رقیبانہ چشمک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تعلق ظاہر یعنی وضع قطع، لباس، نمود و نمائش، حسن جسمانی اور دولت وغیرہ سے زیادہ ہے اور باطنی اوصاف سے کم ہے اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نشانہ زیادہ تر اس کی اپنی جنس کے افراد ہی بنتے ہیں۔

حسد بنیادی طور پر احساس کمتری کی پیداوار ہے جو کسی عضوی کمزوری یا شخصی خامی کے خلاف کسی فرد کا حد سے بڑھا ہوا ردعمل ہے فرائیڈ کے مطابق عورت کے اس طرز عمل کا ماخذ بھی رشک قضیب ہے'' وہ احساس خفت جو اوائل حیات میں لڑکی کو عضوی کمزوری کی بنا پر اٹھانا پڑتا ہے وہ اس جذبہ حسد و رقابت کی اولین بنیاد ہے۔

والدین کا لڑکوں کے ساتھ ترجیحی سلوک اور ازاں بعد معاشرے کی پے در پے ناانصافیاں اس جذبے کو اس کے لاشعور میں رچا دیتی ہیں۔ نہایت گہرے لیکن لطیف پیرائے میں اس کا اظہار، خواتین کے گفتار و کردار، اعمال و افکار اور حرکات و سکنات سے مترشح ہوتا ہے۔ جس کی نمایاں علامات یوں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

❁ حد سے بڑھا ہوا جذبہ خود نمائی، ظاہر داری، دکھاوا اور اوچھا پن۔

❁ تصنع، بناوٹ اور جھوٹی نقالی، اپنے سے کمتر کو نگاہ حقارت سے دیکھنا، ہم رتبہ کی رفاقت سے بچنا اور برتر سے میل ملاپ بڑھانا اور مماثلت پیدا کرنا۔

❁ اولین ملاقات میں ہی اپنے دولت مند اقربا کے تذکرے اور خاندانی وجاہت کے فرضی قصوں کا تکرار۔

❁ غیروں کی ادنیٰ خامیوں کا سختی سے محاسبہ، بے رحمانہ تنقید، الزام تراشی اور خوبیوں کے اعتراف کے بجائے عیوب کی ٹوہ۔

خوشامد پسندی

خوشامد پسندی اگر چہ بشری کمزوری ہے لیکن یہ خواتین کی ایک غالب کمزوری بھی ہے محض چند توصیفی کلمات بھی تمام خواتین کو مبتلائے فریب کر سکتے ہیں البتہ زیرک اور دانش مند خواتین زیادہ لطیف، گہری اور شاطرانہ خوشامد سے متاثر ہوتی ہیں۔

خواتین کی یہ کمزوری صریحاً مردوں کے حق میں جاتی ہے جس سے وہ مقدور بھر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثر اس میں نفاست اور حکمت عملی سے کام لے کر مختلف ذہنی سطح رکھنے والی خواتین کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

خواتین کو یہ تصور دے کر کہ وہ عام عورتوں کی طرح ہرگز خوشامد نہیں ہیں محتاط خوشامدانہ الفاظ سے ان کی انا، اور نرگسی تمناؤں کی خوب تسکین ہو جاتی ہے۔ یا انہیں وہ کچھ ہونے کا تصور دیا جاتا ہے جو وہ اصل میں نہیں ہیں۔ جو ہونے کی تمنا رکھتی ہیں۔

انہیں لاثانی، یکتائے روزگار، بے مثل اور عالم بالا کی کوئی مخلوق بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ عام عورتوں میں ممیز اور بالاتر۔ حقیقی عمر سے کم تر اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہونے کا یقین دلایا جاتا ہے اور یوں انہیں خوب بنایا جاتا ہے۔ عورت کی اس کمزوری کو بھانپ لینا ہی مرد کی چالاکی ہے۔

بنیادی طور پر خوشامد پسند لوگ وہ ہوتے ہیں جو حب ذات میں ڈوبا ہوا نرگسی ذہن رکھتے ہیں جنہیں لاشعوری طور پر اپنی کسی کمی یا محرومی کا احساس ہوتا ہے جو حقائق سے چشم پوشی کا رجحان رکھتے ہیں جب کوئی توانا فرد ان کی چاپلوسی کرتا ہے تو ان کی انا کی تسکین ہوتی ہے وہ اپنی سادہ لوحی میں سمجھ نہیں پاتی کہ یہ ایک مردانہ چال ہے۔ دام تزویر ہے اور فقط ایک ڈھونگ

بعض ماہرین نسائیات بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ وہ اول اول غرور حسن میں کھوئی ہوئی کسی مرغوب خاتون کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کوئی تحقیر آمیز فقرہ چست کرتے ہیں زخم خوردہ خاتون پلٹ کر ردعمل کا اظہار کرتی ہے تو شاطر مرد حکمت عملی بدل کر بتدریج مائل بہ کرم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ کار غالب کے اس شعر کے مصداق ہے۔ ؎

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

خوشامد پسندی سے زیادہ خطرناک خودفریبی خواتین کے لئے کوئی اور نہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ خوشامد پسند انسان بنیادی طور پر غیر مخلص ہوتا ہے۔

مظلوم مردوں کے لئے نرم گوشہ

خواتین کی نگاہ التفات بالعموم جذباتی اعتبار سے مظلوم یا محروم مردوں پر فوراً پڑتی ہے مرد کی اس مظلومیت

کے تصور سے ان میں مظلومیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے مطلب براری کے لئے اکثر ریاکار مرد اپنی فرضی یا حقیقی مظلومیت کی ایسی دلسوز تصویر کشی کرتے ہیں کہ ان کا دل فوراً پسیج جاتا ہے وہ نجات دہندہ بن کر آگے بڑھتی ہیں تو انہیں یہ ہمدردی مہنگی پڑتی ہے۔

مقام حیرت یہ ہے کہ خواتین کی یہ ہمدردیاں زیادہ تر مظلوم جنس مخالف کے لئے ہوتی ہیں اس کے برعکس بعض اوقات وہ اپنی صنف پر بڑے سے بڑا ظلم روا رکھتی ہیں اور انہیں اس کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔

ماہرین نفسیات کا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ خواتین سماجی مرتبے سے کم ملنسار مرد کو بلند مرتبہ، مگر مغرور مرد کے مقابلے میں اپنے روحانی تصورات سے قریب تر پاتی ہیں۔ ملکہ رضیہ سلطانہ کا اپنے حبشی غلام یاقوت کے ساتھ خصوصی التفات اسی نفسیاتی کمزوری کا نتیجہ تھا۔

شخصی تعلقات میں خواتین کو یہ احساس کہ وہ حاکم ہیں اور مرد محکوم، وہ آقا ہیں اور مرد غلام، وہ پوجا کے لائق ہیں اور مرد ان کے پجاری ان کی نرگسی امنگوں کی تسکین کا باعث ہوتا ہے تاہم معاشرے کے محروم و بے نوا افراد کے ساتھ (خواہ ان کا تعلق مردوں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) شفقت و ہمدردی کے اس نسائی جذبے کو ہمیشہ غلط معنی دینا بھی مناسب نہیں۔

❁ ضعیف الاعتقادی

خواتین عموماً اوہام پرست واقع ہوئی ہیں وہ توہمات کی خالق ہیں اور مخلوق بھی۔ لاشعوری طور پر وہ کچھ طلسماتی اور معجزاتی تراکیب اور تدابیر کے تجسس میں رہتی ہیں جو چشم زدن میں ان کی جھولی خوشیوں اور مرادوں سے بھر دے۔ یہی انا یا تجسس پیروں فقیروں اور عاملوں کے آستانوں پر سرگرداں لئے پھرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ نرگسیت کی ہی ایک صورت ہے یہ امید، یہ تمنا اور حد سے بڑھتی ہوئی رجائیت کہ خارجی اسباب کسی نہ کسی طرح ان کی حسب خواہش ڈھل جائیں گے اور زندگی کی شب تاریک، سحر میں بدل جائے گی اپنی ذات سے غیر معمولی محبت کی آئینہ دار ہے۔ اپنی خوش کن آرزوؤں اور سہانے سپنوں کی سنہری جنت میں وہ اس وقت تک کھوئی رہتی ہیں۔ جب تک زندگی کے تلخ حقائق ان کے خیالی گھروندوں کو پاش پاش کر کے نہیں رکھ دیتے۔

پھر یکایک انہیں اپنی بے بسی اور لاچاری کا احساس ہونے لگتا ہے اور ان پر کھلتا ہے کہ حقائق وہ نہیں جن کا انہوں نے تصور کر رکھا تھا۔ چنانچہ شدید مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق وہ توہماتی سہاروں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں۔

خود ساختہ پیروں، فقیروں اور درویشوں کے کاروبار ان کے دم قدم سے چلتے ہیں۔ دور پرے دیہاتوں میں ان کی چوکھٹ پر اکثر محروم تمنا خواتین آنکھوں میں بے بسی کے آنسو لئے اپنی باری کی منتظر نظر آتی ہیں۔ پڑھی ہوئی الائچیوں، دم کئے ہوئے بتاشوں چھو منتر، تعویذ گنڈوں پر اندھا دھند اعتقاد رکھتی ہیں۔ یہ سب ٹونے ٹوٹکے پہنچے ہوئے پیروں، فقیروں اور عاملوں نے انہیں ہدیتاً مرحمت فرمائے ہوتے ہیں۔

بیگم اختر ریاض الدین اپنے سفرنامے ''سات سمندر پار'' میں رقم طراز ہیں کہ لینن کا مقبرہ اور سنیل کے نئے مذہب کی سرکاری درس گاہ ہے روسی عوام کے لئے اس سرکاری دیوتا کی سمادھی پر جانا ایک گہرا جذباتی تجربہ ہے۔

انہوں نے کئی روسی عورتوں کو لینن کے مقبرے پر اسی طرح خاموشی سے آنسو بہاتے، سر جھکائے مناجات کے عالم میں دیکھا جس طرح ہمارے یہاں خواتین خانقاہوں اور مزاروں پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ مشہور سائنس دان آئن سٹائن ایک مرتبہ سفر کے ارادے سے گھر سے نکلا تو کالی بلی نے راستہ کاٹ لیا۔ جس پر اس کی ہمشیرہ نے کہا کہ اسے سفر کا ارادہ ملتوی کرنا چاہئے لیکن آئن سٹائن نے یہ کہہ کر میں انسان ہوں چوہا نہیں۔ سفر کا ارادہ ملتوی نہیں کیا۔

گویا خواتین کی ضعیف الاعتقادی، مشرق و مغرب میں ایک قدر مشترک ہے۔

❁ مذہبیت

خواتین خواہ کسی ملک وملت یا رنگ ونسل سے تعلق رکھتی ہوں مذہب ان کا جز وحیات ہے۔ خدا پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے وہ پیدائشی پجاری ہیں۔ خدائے برحق تک ان کی رسائی نہ ہو تو وہ پتھر کے اصنام بنا کر ہی پوج لیتی ہیں۔ وہ روحانی خلا اور بے یقینی کی فضا میں زندہ نہیں رہ سکتیں۔

خدا ان کی پناہ گاہ، ایک روحانی ضرورت اور ایک بڑا نفسیاتی سہارا ہے۔ اس کی سرکار میں پہنچ کر انہیں ایک گونا تحفظ ملتا ہے شرف انسانی اور مساوات کا احساس ہوتا ہے۔ ظالم اور مظلوم، حاکم ومحکوم اور جنسی تفاوت کا احساس گراں بار ختم ہو جاتا ہے اور وہ مرد کے ساتھ خود کو برابری کی سطح پر کھڑا ہوا پاتی ہے۔ یہاں ان کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ یہ کیفیت حال انہیں تسکین قلب فراہم کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ کسی خاتون کے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ مکمل طور پر دہریہ یا منکر خدا ہو۔

یہ رجوع الی اللہ بہر حال ان کی سلیم الطبعی کی علامت بھی ہے اور اس ضعیف الاعتقادی سے یکسر مختلف ہے جو توہم پرستی سے عبارت اور مذہب کی بگڑی ہوئی صورت ہے اس کے برعکس رب کائنات پر ان کا یہ ایمان بالغیب جبلت انسانی کی فی البدیع متابعت کا مظہر ہے اور اس بنیادی آفاقی صداقت کا اعتراف بھی ہے۔ جس سے انحراف کی راہیں مردانہ انا کو تلاش کرتی آئی ہیں لیکن عورت نے شاذ و نادر ہی اس سے انحراف اختیار کیا ہو۔

مذاہب عالم کی تاریخ شاہد ہے کہ دعوت حق پر لبیک کہنے والوں میں خواتین کا شمار صف اول میں رہا ہے فقط یہی ایک ایسا مقام ہے جہاں وہ طواف وجود سے ہٹ کر طواف حرم میں سرگرداں نظر آتی ہیں۔

(بحوالہ: عورت کی نفسیات۔ ایم اے ملک)

ایڈی پس کمپلیکس

{OEDIPUS COMPLEX}

فرائیڈ نے یہ اصطلاح یونانی ڈرامہ نگار صفوکلیز کے ایک المیہ ڈرامے کے مرکزی کردار ایڈی پس سے مستعار لی ہے۔ کہانی یوں ہے کہ شہزادہ ایڈی پس کی پیدائش پر ماہرین نجوم نے پیش گوئی کی کہ نومولود بڑا ہو کر باپ کو قتل کرے گا اور اپنی ماں سے شادی رچائے گا۔

انتہائے غضب میں بادشاہ نے ایڈی پس کو جلادوں کے حوالے کر دیا لیکن جذبہ ترحم کی بنا پر وہ اسے قتل کرنے کی بجائے کہیں جنگل میں پھینک گئے۔ جہاں ایک گڈریئے اور اس کی بیوی نے اپنے بیٹے کی حیثیت سے اس کی پرورش کی۔ جوان ہو کر لڑکا بلاشبہ شہ زور اور جنگجو نکلا اور مار دھاڑ اور دنگا فساد کی وجہ سے امن عامہ کے لئے خطرہ بن گیا۔

بادشاہ یعنی اس کا باپ سرکوبی کے لئے نکلا تو لڑائی میں ایڈی پس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے ملکہ یعنی اپنی ماں سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے جس سے چار بچیاں پیدا ہوئیں۔ اس گناہ کی پاداش میں مملکت پر آفات و آلام کا نزول ہونے لگا۔ ماہرین نجوم سے رجوع کیا گیا۔ تو حقیقت حال آشکارا ہوئی اور بعدازاں واقعاتی شواہد سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ مقدر کے اس سنگین مذاق پر ایڈی پس کو اتنا شدید احساس جرم ہوا کہ اس نے اپنی آنکھوں کو پھوڑ ڈالا اور اندھا ہو گیا۔ جبکہ ملکہ نے خودکشی کر لی۔

ایڈی پس کمپلیکس کی ابتداء

فرائیڈ کے مطابق ایڈی پس کہانی ہر گھر میں دہرائی جاتی ہے اس نے تین برس سے چھ برس کے لڑکے لڑکیوں کے معصومانہ گفتار و کردار، خیالات و افکار اور خواب ہائے پریشاں کا تجزیہ کرنے کے بعد انکشاف کیا کہ عمر کے اس دور میں ہر لڑکا لڑکی ایک عجیب سی الجھن میں مبتلا ہوتے ہیں۔

علامات: لڑکا کسی گہرے لاشعوری جذبے کے تحت ماں کی طرف ایک انجانی سی کشش محسوس کرتا ہے اور اپنے معصومانہ خوابوں، خیالوں میں باپ کو اپنا رقیب سمجھتے ہوئے اس کو راہ سے ہٹانے کی تصوراتی خواہش رکھتا ہے اور ماں کو اپنا لینا چاہتا ہے جبکہ یہی کیفیت ادھر معصوم بچی کی ہوتی ہے وہ باپ کو اپنا محبوب سمجھتی ہے اور ماں کو رقیب تصور کرتے ہوئے اس سے پرخاش رکھتی ہے باپ کی محبت کو وہ اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتی ہے۔ فرائیڈ اس مادری، پدری، الجھن کو ایڈی پس کا نام دیتا ہے۔

پراعتماد والدین جن کے تعلقات باہمی اعتماد پر مبنی ہوتے ہیں اپنے اور اپنے بچوں کے لئے اس الجھاؤ کو نفسیاتی مسئلہ نہیں بننے دیتے وہ اسے بچوں کی فطرت کی ایک دلچسپ ادا سمجھ کر مشفقانہ نظرانداز کر دیتے ہیں اور

کسی ردعمل کا اظہار نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی ایسا قدم اٹھاتے ہیں جس سے ان کی الجھن میں اضافہ ہو۔ ماں بیٹے کو بیٹا سمجھتے ہوئے پیار تو دیتی ہے لیکن اپنا جذباتی سہارا محبوب یا اپنی محرومیوں کی تلافی کا ذریعہ نہیں بناتی بلکہ باپ بیٹے کے درمیان باہمی خلوص و محبت کا رشتہ مستحکم کرنے میں مدد دیتی ہے تاکہ باپ ہی کی طرح وہ مردانگی کا عمدہ نمونہ بن سکے اسی طرح باپ بیٹی کے ساتھ پیار تو کرتا ہی ہے لیکن وقار کے ساتھ والدین کا یہ متوازن طرز عمل بچوں کو ایڈی پس الجھن سے نکلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

لیکن بعض لڑکے لڑکیاں زیادہ تر ماں باپ کی نادانی کے سبب مادری پدری الجھاؤ میں دائمی طور پر پھنس کر رہ جاتے ہیں اور اس طرح دو انتہائی صورتیں جو بالعموم دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں

1۔ ماں اپنی ازدواجی زندگی کی کسی محرومی کی تلافی کے لئے یا شوہر سے انتقام کی لاشعوری خواہش کے تحت بچے کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھتی ہے اور باپ سے دور رکھنے کے لئے اسے خوف زدہ یا متنفر کئے دیتی ہے ادھر باپ اس الجھن کے لاشعوری محرکات سے بے خبر اندیشہ ہائے دور دراز میں کھو جاتا ہے اور مبتلائے حسد ہو کر بیٹے کے درپے آزار ہو جاتا ہے۔ جس سے اس کی شخصیت کچل کر رہ جاتی ہے اس کا اظہار بالعموم بچے کی مار پٹائی تشدد اور نفرت سے ہوتا ہے۔

2۔ باپ، بیٹی کی اپنے ساتھ جذباتی وابستگی کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتا رہتا ہے۔ بلکہ اس رجحان سے لاشعوری طور پر لطف اندوز ہونے لگتا ہے اور قطع نظر اس بات کے کہ بیٹی عمر کے اعتبار سے کتنی سیانی ہوگئی ہے اس کی ناز برداریوں میں کھویا رہتا ہے۔ ادھر ناسمجھ اور ناپختہ مزاج ماں جو اس صورت حال کا صحیح ادراک نہیں کر پاتی حاسدانہ چشمک کی بنا پر بیٹی کو اپنا رقیب سمجھنے لگتی ہے۔ رشک وحسد میں مبتلا ہو کر انتقام پر اتر آتی ہے۔ باپ بیٹی کی محبت کو برداشت نہیں کر پاتی۔ اسے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھ کر طرح طرح سے اس کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بے جا نکتہ چینی، لعن طعن، طنز و ملامت، حوصلہ شکنی، بددعا اور تاریک مستقبل وغیرہ کی پیش گوئی سے اس کا جینا حرام کر دیتی ہے۔ وہ صبر اور حوصلہ، وسعت قلب، عظمت فکر اور عفو و درگزر جو ایک جوان بیٹی کی باوقار ماں کا طرۂ امتیاز ہے ایسی ماں میں یکسر مفقود ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے ناسمجھ اور ناپختہ کار والدین لڑکے لڑکیوں کی جنسی زندگیوں میں لاتعداد الجھاؤ پیدا کر دیتے ہیں۔

لڑکوں پر مادری الجھاؤ کے اثرات

لڑکوں پر اس الجھاؤ میں دائمی طور پر پھنسے رہنے کے اثرات حسب ذیل پائے گئے ہیں۔

- ان کی جنسی یا جذباتی نشوونما رک کر رہ جاتی ہے یا ابنارمل صورت اختیار کر لیتی ہے۔
- عزم، حوصلے اور استقامت کی کمی واقع ہو جاتی ہے ہنگامی یا بحرانی حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے

بجائے بے بسی، لاچاری، گریہ وزاری اور خود ترسی جیسی کمزوریاں ان میں سرایت کر جاتی ہیں۔ بسا اوقات زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی کرکے آغوش مادر بلکہ رحم مادر میں جا کر چھپ جانے کو جی چاہتا ہے۔

- عمر بھر ماں کے پلو سے بندھے رہتے ہیں اور بعض اوقات اچھا خاصا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود طفل مکتب کی طرح ماں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ذاتی آراء نہیں رکھتے پسند و ناپسند میں اسی کے دست نگر رہتے ہیں۔ یہ سعادت مندی اور فرمانبرداری کسی مذہبی عقیدت کی بدولت نہیں بلکہ ماں سے کسی گہرے جذباتی تعلق خاطر کی بنا پر ہوتی ہے اور اسی عہد طفولیت کی یادگار ہے جب اپنی احتیاجات کے لئے وہ ماں ہی کا مرہون منت ہوا کرتے تھے۔
- ماں کے علاوہ کسی اور عورت کے ساتھ جذباتی وابستگی کی ان میں اہلیت ہی باقی نہیں رہتی، عمر بھر ماں کے ہمراہ تجرد کی زندگی بسر کرنے یا بہ تاخیر شادی کرنے کی وجہ سے ترجیحاً ایسی عورت کے ساتھ جو عمر میں ان سے بہت بڑی ہو یا جسمانی یا ذہنی اعتبار سے ماں کے ساتھ مشابہہ ہو کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا رجحان رکھتے ہیں گویا ماں اور بیوی دونوں کی صفات ایک ہی عورت میں دیکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال بالعموم ازدواجی عدم مطابقت پر منتج ہوتی ہے اور کئی نفسیاتی و جنسی عوارض کو جنم دیتی ہے ازدواجی تعلقات میں بالخصوص ایک انجانا سا احساس گناہ ہمیشہ انہیں دامن گیر رہتا ہے۔
- بالعموم وفا شعار شوہر ثابت نہیں ہوتے اور ازدواجی تقاضوں کو بنانے سے قاصر رہتے ہیں ماں اور بیوی کے درمیان شٹل کاک بنے رہتے ہیں۔ حالات اس وقت سنگین صورت اختیار کر لیتے ہیں جب بیٹا اکلوتا ہو اور ماں شوہر سے علیحدگی، بیوگی یا طلاق وغیرہ کی وجہ سے محرومی محبت کا شکار ہو۔ ایسی صورت میں بیٹے کو بہو کی طرف ملتفت پا کر وہ آتش زیر پا ہو جاتی ہے۔ مرنے مارنے اور طلاق دلوانے پر تل جاتی ہے۔

انتہائے ستم یہ کہ ایک بہو سے گلو خلاصی کے بعد کچھ یہی ڈرامہ آنے والی بہو کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ساس بہو کے بیشتر جھگڑوں اور خاندانی المیوں کے پس پشت معاشی اور معاشرتی محرکات کم اور نفسیاتی زیادہ ہوا کرتے ہیں۔

ذیل میں اسی کیفیت حال کا غماز ایک خط ہے جو اسی مادری الجھن میں مبتلا شوہر کی ایک نو بیاہتا بیوی نے مصنف کو لکھا ہے

''ایک ڈیڑھ برس ہوئے میری شادی میری ساس کی پسند کے مطابق ہوئی۔ میرے میاں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں اور عمر میں مجھ سے آٹھ دس برس بڑے ہیں۔ سنا ہے کہ اس سے قبل انہوں نے ایک شادی کی تھی لیکن میری ساس کے بقول لڑکی کا کردار اچھا نہ تھا۔ اس لئے طلاق پر منتج ہوئی۔ اس بات کا اندازہ تو مجھے ابتدا ہی سے ہو گیا تھا کہ میرے میاں اپنی امی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں اور ہر بات انہی کے مشورے سے کرتے

ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اکلوتی اولاد ہیں اور ان کے والد ان کی کمسنی میں وفات پا گئے تھے۔ اس لئے مجھے چنداں تعجب نہیں ہوا۔ اور میں ان کے اس طرزِ عمل کو بالکل فطری سمجھتے ہوئے ماں کے ساتھ ان کے غیر معمولی لگاؤ کو ان کی سعادت مندی پر محمول کرتی رہی۔ ادھر میں نے بھی کوئی کام کرنے سے قبل ہمیشہ ساس ہی کی رضا اور خوشنودی کو مدنظر رکھا۔ انہیں اپنی ماں کی طرح چاہا اور خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔"

وقت بیت رہا تھا کہ شامت اعمال مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی۔ ہوا یوں کہ میاں کو محکماتی کام کاج کے سلسلے میں ہر سال کہیں ایک آدھ بار ہفتے عشرے کے لئے بیرون ملک جانا ہوتا ہے شادی کے بعد جب بھی ان کا باہر جانا ہوا، ان کی والدہ ہی ان کی ہمسفر رہیں۔ اونچے اونچے غیر ملکی ہوٹلوں میں وہی ان کے ساتھ قیام کرتیں۔ یہ دستور ان کا بہت پرانا ہے۔"

گزشتہ بار میرے اصرار پر وہ مجھے ساتھ لیتے گئے۔ کیونکہ میں امید سے تھی اور طبیعت کچھ خراب رہتی تھی۔ سوچا کہ باہر ذرا چیک اپ بھی ہو جائے گا۔ دو ہفتے قیام کے بعد واپس آنا ہوا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ غالباً ماں سے انہوں نے میرے لئے اجازت طلب نہیں کی تھی۔ اس گناہ کبیرہ کا سزاوار مجھے ہی ٹھہرایا گیا۔ تلافی مافات کے لئے میں نے وہ سب کچھ کیا جو ممکن تھا۔ لیکن ساس کا پارہ تو گویا آسمان پر تھا۔ بول چال بند ہے۔ میاں کو میرے کمرے میں جھانکنے کی بھی اجازت نہیں۔ سوتے بھی اپنی امی کے پاس ہیں۔ ماں بیٹے میں کچھ کھسر پھسر ہوتی رہتی ہے۔ گھر کی فضا کشیدہ ہے خوف و ہراس، مسلسل بے خوابی اور ذہنی دباؤ سے میری صحت اس حد تک متاثر ہوئی کہ اسقاط حمل تک نوبت جا پہنچی۔ اس کی ذمہ دار بھی میں ہی ٹھہری۔ اب ایسی ناگفتہ باتیں سننے میں آ رہی ہیں کہ الامان الحفیظ۔ اپنے گھر کی بربادی کے سامان مجھے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔"

مادری الجھن کے بھنور میں گرفتار یہ ایک ایسے شوہر کا کیس ہے جس کے گرداب سے نکلنے کے لئے طویل اور گہرے نفسیاتی علاج معالجے کی ضرورت ہے ورنہ کئی زندگیاں برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔

ایسی صورت حال میں مردانہ تشخص الجھ کر رہ جاتا ہے۔ لڑکے کی نارمل جنسی نشوونما کے لئے یہ ضروری ہے کہ باپ کے ساتھ بیٹے کے مراسم نفرت کی بجائے محبت پر استوار ہوں۔ رقابت کی بجائے باپ اس کے لئے رشک کا نمونہ ہو۔ مردانہ اوصاف کے لئے پدری لطافت بیٹے کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ باپ سے متنفر اور ماں کی زلف گرہ گیر میں اسیر بیٹا، مردانہ تشخص کھو دیتا ہے اور زنانہ اوصاف اپنا لیتا ہے۔ جنسی کجروی ہم جنسیت، ہیجڑا پن اور مردانہ خصوصیت سے محرومی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ نوے فیصد نوجوانوں کی جنسی بے راہ روی کی جڑیں فرائیڈ کے نظریئے کے مطابق دور کہیں، ایڈی پس دور، میں چھپی ہوتی ہیں عصبی خرابیوں، پیدائشی یا خلقی کمزوریوں کا بہت کم ان میں دخل ہوتا ہے تاہم تحلیل نفسی کے ذریعے لاشعور میں دبی ہوئی الجھنوں کو اکھاڑ باہر کیا جائے تو نفسیاتی وجوہ کی بنا پر جنسی امراض میں مبتلا نوجوان نارمل جنسی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

اسی دور میں یعنی تین برس سے چھ برس کی درمیانی عمر میں اگر طلاق، وفات یا فرار کی بنا پر ماں دفعتاً زندگی سے نکل جائے تو ان تلخ حقائق سے بے خبر ہونے کی وجہ سے وہ اس ناخوشگوار صورت حال کو ماں کی طرف سے دھوکے بازی یا غداری پر محمول کرنے لگتے ہیں یا پھر اپنے ایڈی پس گناہوں کی پاداش تصور کرنے لگتے ہیں یہ دونوں تصورات عورت کے بارے میں ان کے نظریات کو متزلزل کرنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں تصورات عورت کے بارے میں ان کے نظریات کو متزلزل کر کے رکھ دیتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ایک خوف و ہراس اور عدم اعتماد ان کے ذہن میں سرایت کر جاتا ہے۔ بعدازاں ان کی زندگی میں آنے والی ہر عورت ان کی نگاہ میں مشکوک ہو جاتی ہے لہٰذا ردعمل کے طور پر دغابازی، بے وفائی، غداری اور زن بیزاری ان کا اپنا چلن بن کر رہ جاتی ہے۔ شکستہ گھروں سے تعلق رکھنے والے ایسے مرد ازدواجی زندگی میں استقامت کا اظہار عموماً کم ہی کیا کرتے ہیں۔

لڑکیوں پر پدری الجھاؤ کے اثرات

لڑکیوں پر اس پدری الجھاؤ کے اثرات حسب ذیل صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں:

- شادی اور محبت میں ایسے مردوں کو ترجیح دینے لگتی ہیں جو بڑی عمر کے ہوں یا زیادہ تر باپ سے مشابہہ۔ گویا اس طرح شوہر میں باپ اور شوہر دونوں کے اوصاف یکجا دیکھنا چاہتی ہیں۔
- شادی کے بارے میں کچھ موہوم خدشات رکھتی ہیں اور اس پر جلد رضامند نہیں ہو پاتیں۔ بابل کا گھر چھوڑنے کا تصور ان کیلئے سوہان روح ہوتا ہے۔ شادی بالعموم تاخیر سے کرتی ہیں اور جب کرتی ہیں تو دھیان ہر وقت میکے میں لگا رہتا ہے۔ سسرال میں پیش آنے والی بالعموم معمولی نوعیت کی مایوسیوں سے دل برداشتہ ہو کر فی الفور میکے کا رخ کرتی ہیں باپ کی کشش انہیں کہیں ٹکنے نہیں دیتی۔ ادھر باپ بھی ان کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتا رہتا ہے۔ ذرا سی تکلیف کی خبر پا کر سسرال والوں سے آمادۂ پیکار ہو جاتا ہے۔ ایسی لڑکیوں کو اگر طلاق ہو جائے تو اس میں بالواسطہ باپ کا ہاتھ ہوتا ہے۔
- باپ کے ساتھ رقابت بلکہ دشمنی کی صورت میں نمودار ہونے لگتی ہے۔ ماں بیٹی ایک دوسری کا وجود اس طرح ناقابل برداشت سمجھنے لگتی ہیں جس طرح دو سوکنیں، باپ خود بھی چہیتی بیٹی کا ساتھ دیتے ہیں اور اس طرح گھر جہنم زار بن جاتا ہے۔
- ماں سے نفرت اور باپ سے محبت لاشعوری طور پر بعض اوقات لڑکی میں مردانہ اوصاف کی نمو کا باعث بنتی ہے۔ اس کی عادات و اطوار، حرکات و سکنات، چال ڈھال میں کچھ مردانہ پن سا آ جاتا ہے اور نسوانی تشخص کھو کر رہ جاتا ہے۔ جس سے گوناگوں جنسی الجھنیں اور نفسیاتی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ جنسی طور پر بے راہرو، ٹام بوائے اور سیمیں ٹائپ کی مرد بیزار لڑکیاں جن کا جنسی تشخص مسخ ہو چکا ہوتا ہے بالعموم ایسی ہی الجھنوں میں مبتلا ہوتی ہیں۔ ذیل میں ایک خط دیا جا رہا ہے جو حال ہی میں مصنف کو طالبہ کی

جانب سے موصول ہوا ہے۔

''مجھے اپنی ماں سے نفرت ہے اتنی شدید کہ میں اکثر سوچتی ہوں ان کا گلا گھونٹ دوں۔ بار بار اس حدیث کو ذہن میں لاتی ہوں مگر کیا کروں کہ مجھے سوائے دوزخ کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اپنی تمام مشکلات کا باعث میں اپنی ماں ہی کو سمجھتی ہوں۔ میں ایک بزرگ خاتون کی حیثیت سے تو ان کا احترام کر سکتی ہوں لیکن ماں کیلئے جو پیار انسان کے دل میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک شائبہ بھی میں اپنے لئے نہیں پاتی۔''

میں جب اپنے بچپن پر نظر دوڑاتی ہوں تو دور ایک واقعہ پر میری نظر جم جاتی ہے۔ اس وقت میری عمر تقریباً سات آٹھ برس کی تھی۔ ابا جان روزانہ شام کو سیر کرنے جایا کرتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک دن میں دوڑتے دوڑتے گر گئی چونکہ پیٹ کے بل گری تھی۔ اس لئے پیٹ اور رانوں پر نیل پڑ گئے اور پھر میں یہ بات بیان بھی نہیں کر سکوں گی کہ امی نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ جس کے تصور ہی سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس نے ابا جان پر ایک عجیب الزام لگایا اور میرے معصوم ذہن میں نہ جانے کیا کیا تفصیلات بتا کر جنس کا تصور ڈال دیا۔ حالانکہ بات مجھ پر واضح نہیں تھی پھر بھی بہکانے پر نجانے میں نے کیوں کہہ دیا کہ ہاں میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔ غالباً ایک نئی بات کو اپنے اوپر لاگو کرنے کا شوق تھا۔''

''اس طرح میں نے اپنے ابا جان پر وہ الزام لگا دیا جو کسی عزیز پر بھی لگاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس صورتحال نے ابا جان کو شدید پریشانی میں مبتلا کر دیا اور یہ سوچ آج تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتی کہ میں مجرم ہوں اور مجھ سے یہ جرم کروانے والی میری ماں تھی۔ جو مجھ سے بے انتہا پیار کرتی ہے کیونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔''

''مجھے امی ہر لحاظ سے ابنارمل بنانے کی ذمہ دار ہے۔ انہوں نے بچپن سے مجھے ہر قدم پر عدم تحفظ کا احساس دلایا ہر وقت اپنے ساتھ چمٹائے رکھتیں حتیٰ کہ مجھے اکیلے کھیلنے گھر سے باہر جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ حد یہ کہ امی مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ ان کا یہ پیار ایک عذاب بن کر میرے گلے لپٹ گیا۔ میری پرستش اس طرح کی جاتی کہ میں کوئی مافوق الفطرت انسان ہوں۔''

ابا جان سے مجھے حتی الوسع دور رکھا گیا۔ ان کے سونے کے کمرے میں میرا جانا منع تھا۔ تاہم ابا جان مجھے بے حد پیار کرتے لیکن وہ خوف جوان سے متعلق میری ماں نے میرے ذہن میں بٹھا دیا تھا۔ وہ کبھی محو نہ ہو سکا۔''

''کافی عمر تک میری پرورش لڑکوں کے سے انداز پر کی گئی گھر میں مجھے ابا، امی دونوں لڑکوں کے نام سے پکارتے تھے۔ محلے میں میرے ہم عمر لڑکے بہت تھے۔ اور میں اکثر انہی کے ساتھ کھیلا کرتی۔ جسے دیکھ کر امی بہت خوش ہوتیں۔ لڑکیوں سے کھیلنے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ادھر لڑکوں کے والدین میرے ساتھ ان کا کھیلنا پسند نہ کرتے تھے۔ اس لئے بہت جلد مجھے محسوس ہوا کہ میں تنہا رہ گئی ہوں اور اس تنہائی کا مداوا میں نے کتابوں میں گم ہو کر کیا۔''

میرا سارا وقت رسائل و کتب پڑھتے گزرتا۔ اس وقت میری عمر سات آٹھ سال ہو گی جب میں نے پہلی دفعہ منٹو کے افسانوں کا مجموعہ پڑھا۔ انہی دنوں میرا ماموں زاد بھائی جو میرا ہم عمر تھا۔ ہمارے گھر آیا ہوا تھا۔ ہم دونوں سر جوڑ کر مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے مگر پلے کچھ نہ پڑتا۔ جب امی کو سمجھانے کے لئے کہا تو انہوں نے نہایت سختی سے ڈانٹ دیا کہ ایسی کتابیں پھر نہ پڑھنا۔ مگر نہ جانے کیوں جب بھی مجھے کسی بات سے منع کیا گیا۔ وہ میں ضرور کرتی ہوں۔ چاہے اس کے لئے مجھے بعد میں بہت کچھ گنوانا پڑے۔ چنانچہ اب یوں ہونے لگا کہ میں کتابیں اپنے بستے میں باندھ کر سکول لے جاتی اور کلاس میں بیٹھ کر پڑھتی رہتی۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں اردو ادب کے اکثر مشہور ادیبوں کی نگارشات پڑھ چکی تھی۔ لیکن اکثر نکات ان میں ایسے تھے جن پر آ کر میرا ذہن بھنور بن جاتا تھا۔''

''بات کرتی تو کس سے؟ میری اسکول کی سہیلیاں ذہنی طور پر مجھ سے بہت الگ تھیں وہ افسانے پڑھنا اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنا جرم سمجھتی تھیں۔ جبکہ میں لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں کی محفل میں خوش رہتی تھی۔ امی کے ساتھ بات کرنا اپنی بے عزتی کروانا تھا۔ ہاں ابا جان بے شک ادبی ذوق کے مالک تھے اور خاصے کشادہ ذہن رکھتے تھے۔ لیکن امی نے مجھے ایک دن بھی اکیلے ان کے پاس نہیں بیٹھنے دیا۔ اگر بیٹھ جاتی تو خفا ہوتیں اور ابا جان کو کہتیں کہ آپ میری بیٹی کو بگاڑ رہے ہیں۔''

''ایسی صورت میں صرف ایک ساتھی میرا ماموں زاد پرویز تھا۔ وہ اور میں بیٹھ کر افسانوں پر الٹی سیدھی بحث کرتے۔ مگر امی سے چوری۔ جب امی اسکول جاتیں تو ہم تھوڑی دیر بات کر لیتے کیونکہ ان کے سامنے تو میں اگر بچگانہ کھیلوں مثلاً پتنگ بازی یا لڈو وغیرہ کھیلنے میں مصروف رہتی تو وہ بے حد خوش رہتیں اور جہاں انہوں نے مجھ سے کوئی سنجیدہ بات سنی فوراً مجھے ڈانٹ دیتی۔ میں اب جسمانی طور پر بالغ تھی۔ مگر امی چاہتی تھیں کہ میں بچوں جیسی حرکتیں کروں۔ چنانچہ ہوا یوں کہ میں نے اپنے بڑے پن کے اظہار کا ایک اور ذریعہ ڈھونڈ لیا۔''

''ہمارے گھر میں ایک شخص کرایہ دار کی حیثیت سے آ کر رہنے لگا۔ یہ دوسرا مکان ہمارے رہائشی مکان کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کی اور وہ میرے اعصاب پر چھا گیا۔ حالانکہ اس کی تعلیم بہت کم تھی اور ذہنی طور پر بھی وہ مجھ سے کم تھا مگر میں نے اسے اپنی بڑائی کی سند جانا کہ میرا ایک محب بھی ہے چنانچہ میں اکثر گھر سے اسکول جاتی اور کتابیں وہیں چھوڑ کر اس شخص سے ملنے پہنچ جاتی۔ اب نجانے یہ اس کی شرافت تھی یا میری طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی تھی کہ کوئی ناگوار صورتحال پیدا ہوئے بغیر یہ سلسلہ چار سال تک چلتا رہا۔''

جب میں ایف۔اے سیکنڈ ایئر میں پہنچی تو مجھے احساس ہوا کہ اب مجھے اس شخص کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ اب تو میں اپنے پروفیسروں کے ساتھ ان ادب پاروں پر بحث کر سکتی تھی جن کا پڑھنا امی نے گناہ قرار دیا تھا۔ (واضح رہے کہ میرا ذریعہ تعلیم مخلوط تھا) چنانچہ میں نے اس شخص کو صاف کہہ دیا کہ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔

اس پر وہ دل برداشتہ ہو کر کسی اور شہر چلا گیا۔ کہاں؟ یہ مجھے علم نہیں۔ بہر حال کچھ عرصہ ایسے ہی گزرا۔ مگر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میرے اندر کوئی کمی ہے۔ میں کوئی ساتھی چاہتی تھی۔ ذہنی ساتھی اور میرے نزدیک ذہنی سہارا صرف ایک لڑکا ہی بن سکتا ہے۔ میں کسی بھی مرد کو اپنے سارے خیالات سے آگاہ کر سکتی ہوں مگر کسی لڑکی کے ساتھ دو فقرے بولنا دشوار ہو جاتا تھا۔ میں لڑکوں کی محفل کی طرف بے اختیار کھنچی چلی جاتی ہوں جس محفل میں مرد نہ ہوں وہ مجھے سونی سونی نظر آتی ہے۔''

یہ سب باتیں اپنی جگہ درست مگر مجھے مرد اور عورت کے ازلی تعلق سے نفرت ہے۔ نہایت کراہت آمیز تصور ہے میرے لئے کہ ایسا تعلق کسی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور لڑکا میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے مجھے بڑا انٹلکچوئل قسم کا خط لکھا اور پھر رفتہ رفتہ یہ بھی ہونے لگا کہ میں اور وہ گھنٹوں ادبی بحثوں میں گم رہتے اور ایک دن اس نے اظہار محبت کر دیا۔ اس پر میرا جی چاہا کہ میں اس کے جوتا کھینچ ماروں، لیکن میں چپ چاپ اٹھ کر آ گئی۔ پھر اس کے بعد تین چار بار ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ میں دوست کی تلاش میں کسی سے ملتی ہوں اور وہ عاشق نکل آتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دنیا میرے نظریات اور خیالات کو فراڈ سمجھتی ہے مجھے کئی بار کئی لوگ جتلا بھی چکے ہیں کہ میں فلرٹ کرتی ہوں مگر مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں اور جب بھی کوئی نیا الزام سنتی ہوں تو میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر اس ماں کا گلا گھونٹ دوں جس نے میری ذات کو یوں دو حصوں میں بانٹ دیا۔''

''امی کو نہ جانے کیوں وہم ہو گیا ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ ابا جان نے امی کو بہت پیار دیا ہے لیکن وہ اب بھی یہی سمجھتی ہیں کہ یہ سب فراڈ ہے۔ انہوں نے میرے ذہن میں یہی ٹھونسنے کی کوشش کی ہے کہ کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ اب مجھے ساری دنیا اپنی دشمن نظر آتی ہے۔ بعض اوقات بیٹھے بیٹھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا میرے مقابلے میں بہتر ہے اور میں سارے جہاں سے کمتر ہوں۔''

''میری امی اپنے وقت کی کافی خوبصورت عورت تھیں وہ اکثر اپنے حسن کا تذکرہ کیا کرتی تھیں۔ میں معمولی شکل کی ہوں میری کبھی کسی نے تعریف نہیں کی۔ جب بھی میں نے کوئی نیا کام سیکھنے کی کوشش کی۔ امی نے اس کی مخالفت کی۔ مثلاً میں جب کشیدہ کاری کرنے بیٹھتی ہوں تو یہ کہہ کر اٹھا دیتیں کہ تمہاری صحت پر برا اثر پڑے گا۔ کھانا پکانے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ تم نہیں پکا سکتیں، حالانکہ میں جو کچھ سیتی پروتی یا پکاتی ہوں اس کی تعریف ہی ہوتی ہے لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔

''مجھے وہ لوگ بہت خوش قسمت نظر آتے ہیں جن کی مائیں، بہنیں ہوتی ہیں۔ لیکن خود میرا جی چاہتا ہے کہ میرے بچے ہوں اور اس کے ساتھ یہ خیال بھی کہ یہ بچے کسی مرد کے توسط کے بغیر مجھے مل سکیں۔ لیکن بظاہر ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے میری شدت سے آرزو ہے کہ میں شادی کے فوراً بعد بیوہ ہو جاؤں۔''

اکثر احساس ہوتا ہے کہ میرے اندر کوئی ایسی بات ہے جو اور سب میں نہیں، اور یہ یا تو بہت بری ہے یا بہت

اچھی۔ جانے کیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بعض اوقات جی چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں۔ آخر اس دنیا میں میرا مصرف ہے ہی کیا۔ ایک بدصورت اور کند لڑکی کی کیا ضرورت ہے دنیا کو اور اس کے ساتھ ہی میرا ضدی پن ابھر آتا ہے کہ نہیں میں ضرور جیوں گی۔ ذہن ہر وقت جیسے چکی کے دو پاٹوں میں پستا رہتا ہے۔''

کبھی کبھی شدت سے یہ آرزو ہوتی ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں یا مجھے ٹی بی ہو جائے اور میں گھل گھل کر ختم ہو جاؤں۔ افسانے لکھتی ہوں تو ایسے زہرناک کہ پڑھنے والے حیران ہو کر مجھے دیکھتے ہیں اتنا زہر مجھ میں جانے کہاں سے آیا ہے۔ پتہ نہیں دنیا کے ہر فرد سے میں کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر شخص میرا دشمن ہے کسی کے لئے بھی پیار کا جذبہ دل میں نہیں ابھرتا۔ نہ ابھر سکتا ہے''

اکثر سفر کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ ایکسیڈنٹ ہو جائے مگر ایسا کہ مجھے بہت ساری چوٹیں آنے کے باوجود کوئی خطرناک چوٹ نہ آئے یا سیڑھیوں سے گر کر میرا سر پھٹ جائے مگر کبھی پھسلی تک نہیں۔ کسی دوسرے کا خون بہتا دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ مگر اپنا خون بہتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ایک عجیب قسم کا سکون ملتا ہے۔ جب کبھی کسی بات پر غصہ آتا تو تھوڑی دیر کے بعد جی چاہتا ہے کہ کوئی کانچ کی چیز مٹھی میں پکڑ کر دباؤں اور وہ کرچی کرچی ہو جائے۔''

اگر کوئی شخص مجھے چاہے تو اس سے دور بھاگتی ہوں لیکن جب وہ مجھ سے دامن بچائے تو یہ میری خودداری کے لئے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ اجنبی مجھے اچھے لگتے ہیں۔ مگر جب وہ اپنے بن جائیں تو میرے دل میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں رہتی۔ نہ جانے میرے مزاج کا تلون مجھے کہاں لے جائے گا۔''

مکتوب بالا کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لڑکی الجھے ہوئے جنسی تشخص کا ایک کیس ہے اس کی اس افسوسناک صورت حال کی زیادہ تر ذمہ دار اس کی انتہائی خودغرض، عاقبت نااندیش اور جذباتی اعتبار سے ناپختہ کار ماں ہے جو کسی گہرے عدم تحفظ کا شکار ہے۔ اس بات کا احساس مکتوب نگار کو بھی ہے جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہے کہ مجھے امی ہی ہر لحاظ سے ابنارمل بنانے کی ذمہ دار ہیں۔''

گو کہ کچھ ذمہ داری اس میں اس کے باپ کی بھی ہے تاہم امر واقعہ یہی ہے کہ ماں، باپ کے ساتھ بچی کے معاملے میں رقابت میں مبتلا ہے اور وہ بھی کسی ایسے نازک دور میں ایڈی پس دور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جو بچوں میں جنسی تشخص ابھرنے کا دور تصور کیا جاتا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے باپ نے بچی کی فطری وابستگی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے ورغلانے کی کوشش کی جس سے ماں کو تشویش لاحق ہوئی کہ وہ کہیں اسے اکلوتی بچی کی محبت سے محروم کر کے اسے بالکل یکہ وتنہا نہ کر دے چنانچہ آتش حسد نے نسوانی طرز عمل کے عین مطابق محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے کے مصداق ایک بھرپور وار کیا اور ایک ایسے الزام اور اتہام کی مرتکب ہوئی جس کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے نہ صرف بچی کو باپ سے دور کیا بلکہ اس سے شدید متنفر اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ مزید

برآں اس نے بچی کو تشنہ تکمیل آرزوؤں کا آلہ کار بھی بنانا چاہا۔ یقیناوہ ایک بیٹے کو جنم دینا چاہتا تھا جو اس کو احساس تحفظ فراہم کرتا لیکن یہ آرزو نہ برآئی تو اس نے بیٹی ہی کو بیٹے کی طرح پرورش کرنے کا اہتمام کیا مگر ساتھ ساتھ اسے یہ فکر بھی دامن گیر رہی کہ وہ کہیں بڑی ہو کر مد مقابل نہ بن جائے لہذا اسے بچہ بنائے رکھنا چاہا اور ہردم احساس عدم تحفظ دلائے رکھتا۔

ملاحظہ کیجئے۔لڑکی کا بیان کہ ''اسے ایک لمحے کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جاتا اور اپنے ساتھ چمٹائے رکھا جاتا۔'' یہ بچی کی ذہنی اور جذباتی نشوونما کی فطری راہیں مسدود کرنے کی خطرناک کوششیں تھی اس کی کردار کشی تھی۔ لاشعوری طور پر ماں کا یہ طرز تربیت پیار کے پردے میں دشمنی کے مترادف تھا۔ پھر جیسا ہر بچہ پیار کے استحصال سے لاشعوری طور پر باخبر ہوتا ہے۔ یہ بچی بھی ماں سے متاثر ہونے کے بجائے متنفر ہوتی چلی گئی۔ نتیجتاً نسوانی سانچے میں ڈھلنے سے قاصر رہی۔ نفسیاتی اعتبار سے بچہ اس سانچے میں ڈھلتا ہے۔ جسے وہ چاہتا ہے نفرت انگیز ماں ہو یا باپ اس سے مماثلت بھلا کون چاہے گا۔

ادھر حیاتیاتی طور پر ناممکن ہے کہ کوئی لڑکی مردانہ تشخص اختیار کر سکے خواہ اس کی تربیت کتنی ہی مردانہ کیوں نہ ہوئی ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ ''ٹائم بوائے'' بن سکتی ہے۔ ایسی خلاف وضع تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکا تو وہ بن نہ سکی البتہ لڑکی بھی نہ رہی۔

کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا

اس پر ستم بالائے ستم کہ باپ بیچارہ مردانگی کا انتہائی ناقص بلکہ قابل رحم حد تک نامکمل نمونہ ثابت ہوا۔ ماں کے استحصال سے بچی کو نجات نہ دلاتا تو درکنار وہ خود گھر میں سراسیمہ سا ہو کر دبک گیا۔ بیوی نے اس پر انتہائی گھٹیا اتہام باندھا اور وہ چپ رہا۔ مادر مہربان کی نوازشات کی بدولت لڑکی عورتوں کی صف سے تو نکل ہی چکی تھی۔ کمزور اور بزدل باپ بھی اس کے لئے وجہ کشش نہ بن سکا۔ انتہا یہ کہ اس زندگی میں آنے والے دوسرے مرد بھی باپ کی مانند بزدل اور جھینپو قسم کے واقع ہوئے چنانچہ لڑکیوں کی صحبت اسے گوارا تھی ہی نہیں۔ مردوں کے بارے میں بھی اس کے دل میں گہری نفرت کارفرما ہوگئی بلاشبہ ان تمام عوامل نے مل جل کر اسے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں ؎

هم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مذکورہ بالا لڑکی کے افکار و اعمال میں ایک اور نفسیاتی الجھن بھی کارفرما ہے۔ یہ کاسٹریشن کمپلیکس ہے۔ جس سے ایڈی پس دور میں اکثر لڑکیاں دوچار ہوتی ہیں والدین کا رویہ اس دور میں بچے بچیوں کے ساتھ تفریق وامتیاز پر مبنی ہو تو یہ الجھن گوناں گوں پیچیدگیوں کی صورت میں بچیوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔

(بحوالہ: عورت کی نفسیات، ایم اے ملک)

عورت کی صحت وتندرستی کے راز

حسن اور خوشنمائی سے دل چسپی ہونا انسان کے لئے ایک طبعی اور قدرتی بات ہے اور دنیا بھر میں ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جسے حسن سے کوئی دل چسپی نہ ہو اور جس کے دل کو خوبصورت اور خوشنما چیزیں اپنی طرف نہ کھینچیں۔ لیکن یہ بات کس قدر تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے کہ اس قدر عالمگیر مقبولیت حاصل ہونے کے باوجود آج تک کسی زبان میں حسن کی کوئی جامع تعریف نہیں کی گئی اور حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی کو سمجھانا چاہیں کہ حسن کیا چیز ہے تو چند سطروں میں تو کیا چند صفحات میں بھی اس کی تعریف بمشکل سما سکے گی۔

ضرورت آرائش جسم: مکان کی آرائش کا سامان اگر ایک خاص ترتیب اور خاص قرینے سے رکھا ہوا ہو تو وہ حسن میں داخل ہے لیکن اگر وہی سامان بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر پھیلا پڑا ہو تو حد سے زیادہ بدنما اور مکروہ ہو جائے گا۔ لیکن اس بناء پر ہم پھر بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ حسن درحقیقت ترتیب اور قرینے کا نام ہے کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ بہترین چیزیں ایسی ہیں کہ وہ مرتب صورت کی جگہ اپنی پریشان حالت میں زیادہ حسین نظر آتی ہیں چنانچہ ہندوستان کے شاعروں کی غزلیں "زلف پریشاں" کی تعریف سے بھری پڑی ہیں۔

بھرا ہوا جسم: جسم کا گداز پن اور بھرا ہوا ہونا انسان میں بھی حسن خیال کیا جاتا ہے اور جانوروں میں بھی۔ لیکن یہی گداز پن اگر ذرا ترقی کر جائے یا یہ کہ جسم کا کوئی حصہ گداز ہو، کوئی لاغر، تو انتہائی بدنمائی اور بدصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بڑی بڑی آنکھیں خوبصورت ہوتی ہیں۔ لیکن ہر شخص نے بہت سی آنکھیں ایسی بھی ضرور دیکھی ہیں۔ جو خوب بڑی ہونے کے باوجود بری معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کو "بیل کی سی آنکھیں" یا "پھٹی پھٹی آنکھیں" کہا جاتا ہے۔ لمبا اور کشیدہ قد مسلمہ طور پر حسن کی ایک علامت ہے لیکن ہزاروں انسانوں کو اس لمبے قد کی بدولت "لمبے بے ڈول" کا خطاب ملا کرتا ہے اور "کل طویل احمق الا عمر" والی بات ان پر کہی جاتی ہے۔

حسن کی تعریف: ان دقتوں اور ان تمام دشواریوں کے باوجود ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں نے حسن کی تعریف مقرر کرنے کی کوششیں کی ہیں اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جہاں تک انسانی حسن کا تعلق ہے وہاں تک بلاخوف وتردد کہا جا سکتا ہے کہ "تندرستی" اور جسم کی متناسب نشوونما کو اس میں بڑا دخل ہے اگرچہ خال خال ہی ایسے انسان بھی مل سکتے ہیں جو تندرستی اور تناسب اعضا کے بغیر محض اپنے چہرہ کے خط وخال کی بدولت بدصورت نہیں کہے جا سکتے۔ تاہم ان کا بھی شمار خوبصورتوں میں نہیں ہو سکتا اس سے یہ بے شک نہیں کہا جا سکتا کہ صرف تندرستی اور صرف تناسب اعضاء کا نام حسن ہے۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بغیر ان دو چیزوں کے کسی شخص کو اور خصوصاً کسی عورت کو حسین نہیں کہا جا سکتا اور اس بنا پر یہ کلیہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہمارے چہرہ میں خاص بدنمائی موجود نہیں ہے تو ہم تندرستی اور تناسب اعضا پیدا کر کے اپنے آپ کو حسین بنا سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حسین بننے

کی آرزو ہر دل میں موجود ہے اور بدصورت سے بدصورت آدمی بھی آئینہ میں اپنی شکل دیکھنے اور پھر اپنے لباس کو ذرا درست کرنے یا مونچھوں پر تاؤ دینے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بلکہ عورتوں کو خصوصیت کے ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی سیرت میں خوبیاں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے جسم اور اپنی صورت میں بھی زیادہ سے زیادہ حسن اور دلکشی پیدا کریں۔

تندرستی خود ایک حسن ہے: تندرستی کے بغیر عورت کی ہر آرائش بے کار ہے۔ کسی بیمار اور نحیف و نزار عورت کو قیمتی لباس اور بیش بہا زیوروں سے آراستہ کر کے دیکھو۔ یہ معلوم ہو گا کہ کسی لکڑی کو دلہن بنا دیا ہے۔ اس کے برخلاف ایک تندرست عورت کی حالت پر غور کرو اس کی پیشانی ہموار اور درخشاں ہے۔ اس کے رخساروں سے صالح خون کی سرخی جھلک رہی ہے اس کی مصفا گردن کو نہ مرصع ہار کی ضرورت ہے نہ طلائی چمپا کلی کی۔ اس کے سڈول دست و بازو، آرسی کنگن اور بازو بند کی آرائشوں سے بے نیاز ہیں۔ تندرستی نے اس کو ایسی جامہ زیبی عطا کی ہے کہ کم قیمت لباس میں بھی جب وہ زیب تن کرتی ہے تو وہ بیش بہا بن جاتی ہے سادہ پوشاک میں وہ دلہن معلوم ہوتی ہے۔ دیکھنے والے کا دل اس کی طرف کھنچتا ہے۔ غرض کہ تندرستی بجائے خود ایک حسن ہے اور سب سے بڑی مشاطہ حسن۔

تندرستی قائم رکھو: عورت کو ہمیشہ اپنی تندرستی قائم رکھنی چاہئے۔ اگر تندرستی جاتی رہی ہے تو اس کے دوبارہ حاصل کرنے کی بے حد کوشش کرو۔ بلکہ لباس کی فکر نہ کرو۔ زیور کے لئے جان نہ کھپاؤ۔ تندرستی ان دونوں سے زیادہ قیمتی ہے اس نعمت عظمیٰ کو جس قدر اور جس طرح ممکن ہو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ایسے لوگوں پر افسوس ہے جو ایسی ضروری اور قیمتی چیز سے غافل ہیں ان روپے پیسے اور زیور کا جتنا خیال ہے اس کا عشر عشیر بھی تندرستی کے متعلق نہیں ہے۔ ایک عورت جو تندرست نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے شوہر کا دل مسخر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ اپنے فرائض اور واجبی خدمات بجالانے سے قاصر ہے۔ وہ خانہ داری کے انتظام پر بھی قادر نہیں ہو سکتی۔ اور وہ تندرست بچوں کی ماں بھی نہیں بن سکتی۔ اس کا خوش مزاج ہونا ناممکن ہے۔ اس کی زندگی خود اس کے لئے اس کے شوہر کے لئے، اس کی اولاد کے لئے بلکہ خاندان کے لئے وبال ہے اور تندرست نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی بے لطف بنا رہی ہے۔

تدابیر تندرستی: سب سے پہلے عورتوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ بقاء تندرستی کی تدابیر کیا ہیں۔ کونسی باتیں ان کو کرنی چاہئیں اور کونسی باتوں سے ان کو پرہیز لازم ہے؟ اس جگہ مختصر طور پر چند ضروری امور لکھے جاتے ہیں ان کو جان لینے کے بعد اور جن پر عمل کرنے کے بعد بڑی حد تک تندرستی کی حفاظت ہو سکتی ہے اور صحت قائم رہ سکتی ہے۔ تندرستی کے اصول اور حفظان صحت کے قواعد کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

گھر: اول تو ہمیشہ ایسے مکان میں رہو، جو صحت بخش ہو یعنی مکان ہوادار اور روشن ہو جس میں ہر وقت تازہ ہوا آتی رہتی ہو۔ مکان کی دیواروں اور فرش میں سیل نہ ہو۔ پانی احتیاط سے گرایا جائے۔ باورچی خانہ کا دھواں

سارے گھر میں نہ گھلے۔ مکان میں کافی دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان ہوں۔ جائے پاخانہ مناسب فاصلہ پر ہو اور ہمیشہ صاف رکھا جائے۔ گھر کا سامان صاف ستھرا رہے۔ میلے کپڑے، جھوٹے برتن اور اسی طرح کی دیگر اشیاء اسی طرح نہ رکھی جائیں کہ ان سے بدبو پھوٹے اور ہوا میں گندگی پیدا ہو۔ سال میں دو تین بار دیواروں پر سفیدی کرانی چاہئے۔ اگر مکان کا فرش پختہ ہو تو اسے جلد جلد دھونا چاہئے۔

کھانا پینا: کھانے پینے کا بہت بڑا اثر تندرستی پر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ بڑی حد تک تندرستی غذا پر موقوف ہے کھانے پینے کے معاملے میں دو ابہت اہم باتیں ہیں ان کو ہمیشہ اپنی نگاہ میں رکھنا چاہئے۔ ایک تو یہ کہ جہاں تک ہو سکے ثقیل، دیر ہضم اور ایسی غذاؤں سے جن کا ناقص ہونا مسلمہ ہے پرہیز کیا جائے اور دوسری بات یہ ہے کہ جب تک شدید بھوک محسوس نہ ہو اس وقت تک غذا نہ کھائی جائے۔ بہت سی غذائیں ہیں جو رگوں میں اچھا خون پیدا کرتی ہیں، بہت سی غذائیں ہیں جن سے جلد کا رنگ نکھرتا ہے۔ بہت سی غذائیں ہیں جو جلد کو بد رنگ اور کثیف بھی بناتی ہیں۔

کپڑے:

لباس کا بھی تندرستی پر خاص اثر پڑتا ہے ایک تو لباس تنگ نہ ہو کیونکہ اس سے دوران خون رکتا ہے۔ دوسرے موسم کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ موسم کے خلاف لباس پہننے سے سردی یا گرمی تندرستی کو نقصان پہنچاتی ہے جلد کا رنگ خراب ہو جاتا ہے میلا کچیلا لباس بھی مضرت کا باعث ہے، غرضیکہ کپڑے صاف ستھرے، ڈھیلے ڈھالے اور موسم کے مطابق ہونے چاہئیں۔

سونا اور جاگنا:

نیند کا تندرستی کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ اعتدال کے ساتھ جاگنا اور سونا تندرستی پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔ زیادہ سونا تندرستی کے لئے مضر ہے۔ ان باتوں سے غذا اچھی ہضم نہیں ہوتی اور معدہ کو نقصان پہنچتا ہے اور تندرستی کا قائم رہنا دشوار ہے اسی طرح ضرورت کے وقت آرام نہ ملنے سے بھی صحت میں فتور آ جاتا ہے اور جسم کی خوش نمائی کو نقصان پہنچتا ہے۔

نہانا:

صحت قائم رکھنے کے لئے نہانا بھی نہایت ضروری ہے۔ جلد جلد غسل کرنے سے بدن گرد و غبار اور کدورت سے پاک وصاف رہتا ہے روزانہ ایک مرتبہ غسل کرنا چاہئے۔ نہانے سے تروتازگی پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ روزانہ نہ نہا سکیں ان کو ہفتہ میں تین بار نہانا چاہئے۔ جو لوگ مدتوں تک نہیں نہاتے ان کے بدن کے مسامات بند ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

غریب عورتوں کی ورزش: ورزش سے بھی تندرستی قائم رہتی ہے غریب عورتوں کی ورزش یہی ہے کہ وہ اپنے گھر میں چلتی پھرتی رہیں اپنے گھر کے کام کاج میں مصروف رہیں

غم کو پاس نہ آنے دو: تندرستی قائم رکھنے کیلئے یہ بات بھی بڑی ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے غصہ، اور غم اور فکر کو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیا جائے کیونکہ یہ تینوں باتیں انسان کی صحت کی دشمن ہیں۔ خوش باش اور بے فکرے لوگوں کی صحت عموماً اچھی رہتی ہے خوش مزاج آدمی بھی ہمیشہ تندرست رہتا ہے۔

کھلی اور صاف ہوا: چہرہ پر خون کی سرخی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ کھلی اور صاف ہوا میں سانس لینا ہے اور جسم میں تناسب پیدا کرنے کی سب سے اچھی ترکیب یہ ہے کہ مناسب اور باقاعدہ ورزش کی جائے۔ جو ہوا سانس کے ذریعے ہمارے جسم میں جاتی ہے اس کا ایک خاص جزو ہے۔ جس کا نام آکسیجن ہے۔ اسی آکسیجن پر تمہارے رخساروں پر اس کی سرخی اچھی طرح جھلکنے لگے گی۔ لیکن اگر آکسیجن کافی مقدار میں نہ ملے تو خون غلیظ اور سیاہ رہتا ہے اور چہرے پر زردی یا سیاہی نمودار ہو جاتی ہے۔ گھروں کے اندر کی ہوا، شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں کی ہوا میں چونکہ ہر وقت ہزاروں انسان سانس لیتے رہتے ہیں۔ اس لئے آکسیجن کی مقدار اس میں بہت کم رہ جاتی ہے اور اس سے خون کی صفائی جیسی ہونی چاہئے ایسی نہیں ہوتی۔ خصوصاً وہ عورتیں جو رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے آکسیجن سے مستفید نہیں ہوسکتیں۔ کھلے میدانوں کی اور شہر سے باہر سڑکوں کی ہوا نسبتاً بہت زیادہ صاف اور تازہ ہوتی ہے۔ اور اس میں بکثرت آکسیجن موجود ہوتی ہے اگر عورتیں اس ہوا میں سانس لیں تو خون خوب صاف ہو جاتا ہے اور چہرہ کا رنگ بھی نہایت شوخ ہو جاتا ہے ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر عورتیں حسین اور تندرست بننا چاہتی ہیں تو یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اور میسر آسکے۔ وہاں تک کھلے ہوئے مقامات کی ہوا میں سانس لیا کریں۔

عام ورزش:

انسانی جسم کی متناسب نشو و نما کے لئے بہترین ورزشیں چلنا، پھرنا، دوڑنا، بھاگنا، گھوڑے کی سواری اور پانی میں تیرنا ہیں۔ اکثر عورتوں کو چلنے پھرنے کا، یا دوڑنے بھاگنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ اور گھوڑے کی سواری یا تیرنا تو نامعلوم کتنی مدت دراز سے ان کے لئے افسانہ ماضی بن چکا ہے اس لئے مجبوراً ان کے جسم کو مناسب نشو و نما دینے کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ اس قسم کی ورزشیں ایجاد کی جائیں۔ جن کے ذریعہ سے ان کے بدن کے عضلات اسی طرح حرکت کریں جیسے دوڑنے۔ بھاگنے یا تیرنے میں کیا کرتے ہیں ایک نہایت ہی آسان اور سادہ ترکیب سینہ کو چوڑا اور کشادہ کرنے اور اس کے ساتھ گردن اور کمر کے عضلات کو متحرک کرنے کی یہ ہے کہ روزانہ اپنے گھر میں کسی کھلے مقام پر یا چھت پر دیوار کی جانب پشت کر کے اس طرح کھڑی ہوں کہ پاؤں کی ایڑیاں اور سر کی گدی دیوار سے لگی ہوئی ہو اور باقی درمیانی تمام جسم میں سے بھی صرف کمر سے نیچے کا حصہ دیوار کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ دونوں ہاتھ لٹکے ہوئے ہوں اور دونوں طرف کی رانوں کے باہر کی جانب چمٹے ہوئے ہوں۔ جسم خوب تنا ہوا اور اکڑا رہے۔ اسی حالت میں منہ بند کر کے آہستہ آہستہ ناک سے زیادہ سے زیادہ لمبا سانس لیا جائے اور پھر منہ کھول کر جلدی سے اسے ساتھ ہی سر کو اور کمر سے نیچے کے حصہ کو بھی دیوار سے ذرا

الگ کرلیا جائے اور پھر سر کو پیچھے کی طرف جھکا کر دیوار کے ساتھ ملایا جائے۔ اس طرح سے کھڑے ہونے میں کمر اور کمر سے نیچے کا جسم تھوڑا سا باہر کو نکال دینا چاہئے اور ایڑیاں برابر دیوار سے لگی رہنی چاہئیں۔ اب دونوں ہاتھ موڑ کر گردن کے پیچھے رکھ لئے جائیں اور کہنیوں کو پیچھے کی طرف دیوار سے ملا دیا جائے اور پھر منہ بند کر کے چھ مرتبہ آہستہ آہستہ سانس لیجئے اور منہ کھول کر چھوڑا جائے۔ عورتوں کو روزانہ بس اتنی سی ورزش کر لینی کافی ہے۔

اعضائے زیریں:

قہقہہ لگا کر ہنسنا ہاضمہ کے لئے نہایت مفید ہے۔ قہقہہ کی عادت اختیار کر لینے سے بدہضمی کی پرانی اور پیچیدہ شکایات بعض اوقات رفع ہوگئیں۔ زیادہ رنج وفکر سے بدہضمی اور قبض کی شکایات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جس عورت کو قبض کی شکایت رہتی ہو یا بدہضمی سے تکلیف رہتی ہو۔ اس کے لئے بہترین مشورہ یہی ہے کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے کی عادت اختیار کرے۔ یہاں دو ایک ورزشیں لکھی جاتی ہیں۔ مستورات کے لئے ایک سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مفید طریقہ ورزش یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے پنجوں کے بل پر کھڑی ہوں اور بتدریج چاروں انگلیاں اٹھا کر سارا زور پاؤں کے انگوٹھوں پر دیں اور کھڑے ہوتے ہوئے اس بات کا خیال رکھیں کہ جسم بالکل سیدھا رہے۔ شروع شروع میں ایک آدھ مرتبہ ضرور تکلیف محسوس ہوگی لیکن اس کے بعد مشق ہو جائے گی۔ اس طریقہ سے پنڈلی، ران، کمر اور پیٹ کی اچھی ورزشیں ہو جاتی ہیں اور مذکورہ اعضاء کی فراہمی کے ساتھ ساتھ بدہضمی کی کوئی شکایت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

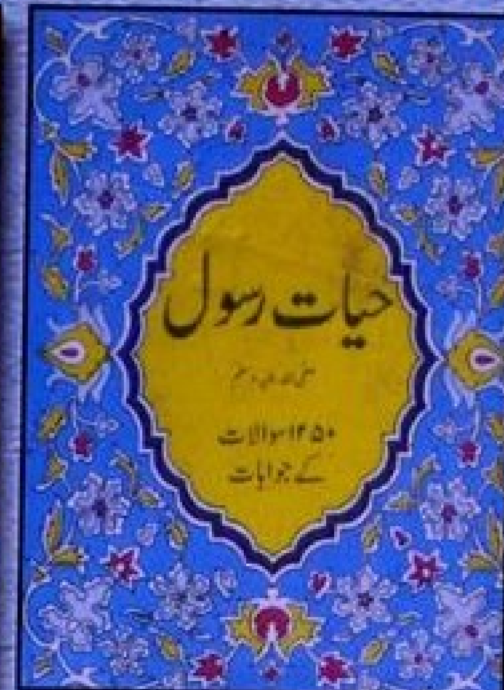
پشت وکمر کی تقویت:

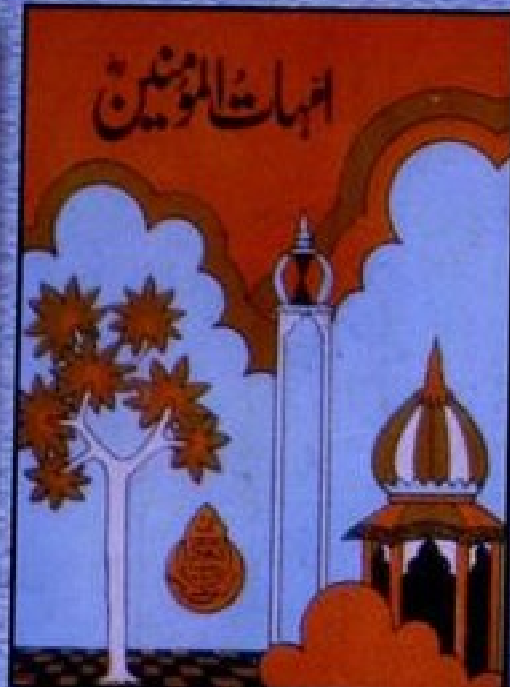
ایک آسان ورزش یہ ہے کہ عورتیں بالکل سیدھی کھڑی ہوں اس کے بعد پنجے اٹھا کر اور پاؤں کے انگوٹھوں پر زور دے کر آہستہ آہستہ بیٹھنے کی کوشش کریں۔ یہاں تک کہ بیٹھ ایڑیوں سے مل جائے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ پھر اٹھ کھڑی ہوں۔ یہ ورزش اپنی طاقت کے مطابق کرنی چاہئے۔ عورت کی پشت وکمر کی قوت نہایت ضروری چیز ہے۔ کمر کے کمزور ہونے سے جسم کے بالائی اعضاء انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں۔ پشت کمر کی ایک آسان ورزش یہ ہے کہ عورت سیدھی کھڑی ہو کر آگے کو جھکے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ گھٹنے نہ جھکنے پائیں اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے فرش کو چھونے کی کوشش کریں۔ پہلے پہل اس ورزش میں بہت دشواری محسوس ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ عورتیں اس ورزش میں کئی مرتبہ کی کوشش میں بھی فرش کو نہ چھو سکیں۔ لیکن چند روزہ مشق سے عادت پڑ جائے گی اور اس آسان ورزش سے بالخصوص نوجوان لڑکیوں کو غیر معمولی فوائد محسوس ہوں گے اور ان کے جسم میں گدازی اور چہرہ میں رعنائی پیدا ہوگی۔

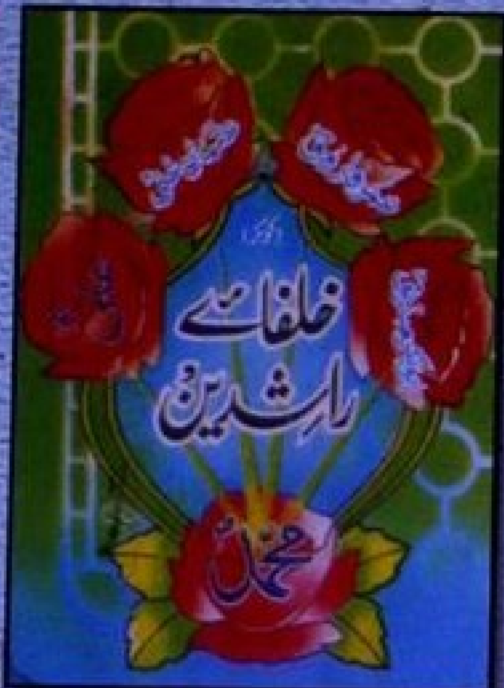
البتہ بھاری بھرکم خواتین کو سب سے زیادہ دقت کا سامنا ہوگا لیکن سچ یہ ہے کہ ان کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ مفید ورزش مذکورہ ترکیب سے فرش چھونا ہے۔

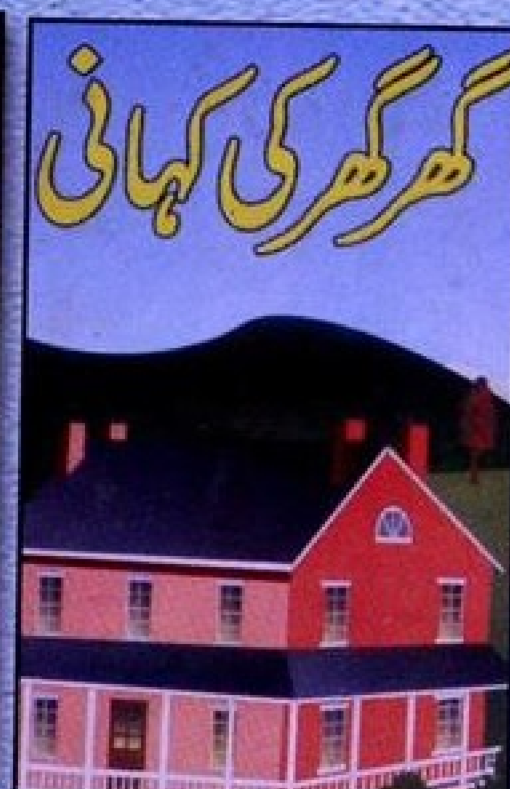
(بحوالہ رموز ازدواج)

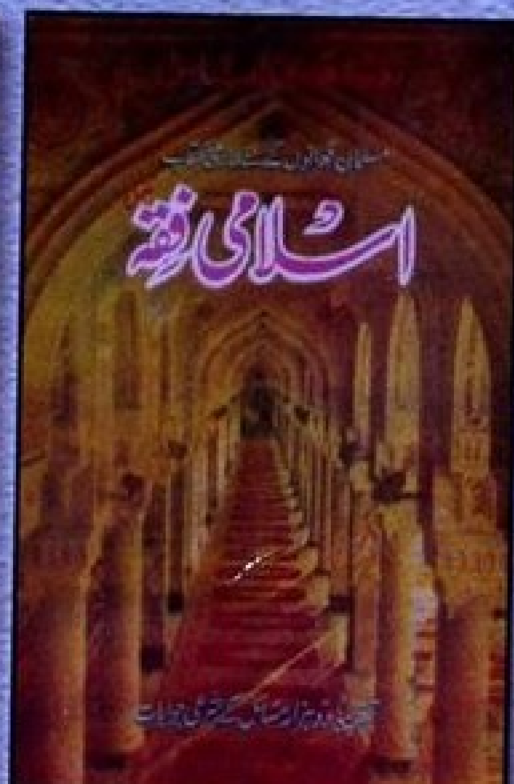
خواتین کے لئے بہترین تحفے





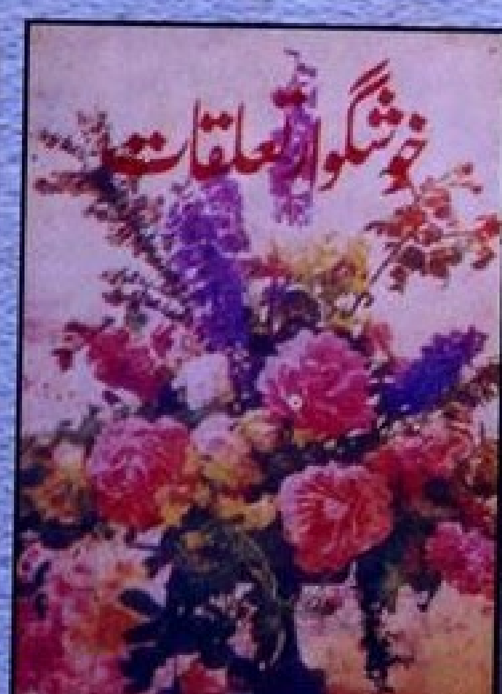


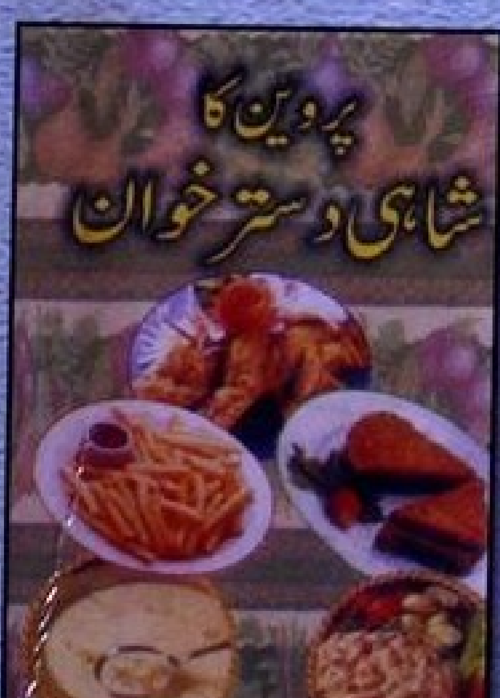












مکتبہ الحسنات (دہلی)